خُطبَاتِ
حکیمُ الاُمّت

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان فون: 4540513-4519240

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دنیا و آخرت

خطبات حکیم الامت جلد اوّل ''دنیا و آخرت''

جدید اشاعت سے مزین آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اللہ کے فضل و کرم اور اپنے اکابرین کی دعاؤں کے طفیل کافی عرصہ سے خطبات کی اشاعت کا ادارہ کو شرف حاصل ہو رہا ہے۔

بہت سے بزرگوں کی تمنا تھی کہ ان کی احادیث مبارکہ کی تخریج ہو جائے۔ ادارہ نے زر کثیر خرچ کر کے یہ کام محترم جناب مولانا زاہد محمود صاحب (فاضل جامعہ قاسم العلوم ملتان) سے یہ کام کرایا اور فارسی اشعار اور عربی عبارات کا ترجمہ اور اس کے ساتھ ساتھ تصحیح کا کام حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ نے سرانجام دیا۔

اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے آمین

بسلسلہ خطبات حکیم الامت جلد - ۱

دُنیا و آخرت

(جدید ایڈیشن)

حکیم الامت مجدد الملت

حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ

عنوانات

منشی عبد الرحمٰن خانؒ

تصحیح و تزئین

صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ

تخریج احادیث

مولانا زاہد محمود قاسمی

ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان

(061-4540513-4519240

دنیا و آخرت

تاریخ اشاعت.............رجب المرجب ۱۴۳۰ھ

ناشر..........................ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان

طباعت...................سلامت اقبال پریس ملتان

قارئین سے گذارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاکم اللہ

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ....چوک فوارہ....ملتان — مکتبہ رشیدیہ.......راجہ بازار.......راولپنڈی

ادارہ اسلامیات.........انار کلی........لاہور — یونیورسٹی بک ایجنسی....خیبر بازار.......پشاور

مکتبہ سید احمد شہید.......اردو بازار.......لاہور — ادارۃ الانور........نیو ٹاؤن.......کراچی نمبر 5

مکتبہ رحمانیہ.......اردو بازار .... لاہور — مکتبہ المنظور الاسلامیہ....جامعہ حسینیہ....علی پور

119-121- HALLIWELL ROAD
BOLTON BLI 3NE. (U.K.)

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K
(ISLAMIC BOOKS CENTERE

اجمالی فہرست

الفانی .... صفحہ ۱۴۵

مَاعِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَاعِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَاكَانُوْا يَعْمَلُوْنَ. (النحل ۹۶)

الباقی .... صفحہ ۱۶۷

مَاعِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَاعِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَاكَانُوْا يَعْمَلُوْنَ. (النحل ۹۶)

الدنیا والآخرۃ .... صفحہ ۱۹۰

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌوَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْكَانُوْا يَعْلَمُونَ. (العنکبوت: آیت ۶۴)

ہم الآخرۃ .... صفحہ ۲۷۰

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غَافِلُوْنَ. (الروم ۷)

تجارت آخرت .... صفحہ ۳۲۴

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ. (التوبہ: ۱۱۱)

تذکیرہ الآخرہ .... صفحہ ۳۵۷

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ. (القیمۃ: ۲۰، ۲۱)

ترجیح الآخرہ .... صفحہ ۳۸۲

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى. اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى صُحُفِ اِبْرَاهِيْمَ وَمُوْسٰى. (سورۃ الاعلیٰ: ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹)

دار المسعود .... صفحہ ۴۲۹

وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ. (سورہ ہود: ۱۰۸)

فہرست مکتب

المراد
ملقب به
تمیز المرغوبة من المرهوبة

فی نفسہ نہ کوئی شے بری ہے نہ اچھی۔ یہ اپنے حسن وقبح میں اپنے مضاف الیہ یعنی مراد پر موقوف ہے۔ اگر اچھے کام کا قصد کیا جائے تو وہ ارادہ عمدہ ہے اور برے کام کا قصد کیا جائے تو وہ ارادہ برا ہے کسی عمل پر جزا وسزا بدوں ارادہ کے مرتب نہیں ہوتی اور ارادہ پر بدوں عمل کے بھی گناہ وثواب لکھا جاتا ہے لیکن اگر بدوں ارادہ کے کوئی گناہ بھول چوک سے ہوگیا تو وہ معاف ہے۔ جس کے لیے حق تعالیٰ نے یہ دعا تعلیم فرمائی:

رَبَّنَا لَاتُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا. (البقرہ ۲۸۶)

دنیا وآخرت کو مراد بنانے کے آثار واحکام کے متعلق یہ وعظ جمعۃ المبارک مورخہ ۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۴ھ کو مراد آباد کی جامع مسجد میں کھڑے ہوکر قریباً پانچ ہزار سامعین کو سنایا گیا جس پر ۲ گھنٹے ۵ منٹ لگے اور جسے مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے قلمبند فرمایا۔ اس وعظ کے نام کی نسبت تو شہر کے نام سے ہے اور لقب کی نسبت ایک لڑکی کے نام سے ہے جس کے نکاح کی تقریب پر یہ وعظ ہوا جو اس خوش بخت کے عقد کی تاریخی یادگار رہے۔ اس وعظ کا کچھ حصہ نماز جمعہ سے قبل ہوا اور کچھ بعد نماز۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُوۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ۔

اَمَّابَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ. قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ الۡعَاجِلَۃَ عَجَّلۡنَا لَہٗ فِیۡھَا مَانَشَآءُ لِمَنۡ نُّرِیۡدُ ثُمَّ جَعَلۡنَا لَہٗ جَھَنَّمَ یَصۡلٰھَا مَذۡمُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا. وَمَنۡ اَرَادَ الۡاٰخِرَۃَ وَسَعٰی لَھَا سَعۡیَھَا وَھُوَمُوۡمِنٌ فَاُوۡلٰٓئِکَ کَانَ سَعۡیُھُمۡ مَّشۡکُوۡرًا. کُلًّا نُّمِدُّ ھٰٓؤُلَآءِ وَھٰٓؤُلَآءِ مِنۡ عَطَآءِ رَبِّکَ وَمَا کَانَ عَطَآءُ رَبِّکَ مَحۡظُوۡرًا. اُنۡظُرۡ کَیۡفَ فَضَّلۡنَا بَعۡضَھُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ وَلَلۡاٰخِرَۃُ اَکۡبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَکۡبَرُ تَفۡضِیۡلًا. (سورہ بنی اسرئیل آیت نمبر ۱۸ تا نمبر ۲۱)

ترجمہ: جو شخص دنیا (کے نفع) کی نیت رکھے گا ہم ایسے شخص کو دنیا میں جتنا چاہیں گے جس کے واسطے چاہیں گے فی الحال ہی دے دیں گے۔ پھر ہم اس کے لیے جہنم تجویز کریں گے وہ اس میں بدحال راندہ (درگاہ) ہوکر داخل ہوگا اور جو شخص آخرت (کے ثواب) کی نیت رکھے گا اور اس کے لیے جیسی سعی کرنا چاہیے ویسی ہی سعی بھی کرے گا۔ بشرطیکہ وہ شخص مومن بھی ہو سو ایسے لوگوں کی یہ سعی مقبول ہوگی۔ آپ کے رب کی (اس) عطاء دنیوی میں سے بھی تو ہم ان کی بھی امداد کرتے ہیں اور ان کی بھی اور آپ کے رب کی (یہ) عطاء دنیوی کسی پر بند نہیں۔ آپ دیکھ لیجئے ہم نے ایک کو دوسرے پر کس طرح فوقیت دی ہے اور البتہ آخرت درجوں کے اعتبار سے بھی بہت بڑی ہے اور فضیلت کے اعتبار سے بھی بہت بڑی ہے۔

مقصود بیان

اس وقت جو آیتیں میں نے تلاوت کی ہیں سب کا بیان کرنا مدنظر بھی نہیں۔ مقصود صرف اول کی دو آیتوں کی بابت کچھ عرض کرنا ہے ان دونوں آیتوں میں حق تعالیٰ شانہ نے دو ارادوں کا ذکر فرمایا

ہے ایک ارادہ دنیا، دوسرا ارادہ آخرت اور ساتھ ساتھ دونوں کے ثمرات بھی مذکور ہیں۔ یہ مضمون اگرچہ بارہا کانوں میں پڑا ہوگا مگر اب تک اس کو سرسری طور سے سنا گیا اور یہی وجہ ہے اس کے مؤثر نہ ہونے کی کیونکہ اگر مؤثر ہوا ہوتا تو اس کی علامات وآثار موجود ہوتے۔ اس وقت اس مضمون کو اسی لیے اختیار کیا گیا ہے کہ جو اثر اس کا ہونا چاہیے تھا وہ ابھی تک نہیں ہوا اور اس کے ضروری ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا اس لیے اس کو بیان کیا جاتا ہے۔

اور ساتھ ہی یہ بھی درخواست کی جاتی ہے کہ اس کو سرسری نہ سمجھا جائے اور مثل سابق بیانات کے اس کو بے توجہی سے نہ سنا جائے کیونکہ اس طرح سننا نہ سننا برابر ہے۔ کسی مضمون کا کانوں میں پہنچنا اس کا نام نہیں ہے کہ اس کو بے توجہی کے ساتھ سن لیا جائے کیونکہ قرآن شریف میں کفار کے بارے میں جابجا ارشاد ہے کہ یہ قرآن کو سنتے نہیں، بہرے ہیں۔ حالانکہ آواز تو ان کے کانوں میں پہنچتی تھی بلکہ سننا اس کا نام ہے کہ مضمون سن کر اس میں تدبر کیا جائے، پھر عمل کیا جائے۔ سورہ صٓ میں صاف صاف مذکور ہے کہ ہم نے قرآن تدبر و تذکر کے واسطے نازل کیا ہے۔ قال تعالیٰ:

كِتَابٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (صٓ:۲۹)

ترجمہ: ”یہ بابرکت کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر اس واسطے نازل کیا ہے تا کہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں اور تا کہ اہل فہم نصیحت حاصل کریں۔“

اور بھی جابجا قرآن شریف میں تدبر نہ کرنے کی شکایت ہے۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ. (کیا وہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے)

ہم لوگوں میں بڑی کمی یہ ہے کہ قرآن شریف میں تدبر نہیں کرتے۔ اس کا مطلب لوگ یہ سمجھے ہوں گے کہ ترجمہ قرآن دیکھنا چاہیے مگر صرف اتنا کافی نہیں کیونکہ جو لوگ ترجمہ کے ساتھ قرآن پڑھتے ہیں ان میں یہ بھی کمی موجود ہے کہ وہ تدبر نہیں کرتے۔ محض سرسری طور پر اس کو پڑھ جاتے ہیں۔ اب آپ کہیں گے کہ پھر کیا مطلب ہے۔ کیا سب مسلمانوں کو مولوی بن جانا چاہیے؟ نہیں صاحبو! میں آپ کو مولوی بننے کی صلاح نہیں دیتا بلکہ مقصود یہ ہے کہ قرآن میں سے جو ضروری حصہ عمل کے لیے علماء نے مدون کر دیا ہے جس کا نام علم عقائد و علم اخلاق و علم فقہ ہے آپ لوگ اس میں توجہ نہیں کرتے۔

تدبر فی القرآن

قرآن میں تدبر کرنے کے یہی معنی نہیں کہ قرآن سامنے رکھ کر ہی اس میں غور کیا جائے

بلکہ یہ بھی تدبر فی القرآن میں داخل ہے کہ جن کتابوں میں مضامین قرآن مذکور ہیں۔ان میں غور و محنت سے کام لیا جائے۔اب آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ مسلمانوں میں ترجمہ نہ جاننا کوئی کمی نہیں کیونکہ ترجمہ قرآن ہر شخص نہیں جان سکتا اس لیے ہر شخص کو مولوی بننا تو دشوار ہے اور جو طریقہ مشہور ترجمہ دیکھنے کا ہے کہ قرآن مترجم لے کر دیکھ لیا اس کو میں خیر خواہی سے کہتا ہوں کہ طریقہ ناکافی ہے اس کو چھوڑ دیا جائے' ترجمہ اردو کا مطالعہ بھی۔ میں سچ کہتا ہوں کہ یہ طریقہ ناکافی ہے اس کو چھوڑ دیا جائے' واقعات ایسے پیش آتے ہیں کہ ترجمہ دیکھنے والوں کو بہت سے مضامین کا سمجھنا دشوار ہو گیا کیونکہ بہت سے مضامین کا سمجھنا مبادی پر موقوف ہوتا ہے اور مبادی قرآن صرف ونحو بلاغت و ناسخ و منسوخ و اصول وفقہ وغیرہ ہیں جب تک کوئی شخص مبادی سے جاہل ہے وہ ان مضامین کو کس طرح سمجھ لے گا جو کہ ان پر موقوف ہیں۔

پھر مصیبت یہ ہے کہ آج کل پوچھنے کی عادت بھی لوگوں میں کم ہے۔اگر کہیں شبہ پڑتا ہے تو اکثر تو اپنی رائے سے اس کا مطلب تراش لیتے ہیں جس سے اکثر کے عقیدے فاسد ہو جاتے ہیں مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ عوام کو مضامین قرآن سے فیض یاب ہونے کا کوئی طریقہ نہ رہا۔ اس کا جواب ایک تو میں پہلے دے چکا ہوں کہ جو کتابیں سلیس مضامین میں لکھی گئی ہیں ان کا مطالبہ تدبر کے ساتھ کیا جائے۔ نیز جو لوگ مضامین قرآن اور علوم حقہ اپنے وعظ میں بیان کرتے ہیں ایسے لوگوں کا وعظ غور سے سنا جائے۔علاوہ ازیں نفس ترجمہ قرآن سے منتفع ہونے کا بھی ایک طریقہ ہے وہ یہ کہ آج کل دو قسم کے آدمی ہیں ایک وہ جن کو تحصیل علوم کے لیے فراغت مل سکتی ہے۔ان کو تو چاہیے کہ بنام خدا اول مبادی قرآن محنت سے حاصل کریں پھر ترجمہ قرآن دیکھیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جن کو اس قدر فراغت میسر نہیں آ سکتی۔ان کو چاہیے کہ پہلے کسی معتبر عالم سے مشورہ کریں کہ مجھے ترجمہ قرآن کون سا لینا چاہیے' کون سا ترجمہ قرآن صحیح اور معتبر ہے۔اپنی رائے سے خود تعین نہ کریں' لوگوں نے آج کل تراجم کے لیے خود ہی ایک معیار مقرر کر لیا ہے مگر اس معیار کا غلط ہونا میں ابھی ثابت کر دوں گا۔

ٹکسالی تراجم

مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ و مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ ٹکسالی ترجمہ ہے کہ بالکل صحیح اور معتبر ہے۔مگر بوجہ زبان بدل جانے کے اور نیز بعض میں محاورات زبان کی رعایت نہ کرنے کے وہ پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ خیر پھیکے ہوا کریں مگر جو مقبولیت ان

کو حاصل ہے وہ دوسرے ترجموں کو حاصل نہیں۔ یہ ان حضرات کے خلوص کی برکت ہے آج کل لوگوں نے عمدہ ترجمہ کا معیار یہ قرار دے رکھا ہے کہ رنگین عبارت ہو۔ کیوں صاحبو! اگر دو حکیم ہوں جن میں سے ایک تو ماہر ہے مگر وہ نسخہ پھیکا لکھتا ہے اور دوسرا حکیم بڑی رنگین عبارت سے نسخہ لکھتا ہے مگر ماہر نہیں ہے۔ انصاف سے بتلایئے کہ کس کے نسخہ کی آپ قدر کریں گے۔ ظاہر ہے کہ ماہر فن کے نسخہ کی ہر شخص قدر کرے گا اور اس کے مقابلہ میں اس غیر ماہر کے رنگین نسخہ کو کوئی بھی نہ پوچھے گا اور یہی کہا جائے گا کہ ہم کو مقصود علاج کرنا اور دوا کا استعمال کرنا ہے اس رنگینی کو لے کر کیا پھونکیں۔

صاحبو! اگر ہم قرآن کو کتاب علاج روحانی سمجھتے تو تراجم کے اندر بھی اسی بات کو ملحوظ کرتے کہ کون سا ترجمہ ماہر فن کا ہے کہ اس کا معتبر جان کر اس پر عمل کیا جائے اور کون سا غیر ماہر کا ہے کہ اس سے اجتناب کیا جائے۔ اگر چہ وہ کیسا ہی رنگین کیوں نہ ہو کیونکہ مقصود تو عمل ہے اور اس میں رنگینی عبارت کو کوئی بھی دخل نہیں مگر ہم لوگ قرآن کو قصہ کہانی کی کتاب سمجھ کر دیکھتے ہیں۔ جب ہی تو رنگین ترجمہ کی قدر ہوتی ہے۔ اگر ترجموں کے مطالعہ سے مقصود عمل ہوتا تو رنگینی پر نظر نہ ہوتی بلکہ مقصود پر نظر ہوتی۔ اگر رنگین عبارت دیکھنے کا شوق ہے تو اس کے لیے ترجمہ قرآن کا کیوں انتخاب کیا جاتا ہے۔ عمدہ زبان تو قصہ چہار درویش کی ہے اس کا مطالعہ کر لیا کیجئے۔ ترجمہ قرآن کو خواہ مخواہ کیوں تکلیف دی۔ غرض صحیح معیار عمدہ ترجمہ قرآن کا یہ نہیں جو آج کل عوام کا مذاق ہو گیا بلکہ صحیح معیار وہ ہے جو میں نے بیان کیا کہ معتبر ماہر فن کا ترجمہ لیا جائے پھر اس کو کسی معتبر عالم سے سبقاً سبقاً پڑھ لیا جائے۔ بدوں اس کے ترجمہ دیکھنا کافی نہیں۔

اسی طرح ترجمہ سمجھنے کے لیے محض ادب دانی کافی نہیں آج کل لوگوں میں یہ بھی بڑی کوتاہی ہے کہ ان لوگوں کی بڑی قدر کرتے ہیں جو عربی میں تقریر و تحریر کر لیا کریں اور اس کو بڑا کمال سمجھتے ہیں مگر قرآن سمجھنے کے لیے محض ادب دانی کافی نہیں اور میں اس کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں کہ اگر قانون کی کتاب ایک شاعر سے پڑھی جائے جس کی زبان بہت عمدہ ہے مگر قانون سے اس کو مس نہیں اور ایک دوسرا شخص ہے جو زبان دانی میں حصہ کم رکھتا ہے مگر قانون سے پورا واقف ہے۔ اب اگر کتاب قانون کی کسی عبارت میں دونوں کا اختلاف ہو۔ شاعر کچھ مطلب بیان کرے اور قانون دان وکیل کچھ اور کہے۔ عقلاء زمانہ انصاف سے بتلائیں کہ اس صورت میں کس کا قول قابل توجہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ قانون دان وکیل کے سامنے زباندان شاعر کا قول ایک کوڑی کو بھی نہ پوچھا جائے گا' زبان آ جانے سے فن سہل نہیں ہو سکتا۔

ضرورت استاد

اس لیے ترجمہ پڑھنے کے لیے کسی قانون شریعت جاننے والے مولوی کو منتخب کیا جائے اور اس سے تمام ترجمہ پڑھ لیا جائے اور یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جب قرآن کا اردو میں ترجمہ ہو گیا ہے تو اب اس کے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے وہ تو خود ہماری زبان ہی ہے۔ بات یہ ہے کہ ترجمہ سے صرف عربی ترکیب اور لغات حل ہو جائیں گے مگر قرآن کوئی مقامات حریری تو نہیں کہ صرف حل ترکیب ولغات اس کے معنی سمجھنے کے لیے کافی ہو جائے۔ قرآن میں تو بڑے بڑے علوم یعنی عقائد وتزکیہ اخلاق وفقہ مذکور ہیں۔ جب تک ان کو نہ بیان کیا جائے اس کا مطلب حل نہیں ہو سکتا اور جو شخص ان علوم سے خود ہی واقف نہیں اور نہ کسی واقف سے پڑھتا ہے وہ اگر خالی ترجمہ دیکھے گا تو اندیشہ ہے کہ وہ مرجیہ وقدریہ کا ہم عقیدہ ہو جائے کیونکہ ہر فن و ہر کتاب کی خاص اصطلاحیں ہوتی ہیں جو محض ترجمہ سے بدوں استاد کے بتلائے حل نہیں ہو سکتیں۔ یہ شخص قرآن کا مطلب ویسے ہی سمجھے گا جیسا کہ کسی شخص نے گلستاں کے اس شعر کا مطلب سمجھا تھا۔

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست ۔۔۔ در پریشاں حالی و در ماندگی!

اس شخص نے بھی اس شعر کا محض ترجمہ دیکھا تھا کہ دوست وہ ہے کہ پریشان حالت و خستگی میں دوست کا ہاتھ پکڑے۔ اس نے ترجمہ ہی پر عمل کیا کہ ایک روز کسی موقع پر اپنے ایک دوست کو پٹتے ہوئے دیکھا تو اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے، دشمن نے اور جی کھول کر اسے پیٹا۔ اس نے ہر چند ہاتھ چھڑائے مگر اس نے نہیں چھوڑے، جب وہ خوب پٹ چکے اور مارنے والے نے بھی مار کر چھوڑ دیا تو اس دوست کو اس پر بڑا غصہ آیا اور اس نے اسے بہت برا بھلا کہا کہ ایسے وقت میں امداد تو نہ ہو سکی اور الٹا دوستی کا یہ حق ادا کیا کہ میرے ہاتھ بھی پکڑ لیے۔ اب یہ حیران ہے کہ میں نے تو شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے کہنے کے موافق دوستی کا حق ادا کیا تھا۔ یہ خفا کیوں ہوتا ہے اور اس سے کہا کہ بھائی! میں نے دوستی کا حق ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کی، میں نے تو وہی کیا جو گلستاں میں شیخ فرماتے ہیں:

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست

(دوست وہ ہے جو اپنے دوست کا ہاتھ پکڑے)

تو صاحبو! اس شخص نے ترجمہ میں کوئی غلطی نہیں کی تھی البتہ ایک کمی تھی کہ جائے استاد خالی است۔ اس نے ترجمہ خود ہی دیکھا تھا، کسی سے پڑھا نہ تھا۔ پس جب گلستاں سمجھنے کے لیے باوجود یہ کہ وہ کوئی بڑی علمی کتاب نہیں، محض ترجمہ دیکھنا بعض عقلاء کو غلطی میں ڈال دیتا ہے تو قرآن کا

ترجمہ دیکھنا کیونکر کافی ہو جائے گا اور اس میں غلطی کا کیوں احتمال نہ ہوگا۔ اب اگر یہ سوال کیا جائے کہ جب ترجمہ قرآن بھی بدوں پڑھے نہیں آسکتا تو ترجمہ کرنے ہی کی کیا ضرورت تھی، اس سے کیا نفع ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ترجمہ سے نفع یہ ہوا کہ آپ کو عربی صرف ونحو ولغت پڑھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ کیا یہ تھوڑا نفع ہے اگر ترجمہ نہ ہوتا تو پہلے صرف ونحو میں دماغ صرف کرنا پڑتا، پھر کہیں برسوں کے بعد اس قابل ہوتے کہ ترجمہ قرآن سمجھ سکیں۔ اب اتنی آسانی ہے کہ جیسا چاہو ترجمہ کسی مولوی سے شروع کر سکتے ہو۔ یہ تھوڑا نفع ہے باقی ترجمہ کرنے والوں کو یہ ہرگز مقصود نہیں کہ کسی سے پڑھنے کی بھی ضرورت نہیں۔

صاحبو! ذرا دنیا کے کاموں پر نظر کرو کہ ذرا ذرا سا کام بھی بدوں استاد کے بتلائے نہیں آتا۔ نجاری یعنی بڑھئی کا کام ذرا کوئی بدوں سیکھے کر تو لے یقیناً اپنے ہاتھ پیر کاٹے گا حالانکہ بارہا بڑھئی کو کاٹتے چھیلتے دیکھا ہوگا۔ وہاں کوئی نہیں کہتا کہ بس ہم نے طریقہ دیکھ لیا ہم بھی ایسے ہی کریں گے۔ ان باتوں میں ساری دنیا کا اتفاق ہے کہ بھائی صرف دیکھ لینا کافی نہیں جب تک کہ باقاعدہ استاد سے نہ سیکھا جائے۔ افسوس قرآن کو ایسا معمولی کلام سمجھا جاتا ہے کہ اس کا ترجمہ خود دیکھ لینا کافی ہوگیا۔ صاحبو! آپ کو اس سے تعجب ہوگا کہ میری عمر پچاس سال سے متجاوز ہوگئی اور لکھنے پڑھنے کا اس عرصہ میں بہت ہی کام رہا مگر آج تک قلم بنانا مجھے نہیں آتا کیونکہ کسی سے سیکھا نہیں۔ یونہی الٹا سیدھا کاٹ چھیل کر کام چلا لیتا ہوں۔ جب خسیس سے خسیس فن بدوں استاد سے سیکھے نہیں آسکتا تو ترجمہ قرآن کی بابت کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں بدوں استاد کے سمجھ لیتا ہوں اور جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں وہ اس کا امتحان اس طرح کر لیں کہ پہلے خود سارا ترجمہ قرآن دیکھ جائیں اس کے بعد کسی عالم سے پڑھیں۔ ان شاء اللہ اس کے بعد خود ہی اپنے کو جاہل کہیں گے اور معلوم کر لیں گے کہ محض ذہین ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔

تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ تدبر قرآن کے لیے سب کو مولوی بننا ضروری نہیں بلکہ قرآن میں تدبر کی اور بھی سہل صورتیں ہیں جو بدوں مولوی بنے حاصل ہو سکتی ہیں مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جب بدوں ترجمہ پڑھے تدبر نہیں ہو سکتا تو قرآن کی تلاوت کرنا بھی فضول ہوا۔ بات یہ ہے کہ فضول اور بے کار وہ ہے جس میں کوئی نفع نہ ہو۔

فوائد تلاوت

قرآن میں منافع بہت سے ہیں۔ ایک نفع تو بعد فہم کے اس پر عمل کرنے کا ہے۔ دوسرا فائدہ

ثواب ہے تو بدوں معنی سمجھے پڑھنا فضول اس وقت ہو جبکہ اس کو ثواب نہ ملے۔ اس بات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرو۔ آپؐ فرماتے ہیں کہ قرآن پڑھنے والے کو ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں اور میں یہ نہیں کہتا کہ الم ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے اور لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف تو الم میں تین حرف ہوئے۔ اس کی تیس نیکیاں ہوئیں اور بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ میں الف اور لام اور میم میں سے ہر ایک کو ایک حرف نہیں کہتا بلکہ لفظ الف میں جو اول الف آیا ہے وہ ایک حرف ہے اور لفظ لام میں جو اول لام بولا گیا وہ ایک حرف ہے اور لفظ میم میں جو اول میم بولا گیا وہ ایک حرف ہے۔ تو گویا آپ نے ہر حرف کے سرے کو بیان کیا ہے اور باقی کو قیاس پر چھوڑ دیا۔ اس حساب سے الم میں نو حرف ہوئے اور اس میں نوے نیکیاں ہوئیں تو یہ قرآن کا تھوڑا نفع ہے کہ بے سمجھے پڑھنے سے بھی ایک لفظ میں نوے نیکیاں مل گئیں اور ہمارا کچھ خرچ بھی نہیں ہوا اور یہ ثواب کوئی حروف مقطعات کے ساتھ خاص نہیں بلکہ یہ تو ایک تمثیل تھی۔ قرآن کے ہر لفظ کا یہی ثواب ہے۔ سورۃ فاتحہ ہم پڑھتے ہیں جہاں زبان سے الحمد نکلا تو اس میں پانچ حرف ہیں، معاً پچاس نیکیاں لکھی گئیں مگر افسوس تو یہ ہے کہ ہم لوگ اس کو نفع نہیں سمجھتے مگر مر کر اس کی قدر معلوم ہوگی۔

اس کی بعینہٖ ایسی مثال ہے کہ دو شخص مکہ جانے والے ہیں اور معلوم ہے کہ یہ تانبے کا پیسہ وہاں بالکل نہیں چلتا۔ ایک نے تانبے کے پیسوں سے دوسرا سکہ چاندی کا جو کہ وہاں رائج ہے، خرید لیا۔ دوسرا شخص جو کہ مکہ کی حالت سے لاعلم ہے اور اس کو خبر نہیں کہ وہاں کس سکہ کی ضرورت ہوگی اس پر ہنستا ہے اور اس کو بیوقوف بناتا ہے اور کہتا ہے جب یہ پیسہ یہاں کارآمد ہے تو وہاں بھی ضرور کام دے گا۔ اس نے صرف پیسے ہی پیسے ساتھ باندھ لیے مگر ایک تیسرا شخص جو کہ مکہ ہو کر آیا ہے فیصلہ کرے گا کہ پہلا شخص بیوقوف نہیں بلکہ وہ عاقل ہے اور دوسرا شخص بے وقوف ہے۔ اس کو اتنی بھی خبر نہیں کہ میں جہاں جا رہا ہوں وہاں کا کیا دستور ہے مگر ابھی تک اس ثالث کے فیصلے کی کسی کو قدر نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ وہ دونوں شخص مکہ پہنچے۔ اب دونوں کی حالت میں کھلا ہوا فرق نظر آئے گا۔ پہلا شخص جو کہ میں چلنے والا سکہ ساتھ لایا ہے وہ تو ہر دُکان پر جاتا ہے اور بے تکلف ضرورت کی چیز لے آتا ہے اور دوسرا جس کی تھیلی میں تانبے کے پیسے ہی پیسے ہیں ہر ضرورت کے وقت دوسروں کا منہ تکتا ہے اور اب اپنی حماقت پر روتا ہے کہ افسوس میں نے عقلاء کے مشورہ پر عمل نہ کیا اور اب یہ پیسے تو یہاں بالکل فضول ہیں، کس طرح کھانا خریدوں؟ کہاں سے پانی خریدوں؟ کس طرح دن کٹیں گے؟

اسی طرح ان نیکیوں کی قدر ہم کو آخرت میں ہوگی کیونکہ یہ وہیں کا سکہ ہے وہاں آپ کے

یہ روپے پیسے کام نہ دیں گے اور وہاں سب کو جانا ہے اس میں کسی مسلمان کو شک نہیں ہوسکتا۔ جب بازار قیامت قائم ہوگا وہاں بھی دو قسم کے لوگ ہوں گے ایک وہ جو کہ وہاں کے سکے یعنی نیکیاں پلے باندھ کر لائے ہیں وہ تو بے تکلف ہر قسم کی راحت حاصل کرلیں گے۔ دوسرے وہ لوگ جو اپنی غفلت کی وجہ سے آخرت کو بھولے ہوئے تھے اور اس وجہ سے کچھ نیکیوں کا ذخیرہ ساتھ باندھ کر نہیں لائے ان کا یہ حال ہوگا۔

کہ بازار چندانکہ آگندہ تر — تہی دست را دل پراگندہ تر

(جس طرح بازار طرح طرح کی چیزوں سے بھرا ہوگا اسی قدر تنگ دست شخص کا دل زیادہ پریشان ہوگا)

اس وقت آپ ان لوگوں کی قدر کریں گے جن کو آج مولویوں کا بگاڑا ہوا کہا جاتا ہے۔ اس دن وہ احمق جن کی حماقت پر آج کل کی نئی روشنی نے رجسٹری کردی ہے عاقل کہلائیں گے اس وقت حیرت ہوگی کہ یہ لوگ جن کو ہم ذلیل سمجھتے تھے بڑے باشوکت ہیں اور آج ہم ان کے آگے ذلیل ہیں۔

اہمیت اعمال

صاحبو! وہاں بجز اعمال صالحہ کے کچھ کام نہ آئے گا اور یہ بھروسہ نہ کرنا کہ ہمارے ماں باپ بہت نیک تھے ان سے کچھ نیکیاں بٹوالیں گے وہاں کوئی کسی کے کام نہ آئے گا۔

حدیث شریف میں ایک شخص کا واقعہ مذکور ہے کہ قیامت کے دن ایک شخص کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہوں گی اور وہاں کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر نیکیاں زیادہ ہوں تو جنتی ہے اور بدی زیادہ ہوں تو دوزخی ہے اور دونوں برابر ہوں تو چندے اعراف میں رکھا جائے گا۔ اس قاعدہ کے موافق اس شخص سے ارشاد ہوگا کہ اگر ایک نیکی کہیں سے تم کو مل جائے تو جنت میں بھیج دیا جائے گا۔ وہ شخص خوش ہوگا کہ میرے ماں باپ، بیوی بچے، دوست احباب بہت سے ہیں، کسی سے ایک نیکی کا مل جانا کیا دشوار ہے۔ چنانچہ وہ جائے گا اور جا کر باپ سے اپنی حالت عرض کرے گا کہ مجھے ایک نیکی کی ضرورت ہے، تم میرے باپ ہو، میرے حال پر رحم کرو، ایک نیکی دے دو۔ وہ صاف جواب دے دے گا کہ یہاں ہم کو اپنی جان کی پڑی ہے تجھے ایک نیکی کیسے دے دوں، ماں بھی اسی طرح جواب دے گی، اولاد بھی ٹکا سا جواب دے گی، دوست احباب بھی دور کی سنائیں گے۔ آخر نہایت مایوس ہوکر لوٹے گا، راستہ میں ایک شخص سخی ملے گا جس کے پاس صرف ایک ہی نیکی ہوگی وہ اس سے پوچھے گا کہ میاں پریشان کیوں ہو رہے ہو، کیا بات ہے؟ وہ جواب دے گا کہ میری پریشانی کا

علاج ہوسکتا تو میں ظاہر بھی کرتا مگر اس کا علاج کسی سے نہیں ہوسکتا ہر ایک کو اپنی جان کی پڑی ہے ظاہر کرنے سے کیا فائدہ۔ ماں باپ' اولاد و اقارب' دوست احباب سب جواب دے چکے' تم کیا کرلو گے؟ وہ کہے گا تم اپنا حال تو کہو' شاید میں اس میں کچھ ساتھ دے سکوں۔ غرض بعد کلام بسیار یہ اپنا حال کہے گا کہ مجھے ایک نیکی کی ضرورت تھی۔ وہ شخص جواب دے گا کہ میرے پاس کل ایک نیکی ہے اور وہ میرے کسی کام کی بھی نہیں کیونکہ گناہ بہت زیادہ ہیں میں تو جہنم میں جاؤں گا یہ نیکی ہوئی تو کیا نہ ہوئی تو کیا' لے نیکی تو ہی لے جا' تیرے ہی کام آ جائے گی۔ یہ شخص حیران ہوگا کہ یا اللہ! یہ کون سخی ہے جو اس طرح بے خبر اپنی نیکی دے رہا ہے۔ صاحبو! وہاں بھی یہ اہل دل ہی سخاوت کریں گے اور یہی مخلوق پر رحم کریں گے' ماں باپ کچھ کام نہ آئیں گے' غرض یہ شخص خوش ہوکر وہ نیکی لے کر لوٹے گا اور دربار الٰہی میں پیش کردے گا وہ تو بموجب اس قاعدہ کے بخش دیا جائے گا کیونکہ نیکیاں غالب ہوگئیں۔

اس کے بعد اس سخی صاحب کو بلایا جائے گا کہ تم نے یہ کیا کیا کہ اپنی نیکی دوسرے کو دے دی کیا تم کو اپنی نجات کی فکر نہیں' وہ عرض کرے گا کہ الٰہی! میرے پاس صرف ایک ہی نیکی تھی۔ میں جانتا تھا کہ قاعدہ کے موافق تو میں جہنمی ہوں اور یہ نیکی میرے واسطے کار آمد نہیں ہوسکتی۔ البتہ اگر حق تعالیٰ اپنے فضل سے بخش دیں تو اور بات ہے مگر جب میری بخشش صرف فضل حق پر موقوف ہے اور میں اپنے عمل سے نہیں بخشا جاسکتا تو اس غریب کی بھی کیوں امید توڑوں۔ میں نے وہ نیکی اس مسلمان بھائی کو دے دی کہ اس کی تو مغفرت ہوجائے گی' میرا معاملہ رحمت حق کے سپرد ہے تو وہ شخص اپنی اس سخاوت پر بخش دیا جائے گا۔

صاحبو! وہ عجیب دربار ہے۔ وہاں ذرا ذرا سی بات پر بخشش ہوجاتی ہے۔ ایک اور شخص کا قصہ حدیث میں آیا ہے کہ اس کے پاس کوئی نیکی نہ تھی ماسوائے کہ اس نے ایک دن راستہ میں سے کانٹا ہٹا دیا تھا جو ظاہر ہے کہ بہت ہی ذرا سی بات ہے مگر حق تعالیٰ کے یہاں اس کی بھی قدر ہوئی اور اس کو اسی بات پر بخش دیا گیا۔ صاحبو! نیک کام کو چاہے کتنا ہی ذرا سا ہو حقیر نہ سمجھو۔ بعض دفعہ ذرا سی بات قبول ہوجاتی ہے اور بڑے بڑے عمل جن پر ناز تھا' رکھے رہ جاتے ہیں۔

ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ جب ان کا انتقال ہوا تو کسی دوسرے بزرگ کو کشف ہوا یا خواب میں دیکھا کہ ان سے سوال ہو رہا ہے کہ ہمارے واسطے کیا عمل لے کر آئے ہو' انہوں نے جواب دیا کہ اور تو کچھ نہیں' توحید لے کر آیا ہوں۔ ارشاد ہوا کہ تو جھوٹا ہے' توحید بھی تیری درست نہیں۔ "اذکر لیلۃ اللبن" دودھ والی رات کا قصہ یاد کرو۔ دودھ والی رات کا قصہ یہ ہوا تھا کہ ایک روز

دودھ پینے کے بعد پیٹ میں درد ہو گیا تھا تو انہوں نے کسی سے یہ کہا کہ دودھ پینے سے درد ہو گیا تو یہ باز پرس ہوئی کہ تم نے دودھ کو مؤثر قرار دیا حالانکہ مؤثر ہم ہیں۔ یہ کیسی توحید ہے جب توحید بھی غلط ثابت ہوئی تو وہ بزرگ بہت پریشان ہوئے۔ پھر ارشاد ہوا کہ تم اپنے قول کے موافق دوزخ کے مستحق ہو چکے کیونکہ تمہارے اقرار میں تمہارے پاس صرف ایک نیکی تھی اور وہ بھی غلط ثابت ہوئی۔ اب سنو! ہم تم کو کس بات پر بخشتے ہیں۔ ایک رات کو تم نے ایک بلی کے بچے کو سردی سے کانپتا دیکھا تھا اور تم نے اس پر رحم کھا کر لحاف ڈال دیا تھا جس پر اس نے تم کو دعا دی۔ وہ دعا اس بلی کے بچے کی ہم نے قبول کر لی اور تم کو اس کی دعا پر بخشا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک عمل تھا مگر کبھی حق تعالیٰ بدوں عمل کے صرف ظاہری صورت پر بخش دیتے ہیں۔

چنانچہ ایک بزرگ ہیں، قاضی یحییٰ بن اکثم جو بخاریؒ کے شیخ ہیں۔ ان کو کسی نے خواب میں دیکھا کہ ان سے سوال ہو رہا ہے اور عتاب آمیز سوال ہو رہا ہے اور وہ چپ خاموش کھڑے ہیں۔ جب عتاب ہو چکا تو انہوں نے عرض کیا کہ میں تو حدیث میں پڑھا کرتا تھا کہ "ان اللہ یستحیی من ذی الشیبۃ المسلم"[1] کہ حق تعالیٰ شانہ بوڑھے مسلمان سے حیا فرماتے ہیں اور اس کو بخش دیتے ہیں مگر یہاں تو معاملہ برعکس معلوم ہوتا ہے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ جاؤ اگرچہ نیکی کچھ نہیں مگر تمہارے بڑھاپے پر رحم کر کے تم کو بخش دیا جاتا ہے۔ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ کہا ہے۔ بے شک ہم کو بوڑھے آدمی پر رحم آتا ہے۔ اسی کو شیخ سعدی فرماتے ہیں:

دلم میدہد وقت وقت ایں امید — کہ حق شرم دارد زموئے سفید

(میرا دل ایسے وقت یہ امید دلاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سفید بالوں سے شرم رکھتے ہیں)

اس سے زیادہ حیرت انگیز دوسری حکایات ہیں کہ یہاں تو قاضی یحییٰ بن اکثم واقعی بوڑھے تھے۔ ایک مسخرہ جوان کی حکایت ہے کہ جب مرنے لگا تو اس کو اپنی حالت پر خوف تھا کیونکہ عمل صالحہ کچھ نہ کیا تھا۔ اس نے یہ وصیت کی کہ جب مجھ کو غسل و کفن دے چکو تو میری داڑھی پر ذرا سا آٹا چھڑک دینا۔ چنانچہ ورثاء نے وصیت پوری کی۔ اس کو کسی نے خواب میں دیکھا کہ اس سے سوال ہوا کہ تو نے یہ وصیت کیوں کی تھی۔ اس نے عرض کیا کہ یا اللہ میرے پاس عمل تو کچھ تھا نہیں، اس لیے اپنی حالت پر اندیشہ تھا اور یہ حدیث میں نے سنی تھی۔ "ان اللہ یستحیی من ذی الشیبۃ المسلم" کہ خدا بوڑھے مسلمان سے شرماتا ہے، قسمت سے میں بوڑھا بھی نہ تھا اور

[1] (مجمع الزوائد للھیثمی ۱۰: ۱۴۹، کنز العمال: ۴۲۶۴۴، جمع الجوامع للسیوطی ۲۵۶۰، السنۃ لابن ابی عاصم ۱: ۱۶)

بوڑھا بننا اپنے اختیار میں نہ تھا' تو میں نے یہ وصیت کی کہ میرے بالوں میں آٹا لگا دینا کہ بوڑھوں کی سی صورت تو ہو جائے۔ بس اتنی بات پر وہ شخص بخش دیا گیا۔ سچ کہا ہے کہ

رحمت حق بہانہ می جوید (اللہ تعالیٰ کی رحمت بہانہ ڈھونڈتی ہے)

یہ تو حکایتیں اہل کشف کی ہیں جو خود حجت شرعیہ نہیں مگر حدیث میں بھی ان کی اصل موجود ہے۔ چنانچہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص کو صرف راستہ میں سے کانٹا ہٹا دینے پر بخش دیا گیا۔ جب ان کی اصل حدیث میں موجود ہے تو پھر ان کشفیات کو بھی تائید میں بیان کرنا صحیح ہو گیا کیونکہ کشف کا بھی حکم ہے کہ اگر حدیث وقرآن کے موافق ہو تو قبول ہے ورنہ رد ہے۔

﴿یہاں تک بیان نماز جمعہ سے پہلے ہوا اس کے بعد حضرت مولانا نے نماز جمعہ پڑھائی۔ بعد نماز کے پھر منبر پر رونق افروز ہوئے اور فرمایا ۱۲ جامع﴾

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ. اَمَّا بَعْدُ!

میں اس بات کو بیان کر رہا تھا کہ نیکیوں کی قدر ہم کو وہاں جا کر ہو گی اس لیے کہ یہ آخرت ہی کا سکہ ہے۔ وہیں اس کا کار آمد ہونا معلوم ہو گا۔ یہاں تو نیکیوں پر کوئی رقم نہیں ملتی اس لیے لوگوں کو اس کی قدر نہیں ہوتی مگر مرنے کے بعد سب کو قدر معلوم ہو جائے گی اور میں نے احادیث سے اس بات کو ثابت کر دیا تھا کہ وہاں ذرا ذرا سی نیکی بھی کار آمد ہے جس کی آج ہم کو قدر نہیں ہوتی۔ اس سے ثابت ہوا کہ قرآن کا بے سمجھے ہوئے پڑھنا بھی بیکار نہیں کیونکہ اس کے ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں تو ایسی چیز بیکار کیوں کر ہو سکتی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف تلاوت کر لینا کافی ہے۔ فہم معنی کی ضرورت نہیں ورنہ شاید کوئی حافظ صاحب خوش ہو جاتے کہ بس ہم مولویوں سے بھی بڑھ گئے۔ سو یہ خیال صحیح نہیں کیونکہ اگرچہ الفاظ قرآن پر اس قدر ثواب ملتا ہے مگر ظاہر ہے کہ مقصود صرف یہی ثواب الفاظ کا تو نہیں' بڑا مقصود وہی ہے کہ معنی سمجھ کر اس کے موافق عمل کرنا۔ اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ صرف ترجمہ بھی کافی نہیں جب تک کہ اس میں تدبر نہ ہو کیونکہ سمجھنا یہی ہے کہ جس پر اصل مقصود یعنی عمل موقوف ہے۔

اسی طرح ان آیتوں کا مضمون بھی اگرچہ کان میں پڑا ہوا ہے مگر جب تک کہ تدبر نہ ہو وہ سننا

مفید نہیں۔ ترجمہ تو کفار بھی سمجھ جاتے تھے اور ہم سے زیادہ سمجھتے تھے مگر ان کو کچھ نفع ہوا؟ کچھ بھی نہیں کیونکہ اس میں تدبر نہیں کیا تھا جس پر عمل مرتب ہوتا۔ سرسری طور پر سنا گیا تھا اس لیے اس مضمون کو اہتمام سے دوبارہ اس لیے بیان کیا جاتا ہے کہ اس میں تدبر کیا جائے اور اس کے موافق عمل کرنے کی کوشش کی جائے۔

ثمرہ نیت

ان آیتوں میں جن کو میں نے تلاوت کیا تھا ایک بہت بڑی چیز کا ذکر ہے اگرچہ وہ بظاہر چھوٹی معلوم ہو یعنی اس میں دنیا اور آخرت کے ساتھ ارادہ کو متعلق کرنے کا ثمرہ بتلایا گیا ہے کہ دنیا کا ارادہ کیا جائے تو اس کا کیا ثمرہ ہے اور آخرت کا ارادہ کیا جائے تو اس کا کیا نفع ہے۔ ہر ایک کو الگ الگ حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔ غرض ان آیتوں میں ارادہ کا ذکر ہے۔ اس امر کی تعیین کے بعد آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ واقعی یہ ایسی چیز ہے جس کو ہم بہت ہی معمولی اور سرسری سمجھتے ہیں مگر یہ سرسری چیز ایسی ہے جیسے گھڑی کی بال کمانی کہ دیکھنے میں تو ذرا سی چیز ہے مگر گھڑی کے چلنے کا دارومدار اسی پر ہے اور وجہ اس بے قدری کی یہ ہے کہ ارادہ ایک موجود غیر حسی ہے اس لیے ہم کو اس کی قدر نہیں مگر واقع میں فکر و ارادہ وہ چیز ہے جس کے ترک کر دینے سے ہمارے سب حال بگڑ گئے اور بہت سے اللہ والوں کے حالات و مقامات اس کی بدولت درست ہو گئے۔ صاحبو! ارادہ بہت بڑی چیز ہے اس کو حقیر نہ سمجھا جائے' دنیا کے بھی سارے کام اس کی بدولت چلتے ہیں' یہ بہت بڑی قوت ہے جو انسان میں رکھی ہوئی ہے۔ ایک مثال سے آپ اس کو واضح طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

فرض کیجئے کہ ایک شخص کو جاڑے کے موسم میں اس حالت میں کہ بارش بھی ہو رہی ہے اور سردی بھی بہت ہے۔ گھر کے اندر بیٹھے بیٹھے پیاس معلوم ہوئی اور پیاس بہت شدید معلوم ہوئی مگر بوجہ تند ہوا کے باہر آنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ اس درمیان میں اس کے پاس حاکم کا حکم پہنچا کہ اسی وقت فلاں جگہ آ کر جو کہ شہر سے بہت فاصلہ پر ہے ہم سے ملو۔ اب غور کیجئے کہ یا تو یہ شخص اس سردی کی حالت میں اندر سے صحن تک بھی نہیں آ سکتا تھا' اب وہ کونسی چیز ہے جو اس کو گھر کے اندر سے صحن تک اور صحن سے گھر کے باہر اور وہاں سے شہر کے باہر کئی میل تک بارش اور سردی میں لے جاتی ہے۔ وہ صرف قوت ارادہ ہی ہے کہ پہلے ارادہ نہ ہوا تھا کیونکہ پیاس کوئی قوی محرک نہ تھی اور اب ارادہ ہو گیا کیونکہ حکم حاکم بوجہ کسی قسم کی رغبت یا رہبت کے قوی محرک ہے جس نے اس کی قوت ارادہ کو حرکت دے دی ہے اور یہ کمبل لے کر تمام مصائب کو برداشت کرتا ہوا حاکم تک جا پہنچتا ہے۔

اب ارادہ کی قوت معلوم کر کے جانو کہ ارادہ فی نفسہ نہ کوئی بری شے ہے نہ اچھی۔ یہ اپنے حسن وقبح میں موقوف ہے اپنے مضاف الیہ پر یعنی مراد پر۔ اگر اچھے کام کا قصد کیا جائے تو وہ ارادہ عمدہ ہے اور برے کام کا قصد کیا جائے تو وہ ارادہ برا ہے' اچھے ارادہ پر ثواب ملے گا اور برے ارادے پر اگر عمل ہو جائے گا تو گناہ لکھا جائے گا۔ اس سے بھی ارادہ کی عظمت معلوم ہوگئی کیونکہ کسی عمل پر جزا و سزا بدوں ارادہ کے مرتب نہیں ہوتی اور ارادہ پر بدوں عمل کے بھی گناہ وثواب لکھا جاتا ہے۔ اگر بدوں ارادہ کے کوئی گناہ بھول چوک سے ہو گیا تو وہ معاف ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

رَبَّنَا لَاتُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِیْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا. (البقرہ ۲۸۶)

یعنی بندوں کو تعلیم فرماتے ہیں کہ اس طرح دعا کیا کرو۔ "یا اللہ! ہم سے بھول چوک ہو جائے تو ہم سے مواخذہ نہ کیا جائے۔" اور حدیث شریف میں وارد ہے کہ اواخر سورہ بقرہ کی دعائیں مقبول ہوگئیں۔ یعنی بھول چوک پر مواخذہ نہ ہوگا۔ ایک حدیث میں اس کو صاف لفظوں میں بیان کیا گیا ہے۔ "رفع عن امتی الخطاء والنسیان"[۱] کہ میری اُمت سے خطا ونسیان معاف کر دیا گیا اور بعض اعمال میں تو سب لوگ جانتے ہیں کہ بدوں ارادہ کے عمل معتبر نہیں ہوتا۔ مثلاً نماز بدوں نیت کے صحیح نہیں ہوتی۔ نیت کا نام ہی تو ارادہ ہے اگر بدوں اس ارادہ کے کوئی تمام دن نمازیں پڑھتا رہے تو سب فضول ہیں اور اگر نیت کر کے دو رکعت بھی پڑھ لے وہ صحیح ہیں۔ ارادہ ہی کی وجہ سے قتل خطا و عمد میں شریعت نے فرق کیا ہے۔ اگر قصداً کسی کو قتل کیا گیا تو اس میں گناہ بھی بہت زیادہ ہے۔ یہاں تک کہ بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا خیال تھا کہ قتل عمد کے لیے توبہ بھی نہیں۔ اگرچہ جمہور نے اس کو رد کیا ہے اور صورت میں قاتل پر قصاص بھی آیا ہے کہ مقتول کے عوض اس کو قتل کر دیا جائے اور اگر خطاء بھول چوک سے قتل ہو گیا اور قتل کا ارادہ نہ تھا۔ مثلاً تیر شکار پر چلایا تھا کسی آدمی کے لگ گیا اور وہ مر گیا تو اس صورت میں گناہ بھی نہیں ہوتا نہ قصاص آتا ہے صرف دیت آتی ہے۔ نیز اگر کسی معصیت کا پختہ عزم ہو جائے تو گناہ فوراً لکھا جاتا ہے اور اگر بدوں ارادہ کے غلطی اور خطا سے گناہ ہو گیا تو کچھ بھی گناہ نہیں ہوتا' وہ معاف ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ ارادہ سبب غالب ہے' اس عمل کے ہو جانے کا اور ایسے سبب کے لیے حکم مسبب کا ہوا کرتا ہے۔

مثلاً سنکھیا سبب غالب ہے ہلاکت کا تو اگر کوئی شخص بے قاعدہ بلا مشورہ طبیب خودکشی کی نیت

---

[۱] (تلخیص الخبیر لابن حجر ا:۲۸۱' کنز العمال: ۱۰۳۰۷' اصلاح خطاء المحدثین للخطابی: ۶' الدر المنتثرہ فی الاحادیث المشتھرۃ للسیوطی: ۸۷' تذکرۃ الموضوعات للفتنی: ۹۱)

سے سنکھیا تولہ بھر کھالے تو چاہے بعد میں دست وقے کرا کے اس کی جان بچ بھی جائے تب بھی اس کو گناہ خودکشی کا ہو گیا کیونکہ اس نے تو کوئی کسر جان ہلاک کرنے میں نہ رکھی تھی۔ یہ اتفاقی بات تھی کہ وہ اس کے بعد بھی بچ گیا۔ اسی طرح جب کسی شخص نے پختہ ارادہ کرلیا کسی گناہ کا تو گویا اس نے اس کے کرنے میں کوئی کسر نہیں رکھی کیونکہ عادت اللہ یوں ہی جاری ہے کہ پختہ ارادہ کے بعد عمل ہو ہی جایا کرتا ہے۔ یوں کبھی اتفاقاً نہ ہوا تو یہ نادر ہے۔ ''والنادر کالمعدوم'' اس لیے یہ شخص ارادہ پختہ کر لینے سے ایسے سبب کا مرتکب ہو گیا جو اکثر مفضی الی المسبب ہو جاتا ہے اس لیے گناہ کا مستحق ہو گیا۔ اسی طرح کسی شخص نے نیک کام کا قصد کیا تو وہ ثواب کا مستحق ہو گیا کیونکہ سبب کے بعد اکثر کام ہو جاتا ہے۔ کبھی نہ ہونا اتفاقی بات ہے لہٰذا وہ مثل کرنے والے کے سمجھا جائے گا اور اس کو اس عمل کا ثواب مل جائے گا۔ اب معلوم ہوا کہ ارادہ کتنی بڑی چیز ہے جو کہ عمل کے وجود کے لیے سبب غالب ہے جس کے بعد اکثر کام ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ شریعت میں اس کو عمل ہی کے مثل شمار کیا گیا ہے۔

ہمت و قدرت

اس کی مسلمانوں میں آج کل بہت ہی کمی ہے۔ کہتے ہیں کہ فلاں کام ہم نے بہت ہی کرنا چاہا مگر نہیں ہوا۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ ان لوگوں نے اس کا ارادہ ہی نہیں کیا۔ صرف تمنا ہی تمنا کی۔ ارادہ اس کا نام ہے کہ جس اختیاری کام کا خیال کرتے ہیں اسی کی دھن لگ جائے اور اپنی پوری کوشش اس میں صرف کر دے' ایسا کر کے پھر کوئی بتلائے کہ کام نہیں ہوا اور اس کے بعد بھی کام نہ ہوا کرے تو دنیا کا کام کیوں کر چلے۔ اس لیے جو شخص یوں کہے کہ میں نے ارادہ کیا اور پھر بھی کام نہیں ہوا میں اس کی بات کبھی تسلیم نہ کروں گا۔ بلکہ اس سے یہی کہا جائے گا کہ تم نے اس کام کی تمنا تو کی ارادہ نہیں کیا۔ ایک شخص میرے پاس آئے جو بوڑھے ہو گئے تھے مگر نظر بد کے مرض میں مبتلا تھے۔ آج کل لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ جوانی میں گناہ نہیں چھوٹتے تو بڑھاپے میں جا کر چھوٹ جائیں گے مگر میں سچ کہتا ہوں کہ جو گناہ جوانی میں نہیں چھوٹا وہ بڑھاپے میں کبھی نہیں چھوٹے گا۔

درختے کہ اکنوں گرفت ست پائے ۔۔۔ بہ نیروئے شخصے برآید زجائے

اگر ہمچناں روزگارے ہلی ۔۔۔ بہ گر دونش از بیخ برنگلی

(وہ درخت جس نے ابھی جڑ پکڑی ہے ایک شخص کی طاقت سے اکھڑ سکتا ہے۔ اگر ایسے ہی وقت گزرتا گیا تو چرخی کی مدد سے بھی جڑ سے نہ نکالا جا سکے گا)

سو جو گناہ اب جوانی میں نہ چھوٹا حالانکہ ابھی اس کی جڑ کمزور ہے تو بڑھاپے میں کیا خاک

چھوٹے گا جبکہ جڑیں مضبوط ہو جائیں گی اور چاروں طرف پھیل جائیں گی۔ نیز ایک بات تجربہ کی یہ ہے کہ ہمیشہ عفت جوان آدمی کی قوی ہوتی ہے کیونکہ جس طرح جوانی میں تقاضا زیادہ ہوتا ہے اس کے روکنے کی قوت بھی زیادہ ہوتی ہے اور بڑھاپے میں یاد رکھئے کہ تقاضا کم نہیں ہوتا۔ اگرچہ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتا مگر تقاضے میں کمی نہیں آتی اور اس کے تقاضے کو روکنے والی قوت کم ہو جاتی ہے تو اور بھی کچھ نہ ہو نظر بد میں تو وہ شخص مبتلا رہے گا ہی۔ خصوصاً جبکہ عورتیں اس کی نظر سے احتراز بھی نہیں کرتیں۔ چنانچہ بوڑھے آدمی سے پردہ بھی کم کرتی ہیں بہت سے بہت وہ فعل نہ کر سکے گا مگر میں کہہ چکا ہوں کہ مدار معصیت ارادہ پر ہے۔ جب ایک شخص نے معصیت کا پختہ ارادہ کر لیا اور پھر بوجہ ناکارہ ہونے کے اسے پورا نہ کر سکا تو گناہ اس کے نامہ اعمال میں لکھا گیا۔

غرض وہ بوڑھے شخص مجھ سے ملے کہ اس کی کوئی سہل تدبیر بتلاؤ کہ میں اس مرض سے نجات پاؤں۔ میں نے کہا کہ سہل کی قید سے تو یہ سلسلہ غیر متناہی چلے گا۔ آج آپ مرض کے ازالہ کی سہل تدبیر پوچھتے ہیں کل کو اس تدبیر کو سہل کرنے کے لیے اگر وہ سہل نہ معلوم ہوئی، دوسری تدبیر پوچھیں گے، اس میں کچھ دشواری پیش آئی تو پھر اس کی سہولت کے لیے اور تدبیر پوچھیں گے۔ اس طرح تو مرض کا علاج نہیں ہو سکتا، بس سہولت کی فکر نہ کیجئے۔ بجز ہمت کے اس کا کوئی علاج نہیں۔ ایک دفعہ پختہ عزم کر لیجئے کہ چاہے کتنی ہی تکلیف ہو ہرگز نگاہ اوپر کو نہ اٹھاؤں گا اور جو کبھی اٹھ جائے تو فوراً نیچی کر لیجئے۔ اس ترکیب سے ان شاء اللہ مرض زائل ہو جائے گا۔ اس کے بدوں زوال ممکن نہیں وہ کہنے لگا کہ میں چھوڑنے پر قادر ہی نہیں، ہمت کیسے کر سکتا ہوں؟ میں نے کہا کہ یہ آپ غلط کہتے ہیں۔ آپ یقیناً چھوڑنے پر قادر ہیں اور دلیل سے میں نے ان کو سمجھا دیا کہ آپ قادر ہیں، وہ دلیل یہ تھی کہ حق تعالیٰ شانہ کا ایک طرف تو یہ ارشاد ہے:

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا. (البقرہ آیت نمبر ۲۸۶)

کہ حق تعالیٰ طاقت سے زیادہ کسی کو تکلیف نہیں دیتے۔

دوسری طرف یہ ارشاد ہے:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَھُمْ. (النور۔ آیت نمبر ۳۰)

کہ مسلمانوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہوں کو نیچے رکھیں اور شرم گاہوں کو محفوظ رکھیں۔

ان دونوں آیتوں کے ملانے سے معلوم ہوا کہ نگاہ نیچی کرنے پر بندہ قادر ہے اس لیے کہ اس کے متعلق حق تعالیٰ کا حکم ہے اور ان کا کوئی حکم طاقت سے زیادہ نہیں ہوتا۔ میرے سامنے تو وہ اس

دلیل میں تاویلیں نکالتے رہے مگر گھر جا کر جوانہوں نے اس میں غور کیا اور خط بھیجا کہ واقعی میں غلطی پر تھا' انسان ہر گناہ سے بچنے پر قادر ہے۔ البتہ پہلے پہل کلفت ضرور ہوتی ہے اس کے بعد یہ کلفت کم ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ پھر عادت ہوجاتی ہے۔

صاحبو! انسان میں ارادہ وہ قوت ہے کہ اس کے ساتھ وہ تمام مخلوق پر غالب آ سکتا ہے۔ صاحبو! تمہارے ساتھ دو لشکر ہیں ایک ملائکہ کا اور ایک شیاطین کا اور ان دونوں میں مقابلہ رہتا ہے۔ ایک چاہتا ہے کہ تم کو بدی سے بچائے اور دوسرا چاہتا ہے کہ تم کو گناہ میں پھنسائے اور ان لشکروں کی ہار جیت تمہارے ارادہ پر موقوف ہے جس کی طرف تمہارا ارادہ ہوجائے وہی غالب ہوجائے گا۔ اگر آپ نے گناہ کا ارادہ کرلیا تو لشکر ملائکہ پسپا ہوگیا۔ اب وہ غالب نہیں ہوسکتا اور اگر گناہ سے بچنے کا ارادہ کرلیا تو لشکر شیطان مغلوب ہوگیا۔ اب وہ کبھی غلبہ نہیں کرسکتا۔ افسوس! آپ میں اتنی بڑی قوت موجود ہے اور پھر آپ یوں کہتے ہیں کہ ہم گناہ چھوڑنے سے عاجز ہیں۔

ظلمت معصیت

صاحبو! آپ عاجز ہرگز نہیں' ہاں یوں کہئے کہ ابھی تک چھوڑنے کا ارادہ نہیں کیا اور ارادہ نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ گناہ کی عظمت اور اس کا خوف دل میں نہیں' گناہ کو ایک معمولی چیز سمجھ رکھا ہے اور جس گناہ کی عظمت دل میں ہے اس میں کسی طرح کی بھی کوئی تاویل منہ سے نہیں نکلتی کیونکہ دیکھئے گناہ دو قسم کے ہیں ایک وہ جو کہ صرف شریعت مقدسہ میں حرام ہیں دوسرے وہ جو کہ قانون اور شریعت دونوں کے اعتبار سے ناجائز ہیں۔ بتلایئے! ان گناہوں میں آپ کیا برتاؤ کررہے ہیں جو کہ قانون کی رو سے ناجائز ہیں اور موجب سزا ہیں۔ ظاہر ہے کہ سب اس سے اجتناب کریں گے' ڈاکہ کوئی نہیں مارتا' چوری شریف آدمی بالکل نہیں کرتے' یہاں تک کہ راستوں میں پیشاب تک نہیں کرتے کیونکہ قانوناً جرم ہے۔ کیوں صاحب اگر کوئی ڈاکو کہنے لگے کہ میں اپنے عیال کو بدوں ڈاکہ کے پال نہیں سکتا تھا اس لیے کہ آمدنی کم اور خرچ زیادہ ہے تو کیا حاکم اس کا یہ عذر قبول کرلے گا اور کیا اس کو سزا نہ دے گا؟ یا چور یہی عذر کرنے لگے تو کیا اس کو رہا کردیا جائے گا؟ حاکم صاف کہہ دیتا ہے کہ ہم یہ باتیں نہیں سننا چاہتے تم نے خلاف قانون کام کیا ہے تم کو پھانسی دی جائے گی۔

اے اللہ کے بندو! ایک جواب حاکم دنیا کے سامنے نہیں چل سکتا۔ وہ خدا کے سامنے پیش کرتے ہوئے کچھ تو شرمانا چاہیے۔ آج کل لوگ بہت بے باک ہوکر کہہ دیتے ہیں کہ صاحب کیا

کریں، مجبور ہیں، بدوں سود اور رشوت کے خرچ نہیں چلتا اور علماء کو تنگ کرتے ہیں کہ اس مجبوری پر نظر کریں۔ ان کو بھی یہ حق ہے کہ ایک حاکم سلطنت کی طرح وہ بھی صاف جواب دے دیں کہ ہم نہیں جانتے خرچ چلے یا نہ چلے۔ شریعت مقدسہ نے اس کو حرام کیا ہے چھوڑنا پڑے گا ورنہ گنہگار ہو گے اور فاسق فاجر کے خطاب کے مستحق ہو گے۔ آج کل لوگ علماء کو مجبور کرتے ہیں کہ سود کے جواز کے فتوے دو اور یہ نہیں جانتے کہ اگر وہ جواز کے فتوے دے بھی دیں گے تو وہ بھی آپ ہی کے شمار میں ہو جائیں گے بلکہ ان کی آپ سے بھی زیادہ گردن نپے گی۔ بھلا کسی مولوی کے جائز کرنے سے کوئی حرام کام حلال ہو سکتا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ عوام مسلمان جن کو ذرا شریعت کا پاس ہے ان مولوی صاحب ہی کو چھوڑ دیں گے۔

صاحبو! اول تو علماء اس کے ذمہ دار نہیں کہ آپ کا خرچ چلتا ہے یا نہیں۔ خدا اور سول صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حکم ہے اس کو ماننا پڑے گا۔ دوسرے یہ عذر بھی بالکل غلط ہے کہ ہم سے گزر نہیں ہو سکتا۔ گزر ہو سکتا ہے مگر فضولیات کو حذف کر دو، فیشن نہ رکھو، کپڑا سستا پہنو، غرض جائز آمدنی کے موافق خرچ رکھو۔ دیکھو گزر ہوتا ہے یا نہیں مگر یہ فضولیات تو چھوڑتے نہیں، پھر کہتے ہیں کہ گزر نہیں ہو سکتا۔ یوں کہیے کہ سود اور رشوت کے بغیر عیش پرستی نہیں ہو سکتی اس کو ہم بھی تسلیم کریں گے مگر عیش پرستی کی فکر کی شریعت میں خود ممانعت ہے اس کی ذمہ دار شریعت کیوں کر ہو سکتی ہے اور جس کو گزر کرنا ہو وہ حلال روزی میں یقیناً گزر کر سکتا ہے۔ البتہ ظاہراً اس میں لوگوں کی نگاہوں سے قدرے سبکی ہو گی۔ سو اول تو یہ بھی خیال غلط ہے ایسے شخص کی قلوب میں بڑی وقعت ہوتی ہے۔ حکام بھی ایسے شخص کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ہم نے فرض کیا کہ سبکی ہی ہوتی ہے مگر اس کو گوارا کرنا چاہیے اور خیال کرنا چاہیے کہ اگر ہم سود یا رشوت لیں گے تو آخرت میں سبکی ہو گی۔ جب حشر کی سبکی کا خیال دل میں ہو گا اس سبکی پر نظر نہ جائے گی اور اس کی پرواہ بھی نہ ہو گی۔ واللہ! ہم لوگ آخرت کو بھولے ہوئے ہیں ورنہ یہ عذر کبھی زبان پر نہ لاتے۔

اچھا صاحبو! یہ عذر آپ کا بدوں اس کے گزر نہیں ہو سکتا۔ اگر مان بھی لیا جائے تو یہ بھی صرف انہیں گناہوں میں چل سکتا ہے جن کے چھوڑنے میں آمدنی کا نقصان ہوتا ہے۔ جیسے سود یا رشوت۔ مگر پھر سوال یہ ہے کہ جن گناہوں کے چھوڑنے میں آمدنی کا نقصان نہیں ہوتا وہ کیوں کیے جاتے ہیں جیسے جھوٹ، غیبت، مسلمان آدمی کو خواہ مخواہ ستانا اور نظر بند۔ کیا نگاہ بد سے بھی کچھ غلبہ بڑھ جاتا ہے؟ جس کے چھوڑنے سے وہ مقدار غلہ کی کم ہو جائے گی۔ آخر ان گناہوں کے کرنے میں آپ کو

کون سی مجبوری ہے؟ اور ان سے بچنے میں کون سا نقصان ہے؟ ان کو چھوڑنے میں آپ کیا عذر کریں گے؟ بلکہ احادیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ گناہوں سے روزی کم ہو جاتی ہے۔ ابن ماجہ میں ہے: ''ان العبد ليحرم الرزق بخطيئة يعملها''[1] گناہ سے زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ گناہ کرنے سے راحت اور چین گنہگار کو نصیب نہیں ہوتا جبکہ اہل طاعت کے دل میں بے چینی کا نام نہیں ہوتا۔ جب دنیا ہی میں گناہوں سے یہ عذاب ہو رہا ہے پھر نہ معلوم گناہ کرنے میں کیا مصلحت ہے۔ واللہ! مسلمان کو تو گناہ کچھ بھی مزہ نہیں دیتا' کافر تو بے فکر ہو کر گناہ کرتا ہے کیونکہ اسے آخرت کا یقین نہیں مگر مسلمان کو تو گناہ کرتے وقت بھی مزا نہیں آتا۔ بار بار دل میں خوف خدا سے خطرہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر یہ شخص غفور الرحیم کے مضمون کو آڑ بنا کر اس خطرہ کو ٹالتا ہے۔ غرض ایک کشمکش میں دل پڑ جاتا ہے پھر ایسی حالت میں گناہ کا کیا لطف کم بخت آئے گا؟ وہی مثل ہے گناہ اور بے لذت۔

اور اس بارے میں کہ اللہ غفور الرحیم ہے آج کل بالکل غلط معنی لوگ سمجھے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے غفور الرحیم ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ گناہ سے جو ضرر ہوتا ہے وہ ضرر بھی نہ پایا جائے۔ اگر غفور الرحیم ہونے کے یہ معنی ہیں تو کوئی صاحب ہمت کر کے سنکھیا تو کھا لیں اگر غفور الرحیم ہونے کے.......... یہی معنی ہیں کہ مضر شے کا ضرر زائل ہو جاتا ہے تو چاہیے کہ سنکھیا کھا لیں تو وہ بھی ضرر نہ کرے حالانکہ وہ ضرر ضرور کرتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ معنی اس کے نہیں' پس نہ معلوم گناہوں کی بابت یہ کیسے سمجھ لیا گیا کہ اس اعتقاد کے بعد وہ ضرر بھی نہیں کریں گے۔ صاحبو! گناہ کی ظلمت تو ضرور پیدا ہو گی اور اس ظلمت کے ساتھ دخول جنت مشکل۔ پس یا تو خدا بعد میں سچی توبہ کی توفیق دے اور یہ توبہ ایسی جرأت کرنے والوں کو بہت کم نصیب ہوتی ہے ورنہ اس ظلمت کو دور کرنے کے لیے عذاب جہنم موجود ہے۔ الا ان يرحم بفضله جب اعتقاد غفور الرحیم سے دنیا کا ضرر رفع نہیں ہوتا تو یہ بڑی سخت غلطی ہے کہ اس اعتقاد سے آخرت کا ضرر مرتب نہ ہونا سمجھ لیا جائے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس آیت میں ارادہ کا بیان ہے اور متعلق کے اعتبار سے اس کی دو قسمیں ہیں۔ محمودہ و مذمومہ' ان دونوں کے احکام اس آیت میں مذکور ہیں اور اس وقت میں انہیں کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔ غور سے سنئے۔

---

[1] (ان العبد ليحرم الرزق بالذنب يصيبه' مسند احمد بن حنبل ۵: ۲۸۰' ۲۸۲' اتحاف السادة المتقين للزبيدى ۵: ۳۰' ۸: ۶۱۷' تفسير ابن كثير ۴: ۳۹۹' ۵۳۱' ۸: ۱۷۳' ۲۲۲' الدر المنثور للسيوطى ۶: ۲۳۳' جامع مسانيه ابى حنيفه ۱: ۱۳۱)

اہمیت نیت

حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيْهَا مَانَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا. وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَمُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا. (بنی اسرائیل:۱۸،۱۹)

یعنی جوکوئی عاجلہ کا یعنی دنیا کا ارادہ کرتا ہے اس کو ہم جلدی اسی جگہ جو چاہیں اور جس کے لیے چاہیں دے دیتے ہیں۔ ذرا قیوم پر غور کیجئے کہ دنیا کے طالب کو دنیا عطا فرمانے کا پختہ وعدہ نہیں فرماتے بلکہ اتنی قیدیں ہیں کہ "مانشاء لمن نرید" کہ جتنا ہم چاہیں اور جس کے لیے چاہیں عطا کردیں گے۔ معلوم ہوا کہ ہر طالب دنیا کا مراد کو پہنچنا لازم اور ضروری نہیں اور اگر دنیا کے دینے کا پختہ وعدہ بھی ہوتا۔ جب بھی تو وہ لینے کے قابل نہ تھی اور میں اس کو دلیل سے بتلاتا ہوں۔

دیکھیے! اگر ایک شخص کو دو مکان دکھلائے جائیں ایک خستہ وخراب، دوسرا نہایت عمدہ اور یہ کہہ دیں کہ خراب تو اسی وقت تم کو مل سکتا ہے اور بعد ایک ماہ کے واپس لے لیا جائے گا اور دوسرا اس وقت نہیں مل سکتا۔ بعد ایک ماہ کے بعد ملے گا اور وہ واپس نہیں کیا جائے گا اور دونوں اکٹھے مل نہیں سکتے۔ تو بتلائیے اس صورت میں کیا کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ کوئی بے وقوف سے بے وقوف بھی اس ویران کو اختیار نہ کرے گا۔ اس فیصلہ میں سب کا اتفاق ہے کہ وہ عمدہ ہی گھر لینا چاہیے گو بعد مدت ملے۔ صاحبو! اس شخص کو تو آپ جج بن کر یہی فیصلہ سنائیں گے کہ ویران گھر کو ہرگز اختیار نہ کرے مگر جب یہی معاملہ آپ کے ساتھ ہوا تو اپنے اس فیصلہ کو بھول گئے۔

صاحبو! حق تعالیٰ شانہ نے آپ کے سامنے دو گھر پیش کردیئے ہیں ایک دنیا جو کہ اسی وقت مل سکتی ہے مگر بعد چندے چھین لی جائے گی اور خراب وخستہ وفانی بھی ہے۔ دوسرا گھر آخرت ہے جو عمدہ ہے اور باقی رہنے والا ہے یہاں آپ نے آخرت کو کیوں اختیار نہیں کیا؟ گزشتہ مثال میں تو ایک ماہ کی بھی مہلت تھی اور یہاں کچھ بھی میعاد نہیں۔ شاید "ہمیں نفس نفس واپسیں بود" (شاید یہی سانس تیری زندگی کا آخری سانس ہو) زندگی کا کیا اعتبار ہے ایک منٹ کا بھی بھروسہ نہیں۔ طاعون کا حال معلوم ہے کہ کس طرح دفعتہً مخلوق کا صفایا کردیتا ہے۔ کل کا مرنے والا آج کیا جانے کہ میں کب مروں گا وہ تو آج بہت کچھ امیدیں اپنے دل میں کرتا ہوگا مگر اسے موت کی کچھ بھی خبر نہیں کہ سر پر آچکی ہے تو یہاں دنیا کی میعاد ایک مہینہ کیا ایک ہفتہ کیا ایک دن بھی نہیں ہے۔

ہر سیکنڈ میں خطرہ ہے کہ اسی وقت ختم ہو جائے تو کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ایسا گھر جس کی اتنی کم میعاد ہو اور فنا ہونے والا ہو اور جس کی کوئی راحت بھی تکلیف سے خالی نہیں۔ آپ نے اختیار کیا اور آخرت کو جس کے ملنے کے لیے ایک سانس کی دیر ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے باقی رہنے والا اور اس میں راحت ہی راحت ہے۔ تکلیف کا نام بھی نہیں' آپ نے چھوڑ دی۔ حالانکہ اگر ایسی صورت کوئی دوسرا شخص آپ سے پوچھنے آئے تو آپ اس کو یہی رائے دیں گے کہ خراب' خستہ' فانی چیز ہرگز لینے کے قابل نہیں' میرا یہ مطلب نہیں کہ آپ دنیا کو بالکل چھوڑ دیجئے' شکایت اور افسوس تو اس بات کا ہے کہ اس کو آخرت پر ترجیح دے رکھی ہے۔

غرض یہ اچھی طرح ثابت ہو گیا کہ دنیا کے ملنے کا اگر پختہ وعدہ بھی ہوتا' تب بھی وہ لینے کے قابل نہ تھی۔ چہ جائیکہ اس کے دینے کا پورا وعدہ بھی نہیں' پھر حالت یہ ہے کہ دنیائے فانی کو اختیار کرنے سے بعض اوقات آخرت کا حصہ بالکل نہیں ملتا۔ جیسے کہ کفار کو اور آخرت اختیار کرنے سے یہ نہیں ہوتا کہ دنیا بالکل نہ ملے بلکہ آخرت اختیار کرنے والے کو دنیا بھی ملتی ہے اگرچہ اتنا فرق ہے کہ آخرت والے کو دنیا کم ملتی ہے اور دوسروں کو زیادہ اور یہ فرق بھی صرف ظاہر ہی میں ہے۔ غریب لوگ امیروں سے زیادہ کھاتے ہیں اور سب ہضم کر لیتے ہیں' صحت اچھی رہتی ہے' خوش وخرم رہتے ہیں' دردسر اور زکام ونزلہ کو جانتے بھی نہیں۔ امیروں کو آئے دن مسہل لینے پڑتے ہیں۔

ایک غریب آدمی کی کسی رئیس سے دوستی تھی۔ غریب آدمی بہت موٹا تازہ تھا اور رئیس صاحب دبلے پتلے بیمار سے رہتے تھے۔ ایک دن اس رئیس صاحب نے اپنے غریب دوست سے کہا کہ یار یوں تو تم غریب ہو مگر دیکھنے میں مجھ سے زیادہ موٹے ہو' ایسی تم کیا غذا کھاتے ہو۔ اس نے کہا کہ میں تم سے زیادہ کھانا کھاتا ہوں اور ہر مہینے نیا نکاح کرتا ہوں۔ امیر نے اس کا مذاق اڑایا۔ اس نے کہا کہ مذاق کی کیا بات ہے' کل کو تمہاری دعوت ہے' امیر نے قبول کر لی اور بڑی حیرت ہوئی۔ دوسرے دن جب کھانے کا وقت ہوا وہ امیر صاحب غریب دوست کے گھر پہنچے تو اس نے باتیں شروع کیں' باتوں باتوں میں بہت دیر ہو گئی۔ ان رئیس صاحب نے کھانے کا تقاضا کیا' اس نے ٹال دیا کہ ابھی تیار نہیں ہوا۔ ذرا سی دیر ہے اور پھر باتوں میں لگا گیا۔ یہاں تک رئیس صاحب کا مارے بھوک کے برا حال ہو گیا اور بار بار تقاضا کیا۔ جب اس نے برا حال دیکھا تو یہ کہا کہ تازہ کھانا تو ابھی تیار نہیں ہوا' باسی روٹی رکھی ہے اور ساگ ہے کہو تو لاؤں؟ اس نے کہا جو کچھ ہو لے آؤ' باتیں نہ بناؤ۔ چنانچہ وہ باسی روٹی اور ساگ لے آیا اور ان رئیس صاحب نے اندھے باؤلوں کی طرح اسے کھانا شروع کیا' ہر لقمہ پر سبحان

اللہ کہتے جاتے۔ جب وہ پیٹ بھر کر کھا چکے تو نفیس کھانے بھی اس نے پیش کیے مگر چونکہ وہ خوب سیر ہو کر کھا چکے تھے اب عذر کر دیا۔ اس نے کہا کہ کھائیے یہ بہت لذیذ ہیں۔ امیر بولا بس جی! اس سے زیادہ لذیذ نہیں، غریب دوست بولا کہ جناب وہ لذیذ کھانا یہی ہے، بھوک میں باسی کھانا جو ہم کھاتے ہیں تو تمہارے پلاؤ سے زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے کیونکہ تم تو ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتے ہی رہتے ہو۔ میرا یہی مطلب تھا وہ رئیس صاحب مان گئے کہ واقعی تم لوگ ہم سے زیادہ اچھا کھانا کھاتے ہو۔

پھر پوچھا کہ لذیذ کھانے کا مطلب تو معلوم ہو گیا۔ اب یہ بتلاؤ کہ ہر مہینہ نکاح تم کیسے کرتے ہو۔ اس نے کہا کہ میں اپنی بیوی کے پاس مہینہ میں ایک بار جاتا ہوں جبکہ طبیعت میں پوری طرح رغبت ہوتی ہے اور شہوت جوش میں ہوتی ہے۔ تم لوگوں کی طرح روزانہ یا دوسرے تیسرے نہیں جاتا۔ پس مجھے ہر مہینے ویسا ہی لطف آتا ہے جیسا کہ نئے نکاح میں آتا ہے اور تم کو تو سوچ اور فکر سے شہوت کو برانگیختہ کرنا پڑتا ہے۔ اس سے تمہیں کچھ لطف نہیں آتا۔ وہ رئیس صاحب مان گئے کہ واقعی تمہاری دونوں باتیں سچی تھیں اور تم لوگ ہم سے زیادہ لطف میں ہو تو غریبوں کو جتنا ملتا ہے، حلاوت کے ساتھ وہ اسے کھاتے ہیں۔ ہاں! خدا اس سے تو بچائے کہ کھانے ہی کو نہ ملے اور فاقہ کی نوبت آئے مگر حسب ضرورت ملنے کے بعد غریب آدمی زیادہ حلاوت سے کھاتا ہے، کام کاج کر کے بھوکا، تھکا ماندہ شوق و رغبت سے کھاتا ہے اور امیر لوگ تو کمیٹی اور مشورہ کے بعد کھانا کھاتے ہیں کہ پہلے خادم آیا کہ میاں کھانا تیار ہے، جواب دیدیا کہ بھوک نہیں پھر ایک دوسرا آیا کہ حضور! فاقہ اچھا نہیں، کچھ تو نوش جان فرمالیجئے، یار دوستوں کے کہنے سننے کے بعد وہ کچھ زہر مار کرتے ہیں کیونکہ بے بھوک کھایا ہوا تو زہر ہی ہو کر لگے گا۔ صاحبو! اگر تم کو امیروں کی تکلیف کا حال معلوم ہو جائے تو تم امیری سے پناہ مانگو اور اگر امیروں کو تمہاری راحت کا حال معلوم ہو جائے تو وہ غریبی کی تمنا کرنے لگیں مگر پہلے وہ بات پیدا کر لو جس سے غریبی میں لطف آئے۔ یعنی قناعت اور کفایت علی الضروریات۔ آپ کو تو کھا رکھا ہے تکلف نے اور وضع نے جس کی وجہ سے خواہ مخواہ قرض کی نوبت آتی ہے اور پریشانی رہتی ہے۔ اگر تکلف اور پابندی وضع نہ ہو بلکہ جیسا جس وقت حال ہو اسی کے موافق چال چلن ہو تو کبھی پریشانی پاس نہ آئے۔

بے تکلفی کا ایک عجیب واقعہ میں سناتا ہوں۔ ہمارے قصبہ کے قریب ایک قصبہ ہے اس میں ایک حکیم صاحب رہتے ہیں جو ہمارے حضرات ہی کی اولاد میں ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ان کے یہاں مہمان ہوئے تو انہوں نے بے تکلف چپکے سے آ کر مولانا سے

عرض کیا کہ یہاں آپ کے بہت معتقد ہیں۔ اگر آپ فرمائیں تو کہیں دعوت کا ڈھنگ ڈالوں کیونکہ میرے یہاں تو آج فاقہ ہے۔ دیکھئے ذرا بھی ان پر مولانا کی تشریف آوری کا اتنا بار نہ ہوا کہ کہیں سے ادھار لے کر دعوت کرنے کا خیال کرتے۔ جب اپنے گھر میں فاقہ تھا تو مہمان سے صاف کہہ دیا اور مولانا رحمتہ اللہ علیہ بھی کیا اچھے مہمان تھے، فرمایا: بھائی! میں تو تیرا مہمان ہوں، جب تیرے گھر میں فاقہ ہے تو میں فاقہ ہی سے رہوں گا۔ خبردار! کسی سے دعوت کا تذکرہ نہ کرنا۔ صبح سے شام ہوگئی اور سارا گھر فاقہ سے بےفکر رہا۔ یہاں تک کہ مغرب کے وقت ایک مریض آیا اور حکیم صاحب کو گیارہ روپے دے گیا۔ اس وقت حکیم صاحب نے آ کر مولانا سے عرض کیا کہ حضرت جی! آپ کی دعوت کے لیے خدا نے گیارہ روپے بھیج دیئے۔ مولانا نے فرمایا کہ بھائی کھانے میں تکلف نہ کرنا۔ انہوں نے کہا کہ حضرت یہ مجھ سے نہ ہوگا، جب نہیں تھا میں نے آپ سے فاقہ تک کرالیا اور اب جب کہ خدا نے آپ کی برکت سے یہ روپے بھیج دیئے تو اب میں کھانا عمدہ پکواؤں گا۔ چنانچہ پلاؤ وغیرہ تیار کرایا اور خوب مزے سے کھایا۔

ایک شخص نے ایک اور عجیب حکایت بیان کی کہ میں اپنے ایک دوست کے یہاں الہ آباد میں مہمان ہوا تو ایک روز اس کے بچے بڑی خوشیاں کر رہے تھے کہ اہا جی! ہمارے یہاں شیخ جی آئے، وہ شخص کہتے تھے کہ میں سمجھا کہ شاید کوئی بزرگ آئے ہوں گے۔ دیر تک اسی کا منتظر رہا کہ ان بزرگ کی میں بھی زیارت کروں مگر جب دیر ہوگئی اور نہ کوئی بزرگ آئے اور نہ ان کا سامان آتا نظر آیا اور کھانے کا وقت بھی گزر گیا تو میں نے دریافت کیا کہ یہ بچے شیخ جی کسے کہہ رہے ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ آج اس گھر میں فاقہ ہے۔ ان لوگوں نے فاقہ کا نام شیخ جی رکھا ہے۔ جب فاقہ ہوتا ہے تو بچوں کو بہلا دیتے ہیں کہ آج شیخ جی آئے ہیں، روٹی نہیں ملے گی، بچے ایسی خوشی سے رہتے ہیں کہ ان کو فاقہ سے رنج نہیں ہوتا۔ اللہ اکبر کیا ٹھکانہ ہے صبر و استقلال کا کہ بڑے تو بڑے بچے تک بھی پریشان نہ ہوتے تھے۔

غرض یہ بات واضح ہوگئی کہ آخرت کے لیے کوشش کرنے والوں کو دنیا بھی بقدر ضرورت و آسائش ملتی ہے۔ گو زیادہ نہ ملے مگر وہ اس تھوڑی ہی دنیا سے وہ لطف حاصل کرتے ہیں کہ طالبان دنیا کو باوجود کثرت مال کے وہ لطف حاصل نہیں ہوتا مگر طلب دنیا کے ساتھ آخرت اس طرح نہیں مل سکتی تو اب بتلایئے کہ طالب دنیا ہونا عقلمندی ہے یا طالب آخرت ہونا حالانکہ آپ ابھی معلوم کر چکے ہیں کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا ایسی حقیر ہے کہ اگر آخرت سے محرومی کی صورت میں اس کے ملنے کا پورا بھروسہ بھی ہوتا جب بھی وہ لینے کے قابل نہ تھی۔ چہ جائیکہ آخرت چھوڑ کر دنیا

کے ملنے کا پورا بھروسہ بھی نہ ہو کیونکہ ارشاد فرماتے ہیں:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا. وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا. (بنی اسرائیل:۱۸، ۱۹)

''یعنی جو کوئی دنیائے عاجلہ کا ارادہ طلب کرے ہم اس کو دنیا ہی میں فی الحال جس قدر چاہتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں دے دیتے ہیں پھر اس کے لیے جہنم مقرر کر دیتے ہیں جس میں وہ برائی اور ذلت کے ساتھ داخل ہوگا اور جو لوگ کہ آخرت کا ارادہ کریں اور اس کے لیے سعی کریں جو اس کے لیے ہوا کرتی ہے۔ درآں حالیکہ وہ مومن بھی ہوں تو ان لوگوں کی کوشش کی قدر کی جائے گی۔''

دنیا و آخرت

اب ذرا دونوں مضامین میں غور کیا جائے کہ طلب دنیا طلب آخرت دونوں کے ثمرات کو کس طرح بیان کیا گیا ہے۔ طالب دنیا کی بابت تو ارشاد ہے: ''عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ'' یعنی ہم طالبان دنیا میں جس کو چاہتے ہیں اور جس قدر چاہتے ہیں دے دیتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ نہ سب کا کامیاب ہونا ضروری ہے اور نہ یہ ضروری کہ جو وہ چاہا کریں وہی مل جائے بلکہ حق تعالیٰ چاہیں گے تو دے دیں گے۔

اور طالبان آخرت کے متعلق ارشاد ہے: ''فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا'' کہ جو آخرت کی طلب، کوشش عملی اور ایمان کے ساتھ کرتے ہیں ان کی کوشش کی قدر کی جائے گی۔ ایمان اور سعی کی قید واقعی ہے احترازی نہیں اور یہ دراصل بیان ہے **من ارادہ الآخرۃ** کا کہ ارادہ آخرت کہتے ہی ہیں ایمان اور عمل صالح میں سعی کرنے کو کیونکہ اس کے بدوں طلب آخرت سمجھتے ہیں مگر عمل صالح نہیں کرتے کہ دراصل یہ لوگ طالب آخرت ہی نہیں، طلب کے لیے علامت بھی چاہیے۔ طلب آخرت کی علامت یہی ہے کہ ایمان اور عمل صالح اختیار کیا جائے اور میں نے یہ مضمون کہ ''وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ'' قید واقعی ہے اس لیے بیان کیا تا کہ یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اس آیت میں جو ثمرہ ارادہ آخرت کے متعلق مذکور ہے وہ صرف ارادہ کا ثمرہ کہاں ہے بلکہ سعی اور ایمان اور ارادہ اس سب مجموعہ کا ثمرہ ہے اور دعویٰ تمہارا ارادہ آخرت کے ثمرہ کا ہے تو اس تقریر سے یہ شبہ زائل ہو گیا کیونکہ میں نے بتلا دیا کہ یہ قید واقعی ہے اور یہ ارادہ کا بیان اور اس کی شرح ہے۔ رہا یہ سوال کہ پھر اس کے مقابل ارادہ عاجلہ کی تفسیر کیوں نہ بیان کی گئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ارادہ آخرت کی اس تفسیر سے مقصود یہ

ہے کہ ارادہ آخرت کا سہل ہونا معلوم ہوجائے کہ اس میں معمولی سعی اور ایمان کی ضرورت ہے تا کہ اس کے بعد آخرت کی طلب کرنے کے لیے رغبت دل میں پیدا ہو، بخلاف ارادہ دنیا کے کہ اس کی ترغیب مقصود نہیں اس لیے اس کی تفسیر بیان نہیں فرمائی۔ علاوہ ازیں یہ کہ ارادہ آخرت کی تفسیر کے متعلق تو لوگ غلطی میں مبتلا ہیں کوئی کسی طریقہ کو طلب آخرت سمجھتا ہے کوئی کسی طریقہ کو۔ اس لیے اس کی تفسیر کی ضرورت تھی اور ارادہ دنیا کو ہر شخص سمجھتا ہے اس کے بیان کی حاجت نہ تھی۔

پس ارادہ دنیا و آخرت میں ایک فرق یہاں یہ بتلایا گیا کہ طلب دنیا سے یہ کچھ ضروری نہیں کہ وہ مطلوب حاصل ہی ہوجائے اور نہ یہ ضروری ہے کہ ہر ایک کو حاصل ہوجائے اور طلب آخرت کی ہمیشہ قدر ہوتی ہے، وہ ضائع نہیں ہوسکتی۔ دوسرا ایک لطیف اشارہ ایک خاص فرق کی طرف اس آیت میں اور بھی ہے جو اسی وقت سمجھ میں آیا ہے اور ابھی تک اس آیت کی تفسیر میں نظر سے نہیں گزرا۔ ممکن ہے کہ کسی نے لکھا بھی ہو، وہ یہ کہ اس جگہ دو جملے شرطیہ ہیں اور ہر ایک میں تعلق شرط کا جزاء کے ساتھ مختلف عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ ارادہ دنیا کی بابت تو ارشاد ہے:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَانَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ

یہ صیغہ استمرار ہے۔ ترجمہ یہ ہوا کہ جو کوئی دنیا کو طلب کرتا رہے اور ہمیشہ طلب میں منہمک رہے تب کچھ ملتا ہے اور ارادہ آخرت کے متعلق من ارادہ بدوں لفظ کان کے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوا کہ ثمرہ اخروی حاصل ہونے کے لیے طلب میں مرنا کھپنا نہیں پڑتا بلکہ کچھ ارادہ کرنے سے بھی وہ ثمرہ حاصل ہوجاتا ہے۔ اس کا یہ تو مطلب نہیں کہ طالب آخرت کا ارادہ اور طلب مستمر نہیں ہوتا۔ کچھ دنوں کے بعد ارادہ طلب زائل ہوجاتا ہے، نہیں! حقیقت میں تو وہ بھی مستمر رہتا ہے مگر تھوڑی سی سعی و طلب کے بعد وہ حکم میں مستمر کے ہوجاتا ہے کیونکہ محبت الٰہی پیدا ہوجانے کے بعد وہ ارادہ خود بخود پیدا ہوتا رہتا ہے، اگرچہ پیدا اختیار سے ہوتا ہے مگر بوجہ اعانت غیبی کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود بدوں اختیار کے پیدا ہو رہا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ آخرت کی طلب محبوب سرکار ہے۔ اس میں سعی کرنے والے کی اس طرف سے امداد ہوتی ہے جس سے وہ بالکل سہل ہوجاتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

من تقرب الى شبرا جئت اليه ذراعا ومن تقرب الى ذراعا تقربت اليه باعا ومن اتانى يمشى اتيته هرولة.[1]

---

[1] (مسند احمد بن حنبل ۲:۴۱۳، ۳:۴۰، الترغيب والترهيب للمنذرى ۴:۱۰۴، مجمع الزوائد للهيثمى ۱۰:۱۹۶، ۱۹۷، کنز العمال: ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، تاريخ بغداد للخطيب البغدادى ۱۱: ۱۵، اتحاف السادة المتقين للزبيدى ۵:۷۷، ۲۲۱)

''اور دنیا مردود بارگاہ الٰہی ہے اس میں ہمیشہ دقت وتعب ہی رہتا ہے اس کے لیے ہمیشہ اہتمام وانہماک از خود کرنا پڑتا ہے اور یہ طلب ہمیشہ بتکلف از سر نو پیدا کرنا پڑتی ہے۔''

پس حقیقتاً تو دونوں ارادے مستمر ہوتے ہیں مگر بوجہ سہولت واعانت غیبی کے ارادہ آخرت گویا مستمر نہیں رہا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا خود بخود اس کے دل میں ان اعمال کا تقاضا پیدا کر دیتا ہے اور ارادہ دنیا حقیقتاً اور حکم دونوں کے اعتبار سے مستمر ہے اس لیے اس کے ساتھ کان استمرار کے لیے بڑھایا گیا اور ارادہ آخرت کے بیان میں کان نہیں بڑھایا گیا اور شرح اس سہولت واعانت کی یہ ہے کہ طلب آخرت میں قدرے سعی کرنے سے جب نسبت مع اللہ پیدا ہو جاتی ہے تو اس سے ایک کیف اور حال ایسا پیدا ہو جاتا ہے جو ہر مشکل کو آسان کر دیتا ہے اسی کو عراقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

صنمارہ قلندر سزا وار بمن نمائی کہ دراز ودور دیدم رہ و رسم پارسائی

(طریق زہد بہت خشک اور دور دراز کا راستہ ہے مجھے تو آپ طریق عشق میں چلائے)

رہ قلندر سے یہی طریق عشق ونسبت مع اللہ مراد ہے اور رسم پارسائی سے وہ طریق عبادت جو بدوں نسبت ومحبت ہو مراد ہے' جس میں اعمال کی یہ حالت ہوتی ہے جو بعد میں مذکور ہے۔

بطواف کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند تو برون در چہ کردی کہ درون خانہ آئی

بز میں چو سجدہ کردم مذز میں ندا برآمد کہ مرا خراب کردی تو بسجدہ ریائی

(میں خانہ کعبہ کے لیے طواف کو گیا تو حرم نے مجھ کو راستہ نہ دیا اور کہا کہ تو نے حرم کے باہر کیا کیا جو خانہ کعبہ کے اندر داخل ہونا چاہتا ہے اور جب زمین پر میں نے سجدہ کیا تو زمین سے یہ ندا آئی کہ تو نے ریاء کا سجدہ کر کے مجھے خراب کیا)

وہ کیف نسبت مع اللہ کا ایسا ہوتا ہے کہ اس کے بعد کام نہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے' کام کرنا کچھ دشوار نہیں رہتا اور اس طریق میں کچھ باطنی مشقت بھی پیش آتی ہے مگر وہ اس سے بددل نہیں ہوتے بلکہ اس میں بھی ان کو بڑا لطف آتا ہے اسی کی بابت ارشاد ہے کہ ''از محبت تلخہا شیریں بود'' (محبت میں تلخیاں شیریں معلوم ہوتی ہیں)

اور ارشاد ہے کہ:

ناخوش تو خوش بود بر جان من ! دل فدائے یار دل رنجان من !

(محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ طبیعت کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اس پر دل قربان کرتا ہوں)

اور کہا گیا ہے کہ

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ــــ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ محبوب کی تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت رہے کہ تو خنجر آزمائی کرے)

اور کہا ہے کہ

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو ــــ دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں یہ آپ کی عطاء ہے اور قتل کریں میں آپ پر فدا ہوں جو کچھ کریں میں راضی ہوں کیونکہ میرا دل آپ پر فدا ہے)

اور اس نسبت مع اللہ سے اور سب کام تو آسان ہو ہی جاتے ہیں جو سب سے بڑی خوفناک چیز ہے جس سے سب لوگ ڈرتے ہیں یعنی موت وہ بھی ان کے لیے ایسی خوشگوار ہو جاتی ہے کہ اس کی یہ لوگ تمنائیں کرتے ہیں۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں:

خرم آں روز کریں منزل ویراں بروم ــــ راحت جاں طلبم و زپے جاناں بروم

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے ــــ تا در میکدہ شاداں و غزل خواں بروم

(اگر محبت کی تمہارے یہاں یہی قدر و منزلت ہے تو بے شک میں نے اپنی زندگی کے دن ضائع کیے)

شاید کوئی صاحب یہ کہیں کہ یہ سب باتیں موت کی تمنا کی پہلے ہی ہوں گی جب موت آئی ہوگی۔ اس وقت حقیقت معلوم ہوئی ہوگی تو یہ خیال غلط ہے۔ ابن فارض رحمۃ اللہ علیہ نے عین موت کے وقت دکھلا دیا کہ اہل نسبت مرتے وقت کیسے مطمئن ہوتے ہیں ان کا واقعہ ہے کہ جب مرنے لگے تو آٹھوں جنتیں ان کے سامنے پیش کر دی گئیں تو انہوں نے جنتوں سے منہ پھیر لیا اور یہ شعر اسی وقت پڑھا:

ان کان منزلتی فی الحب عندکم ــــ ماقد رأیت فقد ضیعت ایامی

کہ اگر میری اس محبت کی یہی قدر تھی جو میں دیکھ رہا ہوں کہ جنتیں میرے سامنے کر دی گئیں تو میں نے اپنے دن ہی ضائع کیے۔ یعنی میں نے تو محبت اس کے واسطے نہیں کی تھی۔ میں تو کسی اور چیز کا طالب ہوں یہ کہتے ہی آٹھوں جنتیں چھپا دی گئیں اور ایک خاص تجلی حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے ہوئی۔ اسی کے ساتھ جان پرواز کر گئی۔ اسی مضمون کو قلندر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم ــــ گوش رانیز حدیث تو شنیدن ندہم

گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد ــــ تا نہ بینم رخ تو روح ندہم

(مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کے رخ انوار کو نہ دیکھنے دیں اور نہ کانوں کو اس کی باتیں سننے

دیں اگر میری جان نکالنے کے لیے ملک الموت آ جائے تو جب تک تیرا پرتو نہ دیکھوں جان نہ نکالنے دوں گا)

یعنی اگر ملک الموت میری جان قبض کرنے آئیں تو جب تک تجلی خاص نہ دیکھ لوں گا جان نہ نکلنے دوں گا۔ حق تعالیٰ رحم فرمائے ابن فارضؒ پر۔ انہوں نے اس حالت کو کر کے دکھلا دیا کہ بدوں تجلی خاص کے چلنے پر راضی نہ ہوئے اسی لیے میں کہتا تھا کہ طالب آخرت کا ارادہ اگرچہ مستمر ضرور ہوتا ہے مگر بوجہ سہولت واعانت غیبی کے گویا وہ بالکل ارادہ ہی نہیں کرتا۔ سب کام بدوں اس کے ارادہ کے ہوتا رہتا ہے اور میرا مطلب یہ نہیں کہ ان سے کبھی گناہ نہیں ہوتا یا یہ معصوم ہیں' نہیں! بلکہ تقاضا معصیت کا ان کو بھی ہوتا ہے کیونکہ نفس ان کے ساتھ بھی ہے مگر ان کے تقاضے کی اور دوسروں کے تقاضے کی ایسی مثال ہے جیسے کہ ایک تو شائستہ گھوڑا شرارت کرے کہ وہ نہ مارنے سے سیدھا ہوتا ہے نہ چمکارنے سے۔ جب وہ شرارت کرتا ہے سوار کو پٹخ دیتا ہے اور زین کو بھی پھینک دیتا ہے تو اب یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ گھوڑا شائستہ ہونے کے بعد بھی کبھی شرارت کرنے پر آتا ہے مگر وہ سیدھا ہو جاتا ہے۔ اہل نسبت کی ایسی ہی مثال ہے' یہی لوگ ہیں جو پل صراط پر برق کی طرح جائیں گے کیونکہ پل صراط جیسا کہ اہل کشف نے لکھا ہے کہ شریعت کی صورت مثالی ہے جو لوگ دنیا میں شریعت پر بسہولت چلتے تھے اور شریعت پر چلنا ان کو آسان اور ایسا خوشگوار ہو گیا تھا جیسا کہ دوسروں کو کھانا' پینا' سونا وہ لوگ پل صراط سے بھی باآسانی گزر جائیں گے۔ پس مضمون مقصود ختم ہو چکا' اب اس آیت میں چند نکات سمجھے جو اس وقت ذہن میں ہیں ان کو بیان کر کے بس بیان کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔

رموز و نکات

ایک نکتہ یہ ہے کہ طالبین دنیا کے بارے میں پہلے یہ فرمایا گیا ہے۔ "عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ" کہ طالبین دنیا میں سے ہم جس کو چاہیں اور جس قدر چاہیں عطا کر دیتے ہیں۔ اس کا مقتضا یہ تھا کہ اس کے مقابلہ میں طالبین آخرت کے لیے یہ فرمایا جاتا "اعطیناہ مایشآء" کہ ہم طالب آخرت کو جو کچھ وہ چاہے گا وہی دیں گے کیونکہ جب دنیا والوں کے لیے یہ فرمایا گیا کہ ان کو جو ہم چاہیں گے وہ دیں گے تو بظاہر اس کے مقابل طالبین آخرت کے لیے فضیلت پوری اس طرح معلوم ہوگی کہ ان کو ان کی طلب کے موافق سب کچھ دیا جائے مگر بخلاف اس کے اس آیت میں "مایشآء" نہیں فرمایا گیا بلکہ بجائے اس کے "اُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا" فرمایا گیا۔ تو بات یہ ہے کہ اگر اس جگہ حق تعالیٰ اہل آخرت کے بارے میں یہ ارشاد فرماتے کہ ان کو جو کچھ وہ چاہیں گے وہی دیا جائے گا تو اس میں درحقیقت کچھ زیادتی نہ ہوتی بلکہ وعدہ گھٹ جاتا کیونکہ نعمائے آخرت کی شان یہ ہے:

مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔[1]

''یعنی نہ ان کو آنکھوں نے دیکھا نہ کان نے سنا نہ کسی بشر کے قلب پر خیال گزرا۔''

تو بتلایئے کہ جب وہاں کی نعمتوں کا یہ حال ہے تو اگر یہ فرمایا جاتا کہ طالبین آخرت کو جو کچھ وہ چاہیں گے' دیا جائے گا اس سے زیادتی ہوتی یا کمی؟ بہت کمی ہو جاتی کیونکہ وہاں کی نعمتوں کا ہم کو وہم بھی نہیں ہو سکتا۔ پھر ہماری خواہش کے موافق جو ہم کو ملتا وہ تو بہت ہی کم ہوتا۔ حق تعالیٰ شانہ کی کتنی بڑی رحمت ہے کہ ہمارے واسطے انہوں نے ایسی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جن کا ہم کو خطرہ بھی نہیں ہو سکتا اور وہاں کا ثواب ہماری خواہش پر موقوف نہیں۔ فرمایا بلکہ اپنی رحمت سے' خواہش سے بہت زیادہ عطا فرمائیں گے۔ اسی کے بارے میں مولاناؒ کا ارشاد ہے:

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را ۔۔۔ کہ بیک گل مے خری گلزار را

نیم جاں بستاند وصد جاں دہد ۔۔۔ آنچہ در وہمت نیاید آں دہد

(تم ایسا بازار کہاں سے لاؤ گے کہ ایک پھول کے بدلے پورا باغ خرید لو' آدمی جان لیتے ہیں اور سو جان عطا کرتے ہیں' جو وہم وگمان میں بھی نہیں آتا اس سے زائد عطا فرماتے ہیں)

اب آپ نے سمجھا کہ ماشاء نہ فرمانا ہی ہمارے لیے رحمت ہے اس وجہ سے حق تعالیٰ شانہ نے اجمالاً فرمایا ''اُولٰٓئِکَ کَانَ سَعْیُھُمْ مَّشْکُوْرًا'' یعنی ان لوگوں کی کوشش کی اس دربار میں قدر ہوگی۔ اسی سے سمجھ جاؤ کہ جن کی کوشش کی قدر دانی ایسے عظیم الشان قدر دان بادشاہ کے دربار میں ہو ان کو کیا کچھ ملے گا۔ اس کا اندازہ اس سے کر لو کہ بادشاہ دنیا جب کسی کی قدر دانی کرتے ہیں تو اس کے ساتھ کیسا معاملہ کرتے ہیں وہ یہ نہیں کیا کرتے کہ خدمت کی حیثیت پر انعام واکرام کریں بلکہ وہ اپنی حیثیت کے موافق انعام واکرام کیا کرتے ہیں جس کا اس کو وہم بھی نہیں ہوتا پھر جس کی قدر دانی حق تعالیٰ شانہ اپنی عظمت کے موافق فرمائیں گے' اندازہ کر لو اسے کیا کچھ ملے گا۔ اس وقت اس کی تفصیل سمجھ میں نہیں آ سکتی۔

دوسرا اشارہ **وَسَعٰی لَھَا سَعْیَھَا** میں ہے کہ یہ کلام اس سعی کے سہل ہونے پر دال ہے جیسا کہ اردو محاورہ میں بھی بولا جاتا ہے کہ اس کام کے لیے جو تدبیر ہے وہ کرنی چاہیے اس تدبیر کو بیان نہ کرنا اور اجمالاً یہ کہہ دینا کہ جو تدبیر اس کی ہے وہ کرنی چاہیے اس سے اس تدبیر کا معلوم اور سہل ہونا معلوم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ کلام یہاں پر وارد ہوا کہ ''جو لوگ طالب آخرت ہیں اور اس کے لیے وہ سعی کرتے ہیں جو اس کی سعی ہے ان کی کوشش کی قدر ہوگی'' اس طرز کلام سے اس سعی کا معلوم ہونا اور سہل ہونا سمجھا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ سعی مختصر اور مشتہر ہے' بیان کی ضرورت نہیں۔

---

[1] (مسند احمد بن حنبل ۵:۳۳۴' المستدرک للحاکم ۲:۴۱۳' المعجم الکبیر للطبرانی ۶:۱۹۰' ۲۴۷' الدرالمنثور للسیوطی ۵:۱۷۷' الترغیب والترھیب للمنذری ۴:۵۵۸' المصنف لابن ابی شیبۃ:۱۳' تفسیر القرطبی ۱:۷۷)

تیسرا اشارہ مشکوراً میں اس بات کی طرف ہے کہ جو کچھ آخرت میں ملے گا وہ محض قدردانی ہے۔ عمل کو اس میں دخل نہیں، اس سے ناز کرنے والوں کو تنبیہ مقصود ہے کہ اپنے عمل پر نازاں نہ ہونا چاہیے جو کچھ وہاں ملے گا محض انعام ہوگا ورنہ تم عمل سے اس کے مستحق نہیں ہوسکتے۔ وجہ یہ کہ طاعت ادائے حق خداوندی اور اس کے حقوق غیر متناہی ہیں اور حقوق غیر متناہی کا ادا کرنا موقوف ہے، عمل غیر متناہی پر اور ہم بوجہ حادث و متناہی ہونے کے عمل غیر متناہی سے عاجز ہیں۔ تو عقلاً انسان ادائے حق خداوندی سے عاجز ہے تو اب جو کچھ بھی اسے ملے وہ محض قدردانی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہاں سے یہ شبہ بھی دور ہوگیا ہوگا جو بعض رحم دل لوگوں کے دلوں میں آیا کرتا ہے کہ کافروں کے لیے ہمیشہ کے لیے خلود فی النار کیوں مقرر ہوا۔ کفر تو اس نے کیا تھوڑی مدت تک یعنی دنیا کی زندگی میں اور سزا ہمیشہ ہمیشہ کے جہنم۔ یہ تو بظاہر عدل کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ تو بات یہ ہے کہ کافر نے حق تعالیٰ کے ساتھ جب شرک و کفر کیا تو اس نے حق تعالیٰ شانہ کے حقوق غیر متناہیہ کو ضائع کیا اور حقوق غیر متناہیہ پر سزا غیر متناہی موافق قاعدہ عقل کے ہے۔ غرض عمل صالح سے تو حقوق غیر متناہیہ ادا نہیں ہوتے اور کفر سے حقوق غیر متناہیہ ضائع ہوجاتے ہیں۔ پس عمل متناہی کے بدلے جزا غیر متناہی جو مومنین کو عطا ہوگی۔ یہ البتہ عقل سے آگے ہے عقل یوں کہتی ہے کہ جب عمل متناہی ہے تو جزا بھی متناہی ہونی چاہیے۔ لوگ آج کل عقل عقل گاتے پھرتے ہیں مگر یہ عقل ان کی خیر خواہ نہیں دشمن ہے۔

آزمودم عقل دور اندیش را   بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(میں نے اپنی دور کی کوڑی لانے والی عقل کو کئی مرتبہ آزمایا پھر میں نے اپنے آپ کو دیوانہ بنالیا)

یہ لوگ ہمیں بے عقل بتلاتے ہیں مگر ہمیں ایسی عقل کی ضرورت نہیں اس سے ہم بے عقل ہی اچھے مگر خبر بھی ہے یہ بے عقلی کس کے لیے ہے۔

ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم   مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم

(اگر ہم قلاش اور دیوانہ ہیں تو کیا غم ہے یہی دولت کیا کم ہے کہ اس ساقی (محبوب حقیقی) اور اس کی شراب محبت سے مست ہیں)

یعنی خدا کا دیوانہ ہزار عاقلوں سے بہتر ہے

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد   (وہ دیوانہ درحقیقت دیوانہ نہیں ہے)

پس مشکوراً فرمانے سے بتلا دیا کہ عقل تو چاہتی ہے کہ تمہارا اجر کم ہوتا مگر یہ ہماری قدردانی ہے۔ ایک حدیث میں بھی یہ مضمون آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں اپنے عمل سے کوئی نہ جائے گا۔ ہاں رحمت الٰہی ہوجائے تو اور بات ہے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا؛ وراس سوال کی ہمت بھی انہی کو تھی۔ یارسول اللہ! ''ولا انت'' کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے عمل سے جنت میں تشریف نہ لے جائیں گے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

فرماتی ہیں کہ میرے اس سوال پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر خوف غالب ہو گیا اور آپ نے سر مبارک پر ہاتھ رکھ کر فرمایا "ولا انا لا ان یتغمدنی اللہ برحمتہ" کہ میں بھی عمل سے جنت میں نہ جاؤں گا مگر یہ کہ خدا کی رحمت میری دست گیری کرے۔ صاحبو! اب کس کی ہمت ہے جو اپنے عمل کو کچھ سمجھے۔ ہماری تو وہ مثال ہے جو کسی بزرگ نے بیان فرمائی ہے:

چوآں کرمے کہ در سنگے نہانست زمین و آسمان دے ہمانست

(جو کیڑا پتھر کے اندر ہے وہی پتھر اس کیڑے کا زمین اور آسمان ہے)

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی مثال میں اور حکایت بیان فرمائی ہے۔ ایک بدوی کی جس نے بجز اپنے گاؤں کے گڑھوں کے کبھی پانی نہ دیکھا تھا اور قحط میں ان کے خشک ہو جانے سے دنیا سے پانی کو ناپید سمجھتا تھا کہ وہ کسی خلیفہ بغدادی کے پاس زمانہ خشک سالی میں ایک گھڑا شیریں پانی کا لے گیا تھا۔ بڑی دور دراز مسافت سے وہ گھڑا سر پر رکھے ہوئے جب پہنچا تو خلیفہ کے دربار میں اس کو پہنچا دیا گیا۔ خلیفہ کے پوچھنے پر اس نے کہا کہ اے امیر المومنین! یہ جنت کا پانی ہے خلیفہ نے بہت قدر دانی سے وہ گھڑا لے لیا اور حکم کیا کہ سونے سے پر کر کے اس گھڑے کو واپس کر دیا جائے اور حکم دیا کہ اس کو نہر دجلہ کی طرف سے واپس کیا جائے تا کہ اسے معلوم ہو جائے کہ یہ ہم نے محض اس کی محبت کی قدر کی ہے ورنہ آب شیریں کی ہمارے یہاں کمی نہیں۔

اسی طرح قیامت میں جب ہم اپنے اعمال کی جزا دیکھیں گے کہ اس قدر بے شمار نعمت ہے تو معلوم ہوگا کہ یہ سب محض قدر دانی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز حق تعالیٰ شانہ اپنے مومن بندے کا حساب چھپا کر لیں گے اور فرمائیں گے کہ ہم نے تم پر یہ انعام فرمائے تھے تم نے پھر بھی نافرمانی کی' فلاں گناہ کو یاد کرو' تم نے فلاں دن یہ کام کیا تھا' اس دن یہ کیا تھا۔ غرض گناہوں کی فہرست شمار فرمائیں گے۔ یہاں تک کہ مومن یہ سمجھے گا کہ بس میں ہلاک ہوا اور ہر طرف سے اپنے کو جہنم کے قریب سمجھے گا۔ اس وقت حق تعالیٰ شانہ فرمائیں گے کہ جاؤ ہم نے دنیا میں بھی پردہ پوشی کی تھی یہاں بھی ہم پردہ پوشی کرتے ہیں۔ پھر اس کے نامہ اعمال میں سے گناہوں کو محو فرما دیں گے اور ان کی جگہ اعمال حسنہ درج فرما دیں گے۔ یہ ہے "اُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِھِمْ" حَسَنٰتٍ کا مضمون۔ کچھ ٹھکانا ہے اس رحمت کا کہ مسلمانوں کو اپنی رحمت سے دوسروں کے سامنے ذلیل نہ فرمائیں گے بلکہ دوسروں کے سامنے اس کی عزت بڑھائی جائے گی اور یوں ظاہر کیا جائے گا کہ گویا اس نے گناہ کیا ہی نہیں۔

صاحبو! ایسے خدا کو چھوڑ کر کہاں جاتے ہو۔ کیا اس کا حق تمہارے اوپر کچھ بھی نہیں جو یوں نافرمانی

---

[1] (المعجم الکبیر للطبرانی ۷: ۳۷۰' تاریخ بغداد للخطیب البغدادی ۷: ۸۵)

پر کمر بستہ ہوئے ہوا یسے رحیم وکریم خدا کے ساتھ تعلق اور لگاؤ پیدا کرو اور اس کی محبت میں کوشش کرو۔ بس اب میں وہ ترکیب بتلا کر جس سے حق تعالیٰ شانہ کے ساتھ تعلق اور لگاؤ پیدا ہو بیان کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔

ترکیب تعلق

اس کی ترکیب یہ ہے کہ سب سے پہلے علم دین بقدر ضرورت حاصل کرو کہ بدوں اس کے خدا تعالیٰ کی خوشی و ناخوشی کا پتہ نہیں چلے گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے پکا عہد کرو کہ آئندہ گناہ نہ کریں گے اور گزشتہ گناہوں سے سچی توبہ جو یہی ہے کہ آئندہ کے لیے پختہ عہد کر لیا جائے کہ اب گناہ نہ کریں گے، توبہ کے وقت عہد پختہ کرنا چاہیے۔ اس کے بعد اگر غلطی سے عہد ٹوٹ جائے تو توبہ پھر ایسی پختگی کے ساتھ کی جائے اور اس پختہ عہد کے بعد اگر پھر گناہ ہو جائے تو صلوٰۃ التوبہ کے ساتھ توبہ کرنی چاہیے۔ خالی زبانی توبہ پر اکتفا نہ کیا جائے کہ یہ علاج ہے نفس کا جس کی اب زیادہ ضرورت ہوگئی۔ ذرا چند روز اس کا التزام کر کے تو دیکھو کہ پھر گناہوں سے طبعی نفرت ہوتی ہے نہیں۔ بڑا مجرب نسخہ ہے اور نہایت سہل کہ جب گناہ ہو جائے تو وضو کر کے دو رکعت نفل پڑھ کر توبہ کی جائے، ہر گناہ پر ایسا ہی کیا جائے۔ آخر کار گناہ سے طبعی نفرت اور طاعت کی طبعی رغبت پیدا ہو جائے گی۔

اور اس کے ساتھ ہی کسی کامل کی صحبت تلاش کرو، اہل اللہ سے ملتے رہو، ان سے اپنا حال کہو، دین میں ان سے مدد لو کہ صحبت کامل اکسیر اعظم ہے۔ یہ صحبت بجلی کی طرح اثر کرتی ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ دنیا سے دل یکسو آخرت کی طرف راغب ہو جاتا ہے اور سونے کے وقت دن بھر کے تمام کاموں کا حساب کیا کرو، جتنے گناہ ہو گئے ہوں ان پر نادم ہو کر استغفار کر کے سوؤ اور کچھ وقت تنہائی کا اللہ کی یاد کے واسطے نکالو۔

یہ پانچ باتیں ہوئیں۔ ان پر عمل کر کے دیکھئے ان شاء اللہ حق تعالیٰ کے ساتھ دل کو پورا لگاؤ ہو جائے گا اور اتنی سہولت کے بعد بھی کوئی نہ کرے تو ایسے ناقدرے کو خدا تعالیٰ ہی ہدایت فرمائیں۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ شانہ ہمیں توفیق فرمائیں۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدِ
النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمْ.

الدنیا

عورتوں میں یہ بڑی خوبی ہے کہ ان کو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام میں شبہ نہیں ہوتا۔ جب سن لیں گی کہ یہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے تو گردن جھکا دیں گی' چاہے عمل کی توفیق نہ ہو لیکن اس میں شک و شبہ اور وجہ وعلت کا سوال ان سے صادر نہیں ہوتا۔ بخلاف مردوں کے کہ ان میں مادہ اس خاص انقیاد کا کم ہے خاص کر آج کل کہ اتنی عقل پرستی بلکہ اکل پرستی غالب ہے کہ وہ ہر بات کی وجہ پوچھتے ہیں' ہر مسئلہ کو اپنی عقل کی میزان میں جانچتے ہیں اور رائے زنی کرتے ہیں کہ عقل کے موافق ہے یا نہیں اور عورتوں کی سمجھ میں خواہ آئے یا نہ آئے وہ تسلیم کر لیں گی۔

یہ وعظ تھانہ بھون میں حافظ احمد صاحب کے مکان پر ۲ ربیع الثانی ۱۳۳۲ھ کو بعد عصر ہوا جو ایک گھنٹہ میں ختم ہوا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ. اَمَّا بَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ. فَقَدۡ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ الدنیا دار من لا دار لہ ولھا یجمع من لا عقل لہ الحدیث۞[1]

ترجمہ: دنیا اس شخص کا گھر ہے جس کا گھر نہ ہو اور اس دنیا کو وہ جمع کرے گا جس کو عقل نہ ہو۔

دنیا کی محبت

یہ ایک لمبی حدیث ہے اس میں سے اس وقت دو جملے اختیار کرنا ضروری سمجھا گیا اس لیے کہ جو میرا مقصود ہے اس کے لیے یہ دو جملے کافی وافی ہیں۔ یہ ارشاد ہے جناب فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اور اس میں ایک ایسی ضروری تعلیم ہے کہ ہر حال میں اور ہر شخص کو اس کا یاد رکھنا اور پیش نظر رکھنا ضروری ہے خاص کر عورتوں کو۔ اس لیے کہ جس کا مرض شدید ہوتا ہے اس کو علاج کی زیادہ ضرورت ہوا کرتی ہے اور جس مرض کا اس ارشاد میں معالجہ ہے وہ عورتوں کے اندر زیادہ ہے۔ وہ مرض کیا ہے؟ حب دنیا۔ چنانچہ دیکھا بھی جاتا ہے کہ عورتوں کے اندر یہ مرض بہ نسبت مردوں کے زیادہ ہے اور عورتوں میں یہ مرض کئی صورتوں سے پایا جاتا ہے۔ بعض کے اندر تو کھلم کھلا ہے وہ تو وہ ہیں کہ جن کے بال بچے کنبہ مال و جاہ ہے۔ وہ تو کھلم کھلا اس میں مشغول ہیں اور ان کو اس سے کسی وقت فراغت نہیں۔

چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد

---

[1] (مسند احمد بن حنبل ٦: ١٧ ، مجمع الزوائد للھیثمی ١٠: ٢٨٨ ، مشکوۃ المصابیح: ٥٢١١ ، کنز العمال: ٦٠٧٦ ، الدر المنثور ٦: ٣٤١ ، اتحاف السادۃ المتقین ٨: ٨٣ ، ٦٢٣ ، ٩: ٢٧٥ ، المغنی عن حمل الاسفار ٣: ١٩٩ ، ٤: ١٩٠ ، مناھل الصفا: ٢٠٥ ، تفسیر ابن کثیر ١: ٣٦٤ ، ٥: ٥٩ ، ٧: ٣٣٤ ، ٨: ٤٠٤ ، تذکرۃ الموضوعات للفتنی: ١٧٢ ، الدر المنتثرہ لاحادیث المشتھرۃ للسیوطیؒ: ٨٤ ، کشف الخفاء للعجلونی ١: ٤٩٣ ، الترغیب والترھیب ٤: ١٧٨)

(جب مرتا ہے تو مبتلا مرتا ہے اور جب اٹھتا ہے تو مبتلا اٹھتا ہے)

کا قصہ ہے اور اپنی زبان حال سے کہتے بھی ہیں کہ دنیا دار ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ ان کے بال بچے نہیں ان میں یہ مرض دوسرے رنگ میں پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا نام بال بچوں کا ہے۔ چنانچہ کہتے بھی ہیں کہ دنیا میں ہمارا کیا ساجھا ہے' ہمارے بال بچے تو ہیں ہی نہیں۔ حالانکہ جو حقیقت ہے دنیاداری کی وہ اس میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ عنقریب واضح ہو جائے گا۔

غرض یہ ہے کہ عورتوں میں یہ مرض بہ نسبت مردوں کے واقعی زیادہ ہے اس لیے کہ مردوں میں بہت کم ایسے ہیں کہ ان کے پاس سامان دنیا نہ ہو اور پھر وہ اس میں اپنے کو پھنسا دیں اور عورتوں میں بہت ایسی ہیں کہ بال بچے نہیں' پاس کوڑی نہیں لیکن ہر ایک کی بات میں ہر ایک کے معاملہ میں دنیا بھر کے قصوں میں اپنی ٹانگ اڑاتی ہیں۔ ان کو تو اللہ تعالیٰ نے فراغت دی تھی اس سے نفع حاصل کرتیں اور بہت سے مرد بھی ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بے فکری دی ہے ان کو بھی وقت کی قدر کرنا چاہیے تھی اور اطمینان سے حق تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہونا تھا۔ خوب فرمایا ہے مولانا نظامی نے:

خوشا روزگار کہ دارد کسے　　　　که بازار حرصش نباشد بسے

بقدر ضرورت یساری بود　　　　کند کارے از مرد کارے بود

یعنی وہ بڑا خوش قسمت ہے کہ اس کو بہت حرص نہ ہو اور چار روٹیاں کھانے کو ہوں اور اللہ تعالیٰ کی یاد کرے۔ یہ مطلب نہیں کہ فکر بالکل ہی نہ ہو' فکر سے کون خالی ہے۔ بات یہ ہے کہ ایک تو وہ ہیں کہ اگر چکی نہ پیسو یا سوئی نہ مارو یا اور کوئی دھندا نہ کرو تو روٹی نہ ملے گی اور ایک وہ ہیں کہ گھر کا اناج آتا ہے یا کوئی عزیز خدمت کرتا ہے یا جوان بیٹا ہے وہ خدمت کرتا ہے تو جو دھندوں میں مشغول ہیں اگر چہ معذور تو وہ بھی نہیں اس لیے کہ ان کو بھی بہت وقت فراغت کا ملتا ہے جس کو فضول اڑا دیتے ہیں مگر زیادہ شکایت تو ان کی ہے کہ جن کو بلا کسی مشقت و محنت کے کھانے کو ملتا ہے اور پھر وہ اس نعمت کی قدر نہیں کرتے' ہزاروں بندگان خدا ایسے بھی ہیں کہ جن کو اس قسم کی بے فکری میسر ہے' مگر دیکھا جاتا ہے کہ زیادہ وہی دنیا کے قصوں میں ٹانگ اڑاتے ہیں بلکہ جو تعلقات والے ہیں وہ تو کبھی کبھی دنیا کی کلفتوں سے گھبرا بھی جاتے ہیں مگر جن کو کوئی تعلق نہیں وہ نہیں گھبراتے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ لوگ یہ سوچ کر ان کی خاطر کرتے ہیں کہ بھائی ان کے کوئی ہے نہیں اور وہ بھی لوگوں کو دھمکاتے ہیں کہ ہمارا دنیا میں کیا رکھا ہے تم ہمارا کیا کر سکتے ہو اور کھانے پینے کو بلا مشقت ملتا ہے۔ پھر اس سے دل گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں اس لیے دنیا ان کی پوری قبلہ و کعبہ ہے۔ پس یہ بھی وجہ ہے

مرض کے شدید ہونے کی کہ مریض ہیں اور اپنے کو صحیح جانتے ہیں اور جن کی اولاد ہے' تعلقات ہیں وہ تو کبھی کبھی بول بھی اٹھتے ہیں کہ بیٹے کی شادی کے بعد ہم بالکل الگ ہو جائیں گے' دنیا کے دھندوں سے کچھ واسطے نہ رکھیں گے' اللہ کا نام لیا کریں گے لیکن جو بے تعلق ہیں جن کے کوئی نہیں ان کو یہ توقع بھی نہیں' کیا ان کو مرنے کا انتظار ہے' بعض ایسے بھی باہمت ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ قصے تو جان کو لگے ہوئے ہیں' مر کے سب دھندے چھوٹ جائیں گے۔ یاد رکھو! مر کر چھوٹنا کارآمد نہیں' چھوٹنا وہ نافع ہے جو زندگی میں دنیا کے دھندے دل سے نکال دے۔

بہر حال مختلف وجوہ سے اس مرض کے اندر مرد اور خصوصاً عورتیں مبتلا ہیں۔ چونکہ عورتوں کے اندر یہ مرض زیادہ ہے اس لیے خطاب میں ان کی رعایت زیادہ ہوگی لیکن یہ نہ ہوگا کہ مردوں کو نفع نہ ہو۔ اس لیے کہ مرض تو مشترک ہی ہے لیکن چونکہ عورتوں میں زیادہ ہے اور نیز عورتوں ہی کی درخواست سے یہ بیان ہوا ہے اس لیے ان کی مصلحت کی رعایت زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے بڑھ کر کسی کا ارشاد نہیں ہے اس لیے کہ اصل میں تو حق تعالیٰ کا ارشاد سب سے بڑھ کر ہے لیکن چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بعینہ حق تعالیٰ کا ہی ارشاد ہے اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے بڑھ کر کسی کا قول نہیں۔ اس لیے میں اپنے مقصود کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو نقل کر دینا اور اس کا ترجمہ کر دینا کافی سمجھتا ہوں اور نیز اس وجہ سے کہ اس وقت میری مخاطب عورتیں ہیں اور عورتوں کی جہاں میں نے بہت سی مذمت کی ہے اسی طرح ایک مدح بھی ان کی بیان کیے دیتا ہوں۔ بقول شاعر

عیب می جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

(اس کے عیب بیان کرتے ہو تو اس کی خوبیوں کا بھی ذکر کرو)

عورتوں کی خوبی

وہ بات مدح کی ان میں یہ ہے کہ ان کو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام میں شبہ نہیں ہوتا جب سن لیں گی کہ یہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام ہیں' گردن جھکا دیں گی' چاہے عمل کی توفیق نہ ہو لیکن اس میں شک وشبہ اور وجہ وعلت کا سوال ان سے صادر نہیں ہوتا۔ بخلاف مردوں کے کہ ان میں یہ مادہ اس خاص انقیاد کا کم ہے خاص کر آج کل کہ اتنی عقل پرستی بلکہ اکل پرستی غالب ہوئی ہے کہ ہر بات کی وجہ پوچھتے ہیں۔ اپنی عقل کی میزان میں ہر مسئلہ کو جانچتے ہیں

اور رائے زنی کرتے ہیں کہ عقل کے موافق ہے یا نہیں اور عورتوں کی خواہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے تسلیم کریں گی۔ ابھی ایک تازہ واقعہ ہوا ہے کہ ایک معاملہ میں ایک بی بی کو بہت جوش وخروش تھا۔ میں نے کہلا بھیجا کہ شریعت کا حکم اس کے متعلق یہ ہے سنتے ہی گردن جھکا دی اور اس کے بعد ایک حرف اس کے خلاف زبان سے اس کے نہیں نکلا اور جس بات پر انکار تھا فوراً اس کو قبول کرلیا۔ پس عورتوں میں یہ خوبی بھی ہے تو اس لیے بھی زیادہ مناسب ہوا کہ بجائے اس کے کہ میں اپنے مضمون کے عقلی دلائل بیان کروں یہ کہہ دوں کہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوں تقریب فہم یا مشاہدہ کرانے یا اسی حدیث کے اندر غور کرانے کی ضرورت سے اور کچھ کہہ دوں' وہ دوسری بات ہے لیکن حجت اور استدلال کی رو سے اس حدیث کے ترجمہ کو کافی سمجھتا ہوں۔

پس بغور سنو کہ اس حدیث میں دنیا کی مذمت ہے اور دنیا کی مذمت ایسی متفق علیہ ہے کہ تمام حکماء وعقلاء قدیم سے کرتے چلے آرہے ہیں اور مختلف عنوانوں اور مختلف تعبیروں سے اور طرح طرح سے مذمت بیان کی ہے مگر ہر ایک نے ایک خاص خاص پہلو سے گفتگو کی ہے جس نے جو پہلو مذمت کا اختیار کرلیا ہے اس سے دوسرے وجوہ چھوٹ گئے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد جامع ہے تمام مذمتوں کو' کوئی مذمت ایسی نہیں رہی جو اس کے تحت میں داخل نہ ہو۔

گھر کی اہمیت

چنانچہ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ارشاد فرماتے ہیں کہ دنیا گھر اس شخص کا ہے جس کا گھر نہ ہو' یعنی دنیا گھر بنانے کی جگہ نہیں ہے۔ یاد رکھو کہ گھر سے سب کو محبت ہوتی ہے اور محبت کی وجوہ مختلف ہیں۔ بعض کو تو خود گھر ہی سے بالذات تعلق ہوتا ہے' خاص کر عورتیں چونکہ رات دن اسی میں رہتی ہیں اس لیے ان کو گھر سے شدید تعلق ہوتا ہے۔ ہمارے بزرگوں میں ایک بی بی تھیں' بہت بوڑھی ہوگئی تھیں۔ جب کبھی ان سے عرض کیا جاتا کہ تم ہمارے یہاں آجاؤ تو وہ یہی کہتی تھیں کہ نہیں بھائی میں تو یہی چاہتی ہوں کہ جس گھر میں ڈولی آئی تھی اسی گھر کھٹولی نکلے۔ ﴿یعنی جس گھر میں دلہن بن کر آئی تھی اسی گھر سے جنازہ بھی نکلے﴾ اور بعضوں کو گھر سے اس وجہ سے محبت ہوتی ہے کہ گھر میں آسائش بہت ہوتی ہے' کسی کا زور نہیں' دباؤ نہیں' چین سے پڑے ہیں۔ بعضوں کو اس لیے ہوتی ہے کہ گھر میں سامان ہے' راحت کی سب چیزیں مہیا ہیں۔ دوسری جگہ جاتے ہیں تو پریشانی ہوتی ہے' جب جی گھبرایا گھر چلے گئے' جب بھوک لگی گھر میں جو کچھ رکھا ہو خواہ باسی تازہ یا

کوئی اور شے کھالیا' یہ بات باہر کہاں! بلکہ وطن ہی میں اگر کہیں دعوت ہو جائے اور باسی روٹی کو جی چاہے تو ممکن نہیں کہ آپ باسی کھائیں' تازی ہی کھانا پڑے گی یا کسی خاص شے کو جی نہیں چاہتا' کبھی وہ شے کھائی نہیں اور دعوت میں وہی سامنے آئی' جھک مار کر وہی کھانا پڑے گی یا اس وقت بھوک نہیں' اپنے گھر تو نہ کھاتے لیکن یہاں کھانا ہی پڑے گا خواہ تھوڑا ہی کھائیں۔ یہ آسائش گھر ہی میں ہے۔ غرض اور بلاد کے اعتبار سے اپنے وطن میں اور وطن کے اجزاء کے اعتبار سے وطن کے اس خاص حصہ میں جس کو اپنا گھر کہتے ہیں زیادہ راحت ملتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ گھر وہ شے ہے کہ جتنی چیزیں آدمی کو مرغوب ہوتی ہیں ان سب چیزوں کا میزان الکل لفظ گھر ہے۔ یعنی حق تعالیٰ نے اس کو جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں' جاہ و مال' اولاد' کھانے پینے' پہننے کی چیزیں اور تمام تفریح کا سامان وہ سب گھر کے اندر آ گئیں۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد "الدنیا دار من لادار له" ہزاروں دفتروں کا ایک دفتر ہے اگر دنیا کی تمام چیزوں کی مال کی' جاہ کی اور اولاد کی' کھانے پینے وغیرہ کی الگ الگ مذمت کی جاتی اور ان کو دل سے اتارنے کی کوشش کی جاتی تو اتنا بلیغ اور مختصر مضمون نہ ہوتا جس قدر یہ ابلغ ہے کہ اس میں سب کچھ آ گیا اور پھر صرف دو لفظ۔

ملکیت کی حقیقت

پس تفصیل اس ارشاد کی کہ دنیا کو گھر نہ سمجھو یہ ہوئی کہ اپنے گھر کو گھر نہ سمجھو' اپنے مال کو اپنا مال نہ سمجھو' اپنے جاہ کو جاہ نہ سمجھو' اپنے بیٹے کو اپنا بیٹا نہ سمجھو' اپنی بیوی کو بیوی نہ جانو۔ غرض جس شے سے علاقہ قلب کو ہوتا ہے سب ہی کچھ اس میں آ گیا۔ گویا مطلب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ہے کہ سب اشیاء کی فہرست تم سے کہاں تک بیان کی جائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ کسی شے کو اپنا نہ سمجھو۔ جڑ کی بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دی اور کس خوبصورتی سے فرمایا ہے۔ ایک دم سے یہ نہیں فرمایا کہ دنیا گھر نہیں ہے تاکہ جو لوگ اس کو گھر سمجھتے ہیں ان کو اول نظر میں انکار کی گنجائش نہ ملے۔ پس اس کی خاطر سے یہ فرمایا کہ گھر تو ہے مگر اس شخص کا ہے جو بے گھر ہو' پس جو گھر سمجھتا ہے وہ بھی اگر غور کر کے دیکھے گا تو معلوم ہو جائے گا کہ واقعی دنیا گھر نہیں ہے۔

تفصیل اس مجمل کی یہ ہے کہ ہم نے مان لیا کہ گھر ہے لیکن یہ تو بتلاؤ کہ گھر کس کو کہتے ہیں۔ اپنا گھر عرفاً اس کو کہتے ہیں کہ جس میں سے تم کو کوئی نکال نہ سکے۔ مثلاً تم کلکتہ جاؤ اور وہاں کسی کے مکان میں ٹھہر جاؤ اور یہ کہو کہ ہمارا گھر ہے' مالک کان پکڑ کر نکال دے گا۔ اسی طرح اپنا مال اس کو کہا جاتا ہے جو دوسرا تم سے نہ لے سکے' یعنی دوسرے کی امانت نہ ہو' پس تم جو دنیا کو گھر سمجھتے ہو اور یہاں کے مال کو

اپنا مال سمجھتے ہو اور یہاں کی آبرو کو اپنی آبرو سمجھتے ہو اور یہاں کی بیوی بچوں' نوکر چاکر کو اپنا سمجھتے ہو تو غور تو کرو کہ اس پر اپنا ہونے کی تعریف بھی صادق آتی ہے یا نہیں۔ پس اگر واقع میں یہ چیزیں مملوک ہیں تو مملوک ہونے کی علامتیں اس میں ہونا چاہیے اور اگر ہم یہ دکھلا دیں کہ اس میں یہ علامتیں نہ پائی جائیں تو ان کو کیسے اپنی سمجھو گے؟

اپنا گھر کون سا ہے جس میں سے کوئی تم کو نہ نکالے۔ ہماری حالت یہ ہے کہ جب سرکاری حکم آتا ہے تو زبردستی ڈنڈا ڈولی کر کے ایک گڑھے میں پھینک دیئے جاتے ہو۔ کیوں صاحبو! یہی تھا تمہارا گھر؟ اور اگر اس پر بھی اپنا گھر سمجھتے ہو تو کیا وجہ ہے کہ اسی کو اپنا گھر سمجھو۔ ساری دنیا کے گھروں کو اپنا گھر سمجھو' اپنا گھر وہی ہے کہ جس پر قبضہ قابو ہو' کوئی وہاں سے اٹھا نہ سکے۔ یہ معیار تو تمہارا ہی مقرر کیا ہوا ہے۔ اس معیار پر یہ گھر تمہارا ہے یا نہیں؟ ہم تو دیکھ رہے ہیں کہ نہیں ہے' جب مالک حقیقی چاہتے ہیں' کان پکڑ کر باہر نکال دیتے ہیں نہ گھر پر قابو رہتا ہے' نہ بیوی رہتی ہے' نہ بچے رہتے ہیں' نہ مال اپنا رہتا ہے' پس جو علامتیں اور معیار اور تعریف اپنا ہونے کی تھی وہی یہاں مفقود ہے پھر کیسے اپنا کہتے ہو؟

یہ تو مرنے کے ساتھ حالت ہوتی ہے اور اس سے قبل کی حالت پر شاید کوئی ناز کرے کہ مرنے تک تو اپنا ہے مر کر ہی تو چھوٹ جائے گا۔ صاحبو! زندگی کی حالت میں بھی کوئی شے اپنی نہیں دیکھو گے' کھانا ہی ہے' جب حق تعالیٰ چاہتے ہیں اس سے محروم کر دیتے ہیں' پیٹ میں مروڑ لگا اور دست آنا شروع ہوئے' کھانے قسم قسم کے اپنے ملک میں موجود ہیں اور کھا نہیں سکتے' پھر یہ کیا اپنے ہوئے اور ان پر کیا قابو ہے' بھلا کھانا تو ایک منفصل شے ہے' خود جو صفات آدمی کے ہیں' راحت اور آرام' یہ بھی جب اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں چھن جاتی ہے۔ پس مال اور جاہ اور ہماری صفات حتیٰ کہ ہماری ذات کوئی شے ہماری نہیں' جب چاہیں جو شے چاہیں چھین لیں۔

انسان کی بے بسی

چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ کسی کی آنکھیں چھین لی جاتی ہیں کسی کی زبان ماؤف ہو جاتی ہے' کسی کی عقل پر آفت آ جاتی ہے' کل جو بڑے عاقل تھے آج ان کے حواس میں فرق آ گیا' پاگل ہو گئے کہاں گئی وہ عقل' کہاں گئے وہ حواس' بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ جنون کے بعد ان کو گوہ موت میں بھی تمیز نہیں رہتی۔ ایک پاگل پاخانہ کھایا کرتا تھا اور دلیل یہ بیان کرتا تھا کہ کیا وجہ ہے کہ لوگ اس کو برا سمجھتے ہیں' یہ میرے ہی اندر سے تو نکلا ہے پھر میرے ہی اندر اگر چلا جائے تو اس میں کیا خرابی ہے۔ میں ان عقل پرستوں سے کہا کرتا ہوں کہ تمہاری عقل اس پاگل کی سی عقل ہے اس لیے کہ

شریعت اور سلامت فطرت تو تمہارے نزدیک کوئی شے نہیں، عقل ہی قبلہ وکعبہ ہے۔ پس ہم کہتے ہیں کہ اگر عقل ہی پر مدار ہے تو اس شخص کے اس استدلال کا جواب دو مگر دیکھو شریعت اور سلامت فطرۃ کو ضم نہ کرنا، محض عقل سے جواب دو۔ بظاہر تو وہ عقل کی بات کہہ رہا ہے کہ میرے ہی اندر سے نکلا ہے میرے ہی اندر چلا جائے تو کیا حرج ہے۔ اگر یہ کہو کہ ہم کو نفرت آتی ہے، میں کہتا ہوں کہ جس کو نفرت نہ آئے کیا اس کا کھانا جائز ہو جائے گا۔ وہ پاگل کہتا ہے کہ مجھے تو نفرت نہیں ہے تو کیا یہ فعل مستحسن ہو جائے گا، کچھ نہیں سب خرمستیاں ہیں۔ آپ جس طرح اس پاگل پر ہنستے ہیں اسی طرح اہل بصیرت آپ پر ہنستے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس عقل پر آج ناز ہے وہ ذرا سی آفت سے سلب ہو جاتی ہے۔

میں ایک بار عشاء کے بعد مدرسہ سے گھر کو جا رہا تھا، رات بہت تاریک تھی، گھر کا راستہ بھول گیا، بہت پریشان رہا، کبھی بھائی کے مکان پر جاتا ہوں اور کبھی اس کے سامنے مکان ہے لطافت علی کا اس پر اور کبھی میاں محمد اختر کے مکان پر جاتا ہوں۔ غرض بڑی پریشانی کے بعد اپنا مکان ملا۔ حالانکہ رات دن کی آمد ورفت، اگر آنکھیں بند کر کے بھی جانا چاہوں تو جا سکتا ہوں مگر اس روز حق تعالیٰ نے دکھلا دیا کہ تمہارے حواس اور تمہارا ادراک اس درجہ کا ہے کہ ہم جب چاہیں بیکار کر دیں، تم کچھ نہیں کر سکتے، پھر کس منہ سے کہتے ہو کہ ہماری چیز ہے ہمارا مال ہے، میرا گھر ہے، ایسا گھر ہے کہ جب میعاد ختم ہو جائے گی، یا بدست دیگرے دست بدست دیگرے، جہاں چاہیں گے پھینک دیں گے، اگر تم اس وقت فرض کرو نہ جانا چاہو، تب بھی زبردستی تم کو پھینک دیں گے۔

ایک کلکٹر کا شملہ پر انتقال ہو گیا تھا، وہاں سے اس کی لاش ڈولی میں آ رہی تھی، ایک شخص نے دیکھ کر بیان کیا کہ سر نیچے پتھروں سے ٹکراتا جا رہا تھا، ایک ایسا حاکم کہ ضلع میں جو چاہے حکم نافذ کر دے آج وہ اپنے سر کو پتھروں کے صدمہ سے نہیں بچا سکتا۔

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا — یکسر وہ استخوان شکستہ سے چور تھا
بولا سنبھل کے چل تو ذرا راہ بے خبر — میں بھی کبھی کسی کا سر پر غرور تھا

اس پر وہ ناز ہے کہ کچھ حد وحساب نہیں، بعضوں کو تو اتنا ناز بڑھا کہ خدائی کا دعویٰ کر دیا۔ چنانچہ فرعون نے کہا تھا "انا ربکم الاعلی" (النازعات آیت نمبر ۲۴) آج کل بھی لوگوں میں خدائی کے دعویٰ سے کم کبر نہیں ہے۔

انسان کی مختلف حالتیں

چنانچہ کہتے ہیں کہ "تم نہیں جانتے کہ ہم کون ہیں" ایک بزرگ نے خوب جواب دیا تھا۔

ایک شخص اکڑتا ہوا جارہا تھا' ان بزرگ نے نصیحت کی کہ میاں اس طرح نہیں چلا کرتے' تواضع اور مسکنت سے چلنا چاہیے' کہنے لگا کہ نہیں جانتے ہم کون ہیں' فرمایا جانتا ہوں۔

اولک نطفة قذرة وآخرک جیفة مذرة وانت بین ذلک تحمل العذرة

اول تو تیرا یہ ہے کہ تو ایک ناپاک نطفہ تھا اور انجام تیرا یہ ہے کہ ایک مردار ہوجائے گا اور درمیانی حالت تیری یہ ہے کہ کئی سیر پاخانہ تیرے اندر ہے اس کو تو اٹھائے پھرتا ہے۔

حق تعالیٰ کی عجیب قدرت ہے کہ آدمی کے بدن میں قسم قسم کی نجاستیں اور گندگیاں بھر رہی ہیں اور معدہ اور اندرون جسم سے ظاہر بدن تک کئی منفذ بھی ہیں مگر ان منافذ سے بو نہیں آتی۔ اگر ان منفذوں سے بو آنے لگے تو آدمی کو بڑی مشکل ہوجائے' کہیں بیٹھنے کے قابل بھی نہ رہے جہاں جائے دھکے دے دیئے جائیں۔ چنانچہ کبھی کبھی اس کا نمونہ دکھلا دیتے ہیں بخر یعنی گندہ دہنی کا بعض لوگوں کو مرض ہوجاتا ہے ایسے شخص کے پاس کھڑا ہونا موت ہوجاتا ہے۔ جب میں دیوبند میں طالب علمی کرتا تھا' نماز میں ایک شخص کبھی کبھی میرے پاس آ کر کھڑے ہوجاتے تو نماز پوری کرنا مصیبت ہوجاتی تھی۔ فقہاء سبحان اللہ! کیسے حکیم ہوئے ہیں' فرماتے ہیں کہ جس شخص کو بخر کی بیماری ہو اس کو چاہیے کہ جماعت سے نماز نہ پڑھے' علیحدہ پڑھا کرے' جماعت کا ہی ثواب ملے گا۔ پس یہ بخر معدہ ہی کی رطوبت سے ہوتا ہے۔

پس انسان کا یہ کلمہ کہ نہیں جانتے ہو میں کون ہوں' بڑے کبر اور جہل کی بات ہے پس ہماری جب یہ حالت ہے تو کسی شے کو اپنی کہنا کیسے صحیح ہوگا۔

حدیث شریف میں ہے:

یقول ابن آدم مالی مالی مالک الا ماا کلت فافنیت اولبست فابلیت او تصدقت فامضیت.[1]

یعنی آدمی کہتا ہے کہ میرا مال ہے میرا مال ہے' تیرا کیا ہے مگر جو تو نے کھالیا وہ تو فنا کردیا اور جو پہنا وہ پرانا کردیا اور جو صدقہ دیا وہ آگے بھیج دیا' وہ بے شک تیرا ہے۔

---

[1] (مسند احمد بن حنبل ۴:۲۴' ۲۶' المستدرک للحاکم ۲:۵۳۴' ۴:۳۲۲' زادالمسیر لابن الجوزی ۹:۲۱۹' المغنی عن حمل الاسفار للعراقی ۳:۱۷۰' ۱۹۹' تفسیر البغوی ۷:۲۸۲' مشکوۃ المصابیح: ۵۱۶۹' اتحاف السادۃ المتقین للزبیدی ۸:۸۳' ۱۴۶' کنز العمال: ۶۰۴۶' ۱' مشکل الآثار للطحاوی ۲:۲۶۰' کتاب الزہد لابن حنبل: ۳۱۱' حلیہ الاولیاء لابی نعیم ۲:۲۱۱' ۶:۲۸' تفسیر ابن کثیر ۱:۳۶۴' ۳:۲۹۶' ۸:۳۶' ۴۹۲' تفسیر القرطبی ۱۰:۱۴۸' ۲۰' ۱۶۹' کشف الخفاء للعجلونی ۲:۳۴۳)

صاحبو! نہ مال اپنا ہے نہ بیوی اپنی ہے نہ بچے اپنے ہیں، ہم لوگ تو مزدور ہیں، چھکڑے کھینچ رہے ہیں جس میں بیوی، بچے، مال متاع لدا ہوا ہے۔ جب منزل پر پہنچ جائے گا، الگ کر دیئے جائیں گے۔ صاحبو! مزدور اور خادم اور مال مالک نہیں ہوا کرتا۔ پس ہم اصل حقیقت میں جب خادم ہیں تو مخدوم کیسے بن جائیں گے۔ اصل میں جب رعایا ہیں تو حاکم کیسے ہو سکتے ہیں۔ عبد ہیں مولیٰ نہیں ہیں، چھوٹے ہیں، بڑائی اس کا حق ہے، مقہور و مغلوب ہیں وہ قاہر و غالب ہے۔

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ (الجاثیہ آیت نمبر ۳۷)

''اسی کے لیے ہے بڑائی آسمانوں اور زمین میں)

ہر چیز امانت ہے

جب ان چیزوں کی یہ حالت ہے کہ کوئی اپنی نہیں، سب عاریت ہیں تو دوسرا حکم نہایت واضح ہو گیا۔ یعنی "**ولھا یجمع من لا عقل له**"[1] کہ اس دنیا کو وہ جمع کرے گا کہ جس کو عقل نہ ہو۔ اس لیے کہ پرائی چیزوں کو کوئی عاقل جمع نہیں کیا کرتا۔ اگر کوئی جمع کرتا ہے تو اس کو لوگ بے عقل کہتے ہیں اور کان پکڑ کر باہر نکال دیتے ہیں جیسے کسی کھیت میں پولوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ اس شخص نے اپنے سمجھ کر جمع کرنا شروع کر دیا تو ظاہر ہے کہ مالک آ کر اس کو ملامت کرے گا اور نکال دے گا۔ اس کو چاہیے تھا کہ اول تحقیق کرتا کہ یہ کس کے ہیں۔ اگر اس کے ثابت ہوتے تو جمع کرتا۔ پس جیسے یہ شخص بوجہ پرائی شے کے جمع کرنے کے بیوقوف ہے اسی طرح جو دنیا جمع کرے وہ احمق ہے۔ یہ حالت ہوئی دنیا کی۔ اب یہ سمجھو کہ دنیا اس مال کا نام نہیں، مال بے چارہ تو مفت میں بدنام ہو گیا ہے اس لیے کہ بعض مال اچھا ہے جیسے حلال مال اور بعض مال برا ہے جیسے رشوت، چوری کا مال۔ پس اگر دنیا نفس مال کا نام ہوتا تو اس کی دو قسمیں کیسے ہوتیں۔ دنیا نام تعلق بغیر اللہ کا ہے یعنی خدا تعالیٰ کے سوا کسی سے تعلق بڑھا کر بکھیڑوں میں پڑ کر، معاملات میں گھس کر اللہ تعالیٰ سے غافل ہونا۔ پس یہ تعلق بغیر اللہ سب کے لیے برا ہے۔ بخلاف مال کے کہ کسی کے لیے اچھا، کسی کے لیے برا ایسے ہی اولاد بھی دنیا نہیں، ہاں قلب کا اس کے ساتھ اتنا تعلق جو غافل کر دے یہ دنیا ہے۔

ایک بی بی ہمارے بزرگوں میں سے میرے لیے دعا کیا کرتی تھیں، اے اللہ! میرے اشرف کا بھی دنیا میں سا جھا کیجیو ﴿یعنی کوئی اولاد ہو جائے﴾ میں نے کہا کہ اگر بچہ ہونے سے

---

[1] (انظر تخریج الحدیث الرقم:۷)

سے دنیا میں ساجھا ہوتا ہوتو میں ایسی اولاد کو نہیں چاہتا۔

اولاد کا فتنہ

صاحبو! آج کل کی اولاد تو بیشتر ایسی ہی ہے کہ وہ خدا سے غافل کرنے والے ہیں۔ پس جس کے نہ ہو وہ شکر کرے کہ اللہ تعالیٰ نے سب فکروں سے آزاد کیا ہے ان کو تو چاہیے کہ وہ تو اطمینان سے اللہ تعالیٰ کی یاد کریں۔ بعض عورتوں نے مرید ہونا چاہا تو میں نے ان سے شرط کی کہ دیکھو رسمیں چھوڑ نا پڑیں گی' کہنے لگیں کہ میرے کچھ ہے ہی نہیں' بال نہیں' بچہ نہیں' میں کیا رسمیں کروں گی۔ میں نے کہا کہ کروگی تو نہیں لیکن صلاح تو دوگی۔ یہ پرانی بوڑھیاں شیطان کی خالہ ہوتی ہیں' خود اگر نہ کریں تو دوسروں کو بتلاتی ہیں۔ چنانچہ دیکھتا ہوں کہ جن کی اولاد نہیں وہ خود تو کچھ نہیں کرتیں لیکن دوسروں کو تعلیم دیتی ہیں۔ کوئی پوچھے کہ اس کو کیا شامت سوار ہوئی ہے۔ اس کو تو یہ مناسب تھا کہ تسبیح لے کر مصلے پر بیٹھ جاتی' کچھ فکر تو ہے نہیں' اللہ تعالیٰ نے سب باتوں سے فارغ کیا تھا' وقت کی قدر جانتی مگر یہ ہرگز نہ ہو سکے گا۔ بس یہ مشغلہ ہے کہ کسی کی غیبت کر رہی ہیں' کسی کو رائے دے رہی ہیں۔ گویا یہ بڑی بنتی ہیں' بات بات میں دخل دیتی ہیں۔ یاد رکھو! زیادہ بولنے سے کچھ عزت نہیں ہوتی' عزت اسی عورت کی ہوتی ہے جو خاموش رہے اور اگر ساکت وصامت ہو کر ایک جگہ بیٹھ کر اللہ کا نام لے تو اس کی تو بڑی قدر اور وقعت ہوتی ہے۔ مگر یہ باتوں کا تمباکو کھانے کی جن کو عادت ہے یہ کیسے چھوٹ سکتی ہے خواہ ذلت ہو خواری ہو کوئی ان کی بات بھی کان لگا کر نہ سنے لیکن ان کو اپنی بڑ ہانکنے سے کام۔ بس عادت پڑ جاتی ہے جیسے نمرود کی جوتیاں کھانے کی عادت پڑ گئی تھی۔

نمرود کا حشر

قصہ یہ ہوا تھا کہ جب نمرود نے خدائی کا دعویٰ کیا اور ابراہیم علیہ السلام نے اس کو بہت سمجھایا مگر نہ مانا اور برابر سرکشی کرتا رہا اور یہ کہا کہ اگر تو سچا ہے تو اپنے خدا کا لشکر منگا لے۔ جانتا تھا کہ ان کا معاون ومددگار کون ہے اور اپنے لشکر اور خدم وحشم پر گھمنڈ تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بوحی الٰہی اس کو اطلاع دی کہ فلاں دن خدائی لشکر آئے گا تو تیار ہو جا۔ چنانچہ اس نے لشکر کو مہیا کیا اور خیال کرتا تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کا یہ خیال ہی خیال ہے۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں مچھروں کا ایک غول ایک جانب سے آیا اور ایک ایک مچھر نے ہر سپاہی کے دماغ میں گھس کر کام تمام کیا۔ نمرود یہ منظر دیکھ کر محل میں گھس گیا۔ ایک لنگڑا مچھر آ کر اس کے ناک میں بھی گھس ہی گیا اور دماغ پریشان کر دیا۔ اگر سر پر جوتا لگتا تھا

تو چین کچھ آ جاتا۔ چنانچہ جو آتا تھا بجائے سلام کے چار جوتیاں اس کے سر پر مارتا تھا۔ حق تعالیٰ نے دکھلا دیا کہ تیری شوکت وقوت بس اتنی ہی ہے کہ ایک مچھر نے اور وہ بھی لنگڑا، تجھے پریشان کر ڈالا۔

اسی طرح جو مرد یا عورت دین کے رشتہ کو چھوڑ کر اپنی خواہشات نفسانی اور خرافات میں مبتلا ہیں اور اس حالت میں وہ خوش ہیں خدا کی قسم ہے یہ جوتیاں کھانا ہے، بعض مردوں کو بھی میں دیکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو فراغت دی ہے مگر وہ اس کی قدر نہیں کرتے۔ بس رات دن یہ مشغلہ ہے کہ بیٹھک میں یا کسی کی دکان پر بیٹھ گئے، کسی کی غیبت کر لی، کسی کے حسب نسب پر طعن کر دیا، کسی کو صلاح دے دی، کسی کو بڑھا دیا، کسی کو اتار دیا۔ ان سے کوئی پوچھے کہ اگر تم یہ باتیں نہ کرو تو تمہارا کون سا کام اٹکا ہوا ہے اور اس سے کسی کا کچھ نقصان نہیں۔ اپنی ہی زبان اور قلب گندہ کرتے ہیں اور بعض عورتیں خود تو شیطنت سیکھتی ہی ہیں لیکن دوسروں کو بھی سکھلاتی ہیں۔ چنانچہ بہو بیٹیوں کو کہتی ہیں کہ بیٹی! تجھ کو گھر برتنا ہے بس کام آنکھوں میں سے نکالا کرتے ہیں ان کو تو اپنی آزادی پر بہت شکر کرنا چاہیے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے سب قصوں سے آزاد کیا۔ شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ نے ایک آزاد کی حکایت لکھی ہے کہ سفر حج میں پیادہ جا رہا تھا اور یہ شعر پڑھتا تھا۔

نہ براشتر سوارم چواشتر زیر بارم ‌ ‌ ‌ ‌ نہ خداوند رعیت نہ غلام شہر یارم

کہ میں نہ اونٹ پر سوار ہوں اور نہ اونٹ کی طرح لدا ہوا ہوں اور نہ رعیت والا ہوں اور نہ بادشاہ کا غلام ہوں۔ بڑا خوش قسمت ہے وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے اولاد سے آزاد رکھا۔ خاص کر آج کل کی اولاد کہ ان سے تو بجز اس کے کہ اپنا دین اور وقت ضائع ہو، کچھ نفع نہیں ہے۔

اولاد کا نعمت ہونا

ہاں اگر اولاد دین میں مدد دے تو سبحان اللہ! ایک بزرگ تھے۔ نکاح نہ کرتے تھے، ایک مرتبہ سو رہے تھے دفعتہً چونک پڑے اور کہنے لگے کہ جلدی کوئی لڑکی لاؤ، ایک مخلص مرید حاضر تھے، ان کے ایک لڑکی کنواری تھی، لا کر فوراً حاضر کی۔ اسی وقت نکاح ہوا، اللہ تعالیٰ نے ایک بچہ دیا اور وہ مر گیا۔ بی بی سے کہا کہ جو میرا مطلب تھا پورا ہو گیا، اب تجھ کو اختیار ہے، اگر تجھ کو دنیا کی خواہش ہے تو میں تجھ کو آزاد کر دوں، کسی سے نکاح کر لے اور اگر اللہ کی یاد میں اپنی عمر ختم کرنا ہو تو یہاں رہو۔ چونکہ وہ بی بی ان کے پاس رہ چکی تھی اور صحبت کا اثر اس کے اندر آ گیا تھا، اس نے کہا کہ میں تو اب کہیں نہیں جاتی۔ چنانچہ دونوں میاں بیوی اللہ کی یاد میں رہے۔ ان سے بعض خواص نے پوچھا کہ حضرت یہ کیا بات تھی؟ فرمایا کہ بات یہ تھی کہ میں سو رہا تھا، میں نے دیکھا کہ میدان حشر ہے اور پل صراط پر لوگ گزر

رہے ہیں۔ ایک شخص کو دیکھا کہ اس سے چلا نہیں جاتا' لڑکھڑاتا ہوا چل رہا ہے' اسی وقت ایک بچہ آیا اور ہاتھ پکڑ کر آناً فاناً میں اس کو لے گیا' میں نے دریافت کیا کہ یہ کون ہے۔ ارشاد ہوا کہ یہ اس کا بچہ ہے جو بچپن میں مرگیا تھا۔ یہاں اس کا رہبر ہوگیا' اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی اور مجھے خیال آیا کہ میں اس فضیلت سے محروم نہ رہوں۔ شاید بچہ ہی میری نجات کا باعث ہوجائے اس لیے میں نے نکاح کیا تھا اور میرا مقصود حاصل ہوگیا ہے۔

بتلایئے! اب بھی کوئی ایسا ہے کہ بچہ کے مرنے کو مقصود کا حاصل ہونا سمجھتا ہو تو اب اگر کسی کا کوئی بچہ مرجاتا ہے تو پیٹ پھاڑ پھاڑ کر مر رہتے ہیں۔ یہ اہل اللہ ہی کی ہمت ہے۔ پس اگر اولاد مر کر یا زندہ رہ کر آخرت کا ذخیرہ ہو تو ایسی اولاد تو بڑی نعمت ہے ورنہ وبال جان ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کا قصہ قرآن مجید میں مذکور ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک بچہ کو قتل کردیا تھا تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ نے یہ کیا کیا کہ ایک بے گناہ بچہ کو مار ڈالا۔ اول تو خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنے ساتھ رکھنے کی یہ شرط طے کرلی تھی کہ میرے کسی فعل پر اعتراض نہ کرنا اس لیے انہوں نے فرمایا کہ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم سے صبر نہ ہوسکے گا۔ اس کے بعد اس واقعہ کی یہ حکمت بیان فرمائی کہ اس لڑکے کے والدین مؤمن ہیں اور یہ لڑکا بڑا ہوا کر کافر ہوتا اور اس کی محبت میں اس کے ماں باپ بھی کافر ہوجاتے۔ اس لیے ارادہ الٰہی یہ ہوا کہ اس کا پہلے ہی کام تمام کردیا جائے اور اس کے بدلہ نیک اولاد ان کو ملے۔

اس قصہ سے معلوم ہوا کہ جو بچے بچپن میں مرجاتے ہیں ان کا مرجانا ہی بہتر ہوتا ہے۔ اسی واسطے جو دیندار ہیں ان کو اولاد کے مرجانے کا غم تو ہوتا ہے لیکن پریشان نہیں ہوتے جو شخص خدا تعالیٰ کو حکیم سمجھے گا وہ کسی واقعہ سے کبھی پریشان نہ ہوگا۔ ہاں جس کی اس پر نظر نہیں اس پر اگر کوئی واقعہ ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی بچہ مرجاتا ہے تو اس کو بڑا اتار چڑھاؤ ہوتا ہے کہ اگر زندہ رہتا تو ایسا ہوتا' دل کے اندر سے شعلے اٹھتے ہیں' ارمان آتے ہیں' حسرتیں ہوتی ہیں کہ ہائے! ایسی لیاقت کا تھا' ایسا تھا' ایسا ہوجاتا۔ صاحبو! تم کو کیا خبر ہے کہ وہ کیسا ہوتا۔ غنیمت سمجھو اسی میں مصلحت تھی۔ ممکن ہے کہ بڑا ہو کر کافر ہوتا اور تم کو بھی کافر بنادیتا۔ اب لوگ تمنا کرتے ہیں اولاد کی یاد رکھو! جس طرح اولاد ہونا نعمت ہے اسی طرح نہ ہونا بھی نعمت ہے بلکہ جس کے نہ ہوئی ہو یا ہو کر مرگئی ہو اس کو اور بھی زیادہ شکر کرنا چاہیے۔

اولاد کا وبال جان ہونا

بعضوں کے لیے اولاد عذاب جان ہوجاتی ہے جیسے منافقین کے بارے میں حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

لَاتُعْجِبْکَ اَمْوَالُھُمْ وَلَا اَوْلَادُھُمْ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَھُمْ بِھَا فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا۔ (التوبہ آیت نمبر ۵۵)

''یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو ان کے مال' اولاد اچھے نہ معلوم ہوں' اللہ تعالیٰ تو یہ چاہتے ہیں کہ ان مالوں اور اولادوں کی وجہ سے ان کو اس دنیا کی زندگی میں عذاب دیں۔''

واقعی بعضوں کے لیے تو اولاد وبال جان ہی ہو جاتی ہے۔ بچپن میں تو ان کی گوہ موت میں نمازیں برباد کرتے ہیں' جب بڑے ہو جاتے ہیں تو ان کے لیے طرح طرح کے افکار ہوتے ہیں کہ ان کے لیے جائیداد ہو' روپیہ ہو' گھر ہو' خواہ دین رہے یا نہ رہے لیکن جس طرح بن پڑے گا ان کے لیے دنیا سمیٹیں گے اور ہر وقت اسی ادھیڑ بن میں رہیں گے اور حلال وحرام میں کچھ تمیز نہ کریں گے۔ پس اولاد ہوتی تو واللہ اعلم ان کی کیا حالت ہوتی۔ ایسے لوگوں کو تو بس یہ مناسب ہے کہ کسی کی بات میں نہ بولیں' بیٹھے اللہ اللہ کئے جائیں۔ عورتیں اس کو سن کر کہا کرتی ہیں کہ بیٹھ تو جائیں' کوئی چین بھی لینے دے' میں کہتا ہوں کہ تم اپنے منہ کو جب گوند لگا کر بیٹھو گی تو کیا کسی کا سر پھرا ہے جو تم سے مزاحمت کرے' زیادہ فساد اور گناہ اس بولنے ہی سے ہوتے ہیں۔

کم گوئی کے فوائد

حدیث شریف میں ہے: ''من سکت سلم''[1]

جو چپ رہا اس نے نجات پائی۔ ایک شہزادہ حدیث کی کتاب پڑھا کرتا تھا۔ جب یہ حدیث پڑھی' استاد سے کہا جناب بس میں آگے نہیں پڑھتا۔ جب اس پر عمل کر لوں گا اس وقت آگے چلوں گا اور اسی وقت سے بولنا چھوڑ دیا۔ بادشاہ کو بڑی فکر ہوئی' سمجھے کہ لڑکے کو آسیب ہو گیا ہے' عامل اور تعویذ گنڈا کرنے والے جمع ہوئے' سب نے تدبیریں کیں' اطباء بھی جمع ہوئے۔ یہ رائے ہوئی کہ ان کو شکار میں لے چلنا چاہیے' وہاں تفریح ہو گی' طبیعت درست ہو جائے گی۔ چنانچہ گئے اور شکاری تیر اور بندوق لے کر چلے کہ اس سے شاید تفریح ہو۔ شکاری جانوروں پر تیر چلانے لگے' اتفاق سے

---

[1] (مَنْ صَمَتَ نَجَا: سنن الترمذی:۲۵۰۱' المسند للامام احمد بن حنبل ۲:۱۵۹' ۱۷۷' سنن الدارمی ۲:۲۹۹' الترغیب والترھیب للمنذری ۳:۵۳۶' اتحاف السادۃ المتقین للزبیدی ۷:۴۴۹' ۴۵۹' ۵۷۸' فتح الباری لابن حجر ۷:۱۵۱' ۱۰:۱۳۰' ۱۱' ۳۰۹' مشکوۃ المصابیح:۴۸۳۶' المغنی عن حمل الاسفار للعراقی ۳:۱۰۵' ۱۳۰' کتاب الاذکار النوویۃ:۱۹۷' تھذیب تاریخ دمشق لابن عساکر:۶۸۹۰' کشف الخفاء للعجلونی ۲:۱۳۲' ۳۵۲' الاسرار المرفوعۃ لعلی القاری ۶:۱۳۶' ۲۵۵' ۲۵۶' الدر المنتثرۃ فی الاحادیث المشتھرۃ للسیوطیؒ: ۱۵۱)

ایک جھاڑی کے پیچھے ایک تیتر چھپ رہا تھا' وہ بولا بولتے ہی اس کے تیر لگا' شہزادہ یہ دیکھ کر بولا کہ کم بخت نہ بولتا نہ مارا جاتا۔ شہزادہ کی اتنی بات سن کر مبارک بادی کا غل پڑ گیا' بادشاہ کو خبر ہوئی۔ بادشاہ نے پھر چاہا کہ شہزادہ کچھ بولے مگر نہ بولا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ باندھ کر اس کو مارو' معلوم ہوتا ہے کہ قصداً نہیں بولتا ہے۔ غرض مار پڑنا شروع ہوئی' شہزادہ دل میں کہتا تھا کہ ایک دفعہ بولنے سے تو مجھ پر یہ آفت آئی ہے اگر پھر بولوں گا تو جانے کیا ہوگا۔ اس کے بعد تمام عمر کسی سے نہیں بولا۔

واقعی زیادہ گناہ ہم لوگوں سے اس زبان ہی کی بدولت ہوتے ہیں۔ خصوصاً عورتوں کو تو اس قدر شوق بولنے کا ہے کہ جب بیٹھیں گی وہ چرخہ چلائیں گی کہ ختم ہی نہیں ہوگا۔ خدا جانے ان کی باتیں اتنی لمبی کیوں ہوتی ہیں اور جب یہ باتوں میں مشغول ہو جاتی ہیں تو ان کی حالت دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بس یہ باتوں ہی کو مقصود اصلی سمجھتی ہیں۔ وہ مزے لے لے کر باتیں کرتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ترس ترس کر ان کو یہ دولت ملی ہے۔ بخلاف مردوں کے کہ ان کی باتوں اور تمام اشغال سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو ختم کر کے وہ دوسرے کام میں لگنا چاہتے ہیں۔ خدا کے واسطے اپنی عقل درست کرو۔ پس "ولها يجمع من لا عقل له"[1] سے یہی مراد ہے اور نفس مال مراد نہیں ہے۔

اور میرے اس بیان سے اولاد والے اور تعلقات والے خوش نہ ہوں کہ ہم تو معذور ہیں۔ یاد رکھو! آپ نے بھی فضول تعلقات بڑھا رکھے ہیں اور وہ ایسے تعلقات ہیں کہ جب چاہو گھٹا سکتے ہو۔ ہاں جو ضروری ہیں وہ تو حقوق ہیں ان میں مشغول ہونا تو عبادت ہے پس جو تعلقات دنیا ہیں اس کے قطع کے آپ بھی مخاطب ہیں۔ میرا مطلب تقریر سابق سے یہ نہ تھا کہ آپ معذور ہیں آپ ہرگز معذور نہیں ہیں میرا مقصود یہ تھا کہ تعلق والوں کو تو ان کے نزدیک ایک عذر بھی ہو سکتا ہے۔ گو وہ نا مسموع ہو اور جن کے کچھ نہیں ان کے پاس تو یہ بھی نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ تعلقات والے اور بے تعلق سب دنیا کے تعلقات چھوڑنے کے مخاطب ہیں۔

بس یہ مضمون تھا جو اس وقت مجھ کو بیان کرنا تھا۔ مجھے امید ہے کہ اس مضمون کو مرد اور عورتیں سب یاد رکھیں گے اور اس پر عمل کرنا شروع کر دیں گے۔ آج کل مشکل یہ ہے کہ آنسو بہا لیں گے' آہیں بھر لیں گے اور سن کر کہیں گے کہ بس جی ہمارا کیا ٹھکانا ہے۔ صاحبو! ان باتوں سے کام نہیں چلتا' کام تو کرنے سے ہی ہوتا ہے پس کام کرو اور باتیں نہ بگھارو۔

اب اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

---

[1] (انظر تخريج الحديث الرقم:٧)

غریب الدنیا

دنیا میں رہ کر اس سے بے تعلق ہونا دشوار ہے اس لیے دنیا میں ہی رہو۔ آسمان پر اڑنے کی فکر نہ کرو مگر دنیا سے اتنا ہی علاقہ رکھو جتنا مسافر کو راستہ یا سرائے سے علاقہ ہوا کرتا ہے۔ یعنی نہ بالکل تارک الدنیا ہو جاؤ نہ بالکل فنا فی الدنیا ہو جاؤ بلکہ دنیوی تعلقات میں اختصار پیدا کرو۔

تعلقات غیر ضروریہ کو کم کرنے کے سلسلے میں یہ وعظ ۲۴ محرم الحرام ۱۳۴۱ھ کو بروز سہ شنبہ حضرت حکیم الامت نے اپنے دولت خانہ پر تھانہ بھون میں مستورات کی درخواست پر تعمیر مکان کے شکریہ کے طور پر بیٹھ کر فرمایا جس پر ۲ گھنٹے ۲۵ منٹ لگے۔ سامعین میں پچاس مرد تھے۔ مستورات علاوہ تھیں۔ یہ وعظ مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمن سيئات اعمالنا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاَهَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ. اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. فَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كن فى الدنيا كانك غريب او عابرى سبيل○[1]

ترجمہ: دنیا میں ایسے رہو جیسے مسافر رہا کرتے ہیں بلکہ اس مسافر کی طرح رہو جو راستہ طے کر رہا ہو۔

اس موضوع کے انتخاب کی وجہ

یہ ایک حدیث ہے یعنی ارشاد ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو لفظاً نہایت مختصر ہے مگر اس میں ایک علم عظیم اور ضروری مضمون پر متنبہ کیا گیا ہے جس کی ضرورت ہر شخص کو واقع ہوتی ہے۔ پس لفظی اختصار پر نظر نہ کی جائے بلکہ معنی کی عظمت پر نظر کرنا چاہیے۔ یہ مضمون نہایت ضروری ہے توجہ سے سننا چاہیے اور گو یہ مضمون نیا نہیں بلکہ اس کو ان لفظوں سے یا ترجمہ سے بار ہا سنا ہوگا اور اس وجہ سے عجب نہیں کہ کسی کو یہ خیال ہوا ہو کہ یہ فرسودہ مضمون بیان کے لیے اختیار کیا گیا ہے بلکہ کوئی نئی بات بیان کرنا چاہیے جو کہ ہم کو معلوم نہ ہو۔

صاحبو! اس خیال میں تو گویا اپنے اعتقاد جہل کی درخواست ہے کہ ہم کو جاہل سمجھ کر نیا مضمون کیوں نہ بیان کیا کیونکہ جدت، عدم علم پر موقوف ہے اور عدم علم جہل (یعنی نیا علم) تو جب بیان کیا جائے جب آپ کو پہلے اس کا علم نہ ہو اور آپ اس سے جاہل ہوں۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ میں آپ کو جاہل نہیں سمجھتا بلکہ عالم سمجھتا ہوں اس لیے نیا مضمون اختیار نہیں کیا کیونکہ اہل علم کے لیے کوئی

---

[1] (الصحيح للبخارى۸: ۱۱۱، سنن الترمذى: ۲۳۳۳، سنن ابن ماجه: ۴۱۱۴، شرح السنة للبغوى۱۴: ۲۳۱، مشكوٰة المصابيح: ۵۲۷۴)

مضمون نیا نہیں۔ پس نیا مضمون تو وہ اختیار کرے جو اپنے مخاطبوں کو جاہل سمجھے کہ ان کو یہ بات معلوم نہیں اس کو بیان کر دو تا کہ ان کا جہل کم ہو اور جو اپنے مخاطبوں کو عالم سمجھے گا وہ اس کا اہتمام نہ کرے گا اور یہ محض میری خوش اعتقادی نہیں بلکہ واقعہ ہے کیونکہ شریعت محدود ہے' غیر متناہی نہیں ہے۔ آدمی تھوڑے سے وقت میں بھی تمام احکام سے اجمالاً واقف ہو سکتا ہے اور اس وقت جو لوگ مخاطب ہیں وہ تو زیادہ وقت تک احکام سنتے رہے ہیں۔ پھر ان کی نسبت سے دین کا کوئی مضمون نیا کیوں کر ہو سکتا ہے۔ پس نئے مضمون کی درخواست کرنا گویا اپنی طرف نسبت جہل کی درخواست کرنا ہے اور یہ تمنا تو ہونا نہ چاہیے کیونکہ جب خدا نے آپ کو عالم بنایا۔ یہ تو آپ اپنی طرف نسبت جہل کی تمنا یا درخواست کیوں کرتے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ جب ہم کو عالم مانا گیا اور یہ مضمون ہم کو معلوم ہے تو پھر بیان سے فائدہ کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ فائدہ کچھ اسی میں منحصر نہیں کہ غیر معلوم کو معلوم کرایا جائے بلکہ ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ معلوم سے غفلت ہو تو اس سے غفلت کو دور کیا جائے بلکہ یہ زیادہ اہم ہے کیونکہ جو بات معلوم نہیں اس پر تو عمل کی توقع قریب ہے کہ شاید علم کے بعد عمل کرے اور جو معلوم ہے اور پھر بھی عمل نہیں کیا گیا تو یہ حالت سخت ہے۔ اس میں کوتاہی زیادہ ہے کیونکہ اب عمل کے لیے کس بات کا انتظار ہے؟

دوسرے کبھی یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ایک مضمون ایک عنوان سے معلوم ہے' دوسرے عنوان سے معلوم نہیں اور دوسرا عنوان زیادہ مؤثر ہے اس لیے معلوم کو دوسرے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے تا کہ اثر زیادہ ہو اور یہ بھی ایک نیا فائدہ ہے۔

نیز کبھی علم اجمالی ہوتا ہے۔ تفصیل سے معلوم نہیں ہوتا اس سے مجمل کو مفصلاً بیان کیا جاتا ہے کیونکہ تفصیل بعد الاجمال اوقع فی النفس ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک فائدہ ہے اور اگر بالکل ہی تکرار ہو جب بھی فائدہ ہے کیونکہ تکرار سے تاکید ہوتی ہے اور تاکید سے قوت حاصل ہوتی ہے۔

پس یہ مضمون فرسودہ نہیں بلکہ بعض حیثیات سے اس میں بھی جدت (نیا پن) ہے کیونکہ جس عنوان سے اس وقت بیان ہوگا یہ عنوان بہت کم کانوں میں پڑا ہوگا۔ پس یہ مضمون قدیم بھی ہے اور جدید بھی ہے۔ ذاتاً قدیم ہے اور وصفاً و عنواناً جدید (یعنی مضمون گو پرانا ہے مگر انداز نیا ہے) ہے۔ اب اس کو قدیم سمجھ کر سنئے تو میری تحقیق کے موافق ہے کہ جدید کا انتظار نہ کرنا چاہیے اور جدید سمجھ کر سنئے تو آپ کے مذاق کے مطابق ہے۔ غرض یہ مضمون ہر طرح سے مفید ہے اس کی وہی حالت ہے۔

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ می دارد برنگ اصحاب صورت را بہ بو ارباب معنی را

(اس کے حسن کی بہار کا عالم دل و جان کو تازہ رکھتا ہے۔ صورت دیکھنے والوں کو رنگ سے

اور معنی سمجھنے والوں کو اپنی خوشبو سے!)

دنیا کے مقیم مسافر ہیں

ترجمہ حدیث کا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: دنیا میں تم ایسے رہو جیسے مسافر رہا کرتے ہیں۔ آگے ترقی فرماتے ہیں کیونکہ مسافر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو سفر کر کے کہیں کچھ دنوں کے لیے ٹھہر گیا' دوسرے وہ مسافر ہے جو برابر چلا آ رہا ہے کہیں ایک دو منٹ کو یا گھنٹہ آدھ گھنٹہ کو ٹھہر گیا تو وہ معتد بہ نہیں۔ اس کو قیام نہیں کہتے۔ چنانچہ مسافر چلتا چلتا کہیں تھوڑی دیر کو آرام لے لے تو اس کو مقیم نہیں کہیں گے۔ واقف (ٹھہرنے والا) کہیں گے اور جو مسافر دس پانچ دن کو ٹھہر جائے اس کو مقیم کہہ دیتے ہیں۔ محاورات میں ان دونوں حالتوں میں فرق ضرور ہے لہٰذا مسافر کلی مشکک ہے جو مختلف افراد پر محمول ہوتا ہے۔ (یعنی مسافر ہونے کے مختلف درجات ہیں) اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ترقی کر کے فرماتے ہیں او عابری سبیل (فیہ أو بمعنی بل ۱۲) یعنی بلکہ اس مسافر کی طرح رہو جو راستہ طے کر رہا ہو کہیں مقیم نہیں ہوا۔ یہ تو ترجمہ حدیث کا ہے۔ اس مضمون کو سن کر ہر شخص یہ کہے گا کہ الحمد للہ! ہم تو اس پر عامل ہیں' دنیا میں ہم اپنے کو چند روزہ مسافر ہی سمجھتے ہیں۔ یہ کوئی نہیں سمجھتا کہ ہم ہمیشہ ہی زندہ رہیں گے۔

مرنے کا ہر ایک کو یقین ہے

اس پر مسلمانوں کا تو کیا کفار کا بھی عقیدہ ہے کہ ایک دن مرنا ضرور ہے۔ ملحد بھی اس کا قائل ہے جو نہ مبداء کا قائل ہے نہ معاد کا۔ سو یہ مضمون ایسا ہے کہ خدا تعالیٰ کی ہستی میں تو بعضوں نے شک بھی کیا ہے مگر اس میں کسی کو شک نہیں' دنیا سے چلا جانا سب کو مسلم ہے۔ ملحد بھی اس کا قائل ہے بلکہ وہ تو ایسی موت کا قائل ہے جو اہل مذاہب کے اعتقاد سے بھی زیادہ ہے کیونکہ اہل مذاہب تو موت کے بعد بھی حیات کے قائل ہیں اور ان کے نزدیک یہ موت دائمی اور ابدی نہیں بلکہ منقطع ہونے والی ہے تو وہ موت کامل کے معتقد نہیں بلکہ ناقص کے قائل ہیں اور ملحد حیات ثانیہ کا قائل نہیں ہے تو اس کے نزدیک یہ موت موبد (ہمیشہ کی موت) ہے جو کامل موت ہے تو وہ ایسی موت کا قائل ہے جو موت کی بہت بڑی فرد ہے گو وہ مقدر ہی ہے فرد محقق نہیں۔ غرض میرا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ اہل حق سے زیادہ موت کے قائل ہیں۔ عجیب تماشا ہے کہ خدا کے منکر موجود' رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے منکر موجود' فرشتوں کے منکر موجود ہیں مگر موت کا منکر کوئی نہیں ہے۔

تو اے صاحبو! جس چیز کے ملحدین تک بھی منکر نہیں اگر تمہارے اندر اس کے انکار کی کوئی

امارت وعلامت پائی جائے تو یہ افسوس کی جگہ ہے یا نہیں۔ یقیناً بڑے افسوس کی بات ہے شاید تم یہ کہو کہ ہم کہاں منکر ہیں تو سنو! کہ زبان سے تو اس کا کوئی بھی منکر نہیں، ہم ہی کیسے انکار کر سکتے ہیں۔

مگر علم کے مقتضا پر عمل نہیں

مگر اپنی حالت کو دیکھو کہ تمہاری حالت سے انکار ٹپکتا ہے یا نہیں اور تمہارے اندر عاملات انکار ہیں یا نہیں۔ اس کو اس مثال سے سمجھو۔

دیکھو! اگر کوئی شخص آگ کا انگارہ ہاتھ میں لے لے تو یہی کہا جائے گا یہ شخص احراق (یعنی آگ کے جلا دینے کا) نار کا منکر ہے۔ اگر کوئی شخص سانپ کو پکڑنا چاہے تو یوں کہتے ہیں کہ شاید یہ سانپ کو جانتا نہیں ہے۔ چنانچہ اس پر وجوہ بلاغت اور نکات معنی متفرع ہوتے ہیں کہ سانپ پکڑنے والے سے کہتے ہیں، دیکھ کیا کرتا ہے، سانپ ہے سانپ۔ یعنی اس کے ساتھ اسی طرح گفتگو کرتے ہیں جیسے منکر کے ساتھ کی جاتی ہے۔ چنانچہ اگر کوئی اپنے باپ کے ساتھ گستاخی اور بے ادبی کرے تو کہتے ہیں دیکھ تو تیرا باپ ہے باپ، حالانکہ باپ کا باپ ہونا اسے بھی معلوم ہے۔ مگر پھر اس سے یوں ہی کہتے ہیں کہ دیکھ یہ تیرا باپ ہے، اہل بلاغت نے اس کی تصریح کی ہے کہ یہاں تنزیل العالم بمنزلہ الجاہل اور تنزیل المقر بمنزلہ المنکر ہے اور یہ قواعد ہر زبان میں جاری ہیں کیونکہ بلاغت کے جو اصول ہیں وہ سب عقلی ہیں جو کسی خاص زبان کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر زبان میں موجود ہیں۔

میرے استاد مولانا فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک طالب علم کی حکایت بیان فرماتے تھے کہ اس نے استاد سے ''مختصر معانی'' پڑھی تھی۔ جب ختم کر چکا تو اس نے دوسری کتاب پڑھنا چاہی۔ استاد نے کہا امتحان لے کر شروع کراؤں گا وہ آمادہ ہو گیا مگر استاد نے متعارف طریق سے امتحان نہیں لیا بلکہ اس نے کہا بازار میں جا کر دیکھو کہ لوگ مختصر معانی کے قواعد کا استعمال کرتے ہیں یا نہیں۔ وہ گیا اور واپس آ کر کہنے لگا کہ لوگوں کو تو ان قواعد کی ہوا بھی نہیں لگی۔ یہ طالب علم ابھی اصطلاحی الفاظ کے چکر میں تھا۔ اس پر حقیقت منکشف نہ ہوئی تھی اس لیے استاد نے کہا کہ تم نے مختصر معانی کو سمجھا ہی نہیں، دوبارہ پڑھو۔ چنانچہ اس نے دوبارہ پڑھی۔ اس کے بعد استاد نے کہا کہ اب تو بازار میں جا کر دیکھو وہ گیا اور واپس آ کر کہنے لگا کہ حضرت واقعی کوئی شخص بھی ان قواعد سے خالی نہیں، فرمایا اب تم مختصر معانی سمجھ گئے۔

غرض یہ قواعد عقلی ہیں۔ سب اہل زبان ان پر عامل ہیں۔ چنانچہ یہ قاعدہ بھی ہر زبان میں مستعمل ہے کہ کسی شے کے مقتضاء کے خلاف عمل کرنے سے اس شے کو کالعدم سمجھتے ہیں۔ اس لیے جو شخص باپ کو جانتا ہو کہ یہ میرا باپ ہے مگر اس کے ساتھ خلاف مقتضائے ابوت برتاؤ کرتا ہے۔

اس کو منکر ابوت قرار دے کر اس سے اس طرح کلام کرتے ہیں جیسے منکر سے کیا جاتا ہے اور یہ قاعدہ عقلی بھی ہے کیونکہ انتفاء لازم عقلاً انتفاء ملزوم کو مستلزم ہے۔

اب میرا عار دلانا صحیح ہے کہ اے مسلمانو! جس چیز کے ملحد بھی منکر نہیں افسوس ہے کہ تم اس کے منکر ہو اور انکار عام ہے۔ خواہ انکار حالی ہو یا قالی ہو یا عملی ہو۔ ملحد اگر اس کا بالکل بھی انکار کر دے تو جائے تعجب نہیں کیونکہ اس کے زعم میں انکار موت و مابعد الموت پر کوئی مواخذہ نہیں' وہ اپنے اعتقاد میں اس کے انکار کو مضر نہیں سمجھتا مگر تم تو مضر سمجھتے ہو۔ تمہارا کسی درجہ میں بھی اس کا منکر ہونا حیرت کی بات ہے اور یہ ابھی بیان ہو چکا کہ مقتضائے علم پر عمل نہ کرنا بھی انکار کے مثل ہے اور یقیناً ہم لوگ علم موت کے مقتضاء پر عمل نہیں کرتے اس لیے حاجت ہوئی اس مضمون کے بیان کرنے کی کیونکہ گو ہم کو اس کا اعتقاد ضرور ہے مگر مقتضاء پر عمل نہیں ہے۔ اجمالاً تو کوتاہی بیان ہو چکی' اب تفصیلاً سنئے۔

ہماری حالت یہ ہے کہ اگر کسی سے یہ کہو کہ کیا تم دنیا میں ہمیشہ رہو گے تو وہ فوراً کہتا ہے کہ صاحب دنیا میں رہنا تھوڑا ہی ہے۔ ایک دن مرنا ضرور ہے۔ مگر حالت یہ ہے:

وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ o (الشعراء آیت نمبر ۱۲۹)

''کہ سامان ایسے کرتے ہیں کہ گویا ہمیشہ یہاں ہی رہیں گے''

اپنے لیے بھی اور اپنے بعد کے لیے بھی سامان ایسے کرتے ہیں کہ گویا خدا تعالیٰ کو مجبور سمجھتے ہیں کہ وہ اس کے خلاف نہیں کر سکتے۔ (نعوذ باللہ منہ)

قوی القلب بزرگوں کی مثال

اس کی توضیح ایک مثال سے اچھی طرح ہوگی وہ یہ کہ ابھی کچھ دنوں پہلے طاعون آیا تھا' غور کیجئے اس وقت دل کی کیا حالت تھی' بعض کے دل تو اس وقت بھی قوی تھے جس کے دو سبب ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ خدا تعالیٰ پر نظر ہو کہ جو کچھ ہوتا ہے ان کے حکم سے ہوتا ہے۔ بدوں خدا کے حکم کے کسی کی موت نہیں آ سکتی اس لیے وہ طاعون کے زمانہ میں بھی ویسا ہی بے فکر رہتا جیسا اور دنوں میں کیونکہ اس کے نزدیک جب موت خدا کے حکم پر ہے تو ہر زمانہ اس کے لیے مساوی ہے۔ یہ تو قوت قلب ہے۔

جیسے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قصہ ہے کہ جنگ صفین میں گردنیں گیند کی طرح اڑ رہی تھیں مگر آپ گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے سو رہے تھے کہ بعض دفعہ تلوار بھی ہاتھ سے چھوٹ جاتی تھی۔ کسی نے کہا: اے امیر المومنین! اس حالت میں یہ بے فکری' ذرا ہوشیار ہو کر رہئے' دشمن کا

حملہ بہت سخت ہے۔فرمایا:

ای یومین من الموت افر　　یوم لایقدر او یوم قدر

یوم لایقدر لایاتی القضاء　　یوم قدر قدر لا یغنی الحمدر

(کہ میاں موت سے کوئی کب بھاگ سکتا ہے یہاں نہ آئی اور کسی دن آئے گی پھر گھبراہٹ کس بات کی)

اور سنئے ! امام مالک رحمتہ اللہ علیہ ایک دفعہ حدیث پڑھا رہے تھے کہ بچھو نے ان کے کاٹا اور گیارہ بار کاٹا۔مگر آپ نے ذرا بھی اُف نہ کی اور برابر حدیث بیان کرتے رہے۔یہ انہی کا دل تھا کہ گیارہ بار بچھونے کاٹا مگر حدیث کو ترک نہ کیا۔یہ بات کہہ دینی تو آسان ہے چنانچہ میں نے بھی کہہ دی ہے مگر ابھی بچھو سامنے سے نکل آئے تو شاید سب سے پہلے میں ہی بھاگوں۔جب امام مالک رحمتہ اللہ علیہ حدیث پڑھا چکے تو خادم نے دریافت کیا کہ اثناء درس میں آپ کے چہرے کا رنگ کیوں بدل رہا تھا۔فرمایا بچھونے میرے گیارہ بار ڈنک مارا مگر میں حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کی وجہ سے نہ اٹھا۔اب اس کو تلاش کر کے مار ڈالو چنانچہ تلاش کر کے مار دیا گیا۔یہ تو اسی اللہ کے پاک بندہ کا دل تھا اس کا نام قوت قلب ہے۔

تو طاعون کے زمانہ میں بعضے تو اس لیے بےفکر تھے کہ وہ یوں سمجھتے تھے کہ زمانہ میں اسی طرح ہوا کرتا ہے کوئی مرتا ہے کوئی جیتا ہے جس میں طاعونی جراثیم پیدا ہو گئے وہ مر گیا اور جس نے اپنے جسم کی حفاظت کی وہ بچ گیا تو ہم تدابیر حفظ صحت پر عامل ہیں ہم کو طاعون نہیں ہوگا۔

قاسی القلب لوگوں کی حالت

یہ قلب قاسی ہے جس کی نسبت حدیث میں آیا ہے۔

البعد شیٔ عنداللہ القلب القاسی۔[1]

"کہ حق تعالیٰ سے سب سے دور قلب قاسی ہے"

جس میں نہ خدا سے خشیت ہے نہ محبت ہے یہ تو قوی القلب اور قاسی القلب لوگوں کا حال تھا مگر جو لوگ کمزور دل کے ہیں اور زیادہ ایسے ہی ہیں ان کے چہرہ پر طاعون کے زمانہ میں ہوائیاں اڑ رہی تھیں، دکان کا کام بھی کرتے تھے، عورتیں کھانا بھی پکاتی تھیں، زمیندار لگان کا تقاضا اور نالش

---

[1] (لم اجده فی "موسوعة اطراف الحديث النبوی الشريف" الذی رتبه ابوهاجر محمد السعيد بن بسيونی زغلول)

بھی کرتے تھے مگر دل کسی کام میں نہ تھا بس موت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے تھا کہ دیکھئے کب بلاوا آ جائے۔ ہر شخص دنیا سے دل برداشتہ تھا' کسی چیز سے دلچسپی اور دلبستگی نہ تھی۔ اس لیے بہت سے بے نمازی اس وقت نمازی اور دیندار ہو گئے تھے۔ اگر ہر وقت ہماری یہی حالت رہے تو یہ کچھ نمونہ ہے۔ (کن فی الدنیا کانک غریب کا) اور اگر یہ حالت نہیں تو غفلت ہے مگر انسان کی حالت یہ ہے جس کو حق تعالیٰ بطور شکایت کے بیان فرماتے ہیں:

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهٖۤ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَاۤ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ.

یعنی انسان کو جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم کو پکارنے لگتا ہے' لیٹے بیٹھے بھی کھڑے بھی (چنانچہ طاعون میں اکثر بے نمازی نماز پڑھنے لگتے ہیں) پھر جب ہم اس کی وہ تکلف اس سے ہٹا دیتے ہیں تو پھر اپنی پہلی حالت پر آ جاتا ہے۔ (پھر وہی دھما چوکڑی کرنے لگا ہے اب نہ نماز ہے نہ روزہ ہے) کہ گویا جو تکلیف اس کو پہنچتی تھی اس کے ہٹانے کے لیے ہم کو پکارا ہی نہ تھا' ان حد سے نکلنے والوں کے اعمال ان کو اسی طرح مستحسن معلوم ہوتے ہیں۔

صاحبو! اگر ہم کو وہ حالت نصیب ہو جائے جو طاعون کے زمانہ میں تھی تو پھر اس کا لطف ہم کو خود معلوم ہو جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہیں چاہتے کہ تم دنیا کے کاروبار چھوڑ کر بیٹھ جاؤ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے ہیں کہ سب کام کرو مگر دل کی حالت وہ ہو جو طاعون کے زمانہ میں ہوتی ہے کہ آدمی سب کام کرتا ہے مگر دل کسی کام میں نہیں ہوتا' دنیا سے تعلق اور لگاؤ نہیں ہوتا۔ بتلایئے! اس زمانہ میں ضروری کام کون سا چھوٹ گیا تھا' ایک بھی نہیں۔ ہاں لغویات اور گناہ کے کام البتہ کم ہو گئے تھے' بس آپ کا مقصود یہ ہے کہ عمر بھر اسی طرح رہو۔ حدیث میں ہے:

یاعبداللّٰہ اذا اصبحت فلا تحدث نفسک بالمسا و اذا مسیت فلا تحدث نفسک بالصباح وعد نفسک من اھل القبور[1]

اے عبداللہ بن عمرو جب تم صبح کرو تو اپنے دل میں شام کا خیال نہ لاؤ اور جب شام کرو تو صبح کا خیال نہ لاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ بلاضرورت امانی محضہ نہ پکاؤ کہ شام کو یوں کریں گے تو صبح کو یوں کریں گے کیونکہ الحدیث یفسر بعضہ بعضا اور دوسری حدیث میں اس قید کی تصریح ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه" اس

[1] (اتحاف السادۃ المتقین للزبیدی ۱۰: ۲۵۱)

میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لایعنی امور کے ترک کرنے کا حکم دیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ضروری اور مفید امور کا ترک ضروری نہیں تو اس میں ضروری خیالات کی بھی اجازت ہے۔ مثلاً کسی کے ذمہ کسی کا قرض ہو تو اس کی بابت تحدیث النفس جائز ہے بلکہ واجب ہے کہ اس کے ادا کی تدبیریں سوچے، یہ ممنوع نہیں بلکہ ممانعت اس کی ہے کہ شیخ چلی کی طرح خیالی منصوبے پکائے۔

شیخ چلی کا واقعہ

جیسے شیخ چلی ایک گھڑا تیل کا دو پیسہ کی مزدوری پر لے کر چلا تو راستہ میں سوچنے لگا کہ ان دو پیسوں کے انڈے خریدوں گا، ان کو مرغی کے نیچے رکھوں گا، اس میں دو بچے نکلیں گے، ایک مرغا ہوگا، ایک مرغی۔ ابھی تک پیسے تو ملے بھی نہیں اور بچے نکلنے لگے، پھر وہ بھی ان کے حساب کے موافق ایک مرغا اور ایک مرغی، پھر ان کے اور انڈے بچے ہوں گے۔ پھر بہت سی مرغیاں ہو جائیں گی تو سب کو بیچ کر بکری خریدوں گا۔ اس کی نسل بڑھے گی تو سب کو بیچ کر گائے لوں گا، اس کی بھی نسل بڑھے گی تو پھر بھینسیں لوں گا، پھر اس کی نسل بڑھے گی تو سب کو بیچ کر ایک بہت بڑی دکان کھولوں گا جس سے مجھے بہت نفع ہوگا تو مالدار ہو جاؤں گا۔ پھر ایک عالیشان مکان بناؤں گا اور وزیر زادی کو نکاح کا پیغام دوں گا، اس سے میرے ایک لڑکا ہوگا جو بڑا ہوگا جو بڑا ہو کر میرے ساتھ ساتھ رہا کرے گا، وہ مجھ سے پیسے مانگے گا تو میں کہوں گا، ہشت، پس ہشت کہنا تھا کہ سر کو حرکت ہوئی اور گھڑا گر پڑا۔ مالک نے دھمکایا کہ ابے یہ کیا کیا؟ تو آپ کہتے ہیں، جاؤ میاں! تمہارا تو چار پانچ سیر تیل ہی ضائع ہوا اور میرا تو سارا کنبہ تباہ ہو گیا (کیونکہ اس کی تو ساری بنا وہ دو پیسے تھے جو مزدوری میں ملتے۔ گھڑا پھوٹنے سے مزدوری گئی تو سارا کنبہ بھی جاتا رہا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حالت کو منع فرماتے ہیں۔

شیخ سعدیؒ کا واقعہ

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ایک رات مجھے ایک تاجر کے پاس رہنے کا اتفاق ہو گیا جس کے پاس سامان تجارت تھا اور بہت سے غلام اور خدمت گار تھے۔ اس نے تمام رات میرا سر کھایا کہ اس وقت میرے پاس اتنا مال ہے اور میرا فلاں شریک ترکستان میں ہے اور کچھ سامان تجارت ہندوستان میں ہے اور یہ فلاں زمین کی دستاویز ہے اور فلاں سامان کا ایک شخص ضامن ہے۔ کبھی کہتا کہ اسکندریہ جانے کا خیال کر رہا ہوں کہ وہاں کی آب و ہوا اچھی ہے۔ کبھی کہتا نہیں! وہاں کا دریا خطرناک ہے پھر کہنے لگا: سعدیؒ مجھے ایک سفر اور درپیش ہے اگر وہ پورا ہو جائے تو بقیہ زندگی قناعت کے ساتھ گوشہ نشین ہو کر گزار دوں گا۔ میں نے پوچھا وہ کون سا سفر ہے؟ کہا فارس کی

گندھک چین میں لے جانا چاہتا ہوں کیونکہ سنا ہے وہاں اس کی بہت قیمت ہے اور چینی گلاس روم میں لے جا کر فروخت کروں گا اور دیبائے رومی ہندوستان اور فولادہندی حلب میں اور حلبی شیشہ یمن اور یمنی چادر فارس میں۔ اسکے بعد سفر ترک کر کے ایک دکان میں بیٹھ جاؤں گا۔ اب بھی ترک دنیا کا ارادہ نہیں، دکان ہی میں بیٹھنے کی نیت ہے۔ غرض اس قسم کا خیالی پلاؤ پکارہا۔ اخیر میں سعدی رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ آپ بھی کچھ اپنی دیکھی اور سنی ہوئی باتیں سنائیں۔ سعدیؒ نے یہ جواب دیا:

آں شنیدستی کہ در صحرا غور　　　　بارسا لارے بیفتا داز ستور

گفت چشم تنگ دنیا دار را　　　　یاقناعت پرکند یا خاک گور

(تو نے غور کے جنگل کا قصہ سنا ہوگا کہ ایک تاجر کا سامان سواری سے گر گیا تو وہ بولا کہ دنیادار حریص کی آنکھ کو یا تو قناعت بھرتی ہے یا قبر کی مٹی)

موت کو قریب سمجھو

واقعی دنیا کی حرص کبھی ختم نہیں ہوتی۔ بس مرکر ہی ختم ہوتی ہے۔ حدیث میں بھی آیا ہے کہ انسان کی حرص شکم کو مٹی ہی بھرتی ہے۔ "ولا یملا جوف ابن آدم الترب ویتوب الله علی من تاب" اس طول امل اور فضول لایعنی خیالات سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ صبح آئے تو شام کی فکر نہ کرو اور شام ہو تو صبح کی فکر نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو اہل قبور میں سے شمار کرو۔ یعنی یہ سمجھ لو کہ گویا آج ہی تھوڑا سا وقت زندگی کا باقی ہے۔ پس وہ کام جو زندگی سے مایوس ہو جانے والا آدمی اخیر میں کیا کرتا ہے ظاہر ہے کہ جو شخص اپنے کو ایک دن یا ایک گھڑی کا مہمان سمجھتا ہو وہ غیر ضروری کاموں میں وقت کو ضائع نہیں کیا کرتا، اس کو اتنے دور دراز کے منصوبوں کی کہاں فرصت۔ بس یہی حال انسان کا عمر بھی ہونا چاہیے مگر اب طاعون کے بعد ہماری یہ حالت ہے کہ اگر کوئی ہمارے سامنے آج کل مر بھی جائے تب بھی ہم کو یہ خطرہ اور وسوسہ نہیں ہوتا کہ ہم بھی اسی جگہ آئیں گے جہاں پر مردہ آیا ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ قبر کے اوپر قصے دنیا بھر کے ہوتے رہتے ہیں، قبر سامنے ہے اور لوگ ادھر ادھر کی حکایتوں اور مقدمہ بازی کی باتوں میں مشغول ہیں۔ گویا یوں سمجھتے ہیں کہ یہ مردہ سب کی طرف سے کفارہ ہو گیا۔ بس سب کی طرف سے اسی کو موت آ گئی اور کسی کو نہ آئے گی۔ جیسے نصاریٰ کا خیال ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنی اُمت کی طرف سے کفارہ ہو گئے۔ اب یہ جو چاہیں بدمعاشی کریں، کسی سے کچھ باز پرس نہ ہوگی۔ غرض موت کا بھول کر بھی خیال نہیں آتا اور وہ سامان کرتے ہیں جیسے ہمیشہ یہیں رہیں گے، اگر ہمارا اپنے گھر کے متعلق وہ اعتقاد ہوتا جو اسٹیشن یا سرائے کے متعلق ہے تو گھر کے

استحکام اور زیب و زینت کا اس درجہ اہتمام نہ کرتے کیونکہ سرائے میں اگر کوئی دیوار یا کمرہ شکستہ ہو تو اس کی کوئی مرمت نہیں کرتا کیونکہ اس کو اپنا گھر نہیں سمجھتے، رات بھر کی یا ایک دو دن کی قیام گاہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے اس کی شکستگی سے کچھ بھی فکر نہیں ہوتا۔ اگر ہم غفلت میں مبتلا نہ ہوتے تو یہاں کے گھر کو اپنا گھر نہ سمجھتے۔ چنانچہ حدیث میں ہے "الدنیا دار من لا دار لہ" کہ دنیا اس شخص کا گھر ہے جس کے گھر نہ ہو۔ گو اس میں دنیا کو دار کہا گیا ہے مگر جب اس صفت پر نظر کی جائے کہ وہ بے گھرے کا گھر ہے تو مطلب یہ نکلتا ہے کہ دنیا حقیقت میں گھر ہی نہیں اور اگر ہے بھی تو کیسا گھر ہے؟

دنیا کے گھر کی حقیقت

ایسا ہے جیسا حق تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ٥ (الروم ۶۴)

یعنی یہ حیات دنیویہ کچھ نہیں صرف ایک لہو ولعب ہے اس میں ایک مثال کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا کا گھر ایسا گھر ہے جیسا بچے کھیل میں گھر بنایا کرتے ہیں اور اپنی بے وقوفی سے اس کو گھر ہی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اس کو ڈھا دو تو روتے چلاتے ہیں کہ ہمارا گھر ڈھا دیا۔

پہلے رسم تھی کہ لڑکیاں پیر پکوڑا بنایا کرتی تھیں۔ اس میں مکوڑوں کے لیے مٹھائی رکھتی تھیں۔ بیچ میں ایک قبر بھی ہوتی تھی، دروازہ اور کمرہ وغیرہ۔ غرض سارا شہر اس میں ہوتا تھا، رات کو چراغ بھی جلائے جاتے تھے۔ یہ رسم پیرزادوں نے ایجاد کی تھی تاکہ بچیوں میں بچپن ہی سے پیر پرستی اور قبر پرستی پیدا ہو جائے جیسا کہ عقلاء نے گڑیوں کا کھیل اس لیے ایجاد کیا تھا تاکہ لڑکیوں کو گڑیوں کے کپڑے سینا پرونا آ جائے تو جیسا کہ ہم لوگ ان بچوں پر ہنستے ہیں کہ یہ کس کو گھر سمجھتے ہیں ایسے ہی اہل اللہ ہم پر ہنستے ہیں کہ یہ دنیا کے ساتھ کیسا دل لگائے ہوئے ہیں۔ اسی کو فرماتے ہیں: "وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ" (الروم ۶۴) (اور یہ دنیوی زندگی سوائے لھو ولعب کے کچھ نہیں) اور جیسے بچے اپنے باپ کو بیوقوف سمجھتے ہیں کہ اس نے ہمارا گھر گرا دیا، ایسے ہی ہم لوگ عقلاء الٰہی کو بیوقوف سمجھتے ہیں کہ یہ ہم سے دنیا چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کو ضرورت زمانہ کی کچھ خبر نہیں، ارے ان کو سب خبر ہے کیونکہ ان پر بھی سب طرح کی حالت گزری ہے۔ اگر وہ پہلے دنیا دار تھے، بعد میں تائب ہوئے، تب تو ظاہر ہے ورنہ ان کو دنیا کی حالت کا تجربہ ہے اس لیے جن ضرورتوں کو تم جانتے ہو، ان سے وہ بھی بے خبر نہیں مگر اس کے ساتھ ان کو ایک اور چیز کی بھی خبر ہے جس کی تم کو خبر نہیں، اس لیے وہ تم پر ہنستے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

خلق اطفا لند جز مست خدا نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

(ساری مخلوق نابالغ بچے ہیں جو ہوائے نفسانی سے چھوٹ گیا وہ البتہ بالغ ہے)

غرض اہل اللہ ہم کو طفل ناداں سمجھتے ہیں کیونکہ ہماری حالت یہ بتلا رہی ہے کہ ہم دنیا کو سفر کی جگہ نہیں سمجھتے' گو زبان سے ہر شخص اس کا مدعی ہے۔

زہد فی الدنیا کے درجے

تفصیل اس کی یہ ہے کہ زہد فی الدنیا کے چار درجے ہیں۔ گو مشہور تو تین ہی درجے ہیں مگر میرے قلب پر اس وقت ایک درجہ اور آیا ہے جو فی نفسہ بزرگوں کے کلام میں مذکور ہے مگر اس سلسلہ میں مذکور نہیں تھا۔ ایک درجہ علم کا' ایک عمل کا' ایک حال کا۔ یہ تو مشہور ہیں اور ایک میں نے بڑھایا ہے کیونکہ حال کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حال راسخ ایک حال غیر راسخ۔ تو میں نے حال میں تفصیل کی ہے کہ ایک درجہ حال غیر راسخ کا اور ایک درجہ حال راسخ کا جس کو سہولت ضبط کے لیے مقام سے تعبیر کرنا چاہیے اور حال غیر راسخ کو صرف حال کہنا چاہیے تو اب چار درجے یوں ہوئے۔ ایک درجہ علم کا' ایک عمل کا' ایک حال کا' ایک مقام کا اور اس کی ضرورت اس لیے ہوئی کہ لوگوں کو اس میں دھوکا ہو جاتا ہے' بہت لوگ حال راسخ کافی سمجھتے ہیں اور حال غیر راسخ بمعنی کیفیت غیر دائمہ کچھ کمال نہیں۔ یہ تو اکثر کو پیش آ جاتا ہے۔ اب اگر اسی پر درجات کا خاتمہ کر دیا جائے جیسا کہ تقسیم مشہور میں ہے تو لوگوں کے نزدیک یہی منتہی ہو گا حالانکہ یہ کچھ معتد بہ نہیں جب تک کہ راسخ نہ ہو۔

ابلیس کی غلطی کا راز

صاحبو! حالات غیر راسخہ اور کیفیات کو منتہی سمجھنے ہی سے بہت لوگ تباہ ہو گئے ہیں۔ بلعم باعورا اور ابلیس وغیرہ اسی غلطی میں تباہ ہوئے۔ ان لوگوں کو کچھ سرسراہٹ اور کیفیت محسوس ہو گئی تھی۔ بس انہوں نے اسی کو منتہی سمجھ لیا اور اس کے بعد مجاہدہ نفس سے اپنے کو مستغنی سمجھ لیا۔ نفس کی اصلاح کے درپے نہ رہے اس سے غافل ہو گئے' آخر کار تباہ ہوئے کیونکہ ان کا نفس ہنوز زندہ تھا۔ یہ کیفیات جو مجاہدہ سے اس میں پیدا ہوئی تھیں درجہ مقام پر نہ پہنچی تھیں اور اس غلطی میں اب بھی لوگ تباہ ہو رہے ہیں۔ مثلاً کسی میں خوف خشیت کا کچھ اثر پیدا ہو گیا دو چار دفعہ رونا آ گیا یا محبت و معرفت کے آثار پیدا ہو گئے یا ذکر اور صحبت شیخ سے ایک قسم کا مشاہدہ حاصل ہو گیا۔ یہ اس کو منتہی

سمجھ گئے اور آئندہ کے لیے مجاہدہ وسعی کو چھوڑ بیٹھے۔ اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ کچھ دنوں میں کورے کے کورے رہ جاتے ہیں کیونکہ وہ حال غیر راسخ تھا اس کی بقا کے لیے سعی کی ضرورت تھی۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی نے درخت لگایا' اس کو پرورش کیا تو عرفاً درخت کا منتہی یہ ہے کہ اس پر پھل آ جائے۔ اس نے کیا کیا کہ ایک دفعہ جو اس پر پھل آ گیا تو اس نے اسی دن سے پانی دینا اور اس کی خدمت کرنا چھوڑ دیا۔ حالانکہ ایک بار پھل آ جانا کافی نہیں کیونکہ بعضے درختوں پر بہت جلدی پھل آ جاتا ہے۔ جیسے بعض قلمی آم ایک سال ہی میں پھل دیتا ہے حالانکہ اس کی بساط کچھ بھی نہیں ہوتی جیسے آج کل بعض بچے باوا ہو جاتے ہیں۔ گو دیکھنے میں پاوا ہی سے ہوں۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ اخیر زمانہ میں بالشتی لوگ ہوں گے۔ شاید یہ وہی لوگ ہیں کیونکہ پہلے زمانہ کے آدمیوں کے سامنے یہ آج کل کے بچے جو تھوڑی ہی عمر میں بالغ ہو جاتے ہیں بالشتی سے زیادہ نہیں۔ پہلے زمانے میں آدمی جلدی بالغ نہ ہوتا تھا' ساٹھ ستر برس کی عمر میں شادی کی فکر ہوتی تھی۔ چنانچہ ساٹھے پاٹھے کا محاورہ اب تک زبان زد ہے۔ مگر آج کل لوگ ساٹھ برس میں گور کا حریرہ ہو جاتے ہیں تو جیسے آدمیوں میں بالشتی ہیں ایسے ہی درختوں میں بھی بالشتی ہیں کہ ذرا زمین سے ابھرے اور پھل دینے لگے' درخت لگانے والا خوش ہو گیا کہ بس اب یہ منتہی کو پہنچ گیا ہے اس نے پانی دینا موقوف کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی بیل اس کے پاس سے گزر گیا اور ایک لات ماردی تو درخت گر پڑا یا گرمی کے زمانہ میں خشکی نے آ دبایا اور چندروز میں خشک ہو کر ایندھن رہ گیا۔ عقل کی بات یہ تھی کہ ایک دفعہ پھل آ جانے سے بے فکر نہ ہوتا بلکہ اس درخت کو برابر پانی دیتا رہتا۔ یہاں تک کہ تنا خوب موٹا ہو جائے اور اتنا اونچا ہو جائے کہ جانوروں کا منہ اس تک نہ پہنچ سکے۔ اب بے شک یہ پانی دینے سے مستغنی ہو جائے گا۔ اس وقت قدرتی بارش ہی اسے کے لیے کافی ہے۔ اسی طرح حال و کیفیت پیدا ہونے سے سالک کو بے فکر نہ ہونا چاہیے بلکہ برابر مجاہدہ میں مشغول رہنا چاہیے۔ یہاں تک کہ حال مقام ہو جائے۔ اس کے بعد اس صاحب مقام کو چلہ و مجاہدات شاقہ کی ضرورت نہ رہے گی۔ مولانا فرماتے ہیں:

خلوت و چلہ برو لازم نماند

﴿تنہائی اور محنت اس پر ضروری نہیں رہتی﴾

انسان مختار و صاحب ارادہ ہے

مگر عمل کی پھر بھی ضرورت رہے گی اور نفس کی نگہداشت اور باطن سے ذکر میں مشغول رہنا اس پر ہمیشہ لازم ہے کیونکہ درخت تو غیر مختار ہے' وہ تو تکمیل کے بعد بلا قصد بھی فیضان الٰہی لے

سکتا ہے اور انسان مختار و صاحب ارادہ ہے اس کو بدوں طلب وقصد کے فیض نہیں مل سکتا۔ اس لیے طلب کا باقی رکھنا اس پر تمام عمر کے لیے ضروری ہے۔

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی   شاید کہ نگاہ ہے کند آگاہ نباشی

(محبوب حقیقی سے تھوڑی دیر بھی غفلت میں نہ گذار۔ شاید وہ نگاہ کرم کریں اور تو بے خبری میں ہو)

اور حدیث میں ہے "الا ان لربکم نفحات فی الدھر الافتصر الھا" بہت لوگ اس ورطہ میں آ کر تباہ ہو گئے کہ انہوں نے حالات و کیفیات کے طاری ہونے پر عمل چھوڑ دیا پھر ویسے ہی کورے ہو گئے جیسے کہ پہلے تھے بلکہ پہلے سے بھی بدتر ہو گئے۔ طلب کے بعد ترک طلب اشد ہے کیونکہ یہ اعراض ہے بلعم باعورا اور ابلیس نے اپنے کو حالات ہی سے کامل سمجھ لیا تھا۔ پھر کم بختوں نے مجاہدہ اور کوشش چھوڑ دی۔ بعض اولیاء بھی اس دھوکے میں مبتلا ہیں۔ ان کو اولیاء مستھلکین کہتے ہیں۔ پس خوب یاد رکھو کہ تکمیل کے بعد بھی کوشش لازم ہے۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں:

درراہ عشق وسوسہ اہرمن بسے ست   ہشیار وگوش رابہ پیام سروش دار

(طریق محبت میں شیطانی الجھاوے بہت سے ہیں' ہوشیاری سے چل اور کانوں کو آواز وحی پر لگائے رکھ)

پیام سروش سے مراد وحی ہے اور وحی کا حکم یہ ہے: "وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاتِیَکَ الْیَقِیْنُ"[1] (اور آپ اپنے رب کی عبادت کرتے رہیے یہاں تک کہ آپ کو موت آ جائے) کہ موت تک عمل سے استغنا نہیں۔ مرتے دم تک اس پر جما رہے۔ فرق اتنا ہوگا کہ پہلے مجاہدہ کے طور پر عمل کرتا تھا اب عبادت کے طور پر عمل کرتا رہے۔ محبوب نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا تھا اس وقت تم نے بھی ہاتھ بڑھایا' اس کے بعد پھر بھی تم کو ہاتھ بڑھا ہوا ہی رکھنا چاہیے تا کہ طلب باقی رہے کیونکہ حق تعالیٰ کی عادت یہ ہے کہ جب تک تم ہاتھ نہ کھینچو اس وقت وہ بھی ہاتھ نہیں کھینچتے اور یہی عادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی کیونکہ آپ مظہر اتم صفات الٰہیہ ہیں۔ جب کوئی آپ سے مصافحہ کرتا تو جب تک خود ہی ہاتھ نہ کھینچتا آپ کبھی ہاتھ نہ کھینچتے تھے۔ جب آپ کی یہاں یہ عادت تھی تو وہاں بھی یہی عادت ہوگی۔ پھر کیا ہے۔

نماند بعصیاں کے درگرو   کہ دارد چنیں سید پیشرو

(گناہوں میں مقید کوئی ایسا شخص نہیں رہے گا کہ وہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم جیسا اپنا پیش رو رکھتا ہوں)

جن کو ایسا رحیم و کریم نبی مل گیا ہو ان کو بہت کچھ امیدیں ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں

---

[1] (الحجر آیت نمبر ۹۹)

یہ صفت حق تعالیٰ کی صفت کرم کا ظل تھا تو حق تعالیٰ اس مسئلہ میں اصل ہیں کہ جب تک تم طلب باقی رکھو گے وہ اپنی عطا اور توجہ کو کم نہ کریں گے۔ مولانا احمد علی صاحب سہارن پوری کا مقولہ ہے کہ میاں جو خدا یہاں ہے وہی تو حشر میں بھی ہوگا اور یہاں تو وہ بڑے رحیم و کریم ہیں اور ان کی صفات میں تغیر ہے نہیں۔ الآن کما کان پھر کیا خطرہ ہے۔ ان شاء اللہ وہاں بھی یہی رحمت ہوگی بلکہ اس سے زیادہ۔

امید و رجا کی حقیقت

مگر اس سے بے فکر ہو کر نہ بیٹھ جانا کیونکہ اس میں بھی ایک تو رجاء کا درجہ ہے اور ایک غرور کا۔ امید و رجاء وہی ہے جو عمل کے ساتھ ہو ورنہ غرور ہے۔ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ رجاء مجرم کو ہو ہی نہیں سکتی اس لیے جن احادیث میں رجاء اور حسن ظن باللہ کی تعلیم ہے۔ درحقیقت ان میں عبادت و عمل کی تعلیم ہے کیونکہ رجاء اسی سے پیدا ہوتی ہے ورنہ وہ تو غرور ہے جس کی نسبت ارشاد ہے: "وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ" (اور تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکہ دیا) غرض حق تعالیٰ بڑے رحیم و کریم ہیں کہ ہاتھ بڑھا کر خود نہیں کھینچتے مگر اس کے ساتھ ان میں استغناء بھی بہت ہے۔

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو　　دار و گیر و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

(جس کا جی چاہے آئے اور جس کا جی چاہے چلا جائے اس درگاہ پر روک ٹوک کرنے والا کوئی نہیں)

اگر تم خود ہاتھ کھینچ لو گے تو پھر وہ بھی کھینچ لیں گے کیونکہ وہ زبردستی اپنی نعمتوں کو کسی کے سر نہیں چپکاتے کہ تم چاہو یا نہ چاہو پھر بھی دیتے ہی رہیں۔ فرماتے ہیں:

"اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ" (سورہ ھود: ۲۸)

(کیا ہم زبردستی رحمت چپکا دیں گے اور تم اس کو ناپسند کرتے ہو) اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی عمل کو شروع کر کے چھوڑ دینا یہ بھی بندہ کی طرف سے ترک طلب کی علامت ہے، جو کبھی کراہت کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے اسی لیے حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

یا عبداللہ الا تکن مثل فلان کان یقوم من اللیل ثم ترکہ

اے عبداللہ! تم فلاں شخص کی طرح نہ ہو جانا جو رات کو اٹھا کرتا تھا پھر قیام لیل کو ترک کر دیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شخص کی حالت پر انکار تھا جبھی تو نصیحت فرماتے ہیں کہ تم ایسے نہ ہو جانا۔ پس کسی عمل کو شروع کرنے کے بعد ترک کرنا مکروہ ہے لہٰذا تکمیل کے بعد بھی عمل میں کمی کرنے کی اجازت نہیں کیونکہ اس صورت میں حق تعالیٰ کی طرف سے بھی کمی ہو جائے

گی اور راز اس میں یہ ہے کہ حق تعالیٰ ہم سے ویسا ہی برتاؤ کرتے ہیں۔

اب دیکھ لیجئے کہ اگر ایک آدمی روز ہمارے پاس آیا کرتا ہو پھر آنا چھوڑ دے تو ہم کو اس سے انقباض ہو جاتا ہے۔ یہی برتاؤ ادھر سے بھی ہوتا ہے' اس پر شاید کسی کو اشکال ہو کہ ہم کو تو کسی دوست کے نہ آنے سے اس لیے انقباض ہوتا ہے کہ ہم کو علم غیب نہیں' ہم آثار و علامات سے ہی استدلال کرتے ہیں تو ممکن ہے کہ جس دوست نے آنا چھوڑ دیا ہے حقیقت میں اس کی محبت کم نہ ہوئی ہو مگر ہم نے ترک آمدورفت سے قلت محبت پر استدلال کر لیا اور اس سے منقبض ہو گئے مگر حق تعالیٰ کو تو ہماری حالت کا علم ہے کہ ہم کو محبت ہے گو عمل میں کمی آ گئی پھر وہاں سے یہ برتاؤ کیوں ہوا۔

جواب یہ ہے کہ ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ بہت لگ لپٹنے کے بعد عمل کو وہی چھوڑتا ہے جو خود بھی بدل جائے۔ بدوں کسی قدر تغیر کے پہلے برتاؤ میں کمی نہیں ہو سکتی۔ ہاں عذر سفر و مرض کی وجہ سے ہو تو اس صورت میں عمل کی کمی اور کوتاہی معاف ہے۔ بشرطیکہ ضروریات میں خلل نہ آئے۔ اس وقت تو حق تعالیٰ ایسا کرم فرماتے ہیں کہ تم سے چاہے عمل کم ہو مگر وہاں اتنا ہی کام لکھا جاتا ہے جتنا صحت میں لکھا جاتا تھا' باقی بدوں عذر کے کوتاہی کرنا بدوں تغیر حالت کے نہیں ہو سکتا۔

انسان طبعاً حریص ہے

طبعاً انسان میں استیلاء کی حرص رکھی ہوئی ہے کیونکہ یہ مظہر صفت الٰہیہ ہے اور استیلاء خدا تعالیٰ کی صفت ہے۔ انسان اس صفت کا بھی مظہر ہے تو جس چیز کی اس کو طلب ہوتی ہے اس پر استیلاء کا حریص ہوتا ہے۔ پس اگر اس کو حق تعالیٰ کی معرفت و محبت مطلوب ہو گی تو طبعاً یہ اس میں بھی استیلاء کا حریص ہو گا' کسی مطلوب میں نقص اور تنزل کو انسان کبھی گوارا نہیں کرتا۔ جب یہ بات معلوم ہو گئی تو اب سمجھئے کہ جس مطلوب میں انسان سے استیلاء کے خلاف تنزل اور کوتاہی کا ظہور ہو گا وہاں ضرور طلب میں کوتاہی ہو گی۔ بدوں اس کے یہ کبھی تنزل کو گوارا نہیں کرتا کیونکہ اس کی طبیعت کا اصلی مقتضاء تو استیلاء ہے۔ بوجہ مظہر صفت الٰہی ہونے کے مگر چونکہ بعض دفعہ استیلاء کامل کی طلب نہیں کرتا بس اتنی ہی بات سے خوش ہو جاتا ہے کہ مجھے احوال و کیفیات پر استیلاء علمی تو ہو گیا ہے میں شوق اور محبت کے پیدا کرنے کی ترکیب جان گیا ہوں' دفع وساوس کی تدبیر مجھے معلوم ہو گئی ہے' گو شوق و محبت اس میں راسخ نہ ہوئی ہو اور وساوس اس کے قلب سے دفع نہ ہوئے ہوں۔ اس وقت اس کی وہ مثال ہوتی ہے جیسے ایک شخص بخیل گھی سامنے رکھ لے اور ہر لقمہ پر کہے تجھ کو کھا لوں گا' روٹی ختم ہو جائے اور گھی باقی رہے۔ اس پر خوش ہو کہ مجھ کو کھانے کی قدرت ہے اور

جیسے ایک جولا ہے کی بھینس چور لے گئے تو وہ کہتا ہے لے جاؤ رسی تو میرے ہی پاس ہے تم کا ہے سے باندھو گے۔ اسی طرح احوال و کیفیات کے وارد کرنے کی ترکیب معلوم کر کے بعض سالکین بے فکر ہو جاتے ہیں کہ بس جب چاہیں گے ان کو حاصل کر لیں گے چاہے توفیق کبھی نہ ہو۔ اسی طرح بعض لوگ نماز شروع کر کے پھر چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ نمازی مشہور ہو گئے ہیں۔ استیلاء شہرت حاصل ہو چکا ہے' چاہے اب وہ عید ہی کے نمازی ہوں کیونکہ نمازی کی ایک قسم یہ بھی ہے۔

چنانچہ ایک واعظ صاحب گاؤں میں پہنچے اور واعظ میں کہا کہ بے نمازی سور ہیں۔ یہ سن کر گاؤں کے لوگ بگڑ گئے اور لاٹھیاں لے کر چڑھ آئے۔ مولوی صاحب نے کہا کیوں آئے خیر تو ہے کہا تم نے ہم کو سور کہا تھا' کہنے لگے میں نے تم کو تھوڑا کہا تھا تم تو نمازی ہو' کیا تم کبھی عید کی نماز بھی نہیں پڑھتے' گاؤں والوں نے کہا ہاں عید کی نماز تو پڑھ لیتے ہیں کہا' پھر تم بے نمازی کدھر سے ہوئے' میں نے تم کو سور نہیں کہا اس پر سب راضی ہو گئے۔

بعضے حج کر کے ناجائز افعال کرنے لگتے ہیں کیونکہ حاجی تو مشہور ہو گئے ہیں اب کسی عمل کی کیا ضرورت ہے بعضے ایک کافر کو مار کر خوش ہیں کہ ہم غازی مشہور ہو گئے ہیں یا خادم قوم کہلانے لگے ہیں۔ پھر اعمال کی کیا ضرورت ہے بعض کچھ دنوں خوب ذکر و شغل کر کے پھر چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ ذاکر اور بزرگ مشہور ہو گئے ہیں اور اب اس لیے نہیں کرتے کہ لوگوں کو یہ دھوکا دے رکھا ہے کہ ہمارا قلب جاری ہو گیا ہے اب ہم کو ذکر لسانی کی ضرورت نہیں رہی۔

غرض انسان میں طبعاً استیلاء کا تقاضا تو ہے مگر کبھی یہ استیلاء ضعیف یا استیلاء ظاہری کو کافی سمجھ لیتا ہے جو نقص طلب کی دلیل ہے کیونکہ جہاں اس کی طلب کامل ہوتی ہے وہاں بدوں استیلاء کامل کے اس کو صبر نہیں آتا۔ پس جب یہ عمل کر کے چھوڑ دیتا ہے تو حق تعالیٰ بھی اس پر توجہ کم کر دیتے ہیں کیونکہ اس نے خود ہی طلب چھوڑ دی یا کم کر دی ہے۔ پس خوب یاد رکھو کہ استیلاء علمی کافی نہیں بلکہ استیلاء حقیقی کی ضرورت ہے اس دھوکہ میں سو میں سے اٹھانوے سالک مبتلا ہیں جو احوال و کیفیات و مقامات کا قدرے ذوق حاصل کر کے پھر عمل سے بے فکر ہو جاتے ہیں۔ اس دھوکہ سے بچنا چاہیئے طالب وہ ہے جو تکمیل کے بعد عمل سے بے فکر نہ ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک واقعہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ آپ کا گزر ایک پتھر پر ہوا جو رو رہا تھا (اس کی تصدیق وہ کرے گا جو قدرت خدا کا قائل ہے) آپ نے پوچھا کیوں روتا ہے؟ کہا جب سے

میں نے سنا ہے کہ جہنم میں پتھر بھی جائیں گے "وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ" [1] (التحریم آیت ۶) (جس کا ایندھن اور سوختہ آدمی اور پتھر ہیں) اس وقت سے بوجہ خوف کے رو رہا ہوں، آپ نے دعا کی کہ اے اللہ! اس پتھر کو جہنم میں نہ ڈالا جائے، دعا قبول ہوگئی۔ آپ نے اس کو تسلی کردی جس سے کچھ دیر کے لیے اس کو سکون ہوگیا۔ موسیٰ علیہ السلام آگے چلے گئے، واپسی میں دیکھا کہ پھر رو رہا ہے، پوچھا اب کیوں روتا ہے؟ اب تو تیری تسلی کردی گئی ہے کہا رونے ہی کی برکت سے تو یہ بشارت ملی ہے تو میں ایسے محسن کو کیوں چھوڑوں۔

ایسے ہی اے سالکین! اگر آپ کو مجاہدہ وعمل کی بدولت احوال وکیفیات اور مشاہدہ حاصل ہوگیا تو جب بھی آپ کو عمل ومجاہدہ ترک نہ کرنا چاہیے کیونکہ اسی کی برکت سے تو یہ دولت ملی اور اسی محسن سے آپ اعراض کرتے ہیں۔ اس وجہ سے میں نے یہ چوتھی قسم بڑھائی تا کہ معلوم ہوجائے کہ زہد فی الدنیا حال غیر راسخ کے درجہ میں منتہی نہیں بلکہ منتہی یہ ہے کہ حال سے مقام ہوجائے۔

زہد فی الدنیا کی تفصیل

اب میں چاروں درجنوں کی تفصیل کرتا ہوں کہ زھد فی الدنیا کا ایک تو علم کا درجہ ہے کہ اعتقاد درست ہوجائے اور یہ جان لے کہ ہم کو ایک دن مرنا ہے اور قیامت بھی آنے والی ہے مگر اس میں ایک دھوکا ہوتا ہے وہ یہ کہ بعض لوگ جو اہل حق کہلاتے ہیں ان کو اپنے اعتقادات کی صحت پر ناز ہوتا ہے۔ بس وہ اعتقاد صحیح کر کے "نحن ابناء الله و احباء ہ" (ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں (نعوذ باللہ) علمائے یہود کا قول ہے) کا مصداق ہوجاتے ہیں کہ ہم اہل حق میں داخل ہیں، اب ہم کو عذاب نہیں ہوگا، چاہے کچھ بھی کرتے رہیں، بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ درستی عقائد کے بعد اعمال میں کوتاہی زیادہ مضر نہیں اور اس کا منشاء یہ ہے کہ ان لوگوں نے اعتقادیات میں محض علم کو مقصود سمجھ لیا ہے اور میں بھی پہلے یہی سمجھتا تھا کہ اعتقادیات میں علم ہی مقصود ہے مگر سالہا سال کے بعد ایک آیت نے مجھے اس طرف راہبری کی کہ عقائد فی نفسہ بھی مقصود ہیں اور عمل کے واسطے بھی مقصود ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَافَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝ [2] (الحدید ۲۲، ۲۳)

(کوئی مصیبت نہ دنیا میں آتی ہے نہ خاص تمہاری جانوں میں مگر وہ ایک کتاب میں یعنی (لوح محفوظ میں) لکھی ہے قبل اس کے ہم ان جانوں کو پیدا کریں یہ اللہ کے نزدیک آسان کام

ہے (یہ بات) بتلا اس واسطے دی ہے تا کہ جو چیز تم سے جاتی رہے تم اس پر رنج (اتنا) نہ کرو اور تا کہ جو چیز تم کو عطا فرمائی ہے اس پر اتراؤ نہیں اور اللہ تعالیٰ کسی اترانے والے شیخی باز کو پسند نہیں کرتا)

یہاں پہلی آیت میں تو مسئلہ تقدیر کی تعلیم ہے کہ جو مصیبت بھی آتی ہے، زمین میں یا تمہاری ذات میں وہ ایک کتاب میں (لکھی ہوئی) ہے۔ (یعنی لوح محفوظ میں) اس مصیبت کے پیدا ہونے سے بھی پہلے بے شک یہ بات حق تعالیٰ پر آسان ہے (اس کا انکار وہی کرسکتا ہے جس کو قدرت الٰہیہ کا علم نہ ہو) آگے تعلیم مسئلہ کی تعلیل فرماتے ہیں کہ یہ بات ہم نے تم کو کیوں بتلائی۔ اس لیے تا کہ کسی چیز کے فوت ہونے پر تم کو رنج نہ ہو۔ (بلکہ اس سے تسلی حاصل کرلو کہ یہ مصیبت تو لکھی ہوئی تھی اس کا آنا ضروری تھا ۱۲) اور کسی نعمت کے ملنے پر اتراؤ نہیں بلکہ یہ سمجھو کہ اس میں ہمارا کچھ کمال نہیں۔ حق تعالیٰ نے پہلے ہی سے یہ نعمت ہمارے لیے مقدر کردی تھی ۱۲)

اس سے معلوم ہوا کہ مسئلہ تقدیر کی تعلیم سے صرف اعتقاد کرلینا ہی مقصود نہیں بلکہ یہ عمل بھی مقصود ہے کہ مصائب میں مستقل رہے اور ہر مصیبت کو مقدر سمجھ کر یہ پریشان نہ ہو۔ اسی طرح نعمتوں پر تکبر و بطر نہ ہو ان کو اپنا کمال نہ سمجھے۔ جب نص سے اس کا مقصود ہونا معلوم ہوگیا اور قاعدہ ہے کہ "الشیء اذا خلا عن غایته انتفی" شے جب اپنی حالت سے خالی ہو تو وہ کالعدم ہوتی ہے تو اب جس شخص کا مصائب و نعم کے وقت یہ حال نہ ہو وہ گویا تقدیر کا معتقد ہی نہیں یعنی کامل معتقد نہیں، اگر کامل اعتقاد ہوتا تو اس کی غرض ضرور مرتب ہوتی۔

اسی طرح توحید کا مسئلہ تعلیم کیا گیا ہے۔ اس سے بھی صرف علم مقصود نہیں بلکہ قرآن میں غور کرنے سے توحید کا مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر اللہ کا خوف اور اس سے طمع نہ رہے۔ اب جو شخص توحید کا قائل ہے مگر غیر اللہ سے خوف و طمع بھی رکھتا ہو وہ گویا توحید کا معتقد ہی نہیں بلکہ مشرک ہے۔ چنانچہ صوفیاء نے اس پر شرک کا اطلاق کیا ہے اور صوفیاء نے کیا حق تعالیٰ نے اس کو شرک فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلاً صَالِحًا وَّلاَ يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ اَحَدًا. (الكهف: ۱۱۰)

(کہ جو کوئی لقاء رب کی امید رکھتا ہو وہ نیک عمل کرتا رہے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے)

حدیث میں "لایشرک" کی تفسیر لایرائی آئی ہے یعنی مطلب یہ ہے کہ عبادت میں ریا

نہ کرے۔اس سے معلوم ہوا کہ ریاء شرک ہے۔حالانکہ ریاء میں غیر اللہ معبود نہیں ہوتا مگر چونکہ فی الجملہ مقصود ہوتا ہے کہ اس کی نظر میں بڑا بننے کے لیے بنا سنوار کر عبادت کی جاتی ہے۔اس لیے اس کو شرک فرمایا اور یہ بالکل عقل کے مطابق ہے کیونکہ عبادت غیر اللہ جوارح سے ہوتی ہے اور جب وہ شرک ہے تو قلب سے غیر اللہ کو مقصود بنانا کیونکر شرک نہ ہوگا۔ یہ تو قلبی عبادت ہے پس غیر اللہ سے خوف و طمع پر صوفیاء کا لفظ شرک اطلاق کرنا غلط نہیں کیونکہ اس صورت میں توحید کی غایت مفقود ہے۔اسی طرح تمام عقائد میں غور کرو تو نصوص سے معلوم ہوگا کہ ہر اعتقاد سے عمل بھی مطلوب ہے' تنہا اعتقاد مطلوب نہیں اور ہماری عادات میں اعتقاد سے عمل بھی مطلوب ہوتا ہے۔

چنانچہ دیکھو ایک شخص سفر سے آیا ہو جس کے دو لڑکے ہیں' ایک بڑا ایک چھوٹا' بڑا تو باپ کو پہچانتا ہے اور چھوٹا نہیں کیونکہ باپ اس کو شیر خوار چھوڑ کر چلا گیا تھا۔جب زمانہ دراز کے بعد یہ گھر پر آیا تو چھوٹے لڑکے نے بڑے سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ بڑے لڑکے نے بتایا کہ یہ تیرا اور میرا باپ ہے۔اس کے بعد چھوٹے لڑکے نے باپ کے ایک گھونسا مارا کہ تو ہمارے گھر میں کیوں آ گیا تو اس وقت بڑا لڑکا بولا' ارے کم بخت! ابھی تو بتلایا تھا کہ یہ تیرا باپ ہے۔میں پوچھتا ہوں کہ بڑے لڑکے کا اس طرح دھمکانا بجا ہے یا بے جا؟ حالانکہ چھوٹا لڑکا کہہ سکتا ہے کہ تو نے باپ ہونا بتلایا تھا تو میں نے انکار کب کیا' میں نے تو گھونسہ ہی مارا ہے۔مگر اہل زبان بڑے لڑکے کی بات کو سب صحیح کہیں گے اور اس کا مطلب یہ بیان کریں گے کہ اس علم کا مقتضاء یہ تھا کہ تم اس کا ادب کرتے' جب تم نے مقتضائے علم کے خلاف کیا تو گویا تم کو علم ہی حاصل نہیں۔معلوم ہوا کہ اہل زبان بھی اعتقاد کے ساتھ عمل کو بھی مقصود سمجھتے ہیں اور جب عمل خلاف مقتضائے علم ہوتا ہے تو علم کو کالعدم سمجھتے ہیں۔

علم پر ناز نہ کرو

پس صاحبو! محض علم پر ناز نہ کرو بلکہ علم کا اہتمام کرو تو جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم کو دنیا کا فانی ہونا معلوم ہے مگر عمل اور برتاؤ ایسا ہے جیسا باقی رہنے والی شے کے ساتھ ہوا کرتا ہے تو ان کا یہ اعتقاد کافی نہیں بلکہ کالعدم ہے اس کے بعد دوسرا درجہ عمل کا ہے کہ دنیا کے متعلق اعتقاد فنا رکھ کر عمل بھی اس کے ساتھ وہی ہے جو فانی کے ساتھ ہوا کرتا ہے مگر حالت یہ ہے کہ تکلف اور مشقت کے ساتھ تعلقات کو کم کرتے ہیں۔دل میں تعلقات سے نفرت نہیں۔ یہ درجہ بھی ناکافی ہے کیونکہ جب دل میں تعلقات دنیا سے نفرت نہیں تو اندیشہ ہے کہ اگر ان سے کسی وقت مجاہدہ میں کمی کر دی تو تعلقات دنیا میں پھنس جائے گا۔اس لیے حال کی ضرورت ہے کہ فنائے دنیا کا قلب سے مشاہدہ

ہو جائے اور دل میں تعلقات دنیا سے نفرت پیدا ہو جائے پھر بھی نہیں کہ ایک دفعہ وعظ سن کر یا ذکر میں مشغول ہو کر تھوڑی دیر کے لیے تعلقات سے نفرت ہو جائے، نہیں بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ یہ حال راسخ ہو جائے اور ہمیشہ کے لیے تعلقات دنیا سے قلب کو الجھن ہونے لگے۔ یہ مقام کا درجہ ہے، یہ ہے مطلوب اور منتہیٰ، اسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ دنیا سے ایسا برتاؤ کرو جیسا مسافر کیا کرتا ہے، یعنی عملاً بھی اور حالاً بھی۔ عملاً تو اس طرح کہ جیسے مسافر سفر میں محض ضروریات پر اکتفا کیا کرتا ہے۔ فضول اسباب ساتھ نہیں لیا کرتا، ایسے ہی تم دنیا کے ساتھ عمل کرو کہ قدر ضرورت پر اکتفا کرو، زائد از ضرورت سامان کی فکر میں نہ پڑو مگر قسمت سے ہمارا تو سفر مثل حضر ہی کے ہوتا ہے۔ ہم اس میں بھی فضول سامان بہت ساتھ لیتے ہیں مگر پھر بھی حضر کی نسبت سے کچھ اختصار ضرور ہوتا ہے تو خیر آپ اتنا ہی کرلیں کہ اپنے سفر جیسا ہی اختصار کرلیا کریں۔ دیکھئے! یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ترک تعلقات دنیا کی تعلیم نہیں فرمائی بلکہ ان میں اختصار کرنے کی تعلیم دی ہے۔

واللہ! اگر تمام عارفین اور عقلاء و حکماء جمع ہو کر زہد فی الدنیا کے مضمون کو بیان کرتے تو اس حقیقت تک کبھی نہ پہنچ سکتے وہ تو بس یہی کہتے کہ دنیا کو بالکل ترک کردو اور اگر ترک کی تعلیم نہ کرتے تو اس کی کوئی حد معین نہ کر سکتے کہ دنیا کے ساتھ کتنا اور کیسا علاقہ رکھنا چاہیے۔ قربان جایئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ دو لفظوں میں آپ نے کتنے بڑے مضمون کو حل فرمایا۔

کن فی الدنیا کانک غریب (دنیا میں مسافر کی طرح رہو)

جس میں یہ بھی بتلا دیا کہ دنیا میں رہ کر اس سے بالکل بے تعلق ہونا تو دشوار ہے۔ دنیا میں رہ کر آسمان پر اڑنے کی فکر نہ کرو بلکہ دنیا ہی میں رہو۔ آگے ''**کانک غریب**'' میں حد مقرر فرما دی مگر دنیا سے اتنا ہی علاقہ رکھو جتنا مسافر کو راستہ یا سرائے سے علاقہ ہوا کرتا ہے۔ پس نہ ترک تعلقات کی تعلیم ہے نہ انہماک فی الدنیا کی اجازت ہے بلکہ تعلقات میں اختصار کی تعلیم ہے اسی لیے عقلاء نے شریعت کو دیکھ کر کہا ہے کہ شریعت اسلامیہ میں ممتنع العمل کوئی چیز نہیں اور جبھی تو بانگ دعویٰ کیا گیا ہے: ''**یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ** اور **مَاجَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ**''[1] (اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ (احکام میں) آسانی کرنا منظور ہے اور تمہارے ساتھ (احکام و قوانین) مقرر کرنے میں) دشواری منظور نہیں) اور (اس نے) تم پر دین کے (احکام) میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی) اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ شریعت نے تعطل کی تعلیم کی ہے انہوں نے

---

[1] (البقرہ ۱۸۵، الحج آیت نمبر ۷۸)

شریعت کو سمجھا ہی نہیں اور دیکھا ہی نہیں۔ بتلایئے اس میں کیا تعطل ہے کہ انسان دنیا میں مسافر بن کر رہے۔ کیا مسافر کھانا چھوڑ دیتا ہے پینا چھوڑ دیتا ہے' کپڑے نہیں پہنتا' کیا کام نہیں کرتا بلکہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ عمر بھر سفر ہی میں رہتے ہیں اور ان کے کسی کام میں بھی خلل نہیں آتا' بیوی بچے سب سفر میں ساتھ رہتے ہیں' سونا جاگنا بیوی کے پاس جانا سارے کام ہوتے رہتے ہیں' صرف اتنی بات ہوتی ہے کہ وہ کسی شہر یا مکان سے دل نہیں لگاتا ہر دم اٹھاؤ چولہا رہتا ہے۔

ضرورت کے موافق دنیا سے تعلق رکھو

بس اسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی ہے کہ ضرورت کے موافق دنیا سے تعلق رکھو مگر اس سے دل نہ لگاؤ' اس میں منہمک نہ ہو جاؤ نہ تعلقات کو بڑھاؤ بلکہ حتی الامکان اختصار رکھو۔ اس میں نہ تعطل ہے نہ اس پر عمل دشوار ہے مگر اللہ بھلا کرے بعض واعظین کا کہ وہ وعظ کے وقت جو زہد و توکل کا بیان کریں گے تو اس کو ہوا ایسا بنا دیں گے جو ان واعظ صاحب کے باپ سے بھی نہ ہو سکے۔ حالانکہ شریعت میں ممتنع العمل کوئی بات نہیں ہے۔ پس یہ شریعت کی تعلیم نہیں ہے بلکہ واعظوں کی من گھڑت ہے۔ شرعاً زہد و توکل کے لیے یہ لازم نہیں کہ ایک پیسہ بھی اپنے پاس نہ رکھے بلکہ مال جمع کرنے کے ساتھ بھی زہد و توکل ہو سکتا ہے۔

جس کی صورت یہ ہے کہ مال کے ساتھ دل نہ لگائے اور ضرورت سے زیادہ کے درپے نہ ہو۔ پس یہ زہد ہے اور اگر بدوں طلب وانہماک کے ضرورت سے زیادہ سامان حق تعالیٰ عطا فرمائیں تو یہ بھی زہد کے خلاف نہیں۔

اور توکل یہ ہے کہ اسباب کو مؤثر نہ سمجھے اور نہ ان پر اعتماد کرے بلکہ حق تعالیٰ پر نظر رکھے اور ہر چیز کو انہی کی عطا سمجھے۔ اس کے لیے ترک اسباب اور ترک ملازمت ضروری نہیں۔

ہاں یہ اور بات ہے کہ کسی کو اسباب کے اختیار کرنے سے الجھن ہوتی ہو اور ترک اسباب سے قلب کو راحت ہوتی ہو اور اس کے قلب میں اتنی قوت ہو کہ ترک اسباب سے پریشانی نہ ہو تو اس کو ترک اسباب کی بھی اجازت ہے لیکن توکل اس پر موقوف نہیں بلکہ اختیار اسباب کے ساتھ بھی توکل ہو سکتا ہے بلکہ جس کو ترک اسباب سے پریشانی میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو اس کو اجازت ہی نہیں۔ صاحبو! بعض طبائع ایسی ہیں کہ اگر ان کے پاس کچھ مال نہ ہو تو ان کے ایمان جاتے رہنے کا اندیشہ ہے۔ ان لوگوں کو ترک اسباب حرام ہے ان کو مال جمع کر کے ہی توکل کرنا چاہیے کیونکہ اسباب میں تاثیر کچھ نہیں ہے مگر ان سے گونہ تسلی ہو جاتی ہے' یہ حکمت اختیار اسباب میں

ضرور ہے۔ چنانچہ گو ہم بچپن سے یہ دیکھ رہے ہیں کہ حق تعالیٰ ہم کو برابر کھانا کپڑا دے رہے ہیں اور یقین ہے کہ ہمیشہ دیں گے مگر پھر بھی جب کچھ رقم پاس ہوتی ہے تو اطمینان سا رہتا ہے بدوں رقم کے ویسا اطمینان نہیں ہوتا جیسا کہ رقم کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسباب میں یہ بڑی حکمت ہے کہ ان سے قلب کو یکسوئی اور جمعیت رہتی ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے تم ریل پر سوار ہو اور ٹکٹ اپنے پاس ہو۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں دلجمعی کامل ہوگی اور اگر ٹکٹ کھو جائیں گو نمبر وغیرہ سب کچھ یاد ہوں' اسوقت دیکھئے کیا حال ہوتا ہے۔

غلط توکل کی مثال

ایسے ہی بعض لوگ ترک ملازمت وغیرہ سے پریشان ہو جاتے ہیں۔ ان کو اس کی اجازت نہیں۔ اس لیے جو واعظین زہد و توکل کے لیے ملازمت ترک کرنے اور اپنے پاس کچھ رقم جمع نہ رکھنے کی عام طور پر تعلیم دیتے ہیں یہ ان کی غلطی ہے۔ یہ لوگ ایسا توکل سکھلاتے ہیں جیسا ایک مولوی صاحب نے کسی بادشاہ کو تعلیم دی تھی کہ تم نے اتنی فوج کیوں جمع کر رکھی ہے' اس کو الگ کر دو اور اگر کوئی دشمن حملہ آور ہوگا تو ہم اس کو وعظ و نصیحت سے سمجھا لیں گے۔ بادشاہ نے فوج الگ کر دی' کچھ دنوں کے بعد دشمن نے حملہ کر دیا۔ بادشاہ نے مولوی صاحب کو بلایا کہ واعظ و نصیحت سے دشمن کو دفع کرو' یہ سمجھانے گئے' بہت کچھ نصیحتیں کیں مگر اس نے ایک نہ مانی تو مولوی صاحب اپنا سامنہ لے کر واپس آئے اور بادشاہ سے کہا حضور! یہ تو بدمعاش ہیں' مانتے نہیں ہیں' بس ان کا ایمان گیا اور تمہارا ملک گیا' صبر کرو۔

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا توکل نہیں سکھلایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکیم ہیں اور حکیم بھی کیسے کہ تمام حکماء آپ کے سامنے طفل مکتب ہیں۔ حق تعالیٰ نے بلا واسطہ آپ کو تعلیم دی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: "علمنی ربی فاحسن تعلیمی و ادبنی فاحسن تادیبی" (میرے رب نے مجھے سکھایا' پس کتنی اچھی تعلیم دی اور میرے رب نے مجھے ادب سکھایا پس کتنا اچھا ادب سکھایا)

حضرت جبرئیل علیہ السلام کی حیثیت

اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کا واسطہ یہ کچھ واسطہ نہیں ہے وہ تو محض قاصد ہیں جیسے ڈاکیہ ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ ڈاکیے کا واسطہ کچھ واسطہ نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص خط میں اپنے کسی شاگرد یا مرید کو علمی نکات لکھ کر بھیج دے تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس شاگرد یا مرید کو ڈاکیے نے یہ علوم

سکھلائے ہیں؟ ہرگز نہیں بلکہ معلم کاتب خط ہی کو کہا جائے گا۔ اسی طرح جبرئیل علیہ السلام ڈاکیے کی طرح محض علوم کو پہنچانے والے ہیں خود تعلیم دینے والے نہیں ہیں' معتزلہ کی عقل خبط ہو گئی ہے کہ وہ جبرئیل علیہ السلام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل کہتے ہیں اور دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معلم ہیں۔ ان احمقوں کو اب تک معلم کے معنی ہی معلوم نہیں۔ جبرئیل علیہ السلام معلم بمعنی استاد ہرگز نہیں ہیں بلکہ معلم بمعنی مبلغ وسفیر ہیں۔

ان کی ایسی مثال ہے جیسے بادشاہ اپنے دربان کے ذریعے سے کسی شخص کے پاس پیغام بھیج دے کہ ہم نے تم کو وزیر بنا دیا ہے تو بتلایئے اس شخص کو بادشاہ نے وزارت دی یا دربان نے؟ اور اگر بادشاہ وزیر کے پاس انتظام کے متعلق کچھ قوانین لکھ کر دربان کے ہاتھ بھیج دے تو ان قوانین کا معلم بادشاہ کو کہا جائے گا یا دربان کو؟ اسی طرح یہاں سمجھو۔ بہرحال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے بلاواسطہ تعلیم دی ہے اس لیے آپ کے برابر کسی کی حکمت نہیں ہوسکتی۔ سو آپ نے ترک اسباب کو حکم نہیں دیا بلکہ یہ فرمایا ہے:

کن فی الدنیا کانک غریب

جس میں اختیار اسباب کی اجازت ہے مگر ان میں اختصار کرنے کی تعلیم ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا "**کن فی الدنیا کانک غریب**" کہ دنیا میں مردہ بن کر رہو۔ گو عارفین نے یہ لفظ کہہ ہی ڈالا۔ ان کی تعلیم یہ ہے کہ "**موتوا قبل ان تموتوا**" لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کیونکہ ہر شخص ایسا نہیں کرسکتا۔ یہ ہر ایک کو آسان نہیں مگر کچھ تسلی آپ نے ان کی بھی فرما دی تاکہ کسی کو ان پر اعتراض کا دعویٰ نہ ہو کہ یہ صوفی نئی نئی باتیں کہاں سے کہتے ہیں' بدعتیں نکالتے ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آپؐ نے فرمایا ہے "**وعد نفسک من اھل القبور**" گو وہاں بھی آپؐ نے موتوا بھی نہیں فرمایا مگر اہل قبور کا لفظ تو آ گیا جس سے صوفیاء کی تعلیم بھی بدعت ہونے سے نکل گئی کیونکہ اس کی اصل بھی موجود ہے لیکن یہ تعلیم خواص کے لیے ہے۔ چنانچہ اس حدیث میں نام لے کر عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خطاب ہے باقی عام تعلیم آپؐ کی یہی ہے کہ دنیا میں ایسے رہو جیسے مسافر رہا کرتا ہے۔

پھر آپؐ نے یہ بھی فرمایا "**کن فی الدنیا غریبا**" کہ بالکل ہی مسافر بن کر رہو کیونکہ اگر بالکل مسافر بن جاتے تو بعض دفعہ دقت پیش آتی۔ مثلاً تم نے سارا سامان خیرات کر ڈالا اور مسافر کی طرح صرف دو وقت کا کھانا رکھ لیا کیونکہ مسافر عادۃً اس سے زیادہ کھانا نہیں رکھتا۔ پھر اگلے دن

تم کو پریشانی ہوئی تو حدیث پر شبہ ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا حکم دیا ہے جس پر عمل کرنے سے پریشانی ہوتی ہے مگر اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی کو حرف گیری کا کیا منہ ہے۔ آپ تو "کن فی الدنیا غریبا" نہیں فرماتے بلکہ کانک غریب فرما رہے ہیں۔ یعنی مثل مسافر کے رہو۔

عارفین زبان شناس نبوت ہیں

اس کا مطلب عارفین نے سمجھا ہے کیونکہ وہی زبان شناس نبوت ہیں۔ ان سے اس کا مطلب پوچھو، خود اپنی طرف سے تفسیر نہ کرو کیونکہ تم نبوت کی زبان نہیں سمجھتے۔

تو ندیدی گہے سلیمان را　　　چہ شناسی زبان مرغاں را

(جب تو نے سلیمان علیہ السلام کو دیکھا ہی نہیں تو پھر تو پرندوں کی بولیاں کس طرح سمجھے گا)

اس کا مطلب حضرت فرید عطارؒ بیان فرماتے ہیں:

ہر کہ اورا معرفت بخشد خدائے　　　غیر حق رادر دل اونیست جائے

نزد عارف نیست دنیا راخطر　　　بلکہ برخود نیستش ہرگز نظر

عارف از دنیا و عقبٰی فارغ ست　　　انچہ باشد غیر قولی فارغ ست

(جس کو خدائے بزرگ اپنی پہچان نصیب کردے تو اس دل میں غیر اللہ کے لیے کوئی جگہ نہیں، عارف کے نزدیک دنیا کا ہونا نہ ہونا برابر ہے بلکہ خود اپنے وجود ہی کے ہونے نہ ہونے پر نظر نہیں، عارف دنیا و آخرت کے غم سے فارغ ہے اس لیے کہ فرمان الٰہی کے علاوہ جو کچھ ہے اس سے بے تعلق ہے)

فرماتے ہیں کہ معرفت اس کا نام ہے کہ دنیا کی قدر دل میں نہ ہو اور اس سے دل کو خالی رکھو۔ یہ نہیں فرمایا کہ ہاتھ کو بھی خالی رکھو۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

اے پسر از آخرت غافل مباش　　　بامتاع ایں جہاں خوش دل مباش

دربلیات جہاں صبا باش !　　　گاہ نعمت شاکر جبار باش !

(صاحبزادے! فکر آخرت سے غفلت میں نہ رہ، اس جہاں کے سامان زینت سے دل بستگی نہ کر، دنیا کے سرد گرم پر راضی برضا رہ اور ہمیشہ خدا کی نعمتوں کا شکر کرتا رہ)

بس یہ معنی ہیں "کانک غریب" کے کہ دنیا کے ساتھ دل نہ لگائے اور جہاں تک ہو سکے تعلقات نہ بڑھائے یعنی زائد از ضرورت تعلقات کو کم کردے، پند نامہ عجیب کتاب ہے اس میں عمل کرنے کی باتیں ہیں، لوگوں کو مثنوی کا بہت شوق ہے کیونکہ اس میں عمل کی باتیں کم ہیں، زیادہ تر سائل اور احوال و کیفیات کی تحقیق ہے جو منتہی کے کام کی باتیں ہیں، مبتدی کو تو سب سے زیادہ عمل

کا اہتمام کرنا چاہیے اس کے لیے الف' با' تا کی ضرورت ہے اور وہ پندنامہ ہے۔ اگر کوئی شخص اس کتاب کو اپنے اعمال میں رکھے تو ان شاء اللہ واصل ہو جائے گا مگر عمل شرط ہے کہ امتحان وہی ہے اور امتحاں بدوں تو یہ آپ کا غلام

قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

اسی کو فرماتے ہیں:

کارکن کاربگذار ازگفتار کاندریں رہ کار باید کار

دعوے چھوڑ عمل میں لگ' اس طریق الفت میں صرف عمل ہے اور شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

قدم باید اندر طریقت نہ دم کہ اصلے ندارد دمے بے قدم

(طریقت میں عمل کرنا چاہیے نہ کہ دعویٰ بغیر عمل کے بے حقیقت ہے)

شیخ فرید عطار رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کتاب پندنامہ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کو دی تھی۔ چنانچہ مولانا رومیؒ نے اس کتاب کو اپنا دستور عمل بنایا۔ پھر معلوم ہے کہ وہ کس درجہ کے ہوئے۔ اس طرح شیخ فرید عطارؒ مولانا رومیؒ کے استاد ہو گئے۔ مولانا رومیؒ نے بعض مقامات پر ان کی بہت تعریف فرمائی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

ہفت شہر عشق راعطار گشت ماہنوز اندرخم یک کوچہ ایم

حضرت عطارؒ عشق کے سات شہروں کو طے کر چکے اور ہم تو ابھی تک ایک ہی گلی کے موڑ پر ہیں۔

تو اتنے بڑے شخص کا قول یہ ہے کہ دنیا سے دل نہ لگانا ہی معرفت ہے۔ باقی دنیا کا پاس ہونا مضر نہیں۔ ہاں بے ضرورت سامان جمع نہ کرے۔ فرماتے ہیں:

چیست تقویٰ ترک شبہات و حرام ازلباس و از شراب و از طعام

تقویٰ کیا ہے؟ کھانے پینے' پہننے میں شبہ اور حرام سے بچنے کا نام ہے۔

ہرچہ افزوں ست اگر باشد حلال نزد اصحاب ورع باشد وبال

زائد از ضرورت ہر شے چاہے حلال ہو متقی بندوں کے لیے وبال ہے۔

زائد از ضرورت سامان کی ممانعت

بزرگوں نے تو حلال آمدنی کو بھی جب کہ ضرورت سے زیادہ ہو' وبال سمجھا ہے اور ہماری یہ حالت ہے کہ مشتبہ اور حرام مال سے بھی گھر بھرتے رہتے ہیں اور بے ضرورت سامان جمع کرتے ہیں۔ گھر میں بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن سے کبھی کام بھی نہیں پڑتا مگر اس بات کو شوق ہے

کہ ہمارے گھر میں اتنے برتن اور اتنے پلنگ اور اتنے بستر ہیں اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم منع فرماتے ہیں۔ باقی قدر ضرورت کی ممانعت نہیں اور راز اس میں یہ ہے کہ زیادہ تر غیر ضروری چیزیں ہی دل کو پریشان کرتی ہیں اور جو ضرورت کے موافق ہوں ان سے پریشانی نہیں ہوتی اور آج کل ہم لوگ زیادہ تر فضول چیزوں ہی کے درپے رہتے ہیں' انہی کے جمع کرنے میں وقت صرف کرتے ہیں ورنہ ضروری سامان تو بہت جلد حاصل ہو جاتا ہے۔ ہر شخص اپنے گھر کی اشیاء میں غور کرے کہ روز اس کے استعمال میں کتنی چیزیں آتی ہیں تو معلوم ہوگا کہ دو چار دس پانچ چیزوں کے سوا اور تمام سامان ایسا ہے جس کی ضرورت مہینوں اور برسوں بھی نہیں ہوتی اسی لیے صائب کہتے ہیں۔

حرص قانع نیست صائب ورنہ اسباب معاش   آنچہ ما در کار داریم اکثری درکار نیست

حرص قناعت نہیں کرنے دیتی اے صائب ورنہ اسباب ضرورت جتنا ہم ضرورت کے لیے رکھتے ہیں اکثر حصہ اس کا بھی زائد از ضرورت ہے۔

اس سے معلوم ہوگا کہ حق تعالیٰ نے ہم کو کیا کچھ نعمتیں دے رکھی ہیں۔ اسی کو فرماتے ہیں: "وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا" (اور اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اگر (ان کو) شمار کرنے لگو تو شمار میں نہیں لا سکتے) میرے خیال میں یہاں احصاء استعمال ہے۔ تم احصاء نہیں کر سکتے بلکہ بہت چیزیں ایسی ملیں گی جن کے استعمال کی نوبت بھی نہیں آتی۔ غرض لوگ خواہ مخواہ بے ضرورت چیزیں جمع کرتے ہیں جن میں بلا وجہ دل اٹکا رہتا ہے۔

جیسے مولانا عطارؒ سے ایک مجذوب نے کہا تھا اس وقت مولانا عطار کی دکان کرتے تھے' طریق کی طرف متوجہ نہ ہوئے تھے۔ حق تعالیٰ نے ایک مجذوب کے ذریعے سے ان کو ہدایت کی۔ وہ ان کی دکان میں کھڑا ہو گیا اور ایک بوتل کی طرف اشارہ کرکے پوچھا اس میں کیا ہے؟ کچھ شربت بتلایا' دوسری طرف کو پوچھا کوئی خمیرہ بتلایا' تیسری میں کوئی لعوق بتلایا گیا۔ تعجب سے پوچھنے لگا سب چیزیں چپکتی ہی چپکتی ہیں تو ایسی حالت میں اتنی چپکتی چیزوں میں سے تیری جان کیونکر نکلے گی۔ مولانا نے ہنس کر کہا جس طرح تیری جان نکلے گی۔ مجذوب نے کہا ہمارا کیا ہے ہم تو یوں جان دے دیں گے یہ کہہ کر لیٹ گیا' جب دیر ہو گئی تو مولانا نے آ کر ہلایا' دیکھا تو وہ جان دے چکا تھا۔ بس ان کے قلب پر ایک چوٹ لگی اور اسی وقت تمام دکان کا سامان خیرات کرکے اللہ کی طلب میں نکل گئے۔

سو جو ہماری حالت ہے اس میں تو واقعی ہماری جان بھی مرتے ہوئے اس سامان میں اٹکی

---

۱ (ابراھیم آیت ۳۴' النحل آیت نمبر ۱۸)

رہے گی۔ خصوصاً عورتوں کی کیونکہ یہ تو بے ضرورت بھی سامان بہت جمع کرتی ہیں جو چیز ان کے سامنے سے گزرتی ہے فوراً اس پر ان کی رال ٹپک جاتی ہے۔

ان کی حالت یہ ہے

لختے برداز دل گذر دہر کہ زپشیم

میرے سامنے سے ہر گزرنے والا دل کا ایک ٹکڑا لے جاتا ہے۔

دہلی میں ایک شاعر نے یہ مصرعہ کہا تھا اس کے بعد اگلا مصرعہ نہ بنتا تھا۔ اب آپ بیٹھے غوطے لگا رہے ہیں۔ اسی لیے حق تعالیٰ فرماتے ہیں: "اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ"[1] (اے مخاطب کیا تم کو معلوم نہیں کہ وہ (شاعر) لوگ خیالی مضامین کے) ہر میدان میں حیران پھرا کرتے ہیں)۔ جب شاعر کو کسی مصرعہ کی فکر ہوتی ہے اس وقت اس کی بالکل یہی حالت ہوتی ہے۔ یہ شاعر بھی دوسرے مصرعہ کی فکر میں پریشان اور غلطاں و پیچاں تھا۔ اتفاق سے ایک کنجڑا تربوز کی قاشیں بیچتا ہوا اس کے مکان کے پاس سے یہ صدا لگاتا ہوا گزرا۔

من قاش فروش دل صد پارہ خویشم

میں اپنے دل صد پارہ کی ایک پھانک بیچتا ہوں۔

یہ سن کر شاعر پھڑک گیا کہ میرے مصرعہ کو جوڑ یہی مصرعہ ہوسکتا ہے' اس سے بہتر نہیں ہوسکتا۔ فوراً بھاگا ہوا کنجڑے کے پاس آیا کہ یہ مصرعہ تم میرے ہاتھ بیچ دو۔ مطلب یہ تھا کہ اب سے اگر کوئی پوچھے تو اس مصرعہ کو میری طرف منسوب کرنا' اپنی طرف منسوب نہ کرنا' اس کا کیا حرج تھا۔ مفت میں دام مل گئے۔ شاعر صاحب مصرعہ خرید کر خوشی خوشی واپس ہوئے مگر اس کے اس قصہ سے مقصود پھر بھی حاصل نہ ہوا کیونکہ اب تک لوگ بیان کرتے آ رہے ہیں کہ یہ مصرعہ کنجڑے سے خریدا گیا ہے۔ اگر وہ یہ قصہ نہ کرتا اور ویسے ہی اپنے مصرعہ کے ساتھ یہ دوسرا مصرعہ لگا لیتا تو کسی کو خبر بھی نہ ہوتی کہ یہ مصرعہ کنجڑے کا ہے بلکہ سب اسی شاعر کا سمجھتے۔

عورتیں زیادہ حریص ہوتی ہیں

بہرحال سامان کے بارے میں تو عورتیں بالکل اسی شعر کا مصداق ہیں کہ ہر چیز ان کے لیے دلربا ہے۔ البتہ عفت کے باب میں تو یہ اس کی مصداق نہیں۔ خصوصاً ہندوستان کی عورتیں کہ یہ تو اپنے خاوند کے سوا کسی غیر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتیں نہ ان کے قلب پر غیر کا وسوسہ آتا

[1] (الشعراء آیت نمبر ۲۲۵)

ہے۔ باقی زیور اور لباس میں تو ان کی بالکل یہی حالت ہے کہ جہاں کوئی نئی چیز دیکھی اور ان کی رال ٹپکی۔ چاہے اپنے پاس کتنا ہی زیور ہو اور کیسا ہی عمدہ کپڑا ہو مگر نئی وضع اور نیا طرز دیکھ کر اپنی چیز سے معاً دل اتر جاتا ہے اور دوسری بنوانے کی فکر ہو جاتی ہے۔

مولانا عبدالرب صاحب کا لطیفہ عورتوں کے متعلق خوب ہے۔ فرماتے تھے کہ عورتوں کی یہ حالت ہے کہ چاہے ان کے پاس کتنے ہی برتن ہوں مگر جب پوچھو یہی کہیں گی کیا ہیں، چار ٹھیکرے اور کپڑے کتنے ہی صندوق میں بھرے ہوں مگر جب پوچھو یہی کہیں گی کیا ہیں، چار چیتھڑے اور جوتوں کے جوڑے چاہے کتنے ہی ہوں مگر جب پوچھو یہی کہیں گی، کیا ہیں دو لیترے، قافیہ خوب ملایا ٹھیکرے، چیتھڑے، لیترے۔ آخر تھے نا دہلی کے لطیفہ سنج۔ واقعی عورتوں کی ہے تو یہی حالت۔

ایک عورت نے خود اقرار کیا کہ ہم تو جہنم ہیں۔ جیسے اس کا پیٹ نہ بھرے گا اور **ھل من مزید** کہتی رہے گی۔ ایسے ہی ہمارا پیٹ بھی نہیں بھرتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس انہماک سے منع فرماتے ہیں جس کی وجہ سے غیر ضروری چیزوں میں دل اٹکا ہوا ہے۔

اور اس کا علاج یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے اختصار کرو۔ مثلاً ایک عورت پان چھوڑ سکتی ہے وہ پان چھوڑ دے، ایک چائے کی عادی ہے جس میں دل انکار رہتا ہے وہ چائے چھوڑ دے۔ ایک روپے گز کا کپڑا پہنتی ہے وہ بارہ آنے گز کا پہننے لگے۔ علیٰ ہذا اسی طرح تمام اخراجات اور سامانوں میں اختصار کرو یعنی قدر ضرورت پر اکتفا کرو، پھر ضرورت کے بھی درجے ہیں۔

ا۔ ایک یہ کہ جس کے بغیر کام نہ چل سکے یہ تو مباح کیا واجب ہے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ ایک چیز کے بغیر کام تو چل سکتا ہے مگر اس کے ہونے سے راحت ملتی ہے۔ اگر نہ ہو تو تکلیف ہوگی گو کام چل جائے گا مگر دقت سے چلے گا ایسے سامان کی رکھنے کی بھی اجازت ہے۔

۳۔ ایک سامان اس قسم کا ہے جس پر کوئی کام نہیں اٹکتا، نہ اس کے بغیر تکلیف ہوگی مگر اس کے ہونے سے اپنا دل خوش ہوگا تو اپنا جی خوش کرنے کے واسطے بھی کسی سامان کے رکھنے کا بشرط وسعت مضائقہ نہیں۔ یہ بھی جائز ہے۔

۴۔ ایک یہ کہ دوسروں کو دکھانے اور ان کی نگاہ میں بڑا بننے کے لیے کچھ سامان رکھا جائے، یہ حرام ہے۔

پس جو عورتیں اپنی راحت کے لیے یا اپنا اور اپنے خاوند کا جی خوش کرنے کے لیے قیمتی کپڑا یا زیور پہنتی ہیں ان کو تو بشرط مذکور گناہ نہیں ہوتا اور جو محض دکھاوے کے لیے پہنتی ہیں وہ گنہگار ہیں اور اس کی علامت یہ ہے کہ اپنے گھر میں تو ذلیل و خوار بھنگنوں کی طرح رہتی ہیں اور جب کہیں تقریب

میں نکلیں گی تو نواب کی بچی بن کر جائیں گی جیسے لکھنؤ کے مزدور دن بھر تو لنگوٹہ باندھ کر مزدوری کریں گے اور شام کو کرایہ کے کپڑے پہن کر جیب میں دو پیسے ڈال کر نکلتے ہیں جن میں سے ایک پیسہ کا تو پان کا بیڑا لیں گے اور ایک پیسہ کا پھولوں کا گجرا گلے میں ڈالیں گے جیسے کسی نواب کے بچے ہوں۔

اب عورتیں دیکھ لیں کہ یہ جوڑے بدل بدل کر جاتی ہیں اس میں ان کی نیت کیا ہے۔ اگر اپنی راحت اور دل کی خوشی ہے تو گھر میں اس ٹھاٹھ سے کیوں نہیں رہتیں، بعض کہتی ہیں کہ ہم تو اپنے خاوند کی عزت کے لیے عمدہ جوڑا پہن کر نکلتی ہیں۔ اگر اس تاویل کو مان لیا جائے تو پہلی دفعہ جو ایک جوڑا تم نے تقریب کے لیے نکالا۔ خاوند کی عزت کے لیے تمہارے خیال میں وہی کافی تھا۔ اب دیکھو کہ اگر کبھی تقریب میں پے در پے دو تین دن جانا ہو جائے تو تم تینوں دن اسی ایک جوڑے میں جاؤ گی یا ہر دن نیا جوڑا بدلو گی۔ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ہر دن نیا جوڑا بدلا جاتا ہے۔ آخر یہ کیوں؟ خاوند کی عزت کے لیے تو ایک ہی بہت کافی تھا مگر نہیں! اس واسطے ہر دن نیا جوڑا نہیں بدلتی ہیں۔ اس لیے ایک جوڑے میں ہر دن نہیں جا سکتیں۔ اگر اور بھی کچھ نہ بدلیں گی تو دوپٹہ تو ضرور ہی بدلیں گی کیونکہ وہ سب سے اوپر رہتا ہے، سب کی نظریں اس پر پہلے پڑتی ہیں۔ اس لیے اس کو ضرور ہی بدلیں گی تا کہ ہر دن نیا جوڑا معلوم ہو۔

پھر محفل میں بیٹھ کر ان کو زیور دکھلانے کی حرص ہوتی ہے بعض تو اسی غرض کے لیے ننگے سر رہتی ہیں تا کہ سب کو سر سے پیر تک کا زیور نظر آ جائے اور جو ان میں سے مولون ہیں وہ ننگے سر تو نہیں رہتیں مگر کسی نہ کسی بہانہ سے وہ بھی اپنا زیور دکھلا دیتی ہیں، کہیں سر کھجاتی ہیں، کبھی کان کھجلاتی ہیں۔ یہ ریا ہے اور اس غرض سے قیمتی کپڑا یا زیور پہننا حرام ہے۔

ایک مرض جو عورتوں میں زیادہ ہے!

ایک مرض عورتوں میں یہ ہے کہ جب کہیں یہ محفل میں جاتی ہیں تو سب کے لباس اور زیور کو سر سے پیر تک تاک لیتی ہیں تا کہ دیکھیں کہ ہم سے تو کوئی زیادہ نہیں اور ہم کسی سے گھٹے ہوئے تو نہیں۔ یہ بھی ریاء اور تکبر کا شعبہ ہے۔ یہ مرض مردوں میں کم ہے اگر دس آدمی ایک جگہ مجتمع ہوں تو مردوں میں سے کسی کو اس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ کس کا لباس کیسا ہے۔ اسی لیے مجلس سے اٹھ کر وہ کسی کے لباس کا حال بیان نہیں کر سکتے اور عورتوں میں سے ہر ایک کو یاد رہتا ہے کہ کس بی بی کے پاس کتنا زیور تھا اور لباس کیسا تھا۔ یاد رکھو! اس غرض سے قیمتی لباس وغیرہ پہننا جائز نہیں اور یہ جو

ضرورت وغیرہ کے درجات میں نے لباس وزیور کے متعلق بیان کیے ہیں یہ انہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ یہ درجے ہر چیز میں ہیں، مکان میں بھی اور برتنوں میں بھی، ہر چیز میں ضرورت کا معیار یہ ہے کہ جس کے بغیر تکلیف ہو وہ ضروری ہے اور جس کے بغیر تکلیف نہ ہو وہ غیر ضروری ہے اب اگر اس میں اپنا دل خوش کرنے کی نیت ہو تو مباح ہے اور اگر دوسروں کی نظر میں بڑا بننے کی نیت ہو تو حرام ہے۔ اس معیار کے موافق عمل کرنا چاہیے مگر اس سے ہر شخص خود کام نہیں لے سکتا بلکہ اس پر عمل کرنے کے لیے کسی مربی کی رائے کی ضرورت ہے۔ یہاں سے شیخ کی ضرورت معلوم ہوگئی۔ خوب فرمایا کہ

گرہوائے ایں سفر داری دلا　　دامن رہبر بگیر وپس بیا
یار باید راہ راتنہا مرو　　بے قلاوزاندریں صحرا مرو

اے دل! اگر طریق الفت میں تجھ کو چلنے کی خواہش ہے تو کسی شیخ کامل کا پلہ پکڑ اور خودرائی کو چھوڑ دے۔ واقف کار ساتھی کے بغیر اکیلا سفر میں مت چل۔ خصوصاً صحرائے محبت میں تو شیخ کامل کے بغیر ہرگز قدم نہ رکھ۔ اور اس کیلئے کسی سے بیعت ہو جانا کافی نہیں بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ اپنے کو اس کے سپرد کر دے۔

چوں گزیدی پیر ہیں تسلیم شو　　ہمچو موسیٰؑ زہر حکم خضر رو
صبر کن درکار خضرائے بے نفاق　　تانگوید خضر روہذا فراق

جب تو نے شیخ کامل اختیار کرلیا تو سراپا اطاعت بن جا۔ موسیٰ علیہ السلام کی طرح خضر علیہ السلام کے حکم پر چل اے مخلص خضر راہ کے حکم کی علت معلوم کرنے میں جلدی مت کرنا کہ تجھ کو تیرا خضر راہ "هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ"[1] (کہ یہ وقت ہماری اور آپ کی علیحدگی کا ہے) نہ کہہ دے۔

غرض ہر بات کو شیخ سے پوچھو کہ میں یہ کام کرنا چاہتا ہوں، یہ ضروری ہے یا غیر ضروری۔ اس سے پوچھ کر کچھ عرصہ کرو ان شاءاللہ ایک دن تم بھی محقق ہو جاؤ گے۔ "وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ"[2] (اور جو شخص اللہ پر (پورا) ایمان رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو (صبر و رضا) کی راہ دکھا دیتا ہے) محقق ہونے کی صورت یہی ہے کہ پہلے اپنے کو کسی کے سپرد کر دو اور اس کے کہنے کے موافق عمل کرو اور محض عمل بھی کافی نہیں بلکہ حال کی ضرورت ہے مثلاً یہی بات جس کا ذکر ہو رہا ہے دل کو لگ جائے کہ ہم دنیا میں مسافر ہیں۔ یہ بھی شیخ ہی کے سپرد ہونے سے حاصل ہوگا مگر افسوس! اب تو مشائخ بھی اس حال سے خالی ہیں۔ چنانچہ ان کو جو کوئی بھی کچھ ہدیہ دیتا ہے فوراً لے لیتے ہیں اور غیر

---

[1] (الکہف آیت نمبر ۷۸) [2] (التغابن آیت نمبر ۱۱)

ضروری چیزوں کا ذخیرہ بھی رکھتے ہیں۔

بعض مشائخ کے یہاں جانمازیں اور قالین غیر محدود جمع ہو جاتے ہیں۔ بھلا کوئی پوچھے کہ تم اتنی جانمازیں کیا کرو گے؟ پھر ایک صورت تو یہ ہے کہ بے ضرورت سامان اس نیت سے لے لیا جائے کہ ہم کو گو ضرورت نہیں مگر اپنے احباب و متعلقین میں سے کسی کو دیدیں گے ان کے کام آ جائے گا اس کا تو مضائقہ نہیں۔ مگر یہاں تو حالت یہ ہے کہ اس کو لے لے کر حفاظت کے ساتھ رکھا جاتا ہے اور اگر اس میں سے کوئی چیز ضائع ہو جائے تو خدام پر مار دھاڑ ہوتی ہے کیونکہ قلب کو اس سے تعلق ہو گیا ہے۔

دنیا میں بے وطن کی طرح رہو

اگر ''کن فی الدنیا کانک غریب[1]'' دنیا میں بے وطن کی طرح رہو۔ ان کا حال بن جاتا تو یہ حالت نہ ہوتی۔ حال تو ایسا ہونا چاہیے جیسے غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایک آئینہ چینی ہدیہ میں آ گیا تھا آپ نے ہدیہ دینے والے کو دل خوش کرنے کے لیے خادم سے فرمایا کہ اس کو احتیاط سے رکھو اور جب ہم کنگھی کیا کریں اس وقت سامنے رکھ دیا کرو۔ لوگ سمجھے ہوں گے کہ شیخ کو اس سے تعلق ہو گیا ہے۔ اتفاق سے ایک دن خادم کے ہاتھ سے وہ آئینہ گر کر ٹوٹ گیا' وہ ڈرا کہیں عتاب نہ ہو' ڈرتے ڈرتے اس نے عرض کیا:

از قضا آئینہ چینی شکست

''قضائے الٰہی سے آئینہ چینی ٹوٹ گیا''

حضرت غوث اعظم نے فوراً فی البدیہہ جواب دیا

خوب شد اسباب خود بینی شکست

یعنی بہت خوب جو اسباب خود بینی کو شکست ہوئی۔

نیز حال ایسا ہوتا ہے کہ ایک دفعہ ملک سنجر نے حضرت کو لکھا کہ میں آپ کی خانقاہ کے لیے ملک نیمروز کی آمدنی مقرر کرنا چاہتا ہوں' اجازت عطا فرمایئے' آپ نے یہ قطعہ جواب میں لکھ کر بھیجا۔

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد   دردل بود اگر ہوس ملک سنجرم
زانکہ کہ یافتم خبراز ملک نیم شب   من ملک نیمروز بیک جونمی خرم

''سنجر کے بادشاہ کے چھتر کی طرح میرا نصیبہ سیاہ ہو اگر میرے دل میں ملک سنجر کی ادنیٰ ہوس بھی ہو جس دن سے ملک نیم شبی کی بدولت ملی ہے میں ملک نیمروز کا ایک دانہ جو کے بدلے

---

[1] (انظر تخریج الحدیث الرقم: ۱۲)

بھی خریدار نہیں ہوں۔"

آخر حضرت ابراہیم بن ادھمؒ میں کیابات تھی جوانہوں نے سلطنت چھوڑ دی۔ عقل اس کے لیے کافی نہیں، نہ علم سے یہ بات ہوسکتی ہے، ہزاروں تاویلیں اس میں ہم ہی کر لیتے کہ سلطنت نہ چھوڑنا چاہیے کیونکہ اس میں خدمت خلق ہے۔ دوسرے ہمیں بحمد اللہ دین کا خیال ہے، ہماری سلطنت سے دین کی اشاعت وخدمت ہوگی۔ کوئی دوسرا نہ معلوم دین کا خیال کرے یا نہ کرے مگر صاحب ان پر تو حال غالب تھا جس نے سب تاویلوں کا دروازہ بند کر دیا۔ صاحب حال کو تاویلیں سوجھتی ہی نہیں، حال کے غلبہ کے آثار ہی دوسرے ہوتے ہیں۔

ایک دفعہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ نے حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہ سے عرض کیا کہ حضرت میں ملازمت چھوڑنا چاہتا ہوں۔ حاجی صاحب نے فرمایا مولوی صاحب ابھی تو پوچھ ہی رہے ہو، پوچھنا دلیل تردد کی ہے اور تردد دلیل خامی کی ہے۔ خامی میں نوکری چھوڑنا مناسب نہیں، جب وقت آئے گا تو رسی تڑا کر بھاگو گے، لوگ تم کو پکڑنا چاہیں گے اور تم روکے نہ رکو گے۔ یہ ہوتی ہے حالت حال کی۔

مقصود حال نہیں اعمال ہیں

صاحبو! حال پیدا کرو، بدوں حال کے کام نہیں چل سکتا۔ گو حال مقصود نہیں بلکہ مقصود اعمال ہیں، اگر بدوں حال کے بھی آدمی عمل پر جما رہے تو کامیاب ہوجائے گا مگر بدوں حال کے عمل پر استقامت دشوار ہے، اسکی ایسی مثال ہے جیسے ریل کو آدمی ٹھیلتے ہوں۔ آخر کہاں تک ٹھیلیں گے، تھوڑی دور چل کر رہ جائیں گے۔ پھر کچھ بھی حرکت نہ ہوگی اور حال کے ساتھ عمل کی ایسی مثال ہے جیسے انجن کی اسٹیم گرم ہو اور وہ ریل کو لئے جا رہا ہو، اب وہ بدوں روکے ہوئے تھوڑا ہی رکے گا۔ اگر اس کے روکنے کو راستہ میں لکڑ اور پتھر بھی رکھ دو گے تو وہ سب کو پھینک پھانک چل دے گا۔ عراقی اسی کی طلب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

صنما! رہ قلندر سزدار بمن نمائی ۔۔۔ کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

"میرے مرشد! مجھے تو طریق جذب کا رستہ دکھلا دے کیونکہ ریاضت ومحنت کا راستہ بہت مشکل معلوم ہوتا ہے"

رہ قلندر سے مراد طریق حالی ہے اور رسم پارسائی سے عمل محض کا طریق مراد ہے تو فرماتے ہیں کہ طریق عمل محض تو بہت دور دراز ہے اس میں غوائل بہت ہیں، آدمی کہاں تک

اپنے کو ٹھیلتا رہے اور کہاں تک خلوص واخلاص کی رعایت کرے، کبھی ریاء پیدا ہوتا ہے کبھی عجب پیدا ہوتا ہے سب سے الگ الگ کہاں تک بچے۔ چنانچہ اسی کو آگے فرماتے ہیں:

بطواف کعبہ رفتم بحرم رہم نداوند — کہ برون در چہ کردی کہ درون خانہ آئی

بزمیں چو سجدہ کردم ززمیں ندا برآمد — کہ مرا خراب کردی تو بسجدہ ریائی

بقمار خانہ رفتم ہمہ پاکباز دیدم — چو بصومعہ رسید ہمہ یافتم رہائی

''طواف کعبہ کے لیے میں گیا تو مجھے حرم کے در پر روک کر کہا کہ باہر کیا ہی کیا ہے جو اندر آ کر پورا کرنے کی آرزو ہے۔ جب زمین پر میں نے سجدہ کیا تو زمین پکاری مجھ کو تو نے ریائی سجدہ کر کے گندہ کر دیا' میں جوئے خانہ میں پہنچا تو وہاں سب کو جوئے کے عہدوں پر مخلص پایا' عبادت خانہ میں گیا تو اکثر کو خلوص سے خالی پایا۔''

غرض اخلاق عمل بدوں حال کے بسہولت نصیب نہیں ہوتا اور حال بدوں کسی شیخ کی صحبت کے حاصل نہیں ہوتا۔

نفس نتواں کشت الاظل پیر — دامن آں نفس کش راسخت گیر

''نفس کا شیخ کامل کی سرپرستی کے سوا قابو میں آنا مشکل ہے اس مصلح نفس کے دامن کو مضبوطی سے پکڑ لے'' بدوں طریق حالی کے ہوائے نفس کا غلبہ رہتا ہے۔ محض عمل میں نفس نہیں رہتا بلکہ غلبہ حال ہی سے دبتا ہے اور حال کیونکر پیدا ہوتا ہے دوام عمل اور کسی قدر ذکر اور صحبت کاملین سے' میں دعویٰ کرتا ہوں کہ ان تین چیزوں کو اختیار کرلو ان شاء اللہ حال پیدا ہو جائے گا۔

پھر ضرورت ہے اس کے ابقاء کی' پھر ترقی کر کے یہی حال مقام ہو جائے گا اور دونوں میں یہ فرق ہوگا کہ صاحب مقام کی حالت تو ظاہر میں عوام متدین کی طرح ہوگی اور باطناً اس کو ترقی ہوگی۔ منتہی کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ دل سب سے الگ اور ہاتھ میں سب کچھ۔ اگر سلطنت بھی اس کے ہاتھ میں ہو تو اس سے بھی دل کو تعلق نہیں ہوتا۔ اگر ہزاروں لاکھوں روپے بھی اس کے پاس ہوں تو دل کو ان سے ذرا بھی لگاؤ نہیں ہوتا' جب اس سے کہا جائے کہ اٹھو چلو اسی وقت سب کو چھوڑ کر الگ ہو جائے گا کیونکہ وہ اس کو اپنا مال ہی نہیں سمجھتا۔ اس پر تو ہر وقت یہ حال غالب ہے۔

فی الحقیقت مالک ہر شے خدا است — ایں امانت چند روزہ نزد ماست

''حقیقت میں ہر چیز کا مالک تو خدا ہی ہے ہمارے پاس یہ چیزیں کچھ دنوں کے لیے امانت ہیں۔''

جب وہ ہر شے کو خدا کی ملکیت سمجھتا ہے تو اس کو فکر کی کیا ضرورت ہے۔ اب زیادہ تفصیل کا

اول تو وقت نہیں۔ دوسرے مقامات کی علامات بالکل ابتداء کے مشابہ ہوتی ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہیں احمق مبتدی ان سے دھوکا نہ کھا جائے اور اپنے آپ کو کامل نہ سمجھ جائے کیونکہ صاحب مقام میں تمکین اور استقامت کی وجہ سے حالات کا غلبہ نہیں ہوتا تو جیسے مبتدی حالات سے کورا ہوتا ہے ایسے ہی وہ بھی نظر آتا ہے۔ اس میں بظاہر عوام سے کچھ امتیاز نہیں ہوتا مگر واقع میں امتیاز ہوتا ہے۔ اس امتیاز میں مبتدی اور متوسط اور منتہی کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص نے تو شراب کبھی پی ہی نہ ہو اس لیے ہوش میں ہے یہ تو مبتدی ہے اور ایک شخص نے تو شراب پینا شروع کی ہے اس لیے مست ہے یہ متوسط ہے اور ایک شخص برسوں سے پینے کا عادی ہے اس کو کسی قدر تو نشہ ہوتا ہے مگر زیادہ نہیں۔ یہ منتہی ہے گو وہ متوسط سے زیادہ شراب پی گیا ہے مگر عادت ہو جانے کی وجہ سے اس پر متوسط کے برابر نشہ نہیں ہوتا اور متوسط نے ابھی تھوڑی ہی سی پی ہے مگر وہ نشہ کا تحمل نہیں کر سکتا' آپے سے باہر ہے کبھی انا الحق کہتا ہے کبھی چیختا چلاتا ہے اس کو سب پہچان جاتے ہیں اور منتہی کو خاص خاص ہی پہچانتے ہیں۔ اسی کو شیخ عبدالحق ردولویؒ فرماتے ہیں:

منصور بچہ بود کہ از یک قطرہ بفریاد آمد — اینجا مردانند کہ دریا ہا فرد برند و آروغ نہ زنند

یعنی منصور کامل نہ تھے' متوسط السلوک تھے اس لیے ایک قطرہ ہی سے چلانے لگے اور یہاں کامل ہیں کہ دریا کے دریا پی جائیں اور ڈکار بھی نہ لیں۔

سو بات وہی ہے کہ کامل پر بوجہ تمکین و استقامت کے حالات کا زیادہ غلبہ نہیں ہوتا وہ از جا رفتہ نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ اور مبتدی یکساں معلوم ہوتا ہے اور اس کی علامات بھی ابتداء کے مشابہ ہوتی ہیں جن سے مبتدی کو اپنے کمال کا دھوکا ہو سکتا ہے اس لیے مقامات کی تفصیل اور ان کی علامات کا بیان نہیں کرتا اور نہ ابھی اس کی ضرورت ہے آپ پہلے حال ہی تک پہنچ جائیں پھر مقام تک پہنچانے والے بھی ان شاء اللہ مل جائیں گے' ابھی تو تین سبق پڑھنے ہیں۔

تین ضروری اسباق

اول علم .... پھر عمل .... پھر حال .... جب تم یہ تین سبق پورے کر لو گے تو چوتھا سبق کوئی اور پڑھا دے گا۔ خواہ ہم بھی پڑھا دیں یا کوئی اور اللہ کا بندہ پڑھا دے۔ پس جن کو علم حاصل نہیں وہ علم حاصل کریں اور جن میں علم ہے عمل نہیں وہ عمل کا اہتمام کریں اور جن میں علم و عمل دونوں ہیں مگر حال نہیں وہ اپنے اندر حال پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

سو جب اس حدیث کو یعنی "کن فی الدنیا کانک غریب"[1] کا حال طاری ہوگا اس کی یہ علامات ہوں گی کہ غیر ضروری سامان میں اس کو انہماک نہ ہوگا۔ نیز وہ کسی سے لڑے بھڑے گا نہیں کیونکہ مسافر کو کوئی برا بھلا کہہ دے تو وہ اس کی وجہ سے اپنی منزل کھوٹی نہیں کیا کرتا۔ چنانچہ اسٹیشن اور سرائے میں کسی کو کسی سے تکلیف پہنچ جائے تو رپٹ نہیں لکھوایا کرتا کیونکہ جانتا ہے کہ اس کے لیے قیام کی ضرورت ہے اور مجھے قیام کی فرصت نہیں۔ سفر میں رپٹ وہی لکھوائے گا جو اپنے کو مسافر نہ سمجھے۔ یہ میں نے اس واسطے کہہ دیا کہ شاید کوئی یہ کہے کہ میں تو سفر میں بھی لڑا کرتا ہوں' اس کا جواب میں نے دے دیا کہ اس وقت تم اپنے کو مسافر نہیں سمجھتے اگر اپنے کو مسافر سمجھتے تو ہرگز ان قصوں میں منزل کھوٹی نہ کرتے۔

دوسرا ایک اور جواب ہے وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قربان جایئے کہ آپ نے یہاں "کَانَّکَ" مسافر نہیں فرمایا بلکہ "کَانَّکَ غریب" فرمایا ہے غریب کے لازم معنی مسافر کے ہیں ورنہ اصلی معنی اجنبی اور بے یار و مددگار کے ہیں۔ پس غریب مطلق مسافر کو نہیں کہیں گے بلکہ غریب وہ مسافر ہے جو بے یار و مددگار ہو تو مطلب حدیث کا یہی نہیں کہ دنیا میں مسافر محض کی طرح رہو کیونکہ بعضے مسافر بے یار و بے مددگار نہیں ہوتے ان کے اخلاق اور طرح کے ہوتے ہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس مسافر کی طرح رہو جو پردیس میں اجنبی اور بے یار و مددگار رہو۔ اب اس سوال کا دوسرا جواب بھی نکل آیا کہ سفر میں وہی مسافر لڑے گا جو کسی کو اپنا حامی سمجھتا ہو اور جو اپنے کو بے یار و مددگار سمجھے گا وہ کبھی نہ لڑے گا ایک جگہ میں نے ایک مسافر کو دیکھا کہ لوگ اس کے سر ہو رہے تھے کہ غسل خانہ میں تو نے پاخانہ پھرا ہے اور وہ بے چارہ خاموش تھا کیونکہ اپنے کو بے یار و مددگار سمجھ رہا تھا۔ حدیث میں اسی مسافر سے تشبیہ ہے جسکی یہ شان ہو اور یہی معنی ہیں اس حدیث کے۔

اسلام کی ابتداء اور انتہا

ان الاسلام بدء غریبا وسیعود غریبا فطوبیٰ للغرباء۔[2]

کہ اسلام غریب ہو کر ظاہر ہوا اور اخیر میں بھی غریب ہو جائے گا۔ یہاں غریب کے معنی مسکین نہیں کیونکہ دین کسی حال میں مسکین نہیں تھا۔ اگر مسکین ہوتا مالداروں کی خوشامد کرتا' ان سے دبتا۔ حالانکہ اسلام نے تو شروع ہی سے متکبرین کو نیچا دکھایا ہے ان کے آلہہ باطلہ کی صاف صاف مذمت کی ہے اور ان کو اپنی اتباع و اطاعت کی دعوت دی ہے مسکین کہیں ایسے بھی ہوتے ہیں۔ ہاں

[1] (انظر تخریج الحدیث الرقم: ۱۲)

[2] (الصحیح للبخاری کتاب الایمان: ۲۳۲' سنن الترمذی: ۱۶۲۹' سنن ابن ماجہ: ۳۹۸۸' المسند للامام احمد بن حنبل ۱:۳۱۸' سنن الدارمی ۲:۳۱۲' تفسیر ابن کثیر ۳:۲۳' ۷:۲۳۹)

ابتداء میں دین بے یارو بے مددگار اور اجنبی البتہ تھا کہ لوگوں نے اس کا ساتھ کم دیا۔ زیادہ آدمیوں نے مخالفت ہی کی۔ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اخیر میں بھی دین اجنبی اور بے یارومددگار ہو جائے گا کہ لوگ زیادہ تر اس کی مخالفت کریں گے' موافقت نہ کریں گے۔ "فطوبیٰ للغرباء" یعنی مبارکباد ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو اس حالت میں دین پر جمے رہیں اور دنیا میں اجنبی اور بے یارومددگار بن کر رہیں کیونکہ جس زمانہ میں دین کی مخالفت ہوگی اہل دین کی بھی ضرور مخالفت ہوگی۔ اس وقت اہل دین بھی غرباء ہوں گے۔ یعنی بے یارومددگار اور یہ لوگ اہل حق ہیں جو حق پر جمے رہتے ہیں اور جس طرح وہ غرباء ہیں اسی طرح وہ غرباء کی طرح رہنے کا قصد بھی کرتے ہیں جس کی تعلیم اس حدیث میں ہے اس لیے ان کو کسی کی مخالفت کی پروا نہیں ہوتی کیونکہ وہ تو "کن فی الدنیا کانک غریب"[1] پر عمل کر کے دنیا میں اپنے کو بے یارومددگار سمجھتے ہیں۔ وہ خدا کے سوا کسی کو اپنا ساتھی نہیں سمجھتے۔ لہٰذا کسی کی مخالفت سے ان کو رنج نہیں ہوتا۔ اگر تمام دنیا ان کو چھوڑ دے جب بھی ان کے حال میں فرق نہیں آتا۔ وہ سب سے آزاد ہیں ان کی وہ حالت ہوتی ہے۔

زیر بارند درختاں کہ ثمر ہا دارند　　اے خوشا سرو کہ از بند غم آزاد آمد

"جو درخت پھل پھول والے ہیں بوجھ میں دبے ہوئے ہیں' سرو کتنا اچھا ہے جو ہر قسم کی خوشی و غمی سے آزاد ہے"

ان سے زیادہ راحت میں کوئی نہیں ہوتا اور اخیر انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں بھی بادشاہت کرتے ہیں۔ مخالفین اخیر میں خود ہی ان کے غلام ہو جاتے ہیں اور اگر فرضاً ظاہر میں دنیا میں بادشاہ نہ بھی ہوئے تو آخرت میں تو وہی بادشاہ ہوں گے۔

خلاصہ یہ کہ تم دنیا میں مسافر اجنبی بے یارومددگار کی طرح بن کر رہو' دنیا کو اپنا گھر نہ سمجھو اور اس مضمون کو اپنا حال بنا لو' ان شاء اللہ پھر تعلقات زائدہ اور فضول سامان سے تم کو خود ہی نفرت ہو جائے گی اور خدا تعالیٰ کی طرف توجہ بڑھے گی۔ یہی مطلوب ہے اور اسی کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں فرمائی ہے۔ اب دعا کیجئے کہ ہم کو توفیق عمل نصیب ہو۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ.

---

[1] (انظر تخریج الحدیث الرقم: ۱۲)

الرضا بالدنیا

رضا اور اطمینان میں فرق ہے۔ رضا امرِ عقلی ہے اور اطمینان امر طبعی۔ بعض دفعہ انسان ایک فعل کو عقلاً پسند کرتا ہے مگر دلچسپی نہیں ہوتی۔ جیسے کڑوی دوا پینا کہ عقلاً تو پسند ہے مگر اس کے ساتھ پوری دلچسپی نہیں ہوتی اور کبھی دلچسپی تو ہوتی ہے مگر عقلاً ناپسند کرتا ہے۔ جیسے زنا وغیرہ غرض یہ کہ کبھی رضا ہوتی ہے اور اطمینان نہیں ہوتا اور کبھی بالعکس لیکن وہ حالت بڑی سخت ہے کہ رضا اور اطمینان دونوں نہیں۔

آخرت سے غفلت اور دنیا کی مصروفیت کے متعلق یہ وعظ مسجد علی حسن صاحب جلال آباد میں ۱۵ صفر ۱۳۳۰ھ کو تقریباً ۱۰۰ آدمیوں کے مجمع میں ہوا۔ ڈیڑھ گھنٹہ میں ختم ہوا اور مولوی سعید احمد صاحب نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ نَحۡمَدُهٗ وَنَسۡتَعِیۡنُهٗ وَنَسۡتَغۡفِرُهٗ وَنُؤۡمِنُ بِهٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡهِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمن سیئات اعمالنا مَنۡ یَّهۡدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡهُ فَلاَهَادِیَ لَهٗ وَنَشۡهَدُ اَنۡ لَّااِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحۡدَهٗ لَاشَرِیۡکَ لَهٗ وَنَشۡهَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُهٗ وَرَسُوۡلُهٗ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیۡهِ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ.اَمَّابَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ. اِنَّ الَّذِیۡنَ لَایَرۡجُوۡنَ لِقَآءَ نَا وَرَضُوۡا بِالۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا وَاطۡمَاَنُّوۡابِهَا وَالَّذِیۡنَ هُمۡ عَنۡ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوۡنَ اُولٰٓئِکَ مَاۡوٰهُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ٥ (سورۂ یونس:۷-۸)

ترجمہ: جن لوگوں کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے اور وہ دنیوی زندگی پر راضی ہوگئے ہیں (آخرت کی طلب اصلاً نہیں کرتے) اور اس میں جی لگا بیٹھے ہیں (آئندہ کی کچھ خبر نہیں) اور جو لوگ ہماری آیتوں سے بالکل غافل ہیں ایسے لوگوں کا ٹھکانا ان کے اعمال کی وجہ سے دوزخ ہے)

تمہید

ان آیتوں میں حق سبحانہ وتعالیٰ نے ایک خاص جماعت کی مذمت ایک خاص صفت پر فرمائی ہے جس جماعت کی مذمت اس میں ہے۔ بحمداللہ حاضرین میں اس جماعت کا ایک فرد بھی نہیں ہے لیکن اس سے اس بیان کو بے ربط یا بے ضرورت نہ سمجھنا چاہیے بلکہ اس میں غور کرنا چاہیے کہ جس کی مذمت ہوتی ہے ذات کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ منبع مذمت کا خاص صفات ہوتی ہیں تو صفات ذمیمہ جس میں ہوں گی وہ مذموم ہوگا جس میں نہ ہوں گی وہ نہ ہوگا۔ چنانچہ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ جس کی مذمت فرمائی گئی ہے ساتھ ہی وہ صفات بھی ذکر فرمادی ہیں جن پر مذمت فرمائی گئی ہے اسی طرح خوشنودی اور رضا میں بھی ان کا خاص منشاء صفات ہی ہوتی ہیں کہ چونکہ یہ صفات ان میں پائی جاتی ہیں اس لیے ہم ان سے خوش اور راضی ہیں۔

تو معلوم ہوا کہ مدح اور مذمت وغیرہ کا مدار حمیدہ یا ذمیمہ صفات ہیں جس میں جیسی صفات ہوں گی ویسے ہی آثار اس پر مرتب ہوں گے اس کے بعد یہ اشکال رفع ہو جائے گا کہ جس جماعت کے باب میں یہ آیتیں ہیں جب حاضرین میں ان میں سے ایک فرد بھی نہیں تو ان آیتوں کو کیوں اختیار کیا گیا اور ترجمے سے معلوم ہو جائے گا کہ کس جماعت کی مذمت ہے مگر میں پہلے ہی بتلائے دیتا ہوں کہ وہ جماعت کفار کی ہے اور اسی وجہ سے وہ شبہ بھی ہوتا تھا کہ یہاں اس کی تلاوت کی کیا ضرورت ہوئی اور اسی شبہ کی بناء پر بعض لوگ یہ سن کر کہ فلاں آیت کفار کے حق میں ہے بےفکر بھی ہو جاتے ہیں کہ خیر ہم تو اس کا مورد نہیں ہیں مگر غور کرنے کی بات ہے کہ وہ آیت جو کفار کی شان میں ہے وہ مسلمانوں کے لیے بجائے بےفکر کرنے کے بہت بڑا تازیانہ ہے مگر مسلمان اس کو سن کر بےفکر ہو جاتے ہیں کہ یہ تو کفار کی شان میں ہے۔

صفات حمیدہ بناء رضا ہیں

صاحبو! یہ صحیح ہے کہ یہ کفار کی مذمت ہے اور قرآن شریف میں اکثر مواقع پر کفار ہی کی مذمت کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی مذمت قرآن شریف میں بہت کم ہے مگر یہ غور کرنے کی بات ہے کہ کفار کی مذمت ہم مسلمانوں کو کیوں سنائی گئی ہے۔ مطلب اس سے یہ ہے کہ ان صفات کا مسلمانوں میں ہونا بہت زیادہ عجیب ہے۔ یہ صفات تو صرف کفار میں ہوتیں۔ ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کو کسی کی ذات سے بغض نہیں۔ کسی کی ذات سے محبت نہیں بلکہ صفات حمیدہ بنائے رضا ہیں اور صفات ذمیمہ بنائے ناراضی و مذمت ہیں۔ تو اگر وہی صفات ذمیمہ مسلمانوں میں بھی ہوں جو مدعی اطاعت اور عبدیت کے ہیں تو ان کو اور بھی شرمانا چاہیے کہ کفار کی جن صفات پر لتاڑا گیا ہے ہم میں وہی صفات ہیں تو ان کی درستی بہت زیادہ کرنی چاہیے۔

مثلاً ایک باغی کو بادشاہ برا بھلا کہے کہ تو نے بغاوت کی، تو نے سرکار کا مقابلہ کیا تو نے یہ کیا، تو نے وہ کیا۔ اس خطاب کو سن کر دوسرے اہل جرائم کو بھی ڈرنا چاہیے اور بےخوف نہ ہونا چاہیے۔ اس کو یہ دیکھنا چاہیے کہ جو الزامات باغی پر لگائے گئے ہیں وہ مجھ میں تو نہیں ہیں۔ بعضاً یا کلاً یا مثلاً ایک باوجاہت آدمی ظلم کرتا ہے اور رعایا کو ستاتا ہے یا ڈکیتی کرتا ہے لیکن باغی نہیں ہے ہاں فوجداری کی بہت سی دفعات اس پر عائد ہیں اور اتفاق سے اسی کے سامنے بادشاہ نے ایک باغی کو تہدید کی اور ان صفات پر بھی تہدید کی جو اس کے اندر بھی پائی جاتی ہیں تو اس کو بھی کان ہونے چاہئیں۔ ہاں ایک فرق ضرور ہے کہ اگر جرائم کم ہوں گے تو ناخوشی کم ہوگی اور اگر زائد ہوں گے تو ناخوشی زائد ہوگی۔

بد دین مسلمان کافر سے بہتر ہے

سو مسلمان خواہ کیسا ہی بد دین مجرم ہو مگر اس کے جرائم کافر کے برابر نہیں ہو سکتے۔ تو یہ تو ماننا پڑے گا کہ مسلمان سے اتنی ناخوشی نہ ہوگی لیکن اس پر تو تسلی نہ ہونی چاہیے کہ ہم سے کم ناخوشی ہے۔ دیکھو! اگر کسی مجرم کو دس برس کی قید ہو اور دوسرے کو پانچ برس کی تو کیا اس دوسرے کو بے فکری ہوگی؟ میرے خیال میں کوئی عاقل ایسا نہیں کہ وہ اس درجہ سے بے فکر ہو جائے کہ میری سزا فلاں شخص سے تو کم ہے بلکہ ایک باریک بات یہ ہے کہ بعض اوقات بڑی دفعہ اور بڑی سزا سن کر اتنی کلفت نہیں ہوتی جتنی چھوٹی دفعہ اور چھوٹی سزا سن کر ہوتی ہے کیونکہ بڑی سزا میں تو مایوسی ہو جاتی ہے اور مشہور ہے۔ الیاس احدی الراحتین)

ایک شخص کا واقعہ ہے کہ اس کو ایک جرم میں جج نے سات برس کی قید کا حکم دیا اور اس سے کہا کہ دیکھو تم اپیل نہ کرنا ورنہ تم کو زیادہ سزا ہو جائے گی۔ میں نے تم کو بہت کم سزا دی ہے۔ مگر اس شخص نے اپیل کی، اس میں شاید ۲۸ برس کی سزا ہوئی۔ ۲۸ برس کا نام سن کر اس کو بالکل یاس ہو گئی کہ اب زندہ بچ کر نہیں نکل سکتا اور اس یاس سے گونہ راحت ہو گئی۔

تو اس حیثیت سے تو مسلمان کو چھوٹی سزا سن کر زیادہ فکر میں پڑنا چاہیے کہ اس کو تو یاس بھی نہ ہوگی۔ غرض اس حیثیت سے یہ تفاوت ہے۔ اگرچہ دوسری حیثیت سے دوسرے تفاوت بھی ہیں مگر میں نے اس کو اس لیے بیان کیا کہ بے فکری نہ رہے کیونکہ اس کو سن کر کہ ایک نہ ایک دن دوزخ سے نکل آئیں گے اکثر لوگ بے فکر ہیں۔ سو یہ بڑی غلطی کی بات ہے کہ تھوڑی سزا کو سن کر بے فکر ہو جائے۔ غرض کفار اور مسلمانوں کی سزا میں تفاوت کا انکار نہیں لیکن وہ تفاوت بے فکر نہیں کر سکتا بلکہ زیادہ فکر ہونا چاہیے یا برابر ہی ہو یا کم ہی فکر ہو۔

دین سے بے فکری کی سزا

مگر تو ہم دیکھتے ہیں کہ بالکل ہی بے فکر بیٹھے ہیں۔ بعض تو بالکل ہی خیال نہیں کرتے ان کی تو شکایت ہی کیا مگر غضب تو یہ ہے کہ بعض خبردار بھی بے فکر ہیں۔ کہتے ہیں کہ کفار کے برابر سزا تھوڑا ہی ہوگی۔ میں اس بے فکری کے رفع کرنے کے لیے یہ تمام تقریر کر رہا ہوں کہ اس خیال کو کبھی دل میں نہ لائے اور اس اعتراض کا جواب دے رہا ہوں کہ یہ تو کفار کے حق میں ہے پھر ہم کو کیا فکر۔

جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ جن صفات پر کفار کو یہ وعید سنائی گئی ہے اگر آپ میں بھی وہ صفات ہیں

تو آپ کو ضرور فکر ہونی چاہیے۔ دوسرے اگر چمار کہہ کر دس جوتیاں مار لی جائیں تو عجب نہیں لیکن اگر کسی بڑے آدمی کو یہ کہہ دیا جائے تو نہایت شرم کی بات ہے تو کافروں کو اگر "منکر لقاء اللہ اور راضی بالحیوۃ الدنیا اور غافل عن الآیات" کہہ دیا جائے تو کچھ عجب نہیں لیکن اگر مسلمان میں یہ صفات پائی جائیں اور اس وجہ سے اس کا اتصاف ان کے ساتھ ہو تو زیادہ شرم کی بات ہے اور لیجئے اگر کسی کو بھنگی کے ساتھ قید کر دیں تو اس کے لیے کتنی ننگ کی بات ہے۔ یاد رکھو کہ جہنم کافروں کے لیے ہے مگر مسلمان اپنے ہاتھوں وہ اخلاق اختیار کر کے جو کافروں میں پائے جاتے ہیں۔ ("من تشبّہ بقوم فھو منھم"[۱])
(جس نے کسی قوم سے مشابہت اختیار کی پس وہ ان میں سے ہے) کے مصداق بنتے ہیں اور ان کے ساتھ قید ہونے کے کام کرتے ہیں۔

تشبّہ کے معنی و شرح

اس حدیث میں تشبّہ کو اول تو لوگوں نے اڑا ہی دیا اور اگر لیا بھی ہے تو صرف لباس میں۔ بہت سے ثقات بھی اس میں مبتلا ہیں کہ وضع اہل شرع کی بنا کر اپنے کو متقیوں میں شمار کرنے لگے۔ گو افعال کیسے ہی ہوں لیکن اس حالت میں اس خیال کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے میرے وطن میں ایک بہروپیا میرے پاس انعام لینے کی غرض سے کسی بوڑھے کی شکل بنا کر آیا۔ ایک شخص نے مجلس میں کہا کہ خدا کے یہاں ان بہروپیوں کی کیا حالت ہوگی کہ کبھی عورت بنتے ہیں، کبھی اور کوئی مکر کی شکل بناتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ہم وہاں اس طرح تھوڑا ہی جائیں گے۔ مولویوں کا لباس پہن کر جائیں گے بس فوراً مغفرت ہو جائے گی میں نے ڈانٹا کہ کیا واہیات ہے۔ کیا خدا تعالیٰ کو کوئی دھوکا دے سکتا ہے۔ یہی حالت ہماری ہے کہ شکل تو بنا لیتے ہیں علماء کی فضلاء و صلحاء کی لیکن باطن میں سینکڑوں خباثتیں بھری ہیں۔

از بروں چوں گور کافر پر حلل — واندروں قہر خدائی عزوجل
از بروں طعنہ زنی بر بایزید — وز درونت ننگ میدارد یزید

کہ صورت تو کافر کی قبر کی سی نہایت مزین۔ اسی کو کہتے ہیں "از بروں طعنہ زنی بر بایزید" کہ بیرونی وضع تو ایسی کہ بایزید بھی شرما جائیں اور قلب کی یہ حالت کہ یزید کو بھی اس سے عار آئے ہم میں صورت کے دیندار تو بہت ہیں مگر سیرت کے دیندار کم ہیں۔

---

[۱] (سنن ابی داؤد: ۴۰۳۱، المسند للامام احمد بن حنبل ۲: ۵۰، ۹۲، المصنف لابن ابی شیبۃ ۵: ۳۱۳، ۳۲۲، کنز العمال: ۲۴۶۸۰، مشکوٰۃ المصابیح: ۴۳۴۷)

غرض یہ حدیث صورت اور لباس ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر حالت کو عام ہے اور لوگ اس حدیث میں خواہ مخواہ کلام کرتے ہیں۔ یہ تو عقلی بات ہے اور ہر کس و ناکس اس کو سمجھتا ہے۔ دیکھو! اگر کوئی شخص لغو و بیہودہ باتیں کرنے لگے تو اس کو کہتے ہیں کہ تو چمار ہو گیا یا اگر ایک شخص ہر وقت ہیجڑوں میں رہنے لگے تو انہی میں شمار ہونے لگے گا۔ جب یہ بات ہے تو اگر ہم اخلاق کافروں کے اختیار کریں گے تو ہم بھی ان ہی جیسے ہو جائیں گے۔ پس ان کے ساتھ دوزخ میں بھی جائیں گے۔ "اللھم انی اسئلک الجنة واعوذبک من النار. جامع" ورنہ دوزخ سے مومن کو کیا علاقہ۔

جیسے جنت خاص متقیوں کے لیے ہے ایسے ہی دوزخ خاص کفار کے لیے ہے۔ بیچ کے لوگ تو چونکہ وہ نہ کافر ہیں اور نہ متقی اس لیے ہمیشہ کو دوزخ میں بھی نہ جائیں گے اور ابتداً جنت میں بھی نہ جائیں گے مگر چونکہ ایمان کی وجہ سے متقیوں کے مشابہ ہیں اس لیے بعد چندے جنت میں چلے جائیں گے تو جنت میں جانے کے قابل وہ ہے کہ یا تو خود متقی ہو یا مشابہ ہو متقی کے ورنہ نہیں، ہاں ایسے لوگ جب پاک صاف ہو جائیں گے اس وقت جنت میں جانے کے قابل ہوں گے جیسے چراغ کہ اس پر اگر بہت سی کیٹ (میل چیکٹ) جمع ہو جائے تو اس کو آگ میں ڈال کر صاف کیا جاتا ہے اور اس وقت وہ نفیس جگہ کے استعمال کے قابل ہوتا ہے۔ اسی طرح ان لوگوں کو دوزخ کے چولہے میں ڈال کر صاف کیا جائے گا۔

دوزخ میں تعذیب وتہذیب

یا دوسری مثال میں یوں سمجھو کہ بچہ اگر نجاست میں لتھڑا ہوا آئے تو کہا جائے گا اس کو حمام میں لے جاؤ اور خوب رگڑو اور اس پر سے نجاست کو کھرچو، تو دوزخ بھی حمام ہے لیکن اس کی برداشت ہرگز نہ ہو سکے گی۔ غرض مسلمانوں کا دوزخ جانا بوجہ مشابہت کفار کے ہے۔ فرق اتنا ہے کہ کفار کو تعذیب کے لیے بھیجا جائے گا۔ مسلمانوں کو تہذیب کے واسطے مگر تکلیف تو ضرور ہی ہوگی۔ دیکھو! جب حمام میں جھانوے سے رگڑا جاتا ہے تو کیسی تکلیف ہوتی ہے تو تہذیب کہہ دینے سے ان کو کیا نفع ہوا، تکلیف تو ہوئی، جہنم میں تو گئے! دیکھو! اگر ایک شخص کے بدن میں چھریاں بھونکی جائیں اور دوسرے کے بدن میں سوئیاں کوچی جائیں تو کیا اس دوسرے کو اطمینان ہو سکتا ہے، ہرگز نہیں اور ہم لوگ اس سزا کو تو کیا برداشت کر سکتے ہیں ہم سے نشتر کی تکلیف تو برداشت نہیں کی جاتی تو ان باتوں سے ہرگز تسلی نہیں ہونی چاہیے۔

ابوطالب کے لیے آیا ہے کہ چونکہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی تھی۔ خدا تعالیٰ کی حکمت کے قربان ہو جایئے، دیکھئے اتنے بڑے تو محب اور ان کو کلمہ نصیب نہیں ہوا۔ موت کے وقت کلمہ پڑھنے پر راضی ہو گئے لیکن خدا ناس کرے ابوجہل کا کہ اس نے اس وقت بھی بہکایا۔ آخر اسی حالت پر خاتمہ ہو گیا تو اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا اور اسی لیے اس کو بیان بھی کیا ورنہ جی نہیں چاہتا تھا لیکن چونکہ ایک مسئلہ کا استنباط مقصود تھا اس لیے بیان کیا۔

نجات کے لیے اظہار محبت کافی نہیں

سو یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ آج کل مجلس کر لینے کو یا میلاد کر لینے کو نجات کا باعث سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو بہت محبت ہے اور بس اسی کو نجات کے لیے کافی سمجھتے ہیں۔ نہ نماز کی ضرورت سمجھتے ہیں نہ روزے کی نہ حج کی نہ استغفار کی اور اس میں زیادہ تر خطا پڑھے لکھے لوگوں کی ہے۔ انہوں نے اپنے طمع اور لالچ کے لیے ایسا کیا کہ عوام الناس کو راضی کرنے کے لیے ان کو ایسے ایسے مضامین سنائے۔ ان کے کہنے پر ایسی مجلسیں کیں، وعظ میں یہ مضامین بیان کیے جاتے ہیں کہ صاحبو! ڈاڑھی منڈواؤ، ناچ کرو، سب معاف ہو جائے گا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھو اور ان کے منکر وہابیوں کے پاس نہ بیٹھو اور وہابی نام رکھا ہے اہل سنت کا گو وہ مقلد اور حنفی ہوں۔ نیز مجالس وعظ میں یہ کہا جاتا ہے کہ جو چاہو کرو، مگر صرف محبت رکھو اور اس کا اثر لوگوں پر یہ ہوا کہ انہوں نے تمام اعمال کو غیر ضروری سمجھ لیا تو ایسے لوگوں کو اس حدیث سے سمجھ لینا چاہیے کہ ابوطالب کے برابر کوئی بھی ان مدعیان محبت میں سے محبت رکھنے والا نہیں۔ ابوطالب وہ تھے کہ سب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دیا لیکن ابوطالب نے ساتھ دیا اور بہت سی تکالیف اٹھائیں۔ آج تو یہ حالت ہے کہ مخالفت شریعت نبویہ میں اگر ایک پیسے کا نفع ہو تو مخالفت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

ایک مجلس میں یزید کے تذکرہ پر ایک شخص کہہ رہا تھا کہ افسوس! میں نہ ہوا ورنہ یوں کرتا اور یوں کرتا۔ یہ سن کر ایک دیہاتی شخص کو جوش آ گیا، کہنے لگا کہ میں کہتا ہوں کہ میں یزید ہوں اور میں نے ایسا ایسا کیا ہے اگر کچھ ہمت ہو تو آ جاؤ، یہ سن کر ان بہادر صاحب کے حواس باختہ ہو گئے۔ یہی حالت آج کل کے محبان رسول کی ہے۔

تو دیکھئے! ابوطالب جن کو اس قدر محبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تھی۔ ان کو بھی نرے دعویٰ محبت نے بھی دوزخ سے نہ بچالیا کیونکہ اطاعت نہ تھی اور آج تو کس کا منہ ہے کہ اتنی محبت کا بھی دعویٰ کرے اور اگر کرے بھی تو خواب یاد رکھو کہ

وجائزة دعویٰ المحبة فی الھوی ولکن لایخفی کلام المنافق !

''اور عشق میں محبت کا دعویٰ جائز ہے لیکن منافق کی بات چھپی نہیں رہتی''

میں کہتا ہوں کہ محبت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرو مگر جس طرح ذکر کا طریق ہے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا ہے لیکن کیا وہاں کوئی تاریخ مقرر ہوئی تھی ہرگز نہیں ان کی تو ہر وقت یہ حالت تھی کہ

ماہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم الا حدیث یار کہ تکرار مے کنیم

(ہم نے کچھ پڑھا ہے اسے بھلا دیا ہے سوائے حدیث یار کے جس کا ہم تکرار کرتے ہیں)

وہ تو ہر وقت زبان پر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ذکر رکھتے تھے۔ بقول مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے کہ ہم تو ہر وقت مولد کرتے ہیں۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

کہتے ہیں تب بھی آپؐ ہی کا ذکر ہوتا ہے۔ ہمارے تو ہر وقت دل میں بسے ہیں۔ زبان سے ہاتھ سے ہر وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد میں ہیں۔ سبحان اللہ! کیا محققانہ بات کہی ہے تو صحابہ تو ہر وقت ذکر کیا کرتے تھے اور نرا ذکر نہیں بلکہ ویسا بننے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ پکھنڈ جواب ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں کہیں نام کو نہ تھے، کسی صحابی نے کبھی مٹھائی تقسیم نہیں کی، کبھی ذکر کی تاریخ مقرر نہیں کی اور اگر کوئی کہے کہ ہم تو خوشی میں مٹھائی تقسیم کرتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ روز کیوں تقسیم نہیں کرتے۔ اس کی کیا وجہ کہ ایک مجمع خاص میں تقسیم کی جاتی ہے۔ اسی طرح کھڑا ہونا، اس کی بابت بھی یہی ہے کہ اس کی کیا وجہ کہ خاص مجمع میں خاص وقت میں قیام ہو۔ اس وقت جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ ہو رہا ہے اس کی کیا وجہ کہ اس وقت کوئی نہیں اٹھتا۔

یہ یاد رکھو کہ یہ سب کمانے والوں کی من گھڑت ہے کہ ہر ہر جزو کو خاص طور سے ایجاد کیا کہ لوگ ہر کام میں ان کے محتاج رہیں اور جب ان سے وہ کام لیں تو کچھ دیں بھی اور جب واعظ کے لیے کچھ ہوا تو آنے والوں کے لیے بھی کچھ چاہیے اس لیے مٹھائی ایجاد کی گئی۔

لوگ عرب کے فعل سے استدلال کرتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ لوگوں کو خبر نہیں ہے کہ عرب میں کس طرح کا مولد ہوتا ہے گو اس میں نشیب و فراز ہے مگر پھر بھی یہاں کی نسبت بہت سادگی ہے مٹھائی تقسیم کرتے ہیں لیکن حالت یہ ہے کہ اگر نصف مجلس کو تقسیم ہونے کے بعد ختم ہو جائے تو بلا تامل کہہ دیں گے کہ ''خلاص'' یعنی اب ختم ہوگئی۔ بھلا یہاں کوئی صاحب مجلس ایسا کرکے

دکھلا دیں۔ واللہ! یہاں جو کچھ ہوتا ہے سب تفاخر کے لیے ہوتا ہے۔

ایصال ثواب کا آسان طریقہ

صاحبو! محبت کے طریقے ہی دوسرے ہوتے ہیں۔ شاہ عبدالرحیم صاحب دہلوی ربیع الاول میں کچھ کھانا پکا کر تقسیم کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کو کچھ میسر نہ ہوا' آپ نے پیسے دو پیسے کے چنے بھنوا کر تقسیم کر دیئے۔ خواب میں دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان چنوں کو تناول فرما رہے ہیں۔ دیکھئے محبت اللہ والوں ہی میں ہوتی ہے۔ ان سے سیکھو اور ان کے طرز عمل پر چلو۔

میں اس کا بہت آسان طریقہ بتلاتا ہوں مگر وہ طریقہ نفس کو گوارا نہ ہوگا۔ وہ یہ کہ خفیہ خرچ کیا کرو' مثلاً ربیع الاول کے مہینہ میں پچاس روپیہ خرچ کرو مگر ظاہر نہ کرو اور ایک ایک روپیہ ایک ایک مسکین کو دے دو۔ اگر واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے تو اس طریقے پر عمل کرو مگر میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ کبھی نہ ہو سکے گا' نفس کہے گا کہ میاں پچاس روپے بھی خرچ ہوئے اور کسی کو خبر تک بھی نہ ہوئی۔

آج کل تو یہ حالت ہے کہ میں کانپور میں تھا۔ ایک شخص ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مجھے بلا کر لے گئے' میں چلا گیا' اگلے دن معلوم ہوا کہ اسی جگہ جہاں ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوا تھا آج رنڈی کا ناچ ہوا ہے مجھے سنکر بے حد صدمہ ہوا۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ اس کے یہاں شادی تھی اور اصل مقصود ناچ کرانا تھا لیکن بعض ثقہ احباب کی خاطر سے ذکر رسول بھی کرایا تھا۔ تو یہ ذکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ ثقہ دوستوں کے لیے ہوا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ناچ کا موازن ہوا اور ناچ اسی جگہ ہوا۔ (نعوذ باللہ منہ) پھر لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے اور ہم محبِ رسولؐ ہیں۔

اور میں کانپور میں سنا کرتا تھا کہ آج فلاں رنڈی کے ہاں مولود ہے' آج فلاں کے ہاں ذکر رسولؐ ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ جب وہاں ضروری مضامین زنا کی مذمت وغیرہ کو کوئی بیان نہیں کرتا تھا تو نرے ذکر رسولؐ سے کیا فائدہ کی توقع ہے۔ دیکھو! اگر دسترخوان پر نری چٹنی ہو تو کیا کوئی اس دسترخوان سے سیر ہو سکتا ہے' کبھی نہیں! البتہ اگر نرا کھانا اور چٹنی نہ ہو تو وہ کارآمد ہو سکتا ہے اور اگر دونوں چیزیں ہوں تو نور علیٰ نور ہے۔

یہ اس پر یاد آ گیا تھا کہ لوگ دعویٰ محبت کرتے ہیں تو دیکھ لیں کہ ابوطالب کی کیا حالت ہے کہ اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت صرف دو جوتے آگ کے پیر میں ہوں گے مگر حالت یہ ہوگی کہ یوں سمجھیں گے کہ مجھ سے زیادہ کسی کو تکلیف نہیں۔ دنیا ہی میں دیکھ لو کہ اگر ببول کا کانٹا بھی لگ جاتا ہے

تو کیا حالت ہوتی ہے تو اگر یہ کوئی کہے گا کہ مجھے تو ہلکا عذاب ہوگا تو خوب سمجھ لے کہ وہاں کا ہلکا بھی ناقابل برداشت ہے تو اس ناز میں ہرگز نہ رہنا چاہیے کہ مجھے تو تھوڑی سزا ہوگی، یہ شبہات تو رفع ہو گئے۔

بے فکری کی سزا کی تفصیل

اب وہ باتیں بھی سن لیجئے جن پر اس آیت میں لتاڑا گیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جو لوگ ایسے ہیں کہ ہمارے پاس آنے کا یقین نہیں رکھتے۔ سو اس سے تو ہم بری ہیں لیکن اس سے بے فکری نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کے نہ ہونے سے گو سزا کم ہو لیکن ہوگی تو ضرور اور دوسری بات یہ فرمائی کہ

وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ. (یونس:۷)

''کہ جو حیوۃ الدنیا پر راضی ہیں اور اس پر مطمئن ہو گئے ہیں اور جو ہمارے احکام سے غافل ہیں۔''

یہ کل چار چیزیں ہیں۔ ان پر فرماتے ہیں: ''اُولٰٓئِکَ مَاْوٰهُمُ النَّارُ'' ترجمے سے معلوم ہوا ہوگا کہ ان چار پر سزا ہے تو ان چاروں کا مذموم ہونا ثابت ہوا۔ اور یہ احتمال نہ کیا جائے کہ شاید مجموعہ پر یہ سزا ہوگی اور ہم مجموعہ سے بری ہیں کیونکہ ''لایرجون لقاء نا'' یہ جزو ہم میں نہیں پایا جاتا۔ سو بات یہ ہے کہ یہاں اول تو اس احتمال کی کوئی دلیل نہیں اور عطف بالواؤ میں کبھی ہر واحد بھی مقصود بالافادہ ہوتا ہے اور شاید اس سے بے فکری ہو نہیں سکتی۔ دوسرے اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی ''لایرجون'' پر اکتفا نہ کرنا اور دوسرے افعال کا بھی ذکر کرنا ظاہر ہے کہ عبث تو نہیں ہے اور اگر ان کو حکم جزوئی میں کچھ دخل نہ ہو تو محض عبث ہونا لازم آئے گا۔ پس سب کو دخل ہوا، پس سب کا مذموم اور مؤثر فی العقوبۃ نہ ہونا ثابت ہو گیا۔

ان چار چیزوں میں سے ایک تو یقیناً ہم میں نہیں ہے اس دفعہ سے تو ہم یقیناً بری ہیں اور ایک میں شبہ ہے۔ یعنی اخیر کا جرم اس میں شک ہے کہ ہم میں ہے یا نہیں کیونکہ اس کی تفسیریں دو ہیں۔ ایک تو یہ کہ عقیدہ نہیں، اس لیے غفلت ہے اور التفات نہیں ہوتا، اس سے تو ہم بچے ہوئے ہیں یا مطلق غفلت مراد ہو تو اس میں ہم مبتلا ہیں۔

رضا و اطمینان میں فرق

رہے بیچ کے دو جرم ان میں ہم یقیناً مبتلا ہیں اور وہ دونوں ایک ہیں مگر قدرے تفاوت ہے۔ یعنی ایک تو مرتبہ عقل کا ہے اور ایک مرتبہ طبع کا کیونکہ رضا تو امر عقلی ہے اور اطمینان امر طبعی ہے تو بعض دفعہ تو انسان ایک فعل کو عقلاً پسند کرتا ہے مگر دلچسپی نہیں ہوتی جیسے کڑوی دوا یا شہادت کے لیے سفر کہ عقلاً

تو پسند ہے مگر اس کے ساتھ دلچسپی نہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دلچسپی تو ہوتی ہے مگر عقلاً ناپسند کرتا ہے جیسے زنا وغیرہ۔ غرض کبھی رضا ہوتی ہے اور اطمینان نہیں ہوتا اور کبھی بالعکس لیکن وہ حالت نہایت سخت ہے کہ رضا اور اطمینان دونوں نہ ہوں تو کفار کو تو علی العموم یہ بات ہے مگر اکثر مسلمانوں کو بھی ہے۔

چنانچہ پسند کی تو کھلی دلیل یہ ہے کہ اگر دنیا اور دین میں تزاحم ہو جیسے مقدمات میں یا رشوت لینے میں یا جیسے بعض کے پاس زمینیں دبی ہوئی ہیں تو ان کو سب جانتے ہیں کہ گناہ ہے مگر دل سے پسند ہے کہ جی برا نہیں ہوتا بلکہ جب اسکی اصلاح کی رائے دی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ یہ ریاست کے معاملے ہیں ناصح کیا جانیں۔ غرض عقلاً پسند کرتے ہیں اور ترجیح دیتے ہیں اگرچہ عقیدہ ایسا نہیں ہے۔ علیٰ ہذا تعلیم کے باب میں جانتے ہیں کہ ابتداء سے تعلیم زمانہ حال میں مشغول کرنے سے اولاد دین سے بے خبر رہتی ہے مگر کہتے ہیں کہ ایسا نہ کریں تو ترقی کیوں کر کریں۔ یہ سب رضا بالدنیا ہے بلکہ اب تو یہ وہ پالیسی ہوگئی ہے کہ اہل علم اور درویشوں میں بھی یہ مرض ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ حالانکہ درویش کو زیادہ محتاط ہونا چاہیے۔ میں دیکھتا ہوں کہ کثرت سے ایسے مولوی اور درویش ہیں کہ اس رضا بالدنیا سے ان کا مذہب یہ ہوگیا ہے کہ مردہ جنت میں جائے یا دوزخ میں ہمارے چار پیسے سیدھے ہو جائیں اور یہی وہ جماعت ہے جن کو دیکھ کر اہل دنیا علم دین سے نفور ہو گئے ہیں۔

علم دین کی بے قدری

صاحبو! علم دین کو ہم نے خود ذلیل کیا ورنہ تو ایسی چیز ہے کہ اس کے سامنے سب کی گردنیں جھک جاتی ہیں۔ دربار دہلی میں جب بادشاہ کے سامنے علماء گئے ہیں تو ان کو دیکھ کر بادشاہ خود جھک گئے۔ افسوس ہے کہ دوسری قوم کے لوگ تو عزت کریں۔ بادشاہ کی یہ حالت تھی کہ والیان ریاست کے سامنے اس نے سر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور علماء کو دیکھ کر جھک کر ان سب کی تعظیم کی۔ اب بتلائیے کہ ان کے پاس کیا چیز تھی' کونسا ملک تھا۔ صرف یہ بات تھی کہ یہ عالم ہیں' دین کے پیشوا ہیں لیکن اگر ہم خود ہی بے قدری کرائیں تو اس میں کسی کا کیا قصور۔ یہی حالت ہوگئی ہے پیروں کی کہ طمع سے ان کی بھی سخت بے قدری ہوگئی ہے۔

مجھے ایک گنوار کا واقعہ یاد آیا کہ فصل پر جب کمیوں کا اناج نکالنے بیٹھا تو گھر والوں نے سب کو شمار کیا' دھوبی کو بھی' خاکروب کو بھی اور یہ بیٹھا سنتا رہا۔ جب سارے کمیوں کا نام سن چکا تو

کہنے لگا کہ اس سسرے پیر کا بھی تو نکال دو۔ مگر یہ پیر بھی ایسے ہوتے ہیں کہ موضع مساوی کے بعضے لوگ قاضی صاحب منگلوری رحمتہ اللہ علیہ کے مرید ہو گئے تھے۔ پھر خاندانی پیر صاحب کو جب خبر ہوئی تو کہنے لگے کہ اچھی بات ہے۔ دیکھو! میں بھی تمہیں پل صراط پر سے دھکا دوں گا تو ایسے پیر ہیں ہی اس قابل۔ علیٰ ہذا بعضے علماء بھی ایسے ہونے لگے ہیں۔

ایک سب جج پرانی وضع پرانی روشنی کے ایک مقام پر بدل کر آئے۔ انہوں نے چاہا کہ وہاں کے روساء سے مل آئیں۔ ایک رئیس صاحب کے پاس پہنچے تو وہ دور ہی سے صورت دیکھ کر گھر میں چلے گئے۔ انہوں نے خادم کے ذریعے سے کہلا بھیجا کہ میں فلاں شخص ہوں۔ آپ سے ملنے کو آیا ہوں، نام سن کر وہ رئیس صاحب باہر آئے اور معذرت کر کے کہنے لگے کہ آپ کا عبا دیکھ کر میں یہ سمجھا کہ کوئی مولوی صاحب ہیں چندہ لینے کی غرض سے آئے ہیں۔ یہ خیالات ہیں عوام کے علماء کے متعلق مگر اس میں زیادہ قصور ان عوام کا نہیں بلکہ ایسے مولویوں کا ہے کہ انہی نے اپنے افعال سے عوام کے خیالات کو خراب کیا۔ اگر علماء اس سے پرہیز کرتے تو عوام کو کبھی ایسی جرأت نہیں ہو سکتی یہ تو اہل علم کی غلطی تھی۔

ترغیب تعلم علم دین

لیکن جن لوگوں نے ایسوں کو دیکھ کر علم دین سے کنارہ کیا ہے وہ بھی غلطی سے خالی نہیں کیونکہ علم دین کے ساتھ یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اخلاق بھی سکھلائیں۔ جن سے یہ افعال نا ملائم پیدا نہ ہوں۔ دوسرے ایک خاندانی رئیس زادہ اگر علم دین پڑھے گا تو وہ بوجہ اس کے کہ فطرۃً عالی حوصلہ ہے کیونکر ایسی حرکات کرنے لگا اور جو لوگ ایسی حرکات کرتے ہیں وہ اکثر کم خاندان کے لوگ ہوتے ہیں۔ پس جب یہ ہے تو تعجب ہے کہ ایسے لوگوں کو دیکھ کر اپنے بچوں کو تعلیم دینی نہ دو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تعلیم حاصل نہ دو، ضرور دو، مگر یہ بھی تو دیکھو کہ علم دین ہر وقت کی ضرورت کی چیز ہے تو چاہیے یہ کہ اول علم دین پڑھاؤ اور اس کے بعد دوسرے علوم ورنہ دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ تو اس کی تعلیم ضرور ہی ہونی چاہیے۔ اگر زیادہ وقت نہ ہو تو اردو کے ہی رسائل پڑھاؤ لیکن سبقاً سبقاً پڑھاؤ۔ یہ نہیں کہ کتاب دے دی اور کہہ دیا کہ دیکھ لو بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ پورا نصاب ہو اور کسی دیندار آدمی کو رکھ کر سبقاً سبقاً پڑھاؤ۔ اگر چوبیس گھنٹہ میں سے ایک گھنٹہ ہی دو بلکہ میں کہتا ہوں کہ فضول وقت میں سے جو کھیل کود میں ختم ہو جاتا ہے اس میں سے اگر ایک گھنٹہ دو اور وقتاً فوقتاً امتحان لیا کرو، کامیابی پر بچے کو انعام دو اور ناکامی پر سزا دو اور عمل کرانے کی بھی کوشش کراؤ۔ جیسے حساب میں مشق کراتے ہو اور اگر وہ نہیں کرتا تو سزا دیتے ہو، اسی طرح ہر مسئلے میں التزام کرو۔

اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بچہ ساتھ کے ساتھ دیندار ہوتا چلا جائے گا۔ ہاں اس کے لیے ایک عالم کے بلانے کی ضرورت ہوگی تو جب سینکڑوں روپیہ انگریزی میں صرف ہوجاتا ہے اگر دس روپے اس میں صرف ہوجائیں گے تو کیا ظلم ہوگا اوران مولوی صاحب سے آپ اپنے لیے بھی یہی کام لے سکتے ہیں کہ ان سے خود بھی مسائل سیکھیں۔

مرض رضا بالدنیا کا عموم

اوراس موقع پر یہ کہنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر میں جیسا پہلے تھا پھر کوئی سلسلہ علم دین کا ہوتو اچھا ہے کہ یہاں کے بچے کچھ نہ کچھ تو ضرور پڑھ لیں۔ دیکھو اگر دو گھنٹے کی صحبت کسی عالم کی ہوجائے تو خواہ یہ بچے دیندار نہ ہوں لیکن ان کو بہت سی باتیں معلوم ہوجائیں گی مگر اس طرف لوگوں کو توجہ نہیں۔ اگر کہیے تو کہتے ہیں کہ یہاں کوئی مولوی نہیں ملتا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر راج کی ضرورت ہو اور وہ نہ ملے تو کیا کرتے ہو یہی کہ دوسرے مقام سے راج کو بلاتے ہو۔ پھر مولوی کو دوسرے مقامات سے کیوں نہیں بلاتے ہو۔ یہاں اس کے منتظر کیوں رہتے ہو کہ مولوی خود آئیں۔ صاحبو! اگر دین کی کچھ بھی عظمت قلب میں ہوتی تو خود مولویوں کو تلاش کرتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ رضا بالدنیا کی ان خرابیوں سے بہت کم لوگ خالی ہیں۔ حتیٰ کہ مولوی اور درویش بھی اور مولویوں اور درویشوں سے ایسا ہونا یہ زیادہ برا ہے کیونکہ یہ دھوکا دے کر کماتے ہیں مگر جماعت میں کچھ لوگ مستثنیٰ بھی ہیں، دنیاداروں میں بھی دینداروں میں بھی۔

یہ تو "رَضُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا" تھا۔ آگے فرماتے ہیں: "وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا" (یونس: ٧)

کہ دنیا میں جی بھی لگایا اور دنیا ان کے دل میں بھی گھس گئی۔ اس کا ازالہ ذرا مشکل ہے دنیا سے تو دل گھبرانا چاہیے مگر ہر مسلمان بتلائے کہ روزانہ کتنی مرتبہ دنیا میں رہنے سے اس کا جی گھبرایا ہے اور کب وحشت ہوئی ہے۔ ہاں اگر وحشت ہوتی ہے تو آخرت میں جانے سے ہوتی ہے۔ حالانکہ دنیا سے وہ تعلق ہونا چاہیے کہ جو مظفرنگر کی سرائے سے کہ اگرچہ وہاں سارے کام کرنے ہوتے ہیں مگر دل جلال آباد میں پڑا رہتا ہے۔ اسکا مطلب بعض لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ مولوی دنیا چھڑاتے ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے۔ ہاں! مولوی یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں سرائے کا تعلق رکھو۔ دیکھو کیا سرائے میں کھاتے نہیں ہو یا کوٹھڑی کرائے پر نہیں لیتے۔ سب کچھ کرتے ہو مگر وہاں جی نہیں لگتا اور دنیا میں جی لگا لیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی حقیقت کو نہیں سمجھا۔ ہماری بعینہ وہ حالت ہے جیسے بچہ سرائے کے کسی آرام کو دیکھ کر ضد کرنے لگے کہ میں یہیں رہوں گا باقی جن کو دنیا کی حقیقت سے واقفیت ہے انکی یہ حالت ہے کہ کہتے ہیں:

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم | راحت جاں طلبم وزپے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسرایں غم روزے | بردرمیکدہ شاداں و غزل خواں بروم

”وہ دن کیسا ہوگا جبکہ میں اس ویران منزل یعنی دنیا سے کوچ کر جاؤں گا اور میں اپنے محبوب کے پاس جا کر راحت جان کی خواہش کروں گا۔ وصال محبوب حقیقی کے بعد زندگی دوام ملے گی، میں نے منت مانی ہے کہ جس دن اس غم کا خاتمہ ہوگا تو میں مے کدہ کے دروازہ تک خوش وخرم اور غزل پڑھتا جاؤں گا۔“

دیکھئے! منت مان رہے ہیں کہ اگر یہاں سے چھٹکارا ہو تو یوں کریں گے۔

دنیا کی محبت زائل کرنے کا طریقہ

بیان تو بہت طویل ہے مگر میں وقت نہ ہونے سے ایک ترکیب بتلا کر مضمون کو مختصر کرتا ہوں اور وہ ایسی ترکیب ہے کہ جس سے تم کو ان شاء اللہ تعالیٰ صحبت کی برکت حاصل ہوگی اور یہ جو دائرے سے باہر قدم نکلا جارہا ہے یہ رک جائے گا اور وہ حالت ہو جائے گی جو طاعون کے زمانہ میں ہوتی ہے کہ سب کچھ کرتے ہو مگر کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہوتی۔

تو وہ ترکیب یہ ہے کہ ایک وقت مقرر کر کے اس میں موت کو یاد کیا کرو۔

اور پھر قبر کو یاد کرو۔

اور پھر حشر کو یاد کرو

اور یوم حشر کے اہوال کو اور وہاں کے شدائد کو یاد کرو۔

اور سوچو کہ ہم کو خدائے تعالیٰ قادر کے روبرو کھڑا کیا جائے گا!

اور ہم سے باز پرس ہوگی!

ایک ایک حق اُگلنا پڑے گا۔

اور پھر سخت عذاب کا سامنا ہوگا!

اسی طرح روزانہ سونے کے وقت سوچ لیا کرو۔ دو ہفتے میں ان شاء اللہ تعالیٰ کایا پلٹ ہو جائے گی اور جو اطمینان وانس اور دلچسپی دنیا کے ساتھ اب باقی ہے نہ رہے گی۔

اور اس وقت اگر چہ احکام فرعیہ بیان نہیں ہو سکے مگر اصول بحمد اللہ کافی بیان ہو گئے ہیں۔ اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ توفیق عمل دے۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ عَلَیْهِ٥

الاطمينان بالدنيا

دنیا کے سب کاروبار کرو مگر دنیا پر مطمئن نہ ہو جاؤ۔ آخرت کو پیش نظر رکھو اور جو وقت کام کاج سے بچے اس کو فضول باتوں میں ضائع نہ کرو' یہ وقت بڑی قیمتی چیز ہے اس کی قدر کرو۔ یہ اتنی قیمتی چیز ہے کہ جس وقت عزرائیل علیہ السلام روح قبض کرنے کے لیے آئیں گے تو تم تھوڑے سے وقت کے لیے تمام سلطنت بھی دینے کے لیے تیار ہو جاؤ گے مگر ایک منٹ کی بھی مہلت نہ ملے گی۔

یہ وعظ ۱۴ رجب ۱۳۲۶ھ کو موضع اجراڑہ ضلع میرٹھ میں ہوا جو دو گھنٹے جاری رہا جسے حکیم محمد یوسف صاحب بجنوری نے قلم بند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمن سيئات اعمالنا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاَهَادِیَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلَّمْ. اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. اِنَّ الَّذِيْنَ لَايَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ○[1]

ترجمہ: جن لوگوں کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے اور وہ دنیوی زندگی پر راضی ہوگئے ہیں (آخرت کی طلب اصلاً نہیں کرتے) اور اس میں جی لگا بیٹھے ہیں (آئندہ کی کچھ خبر نہیں) اور جو لوگ ہماری آیتوں سے بالکل غافل ہیں ایسے لوگوں کا ٹھکانا ان کے اعمال کی وجہ سے دوزخ ہے)

حب دنیا تمام امراض کی جڑ ہے

ہر چند کہ ہمارے اندر مختلف امراض پائے جاتے ہیں لیکن بنص حدیث اصل تمام امراض کی صرف ایک ہی چیز ہے وہ کیا ہے؟ حب دنیا جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف لفظوں میں یوں ارشاد فرمایا ہے:

حب الدنیا راس کل خطیئة[2] (دنیا کی محبت تمام خرابیوں کی جڑ ہے)

اس وجہ سے بجائے اس کے کہ اس وقت ہر مرض کو جدا جدا مفصل بیان کیا جائے۔ مناسب یہ ہے کہ سارے امراض کی اصل اور اس کے علاج کو بیان کر دیا جائے کیونکہ اول تو ہر ایک مرض کو مفصلاً بیان کرنے کے لیے وقت میں گنجائش نہیں۔ دوسرے اصل کا علاج بیان کرنے میں یہ بھی نفع ہے کہ مرض اصلی کا علاج کلی معلوم ہو جانے سے قریب قریب سب امراض کا علاج ہو جائے گا

---

[1] (مشکوۃ المصابیح: ۵۲۱۳، کنز العمال: ۶۱۱۴، الترغیب والترہیب ۳: ۲۵۷)

کیونکہ اصل مرض بقیہ امراض کا سبب ہوا کرتا ہے تو اس کے علاج سے سب کا علاج ہو جائے گا کیونکہ علاج کی حقیقت اصل میں سبب ہی کا ازالہ ہے۔

بنیادی مرض کا علاج پہلے کرانا چاہیے

مثلاً کسی کے جسم میں خون ضرورت سے زیادہ نکل گیا اور اس وجہ سے قلب اور دماغ میں ضعف لاحق ہو گیا اور اس کے علاوہ اور امراض بھی پیدا ہو گئے۔ اس حالت میں ایک تو علاج یہ ہے کہ ہر ہر مرض کا علاج جدا گانہ کیا جائے۔ جیسے مقوی دماغ اور مقوی قلب اجزاء استعمال کیے جائیں تا کہ دماغ میں قوت پیدا ہو اور قلب کا ضعف رفع ہو۔ غرض ہر مرض کا علاج جدا جدا کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس میں بہت ہی وقت صرف ہو گا اور دقتیں پیش آئیں گی۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تمام امراض کی اصل اور جڑ کو تلاش کیا جائے کہ وہ کیا سبب ہے جس کی وجہ سے یہ تمام امراض لاحق ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں تمام امراض کی اصل خون کا جسم سے نکل جانا ہے۔ پس مناسب ہے کہ اس حالت میں ایسی تدابیر کی جائیں جن سے خون میں ترقی ہو۔ جب خون بڑھے گا تمام امراض خود بخود زائل ہو جائیں گے۔ ایسے ہی یہاں بھی سمجھ لیجئے کہ اصل علاج کرنے سے جملہ امراض کا دفعیہ ہو جائے گا۔ حب دنیا چونکہ تمام خطاؤں کی جڑ ہے جب اس کا علاج ہو جائے گا تو سارے امراض خود ہی دفع ہو جائیں گے اور یہ ایک کلی علاج ہے۔

حب دنیا کس طرح بنیادی مرض ہے

البتہ ایک سوال یہاں یہ ہو سکتا ہے کہ حب دنیا کو جو تمام امراض کی جڑ بتلایا گیا ہے تو اس کو دیگر امراض سے کیا علاقہ ہے جس کی وجہ سے اس کو جملہ امراض کی اصل قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً نماز نہ پڑھنے کو حب دنیا سے کیا علاقہ؟ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص میں حب دنیا ہو اور نماز بھی پڑھتا ہو یا ایک شخص میں حب دنیا ہو اور روزہ بھی رکھتا ہو۔ علیٰ ہذا اور اعمال کو دیکھئے تو حب دنیا کو تمام خطاؤں کی جڑ قرار دینے کا کیا مطلب ہے۔ بظاہر تو کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا یا مثلاً کسی میں غصہ ہو اور دنیا کی محبت نہ ہو۔

بات یہ ہے کہ اگر غور کیا جائے تو حب دنیا کو ہر مرض سے تعلق ہے کیونکہ جس میں حب دنیا ہو گی اس کو آخرت کا اہتمام ہی نہ ہو گا تو وہ شخص اعمال حسنہ کو انجام ہی نہ دے گا' نہ برائیوں سے بچے گا اور ایسے ہی برعکس جب آخرت کی فکر ہوتی ہے تو جرائم صادر نہیں ہوتے مثلاً جو لوگ جرائم کرتے ہیں وہ محض اس وجہ سے کہ آخرت کی فکر نہیں' اگر آخرت کے واقعات لوگوں کے پیش نظر ہوں تو جرائم کبھی صادر نہ ہوں مگر حب دنیا کے مراتب مختلف ہیں جیسے فکر آخرت کے مراتب مختلف

ہیں۔ پس جن درجات میں تضاد ہے وہ جمع نہیں ہو سکتے اور جن میں تضاد نہیں وہ جمع ہو سکتے ہیں اور یہی راز ہے۔ اس کا کہ ایک حدیث میں تو فرمایا ہے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے

لایزنی الزانی حین یزنی وھو مومن ولا یسرق السارق حین یسرق وھو مومن.[1]

''زانی شخص اس حال میں کہ وہ مومن ہے زنا نہیں کرتا اور چور اس حال میں کہ مومن ہے چوری نہیں کرتا۔''

اور دوسری حدیث میں ہے کہ فرمایا رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے

من قال لاالہ الااللّٰہ دخل الجنۃ وان زنی وان سرق.[2]

''جس نے لاالٰہ الا اللہ کہا وہ جنت میں داخل ہوا اگرچہ اس نے زنا کیا اور چوری کی۔''

مراتب ایمانی مختلف ہیں

بات یہ ہے کہ مراتب ایمانی مختلف ہیں۔ ایک مرتبہ اہتمام آخرت کا ایمان کا درجہ نفس تصدیق ہے کہ اس سے کم پر اکتفا جائز نہیں یہ درجہ فکر آخرت و ایمان کا زنا اور سرقہ و دیگر معاصی کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے اور ایمان کی مثال ایسی ہے جیسے کسی طبیب نے مریض کو نسخہ لکھ کر دیا اور جملہ امور اس کے متعلق بتلا دیئے اور طبیب کو مقصود ہے کہ اس مریض کو اس نسخہ سے کامل شفا ہو جائے گی مگر مریض نے پورے نسخہ کا استعمال نہ کیا بلکہ آدھے نسخہ کا استعمال کیا۔ ظاہر ہے کہ آدھے نسخہ سے ادنیٰ درجہ کا نفع ہوگا اور پورے سے پورا نفع ہوگا۔ اسی طرح نفس تصدیق عذاب دائمی جہنم سے بچنے کا باعث ہو سکتی ہے مگر پوری نجات کا سبب نہیں بن سکتی اور اس درجہ کے ساتھ معاصی جمع ہو سکتے ہیں اور دوسرا درجہ ایمان کا وہ تصدیق ہے جس پر اثر کامل مرتب ہو اور یہی تصدیق کامل ہے۔ یہ مرتبہ ایمان کا معاصی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا جس شخص کو یہ مرتبہ حاصل ہو تو اس سے زنا اور سرقہ وغیرہ سرزد ہی نہیں ہوگا۔

الغرض خدا تعالیٰ و رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا سمجھنے کے مراتب مختلف ہیں۔ کامل سچا سمجھنا وہ ہے جس پر اثر کامل مرتب ہو کہ معاصی تمامہا چھوٹ جائیں اور دوسرا درجہ ناقص تصدیق کا ہے کہ کچھ معاصی چھوٹ جائیں، کچھ باقی رہیں۔ دوسرے درجہ ایمانی کی مثال آدھے نسخہ کی سی ہے کہ آدھے نسخہ سے آدھا فائدہ ہوگا۔ اسی طرح اس درجہ کے ایمان سے یہ نفع ہوگا کہ آدمی عذاب دائمی جہنم سے نجات پا جائے، پوری نجات یعنی نجات اولیٰ اس کو حاصل نہ ہوگی اور پہلے درجہ

---

[1] (الصحیح للبخاری ۳: ۱۷۸، ۷: ۱۳۶، ۸: ۹۵، ۱۹۷، الصحیح لمسلم کتاب الایمان ب: ۲۴، رقم: ۱۰۰، ۱۰۵، سنن ابی داؤد: ۴۶۸۹، سنن الترمذی: ۲۶۲۵، سنن النسائی ۸: ۶۴، ۶۵، ۳۱۳، سنن ابن ماجہ: ۳۹۳۶)

[2] (فتح الباری لابن حجر العسقلانی ۱۲: ۶۰، کنز العمال: ۲۰۸)

ایمان کی مثال پورے نسخہ کی سی ہے جیسے پورے نسخہ سے پورا نفع ہوتا ہے اسی طرح پورے ایمان سے پورا نفع ہوگا کہ آدمی علاوہ جہنم سے نجات پانے کے اور انعامات کا بھی مستحق ہوگا۔

یا مثلاً دو شخص ہوں کہ ہر ایک ان میں سے سنکھیا کو مہلک سمجھتا ہے مگر ایک نے باوجود مہلک سمجھنے کے اس کو کھالیا اور ہلاک ہوگیا اور دوسرے نے نہ کھایا۔ ظاہر ہے کہ دونوں نے اس کو مہلک تو سمجھا مگر پہلے شخص کا مہلک سمجھنا کامل نہیں کیونکہ مہلک جاننے کا اثر مرتب نہیں ہوا اور دوسرے کا مہلک سمجھنا کامل درجہ کا ہے کیونکہ اس پر اثر مرتب ہوا۔

یا ایک شخص کو کسی نے خبر دی کہ تیرا حاکم آ گیا۔ اس نے اس خبر کو سن کر اس کے آنے کا کچھ بھی اہتمام نہ کیا' نہ کام کی درستی کی' ویسے ہی پڑا رہا۔ معلوم ہوا کہ اس نے حاکم کے آنے کی خبر کو کامل طور پر سچا نہیں سمجھا۔ معمولی سمجھا' اگر اس کو تصدیق کامل ہوتی تو اس پر اثر مرتب ہوتا۔

اسی طرح ایمان سچا اور کامل وہی ہے جس پر اثر مرتب ہو۔ ہر ہر قدم پر اثر ہو جس شخص کی یہ حالت ہوگی کبھی نافرمانی نہ کرے گا اور ایسا شخص ماضی کی کوتاہیوں کا بھی تدارک کرے گا اور آئندہ معاصی سے مجتنب رہے گا۔ اسی طرح مراتب مختلف ہیں۔

مراتب حب دنیا مختلف ہیں

حب دنیا کے بھی مراتب مختلف ہیں کسی میں کم ہے کسی میں زیادہ' کفار میں زیادہ ہے مسلمانوں میں کم مگر ہیں ضرور اور یہی جڑ ہے تمام گناہوں کی کیونکہ حب دنیا میں فکر دین کم ہوتی ہے جس درجہ کی حب دنیا ہوگی اسی درجہ کی فکر دین کم ہوگی' اگر کامل درجہ کی حب دنیا ہے تو کامل درجہ کی دین سے بے فکری ہوگی۔ جیسا کہ کفار میں متحقق ہے اور مسلمانوں میں جس درجہ کی حب دنیا ہے اسی درجہ کی دین سے بے فکری ہے تو یہ دخل ہے حب دنیا کو ان امور میں جن کا میں ذکر کر رہا ہوں اور کفار میں تو یہ مرض ہے ہی' افسوس یہ ہے کہ ہم میں بھی پایا جاتا ہے۔

اور اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس آیت کو کیوں اختیار کیا گیا یہ تو کفار کے بارے میں ہے۔ چنانچہ "اِنَّ الَّذِیْنَ لَایَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا" اس میں صریح ہے۔ مسلمانوں کو اس سے کیا علاقہ؟ یہ شبہ بہت لوگوں کو ہوا ہوگا کیونکہ اکثر لوگوں کا خیال یہ ہے کہ جو آیتیں کفار کے بارے میں ہیں مسلمانوں سے ان کو کچھ علاقہ نہیں اور اسی لیے لوگ بے فکر بھی ہو گئے' میں کہتا ہوں کہ یہ کفار کی ذات ہے یا کفار کے اعمال ہیں' ظاہر ہے کہ بناء ان وعیدوں کی اعمال ہی ہیں جو کفار میں پائے جاتے ہیں اور راز اس کا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو نہ تو کسی کی ذات سے محبت ہے نہ کسی کی ذات سے بغض ہے۔ من حیث الذات خدا تعالیٰ کے نزدیک سب برابر ہیں۔

محبت وبغض کا مدار اعمال پر ہے

بلکہ دارومدار بغض ومحبت کا صرف اعمال ہیں جس کے اچھے اعمال ہوں حق تعالیٰ کو اس سے محبت ہے اور جس کے اعمال برے ہوں اس سے بغض ہے۔ مثل مشہور ہے کہ کام پیارا ہے' چام پیارا نہیں' اگر کسی کی ذات مبغوض ہوتو چاہیے کہ باوجود اعمال کے بھی وہ شخص مقبول نہ ہو۔ حالانکہ حدیث میں ہے کہ جب بندہ توبہ کر لیتا ہے تو اگر اس کے گناہ زمین بھر کر بھی ہوں وہ بھی معاف کردیئے جاتے ہیں۔ بس سمجھ لو کہ کفار پر جو وعیدیں ہیں وہ ان کی ذات پر نہیں بلکہ اعمال پر ہیں اس لیے اگر وہ امور کسی مومن میں پائے جائیں تو وہ بھی مستحق وعید اور عنداللہ مبغوض ہوگا۔ گو اس درجہ کا نہ ہو کیونکہ اقتران بالکفر سے ان اعمال میں زیادہ مبغوضیت آ جاتی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ مدار حب وبغض کا اعمال پر ہے۔ البتہ مومن وکافر کے عمل معصیت میں اتنا تفاوت ہے کہ ایک شخص نے سنکھیا کھایا اور تریاق نہیں کھایا۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص مرے گا اور ایک شخص نے سنکھایا کھایا اور تریاق بھی کھالیا' اثر سنکھیا کا اس صورت میں بھی ہوگا مگر ضعیف۔ یہی حال مومن اور کافر کا ہے کہ مومن نے باوجود استعمال معصیت کے تریاق بھی کھار کھا ہے۔ وہ کیا ہے؟ ایمان کہ اس نے اثر کو ضعیف کردیا ہے۔ بخلاف کفار کے کہ تریاق ایمانی انہوں نے کھایا اس لیے پورا اثر ہوا باقی زہر کھانے والے دونوں برابر ہیں اس لیے دونوں کو زہر کے مفاسد سنائے جائیں گے۔

ایک مثال اس کی یہ ہے کہ دنیا میں جرائم کرنے والے دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو بادشاہ کے باغی ہیں اور جرائم بھی کرتے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں کہ جرائم تو کرتے ہیں مگر باغی نہیں۔ یہ دوسرا فریق چونکہ مطیع ہے اس پر جرائم کی سزا محدود رہے گی۔ بخلاف اس گروہ کے جو باوجود جرائم کرنے کے باغی بھی ہے اس کی سزا محدود نہ ہوگی اور پہلے فریق سے سزا میں وہ بڑھا ہوا ہوگا۔ وہ یہ کہ دائم الحبس کیا جائے گا۔

ابدی سزا کا راز

یہی راز ہے کہ کفار کے ہمیشہ جہنم میں رہنے کا کہ کفار اس میں ہمیشہ رہیں گے اور مومن کو ہمیشگی نہ ہوگی۔ وجہ یہ ہے کہ مومن جرائم تو کرتا ہے مگر اس کے ساتھ باغی نہیں اور کافر جرائم بھی کرتا ہے اور باغی بھی ہے۔

بعض لوگوں کا اعتراض ہے کہ خدا تعالیٰ کے یہاں کفار کو ابدی سزا ہونا خلاف عقل ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ تم بھی وہی کرتے ہو جو خدا تعالیٰ نے تجویز کیا ہے مگر حکام کے اختیار میں غیر محدود ہمیشگی

نہیں اور اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں غیر محدود ہمیشگی ہے۔ اگر دوام ابدی آپ کے قبضہ میں ہوتا تو آپ بھی ایسے مجرموں کے لیے دوام ابدی ہی تجویز کرتے مگر کیا کریں مجرم کو بلا اختیار آپ کے موت آ جاتی ہے۔ اس لیے آپ مجبور ہیں۔ اپنے قلوب کو ٹٹول کر دیکھ لو اگر دوام ابدی آپ کے قبضہ میں ہوتا تو کیا کرتے۔ ظاہر ہے کہ ایسی ہی دوامی سزا تجویز کرتے۔ لوگوں کا بس نہیں چلتا اس لیے مجبور ہیں اور جتنا ان کا بس چلتا ہے اس میں کسر نہیں چھوڑتے۔ جیسے بعض ملکوں کی خاصیت ہے کہ وہاں عمریں بڑی ہوتی ہیں تو وہاں اگر باغی کو دائم الحبس کیا گیا تو وہ ہندوستان کے باغیوں سے زیادہ جیل خانہ میں محبوس رہے گا۔ مگر اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا کہ ہندوستان کے باغی تو بیس تیس برس ہی محبوس رہتے ہیں مگر دوسرے ملکوں کے باغیوں کو سو پچاس برس تک کیوں محبوس رکھا جاتا ہے اور اگر کوئی اعتراض کرے تو یہی جواب دیا جاتا ہے کہ سزا تو دونوں کی ایک ہے یعنی حبس دائمی مگر اس کا کیا علاج کہ ایک ملک میں باغی قید میں جلدی مر جاتا ہے اور دوسرے ملک کے دیر میں مرتے ہیں اس لیے زمانہ حبس میں تفاوت ہو گیا۔

اسی طرح عالم آخرت کی خاصیت ہے کہ وہاں عمریں طویل ہوتی ہیں کسی کو وہاں موت نہیں آتی اور باغی کی سزا دنیا میں بھی حبس دائمی ہے تو آخرت میں بھی اگر حبس دائمی ہے تو اس میں خدا تعالیٰ پر کیا اعتراض ہے؟ خدا تعالیٰ نے کوئی نیا کام نہیں کیا' وہی کیا ہے جو تم کرتے ہو۔ مومن میں چونکہ ایمان ہے اس لیے اس کے اثر سے میعادی سزا ہو گئی کیونکہ وہ باغی نہیں ہے اور کافر چونکہ باغی ہے اور بغاوت کی سزا عقوبت دائمہ ہے اس لیے اس کو ہمیشہ جہنم میں رہنا ہو گا۔

طالب علمانہ اشکال کا جواب

یہاں ایک اور طالب علمانہ شبہ ہو سکتا ہے وہ یہ کہ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ آیت کفار کے بارے میں ہے اور وعید جن اعمال پر وارد ہے ان میں بعض فرعی بھی ہیں۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ کفار مکلف بالفروع ہوں حالانکہ فقہاء اصولیین کے نزدیک کفار مکلف بالفروع نہیں۔ اسی لیے انہوں نے تصریح کی ہے کہ اگر کافر قبل اسلام لانے کے نماز پڑھے تو اس کی نماز نہ ہو گی کیونکہ وہ مکلف ہی نہیں۔ اسی طرح بعد اسلام کے ان نمازوں کی قضا واجب نہیں۔ اس سے کفار کا مکلف بالفروع ہونا لازم نہیں آتا۔ وہ اس طرح کہ کفار کو جو عذاب ہو گا وہ اصل میں نفس کفر پر ہو گا۔ بخلاف مسلمان کے کہ اس کو جو سزا ہو گی وہ ترک فروع پر ہو گی۔ ہاں کافر کی سزا میں بوجہ ترک فروع کے

اضافہ ہو جائے گا اور عقوبت بڑھ جائے گی۔ یہ نہیں کہ نفس ترک فروع پر سزا ہوگی۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے دو باغی ہوں جو حکومت کی اطاعت نہیں کرتے مگران میں ایک تو وہ ہے کہ بغاوت بھی کرتا ہے اور اس کے ساتھ ملک میں شورش بھی کرتا ہے اور دوسرا باغی تو ہے مگر نافرمانی اس کی ذات تک ہی ہے شورش نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ بغاوت پر سزا دونوں کو ہوگی مگر جو بغاوت کے ساتھ شورش بھی کرتا ہے اس کی سزا میں بہ نسبت شورش نہ کرنے والے کے اضافہ ہوگا۔ اس صورت میں اصل سزا تو بغاوت پر ہے مگر بوجہ شورش کے اس میں اضافہ ہو گیا ہے۔

کافر ترک فروع کی مثال شورش کرنے والے باغی کی سی ہے کہ کفر تو کرتا ہی ہے لیکن باوجود کفر کے فروع کو بھی بجا نہیں لاتا تو اس کو اصل سزا تو کفر پر ہوگی مگر ترک فروع کی وجہ سے سزا میں زیادتی ہو جائے گی اور اس کافر کی مثال جو بعض فروع کو ادا کرتا ہے جو مشروط بالایمان نہیں جیسے عدل وتواضع وسخاوت' اس باغی کی سی ہے جو شورش نہیں کرتا۔ اس کو اصل سزا کفر پر ہوگی' ترک فروع سے اضافہ اور زیادتی نہ ہوگی۔ اب شبہ کفار کے مکلّف ہونے کا جاتا رہا اور مسلمانوں کی مثال اس مجرم کی سی ہے جو باغی نہیں ہے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کفار گو فروع کے مکلّف نہیں مگر پھر بھی ترک فروع پر عتاب ہوگا۔ گو تقویت ہی کے لیے سہی تو مسلمان جو کہ فروع کے مکلّف ہیں وہ آیت سے زیادہ مورد وعید ثابت ہوں گے کیونکہ جب غیر مکلّف بالفروع کو بھی ان فروع کے ترک سے ضرر ہوتا ہے تو جو ان فروع کا مکلّف ہے اس کو ان کے ترک سے کیوں ضرر نہ ہوگا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ جو ان معاصی کو اختیار کرے گا وہ مستحق وعید ہوگا۔ خواہ کوئی ہو پس اگر وہ اعمال جو کفار میں پائے جاتے ہیں ہم میں بھی ہیں تو ہم بھی ضرور مستحق وعید ہوں گے۔ گو وعید کفر کے مستحق نہ ہوں مگر وعید معاصی کے ضرور مستحق ہوں گے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جو امور اس آیت میں بیان کیے گئے ہیں اگرچہ سارے ہمارے اندر موجود نہ ہوں مگر بعض کا پایا جانا متحقق ہے۔ گو کفار کے برابر نہ پائے جاتے ہوں۔ چنانچہ آیت کے جزو اول یعنی " اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَ نَا" (یعنی جن لوگوں کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے) (سورہ یونس آیت نمبر۷) سے تو مسلمان بے شک بری ہیں کیونکہ حق تعالیٰ کی لقاء کا تو ہر مسلمان کو اعتقاد ہے۔ یہ جزو تو بحمد اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں ہے نہیں مگر دوسرا جزو یعنی "وَرَضُوۡا بِالۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا" (اور وہ دنیوی زندگی پر راضی ہو گئے ہیں) (سورہ یونس آیت نمبر۷) تو موجود ہے۔ گو کفار سے کم درجہ میں ہو مگر ہے ضرور اور اگر کسی کو شبہ ہو کہ جس رضا بالدنیا پر وعید ہے۔ شاید یہ مشروط بعدم رجاء اللقاء یعنی مشروط بالکفر ہو پھر مسلمان اس کا

موردنہ ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ ذوق لسان کے بالکل خلاف ہے۔ ہر اہل لسان سن کر یہی سمجھے گا کہ ان اعمال کی بھی تقبیح مقصود ہے۔ بلا شرط اقتران بالکفر کے۔

آگے ارشاد ہے: "وَاطْمَأَنُّوْا بِهَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" (اور اس میں جی لگا بیٹھے ہیں) (یونس آیت نمبر ۷) کی تفسیر ہے اور یہ عجیب پر شفقت موقع ہے تفسیر کا کیونکہ رضا بحیات دنیا انسان کا امر طبعی ہے جو اختیار میں نہیں۔

اطمینان بالدنیا مذموم ہے

اگر مطلق رضا بحیات دنیا معصیت ہوتی تو کوئی فرد انسانی بھی اس سے نہ بچ سکتا کیونکہ دنیا کی زندگی سے کون راضی نہیں۔ اس لیے ضرورت واقع ہوئی تفسیر کی۔ اگر تفسیر ساتھ کے ساتھ نہ ہوتی تو اس آیت سے لوگوں کی کمر ٹوٹ جاتی۔ پس شفقت اسی میں ہے کہ ساتھ کے ساتھ تفسیر کردی جائے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں: "وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوْا بِهَا" اس قید کے بڑھانے سے معلوم ہوگیا کہ رضا بحیات دنیا معصیت و مذموم وہ ہے جس کے ساتھ اطمینان بھی ہو ورنہ معصیت نہیں کیونکہ یہ تو امر طبعی ہے چنانچہ ایک اور آیت میں اس کی تصریح ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآءُكُمْ وَاَبْنَآءُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اِقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ. الخ

یعنی آپ کہہ دیجئے اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے قبیلے اور تمہارے وہ اعمال جنکو تم نے حاصل کیا ہے اور وہ تجارت جسکے خسارے سے تم ڈرتے ہو اور وہ مکان جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو اللہ سے اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اور اسکے راستہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہوں۔ الخ

یہاں وعید اس پر ہے کہ یہ چیزیں اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبوب ہوں اور اگر یہ چیزیں کسی درجہ میں تو محبوب ہوں لیکن اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبوب نہ ہوں تو ان پر وعید نہیں کیونکہ ان چیزوں کا محبوب ہونا امر طبعی ہے معلوم ہوا کہ ان چیزوں کو پسند کرنا اور ان پر خوش ہونا اور مطلق رضا محل وعید نہیں۔ البتہ حیات دنیا پر مطمئن ہونا محل وعید ہے اگر اطمینان کی حالت ہو تو قابل علاج ہے ورنہ نہیں۔

اب یہ سمجھنا چاہیے کہ اطمینان کس کو کہتے ہیں کہ جس پر وعید وارد ہے۔ اطمینان کے معنی ہیں سکون کے جو مقابل ہے حرکت کا مطلب یہ ہوگا کہ حیات دنیا پر اتنا قرار ہو گیا ہے کہ اس سے قلب و

ذہن کو آگے حرکت ہی نہیں ہوتی۔ آگے خیال ہی نہیں چلتا جیسے کوئی چیز مرکز پر ٹھہر جاتی ہے کہ آگے نہیں بڑھتی اس پر وعید ہے۔ سو آج کل اکثر ہماری یہی حالت ہو رہی ہے کہ جو جس حالت پر ہے اسی پر ٹھہرا ہوا ہے' آگے قدم ہی نہیں بڑھاتا' ہم کو ساری فکر حیات دنیا ہی کی ہے۔ منہمکین فی الدنیا کی یہ حالت ہے کہ جب کبھی تذکرہ کرتے ہیں تو دنیا ہی کا۔ حتیٰ کہ ریل میں ہوتے ہیں تب بھی دنیا ہی کا تذکرہ ہے۔ یہی پوچھتے ہیں کہ تمہارے یہاں اناج کا کیا حال ہے؟ بارش کیسی ہوئی؟ نرخ کیا ہے؟ غرض ہر مجلس میں دنیا ہی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ حالانکہ ریل کا موقع تو بے فکری اور فرحت کا ہے مگر ان کو اس میں بھی دنیا ہی کی فکر ہے۔ اس سے آگے حرکت ہی نہیں ہوتی۔ دنیا ہی پر سکون و قرار ہو گیا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ آخرت کی فکر نہیں۔ آگے ارشاد ہے: "هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ" (یونس آیت نمبر ۷) یہ ہے کہ باوجود یہ کہ ہماری نشانیوں کو دیکھتے ہیں مگر پھر غافل ہیں ان تینوں جملوں کا یہ حاصل تھا جس سے اصل جرم یہ ثابت ہوا کہ ہم کو حیات دنیا پر اطمینان ہو گیا ہے۔ یعنی حرکت الی الآخرت نہیں ہوتی۔

حرکت الی الآخرۃ کی اقسام

اب یہ سمجھئے کہ حرکت الی الآخرت جو کہ مقابل ہے سکون کا' تین قسم کی ہوتی ہے۔ ایک حرکت اعتقادی' دوسری عملی' تیسری حالی' یعنی آخرت کی دھن میں ہر وقت بے چین رہنا اور اسی کی کاوش ہونا۔ کفار کو تو کسی قسم کی حرکت بھی نہیں کیونکہ ان کا اعتقاد ہی درست نہیں۔ مسلمانوں کو حرکت اعتقادی تو حاصل ہے مگر حرکت عملی اور حالی نہیں یعنی نہ اعمالِ آخرت کا اہتمام ہے نہ اس کی دھن ہے' اس کی کاوش ہی نہیں۔ یہ مرض قریب قریب عام ہے اور عوام تو عوام خود ہم لکھے پڑھوں کی حالت یہ ہے کہ ہمارے قلوب آخرت کے لیے بے چین نہیں ہیں جیسے کسی پر کوئی مقدمہ دائر ہوتا ہے اور اس وقت طبیعت بے چین ہوتی ہے کہ کسی وقت بھی قلب کو قرار نہیں ہوتا۔ ہر وقت اسی کی دھن اور اسی کا فکر اور خیال ہوتا ہے۔ چنانچہ جس زمانہ میں طاعون پھیلا ہوا تھا تو قلوب پر کیسی بے چینی طاری تھی کہ کسی وقت قرار ہی نہ تھا۔ اسی کا دھیان اور اسی کی سوچ تھی۔ سو ہماری یہ حالت نہیں بلکہ جو جس حالت پر ہے اسی پر ٹھہرا ہوا ہے۔ یہ نہیں کہ حالت موجودہ سے ترقی کی جائے۔

مثلاً نمازی ہی کو لیجئے کہ پانچ وقت کی نماز پڑھتے ہیں اسی پر قرار ہے۔ یہ نہیں کہ پانچ وقت کے علاوہ اور بھی کوئی نفل نماز پڑھیں۔ نہ یہ خیال ہے کہ جو نماز ہم پڑھ رہے ہیں وہ ٹھیک طور سے بھی پڑھتے ہیں کہ نہیں۔ یہ بھی ایک قسم کی حرکت ہے جس کو ہم نے چھوڑ رکھا ہے۔ بس ہم کو اپنی حالت پر

اطمینان ہے اور سمجھتے ہیں کہ سب کچھ کررہے ہیں حالانکہ حالت یہ ہونی چاہیے کہ باوجود سب کچھ کرنے کے پھر بھی ڈرتے رہیں۔ چنانچہ ایک آیت میں ہے:

وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَآاٰتَوْا وَّقُلُوْبُھُمْ وَجِلَۃٌ اَنَّھُمْ اِلٰی رَبِّھِمْ رٰجِعُوْنَ

''اور جو لوگ دیتے ہیں اور ان کے دل اس سے خوف زدہ ہوتے ہیں کہ وہ اپنے رب کے پاس جانے والے ہیں۔'' (المومنون آیت نمبر ۶۰)

یعنی باوجود عمل نیک کرنے کے پھر بھی ان کے قلوب خوف زدہ ہیں۔ دیکھئے کوئی حاکم بالا ہو اور اس کا عملہ بڑی مستعدی سے کام کرتا ہو مگر پھر بھی لوگوں کو اس کے آنے کے وقت یہ ڈر سوار رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ حاکم بالا ہم کو پاس نہ کرے جس وقت حاکم آتا ہے تو ان کے قلوب کو بے چینی لاحق رہتی ہے کہ دیکھئے انجام کیا ہو۔

اسی طرح مسلمانوں کے قلب کی حالت ہونی چاہیے کہ باوجود کام کرنے کے پھر بھی ڈر سوار رہے کہ دیکھئے کیا حشر ہوتا ہے' مسلمانوں کو کسی وقت چین نہ ہونا چاہیے۔ اگر یہ حالت نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

دیکھئے! حضرات انبیاء علیہم السلام جو کہ حال پر غالب ہوتے ہیں ان کی حالت یہ تھی کہ ہر وقت سوچ میں رہتے تھے اور ہماری بے فکری کی تو یہ حالت ہے اور پھر ہم کو اپنے تقویٰ پر ناز ہے۔ ہم انبیاء علیہم السلام سے تو زیادہ نہیں وہاں تو یہ حالت تھی کہ حق تعالیٰ کے خوف سے ان کی روح فنا ہوتی تھی اور ہر وقت سوچ میں رہتے تھے ہر مسلمان کی یہی حالت ہونا چاہیے کہ کسی وقت بھی چین نہ ہو' قرار نہ ہو یہ کیفیت ہو۔

عاشقی چیست بگو بندہ جاناں بودن دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن

(عاشقی کیا ہے؟ محبوب کا غلام بن جانا' اپنا دل اس کو دے دینا اور حیران رہ جانا)

یہی ہر وقت کی فکر ترقی ہے قرب کی اور خدا تعالیٰ کے اس قرب کی تو کوئی انتہا ہی نہیں کہ جس پر سکون و قرار ہو سکے۔ وہاں تو یہ حالت ہے کہ جس قدر بھی ترقی کرو وہ کم ہے۔ یہ کیفیت ہے۔

اے برادر بے نہایت درگہے است ہرچہ بروے میرسی بروے مایست

(اے بھائی یہ درگاہ لامنتہی ہے۔ جس مقام پر بھی پہنچو گے اگلا مقام نظر آئے گا)

ہم زمینداروں کو دیکھتے ہیں کہ ان کو دنیا کی ترقی سے چین نہیں جس قدر زمین وغیرہ ان کے پاس ہے اس پر قناعت نہیں بلکہ یہی ہوس ہے کہ اور زمین ہو اور گاؤں ہو۔ پھر افسوس یہ ہے کہ لوگ صرف نماز کی ٹکریں مار کر کیسے بے فکر ہو گئے' عہدیداروں کو فکر ہے کہ ہمارے اگر آج پچاس ہیں تو

کل کو سو ہو جائیں، مکان بناتے ہیں تو فکر ہے کہ اور بنائیں اور بڑھائیں۔ اس میں یہ زیادہ کریں، اس میں وہ بڑھائیں، ایک رئیس کا قصہ ہے کہ ان کو عمارت سے بے حد شوق تھا، اسی کی دھن تھی، وہ کہتے تھے کہ جب تک میرے کان میں بسولی کی آواز نہیں آتی چین ہی نہیں پڑتا۔

عمارت کے بارے میں معماروں کا مقولہ ہے کہ ایک گز زمین میں ساری عمر تعمیر جاری رکھ سکتے ہیں، ایک گز زمین عمر بھر کافی ہے۔ اسی طرح کہ اوپر کو عمارت بڑھاتے ہوئے چلے جائیں، ساری عمر بھی ختم نہ ہو یا ایسی صورتیں اس میں پیدا کرتے چلے جائیں کہ ساری عمر کام جاری رہے۔ ایک گز زمین ہی میں اچے بچے کچے بناتے چلے جاؤ تو ساری عمر بھی ختم نہ ہو۔

غرض جس کو جس چیز کی لت ہوتی ہے اس سے جی نہیں بھرتا۔ افسوس ہے کہ آخرت سے جی بھر گیا ہے اور دنیا سے نہیں بھرتا۔ مولانا فرماتے ہیں:

اے کہ صبرت نیست از دنیائے دوں　　صبر چوں داری زنعم الما ہدون
اے کہ صبرت نیست از فرزند و زن　　صبر چوں داری زرب ذوالمنن

(اے بندہ خدا تو اپنے اہل وعیال سے صبر نہیں کر سکتا تو اللہ تعالیٰ سے کس طرح صبر کر سکتا ہے۔ اے بندہ خدا تجھے کمینی دنیا سے صبر کرنے کی طاقت نہیں تو پھر اللہ تعالیٰ سے کیونکر صبر کر سکتا ہے)

دنیا کے دھندوں سے جی نہیں بھرتا مگر جی بھرا تو خدا سے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹھنڈے ہو کر بیٹھ گئے ہیں کہاں ذوق، کہاں شوق، فکر ہی نہیں کہ کیا ہوگا۔ بس یہی شکایت ہے کہ ہم کو دنیا کی زندگی پر قرار ہو گیا ہے۔ صاحبو! جس کو حرکت ہوتی ہے اس کی تو یہ حالت ہوتی ہے۔

دل آرام در بر دل آرام جو　　لب از تشنگی خشک و برطرف جو

(محبوب سے ہمکنار اور محبوب کی تلاش، پیاس سے ہونٹ خشک اور لب دریا سیرابی کے طلب گار)

دنیا میں کوئی کسی پر عاشق ہو جائے تو بس وصل ہونے پر انتہا ہو جاتی ہے۔ مثلاً کوئی کسی مردار صورت پر عاشق ہو جائے تو وصل ہو جانے پر منتہی ہو گیا اور دل بھر جاتا ہے کیونکہ یہ اس کے حسن کی انتہا ہے آگے کچھ نظر ہی نہیں مگر خدا سے تو جی بھرنا نہ چاہیے کیونکہ ان کے حسن کی انتہا ہی نہیں۔ وہاں تو یہ حالت ہے:

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی راسخن پایاں　　بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

(نہ ان کے حسن کی کوئی انتہا نہ سعدی کے کلام کی جسے جلندھر کا مریض پیاس مر جاتا ہے اور دریا باقی رہتا ہے ایسا محبوب کا بیان باقی رہ گیا)

اور یہ کیفیت ہے

قلم بشکن سیاہی ریز و کاغذ سوز ودم درکش　　حسن ایں قصہ عشق است در دفتر نمے گنجد

(قلم توڑ دؤ سیاہی پھینک دو اور کاغذ جلا دو اور چپ سادھ لو کیونکہ حسن یہ قصہ عشق ہے جو دفتر میں نہیں سماتا)
ان کا حسن تو کیا منتہی ہوتا ان کی حکایات کا بھی کہیں منتہی نہیں۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّىْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّىْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا۔ (الکہف:۱۰۹)

''آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجئے کہ اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لیے سمندر روشنائی ہو تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر خشک ہو جائے گا اگرچہ اس سمندر کی مثل ایک دوسرا سمندر مدد کے لیے آجائے)

ان کی تو شان یہ ہے

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار گل چین بہار تو زداماں گلہ دارد

(نگاہ کا دامن تنگ ہے اور تیرے پھول کثرت سے ہیں اس لیے تیرے پیار کا حسن گلچیں اپنے دامن کی تنگی کا گلہ رکھتا ہے کہ اس کو دامن اتنا تنگ کیوں ملا)

سیری کی دو صورتیں ہوتی ہیں ایک یہ کہ حسن منتہی ہو۔ دوسرے یہ کہ طلب نہ ہو۔ پہلی صورت تو سیری کی یہاں ہو نہیں سکتی کیونکہ حسن کی انتہا نہیں ہاں یہ صورت البتہ ہے کہ ہماری طرف سے طلب نہیں ہے اور مسلمان کے لیے یہ بڑی غفلت اور کمی کی بات ہے اس واسطے ہم کو طلب پیدا کرنا چاہیے۔

صاحبو! دھن پیدا کرو اور یہ سمجھ لو کہ ہر چیز کے حاصل ہونے کے کچھ طریقے ہوتے ہیں۔ دھن پیدا ہونے کے بھی طریقے ہیں۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ مراقبات کرو' اہل اللہ کی صحبت اختیار کرو' ذکر کرو' ہم کو چاہیے کہ شب و روز سوچا کریں۔ افسوس ہمیں کچھ سوچ نہیں ہے' اگر عادت سوچ کی ہو جائے تو سب مرحلے طے ہو جائیں' ہم میں جو عمل کرنے والے ہیں ان کی یہ حالت ہے کہ وقت نکال کر کثرت سے وظائف پڑھتے ہیں' نوافل پڑھتے ہیں' میں پوچھتا ہوں کہ جیسا ان کے لیے وقت نکالا ہے آیا سوچنے کے واسطے بھی کوئی وقت رکھا ہے جس میں آخرت کی باتوں کو سوچا کریں کہ مابعد الموت کیا پیش آنے والا ہے' قبر میں کیا ہوگا؟ میدان آخرت میں کیا کیفیت ہوگی؟ پل صراط پر کیا حالت ہوگی؟ حق تعالیٰ کے روبرو جانا ہوگا؟ صاحبو! عذاب کو سوچو ثواب کو سوچو۔

قرآن شریف میں فکر کے مختلف طریقے بتلائے گئے ہیں۔ کہیں جنت کا ذکر ہے کہیں دوزخ کا حال ہے۔ وجہ یہ ہے کہ طبائع مختلف ہیں کسی کو عذاب کے سوچنے سے نفع ہوتا ہے کسی کو جنت کی نعمتوں کا خیال کرنا سودمند ہے۔

ایک شخص کا قصہ ہے کہ انہوں نے مجھ سے کہا کہ موت کے سوچنے سے دل گھبراتا ہے۔ میں نے کہا کہ اگر موت کے سوچنے سے دل گھبراتا ہے تو حیات کو سوچو کہ اس حیات سے اچھی ایک دوسری حیات ہے۔

صاحبو! دنیا اور آخرت کی مثال روپیہ اور اشرفی کی سی ہے۔ مثلاً ایک شخص اشرفی لے کر نکلا' دوسرا شخص راستہ میں ملا' اس کے پاس چمکدار روپیہ تھا' وہ اس سے کہنے لگا کہ اگر تم کو ہو تو یہ چمکدار روپیہ تم کو دے دوں اور اشرفی میں لے لوں' اشرفی والے کو اشرفی کا رنگ روپیہ کے سامنے اچھا معلوم نہ ہوتا تھا اور روپیہ وزن میں بھی زیادہ تھا' اس لیے بدلنا چاہا' اس حالت میں کسی نے اس سے کہا کہ میاں! دھوکا مت کھانا' روپیہ اگرچہ بہ نسبت اس کے چمکدار اور وزن میں زیادہ ہے مگر اشرفی اٹھارہ روپیہ کو بکتی ہے۔ اب اس نے سوچا کہ جب یہ صورت ہے تو میں روپیہ کو لے کر کیا کروں گا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں یہ شخص مبادلہ پر کبھی راضی نہ ہوگا۔ یہ نتیجہ ہوا سوچنے کا۔

سوچنے کا علم حقیقت لازم ہے جب آدمی سوچتا رہتا ہے تو حقیقت معلوم ہو ہی جاتی ہے۔ بس جب کوئی دنیا اور آخرت کو سوچے گا تو معلوم ہوگا کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کوئی چیز نہیں' روپیہ اور اشرفی کی بھی نسبت نہیں' یہ جو قرآن شریف میں ہے کہ

لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (البقرہ آیت نمبر ۲۱۹'۲۲۰)

''تاکہ تم دنیا و آخرت کے معاملات میں سوچ لیا کرو۔''

کہ فکر کرتے ہیں دنیا اور آخرت میں اس فکر فی الدنیا کی کسی نے کیا اچھی تفسیر کی ہے کہ دنیا کی تکالیف اور دنیا کی لذات میں غور کرے کہ یہاں کی لذات سب ایک دن فنا ہو جائیں گی اور دنیا کی زندگی تکالیف سے بھری ہوئی ہے اور فکر آخرت سے اس کا عکس ثابت ہوگا۔ اس مجموعہ کے سوچنے سے دنیا کی بے قدری ہوگی اور آخرت کی طرف رغبت بڑھے گی۔ جب دونوں کا موازنہ کرے گا تو معلوم ہوگا کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا لاشے محض ہے۔ اور اس مراقبہ سے دنیا کی تکالیف میں بھی کمی ہوگی کیونکہ جب سوچے گا کہ دنیا میں بالفعل اگرچہ تکالیف ہیں مگر یہ ایک روز فنا ہو جائے گی اور آخرت میں راحت ہی راحت ہے تو وہ تکالیف نہ معلوم ہوں گی اس لیے میں نے اس ذاکر سے کہا کہ جب موت کے تفکر سے جی گھبراتا ہے تو حیات کا تفکر کرو۔ حق تعالیٰ نے ہر شخص کے مناسب سوچنے کی چیزیں بتلا دی ہیں مگر افسوس! ہمارا کوئی وقت سوچنے کے لیے فارغ نہیں۔

تفکر اور اس کے موانعات

اب میں موانع تفکر کو بیان کرتا ہوں۔ سو وہ دو چیزیں ہیں جو سوچنے سے مانع ہوتی ہیں' کبھی تو

شہوت جسمانی مانع ہوتی ہے کہ انسان دنیا کی شہوات میں گرفتار ہو کر آخرت کی سوچ نہیں کرتا اور یہیں کی شہوات میں رہ جاتا ہے اور کبھی لذات نفسانی میں مبتلا ہونا مانع ہوتا ہے کیونکہ آخرت کی سوچ میں یہاں کی لذات میں کمی ہو جائے گی مگر لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ آخرت کی سوچ سے یہاں کی تکالیف میں بھی کمی ہو جائے گی۔ پھر لذت کے متعلق بھی انسان کو یوں سوچنا چاہیے کہ اگر میں دنیا کی لذات میں مبتلا رہا تو آخرت کی لذات مجھ سے فوت ہو جائیں گی۔ اس سوچنے میں ہر ہر قدم پر نفع ہے۔

اصل علاج مختصر سوچ ہے کہ اس سے ساری باتیں علم و عمل کی درست ہو جائیں گی۔ اب یہ سمجھو کہ عمل دو قسم کے ہیں ایک وہ کہ جن کا جائز ناجائز ہونا آپ کو معلوم ہے ان پر تو یاد کر کے ابھی سے عمل کرنے لگو، دوسرے وہ کہ جن کا جائز ناجائز ہونا معلوم نہیں۔ چنانچہ زمینداری کے بہت سے ایسے اعمال ہیں جن کا جواز عدم جواز لوگوں کو معلوم نہیں ان کو تلاش کرو، علماء سے پوچھو۔ یہ نمونہ کے طور پر میں نے ذکر کر دیا، سوچنے سے سارے ابواب دین کے مفتوح نظر آئیں گے۔

سوچنے کی مثال ایسی ہے کہ جیسے گھڑی میں بال کمانی کہ ہے تو وہ بہت مختصر مگر تمام پرزوں کو حرکت اسی سے ہوتی ہے اسی طرح سوچنے سے دین کے قلعے فتح ہو جائیں گے، عوام کو تو کیا کہا جائے میں کہتا ہوں کہ علماء بھی کیا کر رہے ہیں، کچھ بھی نہیں کرتے اور میں بھی اس میں داخل ہوں۔ ان کا جی تو چاہتا ہے سوچنے کو مگر خلوت کا اہتمام نہیں۔ غرض عموماً ہمارے مذاق خراب ہو گئے ہیں، ہر وقت ہاؤ ہو اور ہنسی دل لگی میں وقت گزار رہے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ چوپال میں پہنچے اور ہنسی میں سارا وقت گزار دیا۔ اول تو دنیا کے دھندوں سے سوچنے کے لیے فرصت ہی نہیں ملتی اگر فرصت ملی بھی تو پھر بجائے آخرت کے سوچتے ہیں کہ فلاں دوست کے پاس جا کر باتیں کریں گے، وقت کٹے گا، طبعیت بہلے گی، بس وہاں جا کر خرافات میں وقت عزیز کو گزار دیتے ہیں۔

خوب سمجھ لو کہ تمہارے دوست حقیقت میں دشمن ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے تمہارا کوئی روپیہ چرا لے تو اس حرکت پر آپ کو کس قدر افسوس ہوگا۔ اسی طرح جو آپ کے دوست ہیں وہ آپ کے بیش قیمت وقت کو جو اشرفیوں سے بھی زیادہ قیمتی ہے لوٹ رہے ہیں۔ ایک ڈاکو حقہ ہے۔ اس نے (خدا اسے سلامت رکھے) ایسا رواج پایا ہے کہ دو پیسہ کا تمبا کو خرچ کر کے اس کی بدولت جتنا چاہو مجمع کر لو اور اوقات سب کے برباد کر لو۔ بس حقہ کیا ہے جامع المتفرقات ہے۔ یہ حقہ ثقہ اور غیر ثقہ دونوں کا جامع ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ جب کبھی کسی کو اپنے گھر کی رونق اور آبادی مدنظر ہوتی ہے تو وہ حقہ کا اہتمام کرتا ہے۔ اس کا اہتمام کرنا تھا پھر مجمع کی کیا کمی۔ گویا ہم لوگ حقیقت میں خود اس واسطے مجمع

کرتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے پاس دولت ہے وہ سب چرا کر لے جائیں۔ (یعنی وقت)

وقت بڑا بیش قیمت ہے

صاحبو! یہ وقت بڑی بیش قیمت چیز ہے اس کی قدر کرو وقت اتنی قیمتی چیز ہے کہ جس وقت عزرائیل علیہ السلام آجائیں گے قبض روح کے لیے تو تم تھوڑے سے وقت کے لیے تمام سلطنت بھی دینے کے لیے تیار ہو جاؤ گے مگر ایک منٹ کی بھی مہلت نہ ملے گی۔ چنانچہ ارشاد ہے:

اِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ. (یونس ۴۹)

"جب ان کا وہ وقت آ پہنچتا ہے تو ایک ساعت نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ آگے سرک سکتے ہیں۔"

اس اجتماع و اختلاط کے متعلق ایک ضروری اور مفید بات ہے وہ یہ کہ وحشت ناک لوگوں کی فہم سے اندیشہ ہے کہ الٹا نہ سمجھ جائیں کیونکہ آج کل فہم کا قحط ہے۔ سیدھی بات کو بھی الٹا سمجھ جاتے ہیں۔ اس لیے اس کو کہتے ہوئے جی رکتا ہے مگر خیر اس وقت زبان پر بات آ گئی اس لیے تو کلاً علی اللہ بیان کیے ہی دیتا ہوں۔ وہ یہ کہ بعض لوگوں کا آج کل یہ مشغلہ ہو گیا ہے کہ مختلف بزرگوں کے پاس دورہ کرتے پھرتے ہیں۔ آج اس بزرگ کے پاس پہنچ گئے، کل دوسرے کے پاس، پرسوں تیسرے کے پاس، خوب سمجھ لو کہ آج کل اس میں بھی دین کا نقصان ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اکثر بزرگوں کے یہاں ہر قسم کے لوگوں کی مجلس ہوتی ہے اور وہ لوگ ہر قسم کی باتیں وہاں کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ غیبت بھی، پھر یہ بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے اور گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ آج کل اکثر مجالس ایسی ہی ہیں انجام یہ ہوتا ہے کہ یہ شخص بزرگوں کے پاس سے اتنا لاتا نہیں جتنا کھو کر آتا ہے۔ جب یہ حالت ہے بزرگوں کی مجالس کی تو اور مجالس کی خرابیاں کیسی کچھ ہوں گی مگر آج کل جا بجا مجالس گرم کرنے کا عام رواج ہو گیا ہے، چوپالیں اسی واسطے بنائی جاتی ہیں پھر ان میں یہ حالت ہوتی ہے کہ جہاں چار آدمی جمع ہوئے تو غیبتیں اور لایعنی باتیں شروع ہوئیں اور در حقیقت یہ سارے قصے بے فکری کی بدولت ہیں۔ جب کوئی کام نہیں ہوتا تو چوپایوں میں بیٹھ کر معاصی میں وقت گزارتے ہیں۔ یہ نشست گاہیں اسی واسطے آج کل موضوع ہیں۔ یہاں تک کہ جن چیزوں کی طرف نگاہ کرنا حرام کیا گیا ہے چوپال میں بیٹھ کر ان پر بھی نظر ہوتی ہے، ان سے پرہیز کی عادت ہی جاتی رہتی ہے۔ اس کا کچھ خیال نہیں کہ بے موقع نگاہ کرنے پر بھی سخت مواخذہ ہوگا اس لیے اسلم یہی ہے کہ ایسی صحبت ہی سے جدا رہے۔ شاید بچنا آسان ہو جائے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ آج کل ہماری بزرگی کی ایسی مثال ہے

جیسے رڑکی گودام کے کاریگروں کی کاریگری کہ جب تک اس احاطہ میں ہیں اس وقت تک کاریگر ہیں اور جہاں باہر نکلتے ہیں تو اناڑی کیونکہ وہاں سب کام مشین سے ہوتے ہیں۔ باہر مشین کہاں! یہی حالت ہماری ہے کہ جب تک گوشہ میں ہیں تو کچھ عمل کرتے بھی ہیں اور معاصی سے بچتے ہیں اور جہاں گھر سے باہر نکلے اور آفتیں نازل ہوئیں۔ میں پختہ لوگوں کو نہیں کہتا اور پختہ لوگ ہیں کتنے۔ پختہ لوگ تو اس سے مستثنیٰ ہیں ان کی مثال تو آج کل ایسی ہے جیسے ہزاروں چنے میں ایک گیہوں کا دانہ۔

آج کل کی مجالس کی حالت

ورنہ عام مجالس کی تو بری حالت ہے اور یہ خرابی کس وجہ سے ہوئی۔ اس وجہ سے کہ دین کی فکر نہیں رہی' دنیا پر اطمینان ہو گیا جس کو دین کی فکر ہوگی وہ تو لوگوں کے رات دن کے برتاؤ کو دیکھ کر تنگ ہوگا' پریشان ہوگا' دیکھے گا کہ لوگ دین کو ضائع کر رہے ہیں اور دنیا میں ایسے مشغول ہیں اور اس پر ایسا اطمینان کئے ہوئے کہ دین کی ذرا بھی فکر نہیں۔ پس جس کو دین کی فکر ہوگی وہ تو لوگوں کی اس حالت کو دیکھ کر گوشہ ہی قبول کرلے گا۔ میں کھیتی سے منع نہیں کرتا' خرید وفروخت' دنیا کے اور معاملات سے نہیں روکتا' میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سارے کام دنیا کے اور تعلقات کو چھوڑ کر مسجد کے گوشہ میں بیٹھ رہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ کاروبار سب کرو مگر دنیا پر مطمئن مت ہونا۔ آخرت کو پیش نظر رکھو اور جو وقت کام کاج سے بچے اس کو فضول باتوں میں ضائع نہ کرو۔

ممنوعات شرعیہ میں مبتلا مت ہونا بلکہ جو لوگ آج کل کی مجالس میں شریک ہونے سے متحرز ہیں اور بیلوں کی صحبت میں رہتے ہیں وہ پھر اچھے ہیں۔ بہت ہوگا ایسا شخص بیلوں کی صحبت میں رہنے سے بیل ہو جائے گا مگر مواخذہ آخرت سے تو بچے گا۔ میں اسی لیے کھیتوں کو پسند کرتا ہوں کیونکہ ان لوگوں کو گناہوں کے لیے کم موقع ملتا ہے' کہیں پانی دے رہے ہیں' کہیں نولائی کر رہے ہیں' کہیں آوازیں لگا رہے ہیں' بعضے خدا کے بندے ایسے ہیں کہ آوازیں بھی اللہ کے ذکر کی لگاتے ہیں۔ گو اس میں قدرے کلام ہے مگر مقصود ان کے مذاق کا بیان کرنا ہے۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو واہی تباہی باتوں سے غیبت وغیرہ سے تو بچاؤ ہوتا ہے۔

کسانوں کی یہ کیفیت ہے کہ صبح سے کھیتی کے کام میں مشغول رہے۔ دوپہر کو گھر سے کھانا پہنچ گیا' اس کو کھا کر ذرا آرام کیا' پھر کام میں مشغول ہو گئے' رات کو ہارے تھکے آئے نماز پڑھی اور سو گئے۔ ساری خرافاتوں سے بچے' ان میں تکبر ونخوت نہیں ہوتا۔ بہت ہوگا ایسے اشغال میں ذرا بے تمیز ہو جائیں گے مگر یہ بے تمیزی ہزار درجہ اچھی ان خرافات میں مبتلا ہونے سے جو شہروں میں

ہورہی ہیں۔مگر ستم یہ ہے کہ جولوگ ان مکروہات میں گرفتار ہونے سے پرہیز کرتے ہیں ان کو آج کل دیوانوں میں شمار کرتے ہیں۔مگر واقعی بات یہ ہے:

ماگر قلاش وگر دیوانہ ایم مست آں ساقی وآں پیانہ ایم

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد مرعسس رادید ودرخانہ نہ شد

(اگر ہم قلاش اور دیوانہ ہیں تو کیا غم ہے یہی دولت کیا کم ہے کہ اس ساقی اور محبوب حقیقی اور اس کی شراب محبت سے مست ہیں جو دیوانہ نہیں وہی دیوانہ ہے جس طرح جو شخص کوتوال کو دیکھتا ہے گھر چلا جاتا ہے جب محبوب حقیقی کا عشق غالب ہوتا ہے عقل کافور ہوجاتی ہے)

خلوت اوراس کی حقیقت

گوشہ سے مراد مسجد کا گوشہ نہیں بلکہ تنہائی ہو چاہے گھر ہو چاہے جنگل ہو کیونکہ اس میں یہ بھی شرط ہے کہ اپنی حالت ممتاز مت بناؤ اور مسجد کا گوشہ آج کل ممتاز حالت ہے بلکہ خلوت ہو مگر اس طرح کہ کسی کو خلوت کا پتہ بھی نہ چلے۔اگر لوگوں کو خلوت کا پتہ چل جائے گا تو جان کھا جائیں گے۔اس لیے خلوت بھی ترکیب سے کرو، کھیتی کرلو اور کوئی شغل کرلو مگر مکروہات سے بالکل بچے رہو۔بس یہ آج کل خلوت ہے۔

مولوی ظہیرالدین صاحب ایک درویش تھے میرے پھوپھا صاحب کے بھائی انہوں نے خلوت کا طریقہ عجیب اختیار کیا تھا۔مجمع میں ہوتے' دروازہ کھلا رکھتے' نفل پڑھتے رہتے۔جب کوئی آتا سلام کے بعد بہت خوش اخلاقی سے پیش آتے۔خیریت دریافت کرتے' ضروری باتیں کر کے پھر نیت باندھ لیتے۔پھر سلام کے بعد ایک آدھ بات کر لیتے اور پھر نیت باندھ لیتے۔یہ نہ تھا کہ ہماری طرح ان کے پاس باتوں کا چرخہ چلتا ہی رہے۔لوگ ان کو روکھا خیال کر کے خود ہی آمدورفت کم کردیتے اور کوئی ان کی شکایت بھی نہ کرتا کہ بڑے بدد ماغ ہیں' بولتے ہی نہیں کیونکہ وہ نماز میں رہتے تھے اور نماز میں کوئی بولتا ہی نہیں ہے۔لوگ یہی خیال کر لیتے کہ چونکہ مولوی صاحب نماز میں اکثر رہتے ہیں اس لیے زیادہ کلام نہیں کرتے' مولوی صاحب تنہائی میں نہ بیٹھتے تھے کہ جس کی وجہ سے ممتاز معلوم ہوں۔مجھے یہ طرز ان کا بہت پسند آیا کہ ظاہراً تو خلوت نہ معلوم ہوتی تھی مگر حقیقت میں خلوت تھی۔

ایک بزرگ کی یہ حالت تھی کہ رات کو بولتے دن کو نہ بولتے کیونکہ رات کو مجمع نہیں ہوتا کہ جس سے خرابیاں پیش آئیں اور وہ بھی عشاء تک بولتے اور بعد عشاء کے گھر جا کر سور ہتے۔اس میں بھی نہ بولنے میں ان کی شہرت نہیں ہوتی تھی اور عشاء کے بعد ویسے بھی بلاضرورت بات چیت کرنا خلاف سنت ہے مگر اب تو بعض لوگ بزرگوں کو عشاء کے بعد بھی دق کرتے ہیں اور ان کے پاس جمع ہوجاتے

ہیں اور وہ اخلاق کی وجہ سے کچھ کہتے نہیں حالانکہ ان کو اس سے سخت تکلیف ہوتی ہے مگر لوگ بیٹھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ آپ کو کیا حق ہے ان کو مجبور کرنے کا اور وہ کس کس کی مرضی کے موافق کام کریں۔ میری رائے تو یہ ہے کہ ایسوں کو روک دینا چاہیے گو بعضے ناراض ہوں گے مگر اس کی پروانہ کرنا چاہیے۔

مخلوق کے مقابلہ میں خالق کی رضاء ضروری ہے

بس صرف اس کا اہتمام کرنا چاہیے کہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ناراض نہ ہوں چاہے ساری دنیا جاتی رہے۔ خلقت کو کوئی راضی نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ ہی احق ہیں کہ ان کو راضی رکھا جائے۔ "**واللہ ورسولہ احق ان یرضوہ**" (التوبہ آیت نمبر ۶۲) اگر ان کو راضی رکھو گے تو وہ لوگوں کی گردنیں پکڑ کر راضی کردیں گے مگر نیت یہ نہ ہونی چاہیے کہ حق تعالیٰ کو اس لیے راضی رکھنے کی فکر کریں کہ مخلوق ہم سے راضی ہوجائے اور اگر فرضاً حق سبحانہ تعالیٰ راضی ہوں اور مخلوق راضی بھی نہ ہو تو حرج ہی کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کو مقدم سمجھنا چاہیے مخلوق راضی ہو یا نہ ہو۔ یاد رکھو کہ اگر سب کی للو پتو رکھو گے تو دین برباد ہوجائے گا۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ مخلوق کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرو بلکہ جب یہ دیکھو کہ لوگوں میں بیٹھ کر دین خراب ہوتا ہے تو نرمی سے ان کو سمجھاؤ کہ اس قسم کی باتوں سے دین کی خرابی ہے۔ اس واسطے میں کنارہ کشی چاہتا ہوں۔ اس صورت میں لوگ ناراض تو ہوں گے مگر نصیحت ہوگی اور آئندہ کے لیے ان کا حوصلہ پست ہوجائے گی کہ پھر وہ خرافات کا ذکر بھی تمہارے سامنے نہ کریں گے۔ آج کل بدوں بے مروتی کے کام نہیں چلتا۔ میں بداخلاقی کرنے کا نہیں کہتا لیکن اگر خدا کی نافرمانی میں مخلوق سے مروت کی تو خدا تعالیٰ کو کیا منہ دکھلاؤ گے۔ خرافات میں وقت گزارنے سے کیا فائدہ ہے؟ وقت کی بڑی قدر کرنی چاہیے اور اس کی اچھی صورت یہی ہے کہ اختلاط کم کردو' دکانداری وغیرہ خلوت کے منافی نہیں بس دکانداری میں اتنا کام ہے کہ کوئی سودے کا نرخ دریافت کرے اس کو بتلادو' اگر وہ کہے دے دو' مختصر سی بات کرلو' ضروریات کو شریعت نے مستثنیٰ کیا ہے۔

خوب سمجھ لو کہ جو شخص پھیری لگاتا ہے اور اپنا سودا بیچنے کے لیے آوازیں دیتا ہے جو نور اس کے قلب میں سبحان اللہ کہنے سے ہوگا ویسا ان آوازوں کے لگانے سے ہوگا کیونکہ یہ بھی ضروری چیز ہے۔

مسلمان کا ہر فعل عبادت ہے!

مسلمان کا تو ہر فعل غرض محمود سے ہو شرع میں عبادت ہے۔ گو بظاہر دنیا کا کام نظر آتا ہو۔ پس اسکا مضائقہ نہیں مگر جس بات سے دین کی مضرت ہو اگرچہ ایک ہی بات کیوں نہ ہو اس سے بچو۔

میں کہتا ہوں کہ اگر کم تعلقی کے برکات دیکھنا چاہو تو یوں کرو کہ دس دن کے لیے اپنے کاموں کا انتظام کر کے تنہائی اختیار کر لو‘ دیکھو تو کیا ہوتا ہے اس سے تم جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ تو نہ ہو گے مگر ان شاء اللہ حس پیدا ہو جائے گی۔ اول اول تو جی گھبرائے گا مگر پھر آسانی ہو جائے گی۔ پھر خلوت کے بعد سمجھو گے کہ جن خرافات میں مبتلا تھے انہوں نے ہمارے دل کا ناس کر دیا ہے۔ پھر ذرا سی خلاف بات ہونے پر یہ کیفیت ہوگی۔

بردل سالک ہزار اں غم بود   گرز باغ دل خلائے کم بود

(سالک کے دل میں ہزاروں رنج و غم صادر ہوتے ہیں۔ اگر باطنی حالت میں ذرہ بھی کمی پاتا ہے)

حس کے صحیح ہو جانے پر اس کا تجزیہ کر لیجئے گا۔ اس وقت تو ہماری حس ہی صحیح نہیں رہی جس کے صحیح ہونے پر یہ حالت ہوگی کہ اگر ایک منٹ کے لیے بھی باہر آ جائیں اور ایک بات فضول منہ سے نکل جائے تو سارا کیا ہوا برباد معلوم ہوگا۔ باقی معاصی کا تو کیا پوچھنا ہے۔

اب ہماری حس کی ایسی مثال ہو رہی ہے جیسے سانپ کے کاٹے ہوئے کو نیم کی پتیاں میٹھی معلوم ہوتی ہیں۔ اس طرح ہم کو معاصی جو زہر قاتل ہیں مزیدار معلوم ہوتے ہیں۔ سو اس کا علاج کرو اور علاج کے لیے کسی تجربہ کار طبیب کو تلاش کرو اور جب تک طبیب نہ ملے ایک بڑا علاج یہی ہے کہ جو عرض کیا گیا کہ سوچنا شروع کر دو۔ آخرت کے تمام امور کو سوچا کرو کہ میں قبر میں جاؤں گا‘ وہاں سوالات ہوں گے‘ اگر ٹھیک جواب دے دیا تو راحت ہوگی اور اگر جواب ٹھیک نہ دیا گیا تو عذاب ہوگا پھر اس کے بعد دوبارہ زندہ کیا جاؤں گا‘ میدان قیامت کی سختیوں کو بھی سوچے یہ کہ خدا تعالیٰ کے روبرو کھڑا کیا جاؤں گا‘ اس کے بعد پل صراط پر چلنا ہوگا‘ پھر جنت ملے گی یا دوزخ میں ڈالا جاؤں گا‘ دوزخ میں کوئی پرسان حال نہ ہوگا‘ غرض سارے امور کو سوچا کرے۔

ایک قابل عمل بات

اور اس کے ساتھ ہی کسی بزرگ سے تعلق پیدا کر لو‘ اگر ممکن ہو سکے تو اس کی صحبت میں رہو۔ اگر اس کے حقوق صحبت ادا نہ کر سکو تو اس سے خط و کتابت کر کے اپنے اعمال کی حفاظت رکھو۔ دیکھ بھال رکھو کہ زبان کو کس چیز میں مشغول رکھتے ہو۔ کان سے کیا کام لیتے ہو‘ تمام اعضاء کی حفاظت رکھو اور شیخ کو اپنے حالات کی اطلاع کرتے رہو اور جو وہ بتلائے اس پر عمل کرو کیونکہ امراض باطنی کی جو دوائیں ہیں وہ ان کی خاصیت خوب جانتا ہے‘ وہ بصیر ہے‘ دانشمند ہے‘ طبیب روحانی ہے‘

امراضِ قلبی کے علاج سے بخوبی واقف ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اصل مرض ہمارے اندر یہ ہے کہ آخرت سے بے فکر ہو کر دنیا پر اطمینان کر لیا ہے۔

یہ اطمینان بالدنیا ہے تو چھوٹا سا عنوان مگر اصل ہے تمام امراض کی۔ اس کا علاج ہونے سے تمام امراض کا علاج ہو جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ قلب کو دنیا پر قرار ہو جانا اور آخرت کے لیے قلب کا بے چین نہ ہونا۔ یہ جڑ ہے تمام بیماریوں کی۔ پس یہ اطمینان دل میں سے نکالو اور خدا تعالیٰ کی اطاعت کو اپنے اوپر لازم کر لو گو بتکلف ہی سہی خدا تعالیٰ کی اطاعت میں اثر خاص ہے کہ اس سے فکر پیدا ہوگی اور فکر کے پیدا ہونے سے تمام کام درست ہو جائیں گے۔

ایک بات اپنے اوپر اور لازم کر لو وہ یہ کہ جو اپنے جی میں آئے فوراً مت کر لیا کرو بلکہ علماء سے تحقیق کر کے کیا کرو۔ اگر ناجائز بتلائیں ہرگز اس کام کو مت کرو' اپنے کو علماء کا محتاج سمجھو' علماء کی قدر کرو' اس طرح دستور العمل رکھنے سے پھر قلب دنیا پر ہرگز مطمئن نہ ہوگا۔

اور یہ بھی سمجھ لو کہ بدوں خود حرکت کیے ہوئے کچھ نہیں ہو سکتا' محض توکل پر بیٹھ رہنا اور خود متوجہ نہ ہونا بے سود ہے۔ خود قصد کرو گے تو اس طرف سے بھی توجہ ہوگی۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جب قصد بھاگنے کا کیا تھا تو قصد کرتے ہی سارے قفل مکانوں کے ٹوٹ گئے تھے۔ رحمتِ حق کے متوجہ ہونے کے لیے عادۃً قصد شرط ہے۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم احدی بن گئے ہیں' حرکت ہی نہیں کرتے۔

بس اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں اور پھر کہتا ہوں کہ سوچنا عمر بھر کا نسخہ ہے۔ اسی پر عمل رکھو۔ سارے کام تمہارے درست ہو جائیں گے۔ میں نے مختصر علاج بتا دیا اب جو کوئی عمل نہ کرے تو اس کا کیا علاج؟ اس وقت اس سے زیادہ اور کوئی ضروری مضمون ذہن میں نہیں۔ گو تفصیل کی حاجت باقی ہے مگر اس پر عمل کرنے سے تفاصیل کی خود فکر ہو جائے گی۔ جتنا بتایا ہے اس کو تو شروع کر دو' اب دعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ عمل کی توفیق دیں۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِہٖ
وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ عَلَیْہِ

متاع الدنیا

دنیا کی محبت ایک مہلک مرض ہے جس کا علاج موت کی یاد ہے اور موت کے توحش سے بچنے کا علاج خدا کی رحمت کو یاد کرنا ہے۔

دنیا کو اپنا وطن اور قیام گاہ نہ سمجھنے کے متعلق یہ وعظ ۱۷ شعبان ۱۳۳۰ھ کی رات کو تھانہ بھون میں منشی اکبر علی صاحب کے مکان پر کھڑے ہو کر بیان فرمایا۔ جہاں حضرت تھانویؒ کی برادر زادی بچی فوت ہو گئی تھی اور قریباً ۱۶۰ افراد کا مجمع تھا۔ یہ وعظ سعید احمد صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمَنۡ سیئات اعمالنا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلاَھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ. اَمَّابَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ. اَمَّابَعۡدُ فَقَدۡقَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی.

یٰۤاَیُّھَاالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَالَکُمۡ اِذَا قِیۡلَ لَکُمُ انۡفِرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اثَّاقَلۡتُمۡ اِلَی الۡاَرۡضِ اَرَضِیۡتُمۡ بِالۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا مِنَ الۡاٰخِرَۃِ فَمَا مَتَاعُ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا فِی الۡاٰخِرَۃِ اِلَّا قَلِیۡلٌ. (التوبہ آیت ۳۸)

ترجمہ: اے ایمان والو تم لوگوں کو کیا ہوا کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں (جہاد کے لیے) نکلو تم زمین کو لگے جاتے ہو' کیا تم نے آخرت کے عوض دنیاوی زندگی پر قناعت کر لی' سو دنیاوی زندگی کا تمتع تو کچھ بھی نہیں بہت قلیل ہے۔

تمہید و تعین مقصود و ضرورت

یہ ایک آیت ہے جس میں حق سبحانہ وتعالیٰ نے دین کے ایک خاص کام میں سستی کرنے پر ملامت فرمائی ہے مگر اس وقت اس خاص ہی کا بیان کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اس ملامت کی جو بناء اور علت بیان فرمائی ہے جس کا ذکر ارضیتم سے شروع ہوتا ہے اس کا بیان کرنا مقصود ہے تا کہ اس کے عموم سے مضمون بھی عام ہو جائے' ہر عمل کی کوتاہی کو فرماتے ہیں۔ ''تم جو دین کے کام میں سستی کرتے ہو کیا حیات دنیا پر راضی ہو گئے ہو؟ اور یہ سستی جو تم میں آ گئی ہے تو کیا آخرت کی ضرورت اور خیال تم کو نہیں رہا؟''

پھر فرماتے ہیں کہ ''آخرت کے مقابلے میں حیات دنیا کی متاع تو بالکل ہی قلیل ہے' کچھ بھی نہیں اور باوجود اس کے تم پھر دنیا پر راضی ہو۔'' یعنی اس سے اتنی محبت ہے کہ اس کو اپنی قرار گاہ سمجھتے ہو

اوراس لیےاس دینی کام (لانه سبب الفراق عن الدنيا ظاهرًا. ۱۲ منه) سے گھبراتے ہو سو یہ تو ایسی چیز نہیں کہ آدمی اس کی حیات پر راضی ہو جائے۔

یہ ہے مضمون اس علت کا اور اسی کو بیان کرنا مقصود ہے۔ اس کا حاصل اس کے ترجمے سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ خدا تعالیٰ ان لوگوں پر ملامت کر رہے ہیں جنہوں نے دنیا پر قناعت کر لی ہے اور آخرت کو بھول گئے ہیں اور دنیا کو محبوب سمجھتے ہیں۔ مسلمان ایسا تو کوئی نہیں ہے کہ اس کا یہ عقیدہ ہو کہ آخرت کوئی چیز نہیں۔

مسلمانوں کا منکرانہ برتاؤ

مگر حالت ضرور ایسی ہے کہ ان کے برتاؤ اور معاملات سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی منکر ہو کیونکہ جتنی محبت دنیا کی ہے آخرت کی وہ محبت اور اس کا اتنا شوق نہیں ہے۔ چنانچہ دلوں کو ٹٹول کر دیکھ لیں کہ دنیا میں قیام کی بابت ہم لوگ کیا کیا خیالات پکاتے ہیں کہ ہم یوں رہیں گے، یوں بسیں گے، بہو آئے گی، جائیداد آئے گی، یوں ہم ملازم ہوں گے، ڈپٹی کلکٹر ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔

اب انصاف سے دیکھ لو کہ آخرت کے متعلق بھی کبھی ایسی امنگیں ہوئی ہیں کہ مر جائیں گے تو خدا کے سامنے جائیں گے یوں جنت ہوگی، اس میں باغات اور مکانات ہوں گے، یوں حوریں ہوں گی۔ غالباً کبھی بھی یہ امنگیں نہیں ہوتیں بلکہ خیال بھی بہت ہی کم آتا ہے تو دنیا کی جس قدر محبت ہے نہ آخرت کی وہ محبت نہ وہاں جانے کا اتنا شوق اور اگر ہوتی تو جیسے یہاں کی زندگی کے متعلق دل میں خیالات پیدا ہوتے ہیں وہاں کی زندگی کے متعلق بھی تو ہوتے اور جیسے دنیاوی امور میں غلطاں پیچاں رہتے ہیں اور یہاں کی خوشیوں میں کھپے رہتے ہیں ایسا ہی امور آخرت کی امنگ کبھی خواب میں بھی نہیں آتی اور بعض ایسے ہیں جن کے پاس دنیا میں خوشی کا کوئی سامان نہیں اور اس لیے وہ ہمیشہ غمزدہ رہتے ہیں اور ان کو کبھی خوشی نصیب نہیں ہوتی۔ وہ شاید میرے جواب میں یوں کہیں گے کہ صاحب ہم تو دنیا کی خوشیاں نہیں مناتے بلکہ ہم تو یہ سوچا کرتے ہیں کہ کوئی والی نہیں وارث نہیں۔ یہ زندگی کیسے کٹے گی تو میں جواب میں کہوں گا کہ مجھ کو ان کی یہ شکایت ہے کہ جیسے تم نے دنیاوی زندگی کو سوچا، کبھی آخرت کی زندگی کو بھی سوچا اور وہاں کی مصیبت کا بھی خیال کیا کہ وہ زندگی کیسے کٹے گی، دوزخ میں جانا پڑا تو وہ مصیبت کیوں کر سہی جائے گی؟ پھر جیسے یہاں کی تکلیف کو سوچ کر تدبیر سوچتے ہو کہ شاید فلاں تدبیر سے یہ مصیبت کٹ جائے یا فلاں تدبیر سے مشکل آسان ہو جائے ایسے کبھی آخرت کی مصیبت کو بھی سوچا ہے حالانکہ دنیا کے مصائب تو بعض ایسے بھی ہیں کہ ان کی کوئی تدبیر ہی نہیں ہے اور اس

لیے اس کو سوچنا عبث ہے مگر پھر سوچتے ہو اور آخرت کی تو کوئی مصیبت بھی ایسی نہیں ہے جو لا علاج ہو بلکہ اس کی ہر مصیبت کی تدبیر موجود ہے مگر پھر بھی اس کا نہ ذکر نہ فکر۔

درستی آخرت کی تدابیر کی ضرورت

اور اگر بعض ایسے لوگ ہوئے بھی کہ وہ کبھی علی السبیل التذکرہ آخرت کا ذکر کر دیتے ہوں اور اس لیے سمجھتے ہوں کہ ہم کو دین کی فکر ہے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔

دیکھو! اگر کسی کے پاس آٹا بھی ہو اور توا بھی ہو' لکڑیاں بھی ہوں اور پکائے نہیں مگر ان سب سامانوں کا ذکر کرتا رہے اور سوچتا رہے تو اس ذکر سے اور اس سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ تدبیر تو یہ ہے کہ ہمت کر کے اٹھے اور پکانا شروع کر دے اور جب بھوک لگے کھالے' تو آخرت کی فکر بھی یہی ہے کہ یوں سمجھتے کہ میں مروں گا خدا کا سامنا ہوگا' یوں عذاب ہوگا' اور یہ سوچ کر عذاب سے بچنے اور نجات حاصل کرنے کے لیے تدابیر شروع کر دے۔ شیطان نے بہت سے لوگوں کو بہکا رکھا ہے کہ گاہ گاہ ان کو اس قسم کے خیالات پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ دل میں ڈال دیتا ہے کہ تم کو دین کی بہت فکر ہے۔

صاحبو! اگر تمہارے پاس سامان نہ ہوتا تو اتنا ہی غنیمت تھا لیکن جب خدا نے ارادہ دیا' ہمت دی' بھلے برے کی پہچان دی' پھر کیا وجہ کہ دنیا کے معاملات میں تو نری فکر پر بس نہیں کیا جاتا اور دین کے کام میں نری فکر کو کافی سمجھا جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں' واقع میں آخرت کا خیال ہی نہیں ہے۔

دنیا سے زیادہ آخرت کا اہتمام ضروری ہے

بہر حال اگر کوئی دنیا کی خوشیاں مناتا ہے تو یہ شکایت ہے کہ آخرت کی خوشیاں کیوں نہیں منائی جاتیں اور اگر کوئی دنیا کے غم میں رہتا ہے تو اس کی یہ شکایت ہے کہ آخرت کا غم کیوں نہیں کیا جاتا اور اگر کوئی خوشی منانے والا کہے کہ آخرت کی خوشی کہاں سے منائیں اس کی ہمیں امید ہی کہاں ہے ہم تو گنہگار ہیں اور دنیا کی خوشی تو حاضر ہے۔ اس کو کیسے نہ منائیں تو یہ شیطان کا دھوکہ ہے اس میں دو دعوے ہیں اور دونوں غلط ہیں۔ یعنی اول بھی غلط کہ دنیا کی خوشی حاضر ہے۔ دوسرا بھی غلط کہ آخرت کی خوشی کہاں ہے۔ پہلا تو اس لیے غلط کہ جو کہا جاتا ہے کہ یوں بیٹا ہوگا' یوں چین کریں گے تو یہ تمہارے قبضہ میں کہاں ہے' ہزاروں آدمی ایسے ہیں کہ وہ سوچتے کچھ ہیں اور ہوتا کچھ ہے۔ پھر اگر خوشی ہوتی بھی ہے تو تجربہ یہ ہے کہ تمنائیں ہمیشہ تعداد میں حاصل سے بڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔ یعنی حاصل ہوتا

ہے کہ کم اور تمنا ہوتی ہے زیادہ تو جس کی تمنا جس قدر زیادہ ہوگی وہ ہمیشہ اسی قدر زیادہ غم میں رہے گا۔

اللہ والے البتہ خوش رہتے ہیں اس لیے کہ دنیا کی کچھ تمنا ہی نہیں کرتے۔ اولاد ہوئی اس پر خوش ہیں نہ ہوئی اس پر خوش ہیں۔ ہر حال میں راضی ہیں اور دنیاداروں کو خوشی کہاں۔ واللہ! راحت جس چیز کا نام ہے اگر وہ حاصل نہ ہوئی تو پھر اس کا جتنا سامان ہوگا زیادہ موجب تکلیف موجب حسرت ہوگا۔

لوگ روپیہ پیسے کو راحت سمجھتے ہیں حالانکہ راحت روپیہ پیسہ نہیں۔ ورنہ چاہیے تھا کہ صندوق کو زیادہ لذت ہوتی مگر یہ لوگ صندوق سے بھی زیادہ بدتر ہیں کیونکہ اس کو ادراک الم کا نہیں ہے اور یہ لوگ تو آلام میں مبتلا ہیں تو معلوم ہوا کہ دنیادار بہت ہی کم آرام میں ہیں۔ غرض دنیا میں کہیں خوشی نہیں ہے اور دوسری بات کہ آخرت میں کونسی خوشی ہے اس لیے غلط ہے کہ وہ بعد وعدہ الٰہیہ بالکل تمہارے اختیار میں ہے۔

چنانچہ دنیا کی خوشی تو کبھی کبھی حاصل بھی نہیں ہوتی کہ ساری عمر چاہو اور نہ ہو اور آخرت کی کوئی راحت بھی ایسی نہیں ہے کہ وہ اختیاری نہ ہو' خدا کی یہ رحمت ہے کہ آخرت کی کتنی ہی بڑی سے بڑی تمنا ہو مگر وہ باستثناء منصوص مثلاً درجات نبوت وغیرہ مباشرت اسباب سے ضرور پوری ہوتی ہے۔ مثلاً اگر چھوٹے درجے کا آدمی جیسے عاصی گنہگار بڑے درجہ میں جانا چاہیے مثلاً حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے درجے میں تو جا سکتا ہے اس طرح سے کہ اپنے اعمال میں ترقی کرے۔

تو بس وہاں تو خوشی ہے جو بالکل اپنے اختیار میں ہے تو اس کی فکر کرو اور اس کی امنگیں پیدا کرو اور اس کی تدبیر کرو یعنی معصیت کو چھوڑ دو اور نمازیں پڑھو' جواب تک چھوٹ گئی ہیں ان کی قضا کرو' زکوٰۃ دو' اس کے بعد سب خوشی تمہارے واسطے ہے اس کے بعد حق ہے کہ خوشی مناؤ۔

اسی طرح اگر کوئی مصیبت زدہ کہے کہ یہاں کی مصیبت تو حاضر ہے اس لیے اس کا اہتمام ہے اور وہاں تو اللہ غفور الرحیم ہے پھر کیوں غم کریں تو سمجھ لو کہ یہ بھی شیطان کا دھوکہ ہے۔ غفور الرحیم نے یہ وعدہ کہاں کیا ہے کہ خواہ تم کچھ ہی کرو میں تم کو جنت میں بلاعقوبت اول ہی بار داخل کر دوں گا' غرض نہ آخرت کی نعمت کو کوئی سوچتا ہے نہ وہاں کی مصیبت کو جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے دنیا کو گھر بنا رکھا ہے۔

اے مسلمانو! تمہارا وطن آخرت ہے مگر تم نے اپنے لیے دنیا کو وطن بنا رکھا ہے اور اپنے لیے اور اپنے عزیز کے لیے دنیا ہی دنیا چاہتے ہو۔ میری ایک خاندانی بزرگ بی بی نے مجھ کو ایک بار یہ دعا دی تھی کہ اللہ کرے اس کا بھی دنیا میں سا جھا ہو' کیسے غلط عنوان سے دعا کی ہے جس کا خلاصہ یہ

ہے کہ اب تو دین ہی دین ہے خدا کرے دنیا میں بھی پھنسے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں دنیا ہی بڑی چیز تھی اس لیے یہ چاہا کہ ہمارے پیارے بھی اس میں پھنسیں۔ ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' کیسے غضب کی بات ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لو کہ سارے غم اس سے ہیں کہ دنیا کو گھر بنا رکھا ہے ورنہ اگر اس کو گھر نہ سمجھتے تو کوئی بھی غم نہ ہوتا۔

دنیا اور دار آخرت

دیکھو! جب کسی سفر میں جاتے ہیں اور کسی سرائے میں قیام ہوتا ہے تو وہاں کی چارپائی میں کیسے کھٹمل ہوتے ہیں، کبھی چارپائی ٹوٹی پھوٹی ہوتی ہے مگر سوچتے ہو کہ ایک شب تو قیام ہی کرنا ہے جس طرح ہو گزار دو، ایک شب کی تکلیف ہی کیا، پھر تو گھر پہنچ جائیں گے، غرض سرائے کی تکلیف اس لیے تکلیف نہیں معلوم ہوئی کہ اس کو گھر نہیں سمجھا۔ یہی حال دنیا کی تکلیفوں کا ہے۔ سو اگر آپ دنیا کو اپنا گھر نہ سمجھتے تو اسی طرح اس کے ساتھ بھی برتاؤ ہوتا۔ ہرگز اس کے متعلق ہر وقت تذکرہ نہ ہوتا اس کا اس قدر سلسلہ گھسیٹتے بلکہ ہر بات میں زبان پر یہ ہوتا کہ ہمارا گھر آخرت ہے وہاں چین و آرام کریں گے۔ یہاں کی ذرا سی تکلیف کا کیا ہے حالانکہ ہم کو کبھی بھی یہ خیال نہیں ہوتا۔ خاص کر عورتیں کہ اگر کوئی غم ان پر آ جائے تو وہ حالت ہوتی ہے کہ گویا کبھی خدا تعالیٰ کی کوئی نعمت ہی ان پر نہیں ہوئی اور اس وقت ان کو بجز اس مصیبت کے تذکرے کے کوئی کام کوئی قصہ نہیں ہوتا۔ گویا یہی ان کا دین ہے یہی دنیا ہے اور کم و بیش مرد بھی اس میں مبتلا ہیں کہ ان کو بھی آخرت یاد نہیں رہتی ورنہ اگر آخرت یاد ہو تو دنیا کی کوئی تکلیف سرائے کی دو روزہ تکلیف سے زیادہ نہیں ستا سکتی تھی اور اپنے وطن اصلی کو یاد کر کے راحت ہو جایا کرتی، خواہ کتنی ہی بڑی مصیبت ہوتی۔ مثلاً اس شخص کا کوئی پیارا بچہ مر جاتا تب بھی اس کو پریشانی نہ ہوئی۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ مثلاً اگر کوئی سفر میں ہو اور اس کا کوئی بچہ گم ہو جائے اور اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ میرا بچہ وہاں چلا گیا ہے جہاں میرا گھر ہے اور جہاں میں بھی جا رہا ہوں تو کیا وہ روئے پیٹے گا، ہرگز نہیں! بلکہ اس کو یہ سن کر اطمینان ہو جائے گا اور سمجھے گا کہ اب کسی دن میں بھی اس سے جا کر مل لوں گا تو اگر ہم آخرت کو اپنا وطن سمجھتے تو اولاد کے جاتے رہنے پر اتنا بڑا قصہ لے کر نہ بیٹھا کرتے، ہاں جدائی کا غم ہوتا ہے، تسلی بھی تو ہونی چاہیے کہ وہ اپنی راحت کی جگہ پہنچ گیا، اپنے گھر پہنچ گیا، ہم بھی وہیں جائیں گے اور مل لیں گے۔ خدا تعالیٰ نے یہی مضمون اس آیت کے دوسرے جملے میں سکھلایا ہے۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ۔ (البقرہ ۱۵۶) (ہم تو اپنے مال واولاد (حقیقتاً) اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہیں اور ہم سب (دنیا سے) اللہ تعالیٰ ہی کے پاس جانے والے ہیں)

یعنی جو چیز گئی وہ خدا کے پاس گئی اور ہم بھی خدا کے پاس جائیں گے اور سب کے سب وہیں جمع ہو جائیں گے تو اس کو سوچ کر تسلی ہونی چاہیے تھی۔ اگر آخرت کو گھر سمجھتے لیکن اب تو وہ مار دھاڑ ہوتی ہے کہ گویا خدا تعالیٰ نے ان کی جائیداد چھین لی۔ غرض یہ ہے کہ یوں ہونا چاہیے تھا جیسے دنیا کی مثال میں سمجھا دیا مگر جب ایسا نہیں ہوتا تو اس سے سمجھ میں آیا ہوگا کہ اولاد کے مرنے کا ایسا غم بھی اس لیے ہوتا ہے کہ دنیا کو اپنا گھر سمجھتے ہیں۔

دنیادار کو موت کا خوف

پس بڑی بھاری غلطی ہماری یہ ثابت ہوئی کہ ہم نے دنیا کو اپنا گھر سمجھ رکھا ہے اسی لیے یہاں سے جدا ہونے کا رنج وغم ہوتا ہے ورنہ جب آدمی سفر میں جاتا ہے تو جتنا گھر سے قریب ہوتا جاتا ہے خوشی بڑھتی جاتی ہے اور یہاں یہ حالت ہے کہ جوں جوں مرنے کے دن قریب آتے ہیں روح فنا ہوتی ہے اور یہ حالت دنیاداروں ہی کی ہے کیونکہ وہ دنیا ہی کو اپنا گھر سمجھتے ہیں۔ بخلاف اہل اللہ کے کہ ان کو اس کا ذرا بھی غم نہیں ہوتا اور ان کو نہ اپنے مرنے کی پرواہ ہوتی ہے نہ اولاد کے مرنے کی پرواہ ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ بعض دفعہ تو جہلاء کو ان کے سنگ دل ہونے کا شبہ ہو جاتا ہے حالانکہ ایسا نہیں۔ ان سے زیادہ تو کوئی رحم دل ہی نہیں ہوتا مگر اس پریشانی نہ ہونے کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ آخرت کو اپنا گھر سمجھتے ہیں اس لیے ان کو اولاد کے مرنے کا غم اتنا ہی ہوتا ہے جتنا کہ سرائے سے لڑکے کے گھر چلے جانے پر مسافر باپ کو ہوتا ہے کہ ایک گونہ مفارقت سے قلق ہوا پس زیادہ نہیں کیونکہ وہ آخرت کو اپنا وطن سمجھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جب وہ مرنے کے قریب ہوتے ہیں تو خوشیاں مناتے ہیں جس طرح عادت ہے کہ سفر سے واپس آتے ہوئے گھر کے قریب پہنچ کر خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ چنانچہ اس خوشی کو ایک بزرگ کہتے ہیں:

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بردم — راحت جاں طلبم وزپے جاناں بردم
نذر کردم کہ گر آید بسرایں غم روزے — تا در میکدہ شاداں وغزل خواں بردم

(وہ دن بہت اچھا ہوگا کہ اس ویرانہ مکان (دنیا) سے جاؤں، جان کو آرام مل جائے اور محبوب حقیقی کے دیدار کے لیے چلا جاؤں، میں نے نذر کی ہے کہ اگر یہ دن نصیب ہو تو خوش وخرم اور غزل پڑھتا ہوا چلا جاؤں)

حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی قدس سرہ سے ایک شخص نے کہا کہ حضرت اب تو آپ بوڑھے ہوگئے' آپ نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر فرمایا کہ الحمدللہ اب وقت قریب آیا۔

مگر ان حکایات سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ان کو اعمال پر یا مقبول ہونے پر ناز ہوتا ہے۔ اس لئے احتمال مواخذہ نہ ہونے پر خوش رہتے ہیں۔ استغفر اللہ! ناز کی مجال کس کو ہے بلکہ وہ خوشی صرف اس بات پر ہوتی ہے کہ وہ آخرت کو اپنا گھر سمجھتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ ان کو دار و گیر کا اندیشہ ہوتا ہے یا نہیں' تو سمجھو کہ اندیشہ ضرور ہوتا ہے لیکن رحمت خداوندی سے امید بھی ہوتی ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ پھر چھوٹ جائیں گے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کا گھر ٹوٹا پھوٹا پڑا ہوا اور سرائے نہایت پختہ ہو تو وہ اپنے گھر ہی کو پسند کرے گا اور سوچے گا کہ اگرچہ اس وقت میرا گھر ٹوٹا پھوٹا ہے لیکن میں ان شاء اللہ پھر اس کو پختہ کرلوں گا۔ اسی طرح اگرچہ ان کو اندیشہ ہوتا ہے مگر جانتے ہیں کہ ایمان کی سلامتی ہے تو ضرور رحمت ہوگی۔ غرض وطن سے طبعی محبت ہوتی ہے گو وہاں کچھ تکلیف بھی ہو تو کوئی یہ شبہ نہیں کرسکتا کہ ان کا ناز ہوتا ہے۔

دنیا کی حقیقت کے استحضار کا اثر

غرض حقیقت واقعی یہ ہے جو مذکور ہوئی' اس کو اگر کوئی سمجھ جائے تو ہزاروں غم کم ہوجائیں اور دنیا کی تمام ہوسیں فنا ہوجائیں' ہم جو دنیا میں چاہتے ہیں کہ یہ بھی ہوجائے وہ بھی ہوجائے' یہ ایسا ہے جیسے کوئی سرائے میں یہ تمنا کرے کہ یہاں جھاڑ اور فانوس سب لگادیئے جائیں اور پھر اپنی کمائی سے خرید کر لگا بھی دے تو ظاہر ہے کہ کتنی بڑی حماقت ہے۔ خاص کر جب کہ یہ بھی حکم ہو کہ مثلاً چار دن سے زیادہ کوئی اس سرائے میں قیام نہیں کرسکے گا۔ اس وقت تو اپنی کمائی وہاں کی تزئین میں لگانا پورا خلل دماغ ہے اور دنیا ایسی ہی محدود القیام سرائے ہے کہ اس حد کے بعد بلا اختیار یہاں سے نکل جانا پڑے گا۔ اول تو سرائے میں اگر قیام اختیاری بھی ہو تو تب بھی یہی ہونا چاہیے کہ اس کے ساتھ گھر کا سا معاملہ نہ کرے اور جب اختیاری بھی نہ ہو تب تو ہرگز بھی اس میں دل نہ لگانا چاہیے بلکہ اس سے توحش اور ضیق رہنا چاہیے۔

الدنیا سجن المؤمن کے معنی

یہی حدیث کے معنی ہیں میرے نزدیک "الدنیا سجن المؤمن"[1] کے۔ لوگوں نے اس

---

[1] (الصحیح لمسلم' المقدمہ ا' سنن الترمذی: ۲۳۲۴' سنن ابن ماجہ: ۴۱۱۳' شرح السنۃ ۱۴: ۲۹۶' ۲۹۷)

حدیث کے مختلف معنی کہے ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ جیل خانہ تکلیف وغیرہ کی وجہ سے نہیں فرمایا کیونکہ بعض مومنین کو دنیا میں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی بلکہ اس لیے فرمایا کہ جیل خانے میں کبھی جی نہیں لگا کرتا اگرچہ کیسا ہی عیش ہو تو مسلمان کی شان یہ ہے کہ دنیا میں اس کا جی نہ لگے۔ اگرچہ بظاہر اس میں کیسا ہی عیش و آرام ہو کیونکہ جی لگنے کی جگہ گھر ہے اور وہ گھر نہیں ہے۔ پھر جب جی نہ لگے گا تو کیوں ہوئیں ہوں گی اور کیوں سوچے گا کہ یوں ہو اور یہ ہو اور وہ ہو بلکہ اب یہ سوچے گا کہ دنیا تو پردیس ہے یہاں جس طرح سے بھی دن گزر جائیں ٹھیک ہے اور دنیا کی سوچ کے بجائے اب یہ ہوگا کہ آخرت کی سوچ ہوگی کہ اس کے لیے یہ سامان ہونا چاہیے اور یہ فکر ہونا چاہیے اپنے نفس کی اصلاح ہونی چاہیے اور یہ سوچے کہ اگر یہ سامان ہو گیا تو پھر یوں بہار ہوگی اور یوں عیش ہوگا ورنہ یوں مصیبت ہوگی یوں پریشانی ہوگی۔

اب غور کر کے دیکھو کہ کتنے آدمی ہیں جو یہ سوچتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ دنیادار تو الگ رہے دینداروں کو بھی آخرت کے متعلق بھی نہ امنگیں پیدا ہوتی ہیں نہ اندیشے‘ خدا تعالیٰ صاف فرماتے ہیں:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ۔[۱]

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص دیکھ بھال لے کہ کل (قیامت) کے واسطے اس نے کیا ذخیرہ بھیجا ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔)

دیکھو! ایک دن کا سفر ہوتا ہے تو اس میں ناشتہ بھی ہمراہ لیا جاتا ہے اور سامان بھی ہوتا ہے۔ آخرت کا اتنا بڑا سفر درپیش ہے اس کیلئے کیا زادراہ تیار کر رکھا ہے بالخصوص جب کہ وہ وطن اور گھر بھی ہے کہ اس صورت میں تو اس کیلئے بہت کچھ سامان کرنا چاہیے تھا۔ یعنی قطع سفر کیلئے زاد اور ناشتہ اور گھر پر بیٹھنے کیلئے کمائی اور ذخیرہ۔ پس ایک اثر تو گھر سمجھنے کا یہ ہونا چاہیے تھا ایک دوسرا اثر اسکے گھر سمجھنے کا یہ ہونا چاہیے تھا کہ دنیا کے حوادث سے غم نہ ہوتا نہ اپنے واسطے اور نہ لگے سگے کے واسطے‘ گھر تو وہاں ہے اب جو موت سے ہم کو موت آتی ہے جیسے کسی کو جیل خانہ میں لے جاتے ہیں۔

ہمارے حضرت (حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کے پاس ایک بوڑھا شخص آیا‘ کہنے لگا کہ میری بیوی مرتی ہے‘ حضرت فرمانے لگے کہ اچھا ہوا جیل خانہ سے چھوٹتی ہے اور پھر فرمایا کہ یہ کیوں غم کرتا ہے تو بھی چلا جائے گا۔ کہنے لگا روٹی کون پکائے گا‘ حضرت نے فرمایا کہ کیا ماں کے پیٹ سے وہی روٹی پکاتی ہوئی آئی تھی تو موت کے متعلق اس تمام تر کرب و رنج کی وجہ یہی ہے کہ ہم لوگ آخرت کو

---

[۱] (الحشر آیت نمبر ۱۸)

بھولے ہوئے ہیں ورنہ اگر وہ یاد ہوتی تو موت کا کیا غم ہوتا اور ایک اثر آخرت کو گھر سمجھنے کا یہ ہونا چاہیے تھا کہ کسی سے عداوت اور رنج نہ ہوتا۔ اگرچہ معمولی طور پر کسی بات میں لڑائی بھی ہو جایا کرتی۔

دیکھو! ریل میں مسافروں میں لڑائی تو ہوتی ہے مگر یہ نہیں ہوتا کہ اپنے سفر کے سامان کو چھوڑ کر کسی سے الجھنے لگیں کیونکہ جانتے ہیں کہ اس سے سفر کھوٹا ہوگا مگر اس طرح سے دنیا کے فضول قصوں میں بھی کسی نے سوچا ہے کہ ان میں پھنسنے سے آخرت کا سفر کھوٹا ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کو گھر نہیں سمجھتے' نیز اگر آخرت کو اپنا گھر سمجھتے تو دنیا کے ساز و سامان پر اترایا نہ کرتے۔ چنانچہ اگر سفر میں کہیں سیج بند کسا ہوا پلنگ ملے تو کوئی بھی اس پر نہیں اتراتا کیونکہ جانتا ہے کہ یہ تو مانگی ہوئی چیز ہے اور ہماری یہ حالت ہے کہ اگر ہمارے پاس چار پیسے ہوں تو ہم ان پر اتراتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہم دنیا کو اپنے گھر سمجھتے ہیں اور بہت سے دلائل اس کے ہیں کہ ہم نے دنیا کو اپنا گھر سمجھ رکھا ہے' یہی بڑی خرابی ہے اور اسی سے آخرت کے کاموں میں سستی اور کاہلی پیدا ہوتی ہے۔

یہ تو ہماری حالتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے آخرت کو اپنا گھر نہیں سمجھا۔ اب صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو دیکھئے کہ انہوں نے کیسی کیسی سختی اٹھائی لیکن ان کو کبھی ہراس نہیں ہوا اور ان سختیوں سے تو ان کو کیا اثر ہوتا جو سب سے بڑی سختی ہے موت وہ اس کے مشتاق رہتے تھے کہ کون سا وقت ہوگا کہ ہم یہاں سے چھوٹیں گے۔ وہ حضرات کماتے بھی تھے لیکن لاچاری کو جیسے بڑی زبردستی سے کوئی کام کرتا ہے۔ پس وہ حضرات آخرت کو اپنا گھر سمجھتے تھے اور یہ اس کے آثار تھے۔

دنیا سے کتنا تعلق رکھنا چاہیے!

میں جو کہتا ہوں کہ دنیا کو اپنا گھر نہ سمجھو اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا مت کماؤ۔ دنیا کے کمانے کا مضائقہ نہیں مگر یہ نہ ہو کہ اس میں بالکل کھپ جاؤ جیسے ہم لوگوں کی حالت یہ ہے کہ گویا خدا تعالیٰ سے کوئی واسطہ ہی ہم کو نہیں۔ مثلاً جب کپڑا لے کر پسند کرنے بیٹھیں گے تو معلوم ہوگا کہ گویا ان کا یہی ایمان ہے۔ جب زیور کے پیچھے پڑیں گے تو اس طرح کہ بس وہی دل میں بسا ہوگا۔ میں پھر کہتا ہوں کہ میں دنیا کا کام کرنے سے منع نہیں کرتا مگر یہ کہتا ہوں کہ اس میں دل نہ لگاؤ' کام سب کرو مگر جی اترا ہوا ہونا چاہیے' دل کو کھپا دینا یہی زہر ہے۔ یہ وہ بلا ہے کہ اس سے اندیشہ ہے کہ مرتے وقت یہی غالب نہ ہو جائے اور اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے اس وقت بالکل بے تعلقی نہ ہو جائے۔ لہٰذا جہاں تک ہو اس کی کوشش کرو کہ دنیا میں دل لگا ہوا نہ ہو' دل کو خدا تعالیٰ ہی میں لگاؤ' ہاتھ سے کام کرو کچھ حرج نہیں۔

حدیث شریف میں ہے کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں سب کام کر لیتے تھے لیکن جب اذان ہوتی تو یہ حالت ہوتی کہ "قام کانه لایعرفنا" اور ہم لوگوں کی اور بالخصوص عورتوں کی یہ حالت ہے کہ اگر سینے میں لگیں تو نہ نماز کی فکر ہے نہ روزے کی۔ اس طرح دنیا کے ہر کام میں ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو دین کی کچھ خبر ہی نہیں اور یہ دین کو کچھ سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ افسوس! کیا دین ایسی بے فکری کی چیز ہے یہ معاملہ تو دنیا کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ خوب کہا ہے؟

غم دیں خور کہ غم غم دین ست   ہمہ غمہا فروتر ازاین ست
غم دنیا مخور کہ بیہودہ است   ہیچ کس در جہاں نیا سودہ است

(دین کا غم کھا کہ دراصل غم تو دین ہی کا ہے باقی غم اس سے کم ہی ہیں، دنیا کا غم مت کھا کہ بیہودہ ہے کسی نے اس سے دنیا میں آرام نہیں پایا)

واقعی یہاں کا غم ہی کیا؟ یہاں کے غم تو ایسی حالت ہے جیسے خواب کا غم، سو خواب میں اگر کوئی شخص یہ دیکھے کہ مجھے سانپ نے کاٹ لیا ہے اور اسی وقت آنکھ کھل جائے اور دیکھے کہ ایک نہایت عمدہ سیج بند کسے ہوئے پلنگ پر آرام کر رہا ہے اور بہت بڑا محل ہے، لوگ ادھر ادھر کھڑے جھک جھک کر سلام کر رہے ہیں تو کیا اس شخص کے ذہن میں وہ خواب رہے گا، ہرگز نہیں۔

اسی طرح یہاں کی خوشی بھی خواب کی سی خوشی ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص خواب میں یہ دیکھے کہ میں تخت سلطنت پر متمکن ہوں اور آنکھ کھل جائے تو دیکھے گا کہ چاروں طرف پولیس کے سپاہی بیڑیاں لیے کھڑے ہیں اور اس کو جیل خانہ لے جانا چاہتے ہیں تو کیا اس خواب کی بادشاہت سے اس کو راحت پہنچے گی، ہرگز نہیں۔

بس یہی حالت ہے دنیا کے غم اور دنیا کی خوشی کی کہ اگر خدا کے سامنے خوش گیا تو یہاں کے عمر بھر کے غم و رنج کچھ بھی نہیں ہیں اور اگر خدا کے سامنے غمزدہ گیا تو یہاں کی عمر بھر کی خوشی بھی خاک ہے مگر اب لوگ اس خواب و خیال کو حقیقی غم اور خوشی سمجھتے ہیں جس کی وجہ بس وہی ہے کہ جس کا بیان کر رہا ہوں کہ دنیا کو اپنا گھر سمجھ رکھا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں بس یہ بات نہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ ان حضرات میں نہ تکبر تھا نہ شیخی تھی اور نہ وہ کسی مخلوق سے ڈرتے تھے۔ اس لیے کہ خدا تعالیٰ سے لو لگائے ہوئے تھے۔ ہر وقت آخرت کے منتظر تھے اور صحابہ کرامؓ کی تو بڑی شان ہے اولیاء اللہ کی یہی حالت ہوتی ہے۔

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس سرہ پر جب فقر و فاقہ ہوتا اور بیوی کئی کئی وقت کے بعد بہت پریشان ہو کر شکایت کرتیں تو آپ فرماتے کہ اب عنقریب ہم کو جنت میں ملنے والا ہے۔

وہاں ہمارے لیے عمدہ عمدہ کھانے تیار ہو رہے ہیں، وہ بھی ایسی نیک بخت تھیں کہ فوراً ہی مان جاتیں۔ آج کل کی بیویاں نہ ہوئیں، بعض تو اس وقت ایسی ہیں کہ عجب نہیں، یوں کہتی کہ بس وہ نعمتیں تم ہی لیجیو مجھے تو یہاں لا دو جس سے پیٹ بھرے مگر ان بندی خدا کی یہ حالت تھی کہ ان کے پاس زیور تو کیا ہوتا، صرف ایک چاندی کا ہار تھا اور وہ بھی اس لیے رکھا تھا کہ مولانا رکن الدین یعنی صاحبزادے کے نکاح میں اگر دو چار مہمان آ گئے تو ان کو ایک دو وقت کھانا کھلا دیں گے مگر حضرت شیخ کو وہی ناگوار تھا اور ہمیشہ اس کے جدا کرنے کا تقاضا فرماتے اور وہ یہ عذر کرتیں تو دیکھئے یہ نہیں کہا کہ آخر کچھ تو میرے ناک کان میں ہونا چاہیے، آخر عورت ہوں۔ سبحان اللہ! وہ حضرات کیسے قانع اور صابر تھے۔

تو ان حضرات کی یہ حالت صرف اس لیے ہوتی ہے کہ وہ دنیا کو اپنا گھر نہیں سمجھتے اور یہی وجہ ہے کہ جب ان کا کوئی نقصان ہو جاتا ہے تو ان کو غم بھی نہیں ہوتا کیونکہ غم خلاف امید ہونے سے ہوتا ہے تو جو شخص کسی چیز کے بارے میں یہ امید رکھے کہ یہ ہم سے جدا نہ ہوگی اس کو اس چیز کے جدا ہونے کا غم ہوگا ورنہ کوئی بھی غم نہ ہونا چاہیے۔ ہاں طبعی رنج دوسری بات ہے۔ میں پریشانی کے غم کی نفی کر رہا ہوں، یہ ہے فرق ان لوگوں میں جو دنیا کو اپنا گھر سمجھتے ہیں اور ان میں جو دنیا کو اپنا گھر نہیں سمجھتے اسی کو خدا تعالیٰ فرماتے ہیں:

اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ۔

(ترجمہ: کیا تم نے آخرت کے عوض دنیاوی زندگی پر قناعت کر لی سو دنیاوی زندگی کا تمتع تو کچھ بھی نہیں بہت قلیل ہے)۔ (التوبہ ۳۸) اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ساری خرابیوں کی جڑ دنیا کی محبت ہے۔ اس کو دل سے نکالنا چاہیے۔

دنیا کی محبت کم کرنے کا طریقہ

اس کا طریقہ یہ ہے کہ آخرت کو کثرت سے یاد کیا جائے اس سے دنیا کی محبت دل سے نکل جائے گی اور آخرت کی محبت اور آخرت کے عذاب سے خوف یوں پیدا کرو کہ بیٹھ کر سوچا کرو کہ ہم کو مرنا ہے اور خدا کے سامنے جانا ہے پھر ایک دن ہمارا حساب ہوگا۔ اگر اچھی حالت ہے تو بڑی بڑی نعمتیں ملیں گی ورنہ سخت سخت عذاب ہوں گے اور نفس سے کہا کرو کہ اے نفس! تو دنیا کو چھوڑنے والا ہے قبر میں تجھ سے سوال ہوگا۔ اگر اچھے جواب دے سکا تو ابدالآباد کا چین ہے ورنہ سدا کی تکلیف ہے۔ پھر تجھے قیامت کو اٹھنا ہے اور اس روز تمام نامہ اعمال اڑائے جائیں گے، تجھے پل صراط سے گزرنا ہوگا، پھر آگے یا جنت ہے یا دوزخ ہے اس کو روزانہ سوچا کرو، اس سے آخرت کے ساتھ تعلق

ہوگا اور دنیا سے دل سرد ہو جائے گا۔

اور موت کے مراقبے سے ممکن ہے کہ کسی کو یہ خلجان ہو کہ اس سے تو وحشت ہوگی اور جی گھبرائے گا اس کا علاج یہ ہے کہ جب وحشت ہونے لگے تو خدا تعالیٰ کی رحمت کو یاد کیا کرو اور سوچا کرو کہ اس کو اپنے بندوں سے اتنی محبت ہے کہ ماں کو بھی اپنے بچے سے اتنی محبت نہیں ہے تو اس کے پاس جانے سے وحشت کی کوئی وجہ نہیں۔

اور اگر اس مراقبے کے بعد پھر کبھی دنیا کی طرف دل راغب ہو اور گناہ کو جی چاہے اور کوئی گناہ صادر ہو چکا ہو تو مراقبے کی تجدید کے ساتھ توبہ کرلیا کرو اور توبہ کا متمم یہ بھی ہے کہ اگر کسی کا حق تمہارے ذمے ہو اس کو بہت جلدی ادا کردو اس سے ان شاء اللہ تعالیٰ خدا تعالیٰ سب گناہوں کو معاف کردے گا۔ پھر ان شاء اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آخرت کا دائمی عیش ہوگا اور آخرت کا شوق پیدا ہونے کی میں نے ایک کتاب لکھی ہے اس کا نام ہے ''شوق وطن''۔ اس کا مطالعہ بھی بہت مفید ہوگا۔ حاصل سب کا یہ ہوا کہ دنیا کی محبت ایک مہلک مرض ہے اور اس کا علاج موت کی یاد ہے اور اس کے توحش سے بچنے کے لیے خدا کی رحمت کو یاد کرنا علاج ہے اور ان کے مؤکد کرنے کے لیے ''شوق وطن'' کا مطالعہ ہے۔

اب میں ختم کرتا ہوں۔ اپنے مرض کی اطلاع سب کو ہوگئی ہے اس کو بہت جلد زائل کریں اور خدا تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ ہمت عطا فرمائیں آمین! یارب العالمین۔

الفانی

شوق لقاء میں موت کی تمنا جائز ہے اس لیے اہل اللہ موت کی تمنا کرتے ہیں مگر ہم کو اس کے نام سے بخار چڑھ جاتا ہے ہم موت کو اتنا بھولے ہوئے ہیں کہ دوسرے کو مرتا دیکھ کر بھی اتنا خیال نہیں آتا کہ یہ منزل ہمارے بھی سامنے ہے بلکہ یوں سمجھتے ہیں کہ بس موت اسی کے واسطے تھی!

دنیا کی بے ثباتی کے متعلق یہ وعظ ۳۰ جمادی الآخری ۱۳۳۱ ہجری کو تھانہ بھون میں منشی اکبر علی صاحب کے مکان پر مولانا سعید احمد صاحب کی وفات پر تعزیت کے لیے جمع شدہ حضرات کے روبرو ہوا جو دو گھنٹے میں ختم ہوا اور اسے مولانا ظفر احمد صاحب عثانی نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سیئات اعمالنا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلاَھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ. اَمَّابَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ. مَاعِنۡدَکُمۡ یَنۡفَدُ وَمَاعِنۡدَ اللّٰہِ بَاقٍ وَلَنَجۡزِیَنَّ الَّذِیۡنَ صَبَرُوۡا اَجۡرَھُمۡ بِاَحۡسَنِ مَاکَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ. (النحل نمبر ۹۴)

ترجمہ: جوتمہارے پاس ہے وہ ختم اور فنا ہو جائے گا اور جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ پائیدار اور باقی رہنے والا ہے۔

قرآن وحدیث کا کمال

یہ ایک مختصری آیت ہے اس میں حق تعالیٰ جل شانہ وعم نوالہ نے ہم کو ایک بڑے کام کی بات تعلیم فرمائی ہے جس سے ہماری تمام پریشانیوں کا علاج ہو جائے گا اور یہ مضمون بہت ظاہر ہے جس میں کوئی پیچیدگی نہیں اور یہ قرآن وحدیث کا کمال ہے کہ اس کی کوئی بات پیچیدہ نہیں۔ شریعت مقدسہ کی تعلیم بہت صاف تعلیم ہے کیونکہ قرآن مجید ایسے لوگوں کے لیے نازل ہوا ہے جن میں مختلف فرقے اور مختلف حالات ہیں اس لیے قرآن کے علوم بہت سہل ہیں اور اس کی باتیں دل کو لگتی ہیں تاکہ سب کو فائدہ پہنچے۔ اس لیے اگر قرآن سے ایک عامی منتفع ہے تو ایک فلسفی بھی اس سے مستفید ہے۔ ہر شخص خواہ عامی ہو یا عالم اس سے مستفید ہونے میں یکساں ہے۔ گو استفادہ کا درجہ مختلف ہو۔ ہر شخص کو اس کے مرتبہ کے موافق اس سے نفع ہوتا ہے۔ اس کی یہ شان ہے۔

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ مے دارد　　برنگ اصحاب صورت رابہ بو ارباب معنی را

(اس کی عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل و جان کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے

دل و جان کو بو سے تازہ رکھتی ہے)

اس لیے بعض لوگوں نے قرآن شریف کو بارش سے تشبیہ دی ہے کہ ہر زمین کو اپنی استعداد کے موافق اس سے سیرابی و سرسبزی حاصل ہوتی ہے اور جس طرح نہ جفت قرآن شریف کی ہے ایسے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور جو تعلیمات حدیث میں ہیں ان کی بھی یہی شان ہے کیونکہ وہ بھی وحی الٰہی ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ قرآن وحی متلو ہے اور حدیث وحی غیر متلو ہے اس لیے جو مضمون حدیث میں ہو اس کا سمجھنا اور سمجھانا بھی بہت سہل ہے جیسے قرآن کا سمجھنا اور سمجھانا سہل ہے اور کیوں نہ ہو وہ ایسے متکلم کا کلام ہے جس کو ہر مشکل کا آسان کرنا سہل ہے۔ پس قرآن و حدیث کی تعلیم کا سہل ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

اور یہ سہولت تذکیر کے حصہ میں ہے اور استنباط کا حصہ صرف مجتہدین کے ساتھ خاص ہے اسی لیے یسرنا میں للذکر اور لتبشر و تنذر کی قید ہے اور بعض مضامین میں یستنبطونہ کی قید ہے انہی سہل اور تذکیری مضامین میں سے یہ بھی ایک مضمون ہے جو اس آیت میں مذکور ہے اگر اس میں تدبر کیا جائے تو اس سے ہماری بہت بڑی غلطی رفع ہوگی۔

عدم تدبر کا نتیجہ

تدبر کی قید میں نے اس لیے لگائی کہ شریعت کی تعلیم باوجود سہل ہونے کے ہم کو خفی اس لیے معلوم ہوتی ہے کہ ہم اس میں تدبر سے کام نہیں لیتے اور عدم تدبر سے تو دنیوی حسی باتیں بھی خفی ہو جاتی ہیں۔ علمی مضامین کا تو ذکر ہی کیا۔ مضامین علمیہ کا تعلق چونکہ بلا واسطہ عمل سے ہے وہاں تو بدوں تدبر کے کام نہیں چل سکتا مگر محسوسات میں بھی باوجود یہ کہ ان کا تعلق حس سے ہے تدبر کی ضرورت ہوتی ہے اور بدوں تدبر کے بعض دفعہ سخت غلطی ہو جاتی ہے۔ اسی مضمون کو دیکھ لیجئے کہ باوجود واضح ہونے کے عدم تدبر کی وجہ سے خفی ہو گیا۔

ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''جو تمہارے پاس ہے وہ ختم اور فنا ہو جائے گا'' ایک جملہ تو یہ ہے۔ دوسرا جملہ اسی کی تتمیم و تکمیل کے لیے ہے کہ ''جو خدا کے پاس ہے وہ پائیدار و باقی رہنے والا ہے۔''

ترجمہ سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کوئی پیچیدہ اور خفی مضمون ارشاد نہیں فرمایا' بلکہ ایک واضح آسان و سرسری مضمون ہے مگر عرفی اصطلاح کے موافق وہ سرسری نہیں کیونکہ واقع میں بڑا اعلیٰ مضمون ہے' مگر چونکہ ہم اس میں تدبر نہیں کرتے اس لیے سرسری سمجھا جاتا

ہے۔ غرض ایک معنی کے لحاظ سے تو یہ سرسری بھی ہے یعنی سہل ہونے کی وجہ سے۔ مگر آج کل سرسری بات، معمولی اور بے وقعت بات کو کہا جاتا ہے۔

سو اس معنی کے قرآن کا کوئی مضمون بھی سرسری نہیں، ہر مضمون باوقعت اور اعلیٰ درجہ کا ہے ہاں دوسرے معنی کے لحاظ سے اس کو سرسری کہنا صحیح ہے کہ واضح اور صاف اور آسان مضمون ہے مگر چونکہ ہم اس میں غور نہیں کرتے اس لیے ہم کو قرآن کی باتیں غیر واضح معلوم ہوتی ہیں اور ان سے ہم کو اجنبیت سی ہے اور باوجود یہ کہ مضمون اعلیٰ درجہ کا ہے اور نہایت باوقعت ہے مگر آج کل اس کی زیادہ وقعت نہیں کی جاتی۔

کثرت سماع و مشاہدہ کا اثر

جس کی ایک وجہ کثرت سماع و کثرت مشاہدہ بھی ہے کیونکہ قاعدہ ہے کہ جس بات کو بار بار سنا جائے یا بار بار دیکھا جائے وہ طبعی امر ہو جاتا ہے اس لیے اس کی زیادہ عظمت نہیں ہوتی۔ پھر اس بات کو اگر اہتمام کے ساتھ کوئی بیان کرے تو تعجب ہوتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی نیا مضمون ہے۔ اس لیے انسان اس میں کسی قدر معذور بھی ہے مگر خدا تعالیٰ نے انسان کو عقل بھی دی ہے اور فطرت دی ہے اس لیے اگر دونوں کے مقتضا میں تزاحم ہو تو اس وقت اس کو شریعت کی تعلیم پر عمل کرنا چاہیے کیونکہ شریعت کی تعلیم میں دونوں کی رعایت ہے۔ مثلاً کسی چیز کے فوت ہونے سے رنج پہنچے تو عقل اس وقت رنج کرنے سے منع کرتی ہے کیونکہ وہ یہ کہتی ہے کہ رنج کرنے سے وہ شے واپس نہیں آ سکتی اس لیے اس کا رنج فضول ہے اور طبیعت رنج کا تقاضا کرتی ہے مگر طبیعت کا یہ اثر اور تقاضا ایک حکم غیر واقعی پر مبنی ہے کہ یہ چیز ہم سے جدا کیوں ہوئی۔ اس لیے ہے کہ تمہارے قبضہ میں تو خود اپنی ذات بھی نہیں۔ اگر تم کو اپنی ہی ذات پر قبضہ ہوتا ہو تو کوئی شخص بھی بیمار یا مفلس نہ ہوا کرتا۔ مگر انسان کی ذات میں جو تصرفات و تغیرات رات دن ہوتے رہتے ہیں وہ اس کو بتلاتے ہیں کہ وہ خود مختار نہیں بلکہ دوسرے کے قبضہ میں ہے تو جب یہ اپنی ذات میں بھی خود مختار نہیں تو دوسری چیزوں میں اس کو دخل در معقول کا کیا حق ہے تو چونکہ یہ حکم عقل کے خلاف تھا اس لیے عقل نے اس کو رد کر دیا۔ شریعت کی یہ خوبی دیکھئے کہ دونوں کی رعایت کی گئی کہ حزن بھی ہو مگر اس کو غالب نہ کرو۔ شریعت نے عقل کی بھی رعایت کی اور طبیعت کی بھی۔

فنائے دنیا سے غفلت

اسی طرح یہاں جس مسئلہ کا ذکر ہے اس میں عقل کا مقتضا یہ ہے کہ فنائے دنیا سے کبھی غفلت نہ

ہو کیونکہ جب واقع میں اس کو بقاء نہیں اور فنا اس کے ساتھ لگا ہوا ہے تو اس سے غفلت بڑی غلطی ہے۔

دیکھو! اگر بادشاہ کسی خزانچی کے سپرد خزانہ کردے اور اس کو معلوم ہے کہ یہ میرے پاس بطور امانت کے ہے جو چند روز کے بعد لے لیا جائے گا۔ اس کو لازم ہے کہ اس کی امانت ہونے سے غافل نہ ہو مگر کوئی خزانچی خزانہ کو اپنی ملک سمجھ کر اس میں مالکانہ تصرف کرنے لگے تو یقیناً سب اس کو احمق بنائیں گے۔

اسی طرح فنائے دنیا سے غفلت عقل کے نزدیک سخت غلطی ہے مگر طبیعت غفلت کو مقتضی ہے کیونکہ فنائے دنیا کو بار بار دیکھتے دیکھتے مساوات سی ہو جاتی ہے اور جس چیز کو مساوات سی ہو جائے اس سے طبیعت کو غفلت ہو جاتی ہے۔ شریعت نے یہاں بھی دونوں کو معتدل کر دیا اور دونوں کی رعایت فرمائی کہ غفلت کو تو مضائقہ نہیں مگر نہ اتنی غفلت کہ احکام عقلیہ بالکل برباد ہو جائیں۔

اگر تھوڑی سی غفلت بھی نہ ہو تو انسان معطل ہو جائے جس کے سامنے ہر دم موت ہی کھڑی ہو وہ کوئی کام اچھی طرح نہیں کر سکتا مگر اس کے لیے ایک حد ہے جس کے آگے طبیعت کے احکام ختم ہو جاتے ہیں اور وہ حد یہی ہے کہ اتنی غفلت کا تو مضائقہ نہیں جس کی انتظام معاش میں ضرورت ہے مگر اتنی نہ ہو جس سے احکام عقلیہ بالکل برباد ہو جائیں کہ دنیا سے ایسی دلبستگی ہو کہ گویا ہمیشہ یہیں رہنا ہے جو شخص دنیا سے ایسی دلبستگی کرے اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے کوئی مسافر سرائے میں دل لگالے اور ایک رات کے قیام کے لیے وہاں خوبصورت مکان تعمیر کرنے اور باغ لگانے لگے۔ یقیناً سب اس کو بیوقوف کہیں گے کہ صرف رات بھر کا تو قیام اور اس کے لیے اس قدر سامان جو وطن اصلی کے مناسب تھا۔ پس ہم کو جو فنائے دنیا سے غفلت ہے اس کو تو مضائقہ نہیں مگر اس کا حد سے بڑھ جانا یہ محل شکایت ہے۔

ہماری حالت ایسی ہے جیسے ایک چمار کی حکایت ہے کہ کسی نے اس کے جوتا مارا تو وہ کہتا ہے اب کے تو مار۔ اس نے پھر مارا تو پھر بھی کہا کہ اب کے تو مار۔ غرض وہ مارتا رہا اور یہ برابر یوں ہی کہتا رہا اب کے تو مار۔ اس طرح ہم بھی رات دن فنائے دنیا کے واقعات دیکھتے رہتے ہیں مگر اپنی فنا سے غافل ہیں۔ گویا بزبان حال یوں کہتے ہیں کہ اب کے تو موت آئے اب کے تو طاعون آئے۔

اے صاحبو! مشاہدہ سے زیادہ کیا ہوگا جب مشاہدہ سے بھی ہماری غفلت کا پردہ نہ اٹھا تو کب اٹھے گا۔ یہ غفلت تو ہماری زوال دنیا کے متعلق ہے جو مشاہدہ ہے۔

بقائے آخرت سے غفلت

رہا بقائے آخرت تو ہر چند کہ وہ مشاہدہ نہیں مگر اعتقادی مسئلہ ہے اور اعتقادیات کا دل میں

مضبوطی کے ساتھ جما رہنا ضروری ہے اور جو بات دل میں جمی ہوئی ہو اس سے اجنبیت نہ ہونا چاہیے مگر ہماری حالت یہ ہے کہ جب کوئی یہ کہے کہ تم مرو گے اور خدا کے سامنے جاؤ گے۔ قبر میں سوال جواب ہوگا' قیامت میں نامہ اعمال سامنے ہوگا تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خواب دیکھ رہے ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ جس چیز کا درجہ حال میں جما ہوا ہونا چاہیے تھا وہ ایسی ہوگئی جیسے خواب ہو اور اس کی علامت یہ ہے کہ ناصحین سے الجھتے ہیں اور بعضے تو بے دھڑک کہہ دیتے ہیں۔

اب تو آرام سے گزرتی ہے عاقبت کی خبر خدا جانے!

اور جوان سے ذرا اچھے ہیں وہ ناصحین کی نصیحت کے جواب میں یوں کہہ دیتے ہیں کہ میاں اللہ غفور الرحیم ہے' آخرت کی فکر کہاں تک کریں' اللہ تعالیٰ سب بخش دیں گے۔ گویا ان کے نزدیک آخرت میں فقط ایک ہی جزو کا ظہور ہوگا دوسرے جزو کا یعنی عذاب کا ظہور نہ ہوگا۔ کیوں صاحب! جہاں یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ بخش دیں گے وہاں یہ خطرہ کیوں نہ ہوا کہ شاید کسی بات پر پکڑ ہونے لگے' شاید دوزخ میں بھیج دیئے جائیں۔

حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی یہ حالت تھی کہ کام بہت کر کے بھی ڈرتے تھے۔ چنانچہ ایک بار حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا کہ کیا تم اس پر راضی ہو کہ ہم نے جو اعمال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کئے ہیں ان کا اجر تو ہمارے واسطے سالم رہے اور جو اعمال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کیے ہیں ان پر گرفت نہ کی جائے چاہے ثواب بھی نہ دیا جائے' تو حضرت ابوموسیٰ نے فرمایا کہ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ جو اعمال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کئے ہیں ان کا اجر بھی سالم رہے اور جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کئے ہیں ان کا ثواب بھی ملے کیونکہ ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی بہت کام کئے ہیں۔

اور ظاہر میں یہ بات صحیح بھی تھی کیونکہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے زیادہ تر فتوحات وغزوات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہی کی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مدت خلافت میں جس قدر فتوحات ہوئی ہیں کہ اسلام مشرق سے مغرب تک پھیل گیا۔ ان سے پہلے اس قدر فتوحات نہیں ہوئیں۔

مگر باوجود اس کے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ بھائی میں تو اس پر راضی ہوں کہ جو اعمال ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کئے ہیں وہ سالم رہیں اور ان کا ثواب ہم کو مل جائے اور جو اعمال بعد میں کئے ہیں ان سے برابر سرابر چھوٹ جائیں کہ گرفت ہی نہ ہو' تو غنیمت ہے' ثواب تو کیا ہوتا اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جو ان اعمال پر ثواب کی امید ہوئی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کے سامنے کئے تھے تو وہ بھی اس لحاظ سے نہ تھی کہ وہ اپنے اعمال ہیں بلکہ محض اس وجہ سے امید تھی کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جو اعمال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کئے ہیں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے ٹھیک ہوگئے ہیں۔ ان میں خلوص ونورانیت وغیرہ حضورؐ کی برکت سے آ گیا تھا۔

مردِ کامل کی ضرورت

حقیقت میں یہی باتیں ہیں جن سے ہم غافل ہیں اور یہ ایک باریک بات ہے جس کی ہم کو خبر نہیں کہ ہم جو بعضے کام کرتے ہیں کبھی تو وہ اپنی قوت سے ہوتا ہے اور کبھی اہل اللہ کی نظر وتوجہ سے ہوتا ہے۔ اسی لیے فرماتے ہیں:

یار باید راہ راتنہا مرو　　بے قلاؤز اندریں صحرا مرو

یعنی باطنی راستہ کے لیے کوئی رفیق ساتھ لے لو۔ تنہا اس راستہ کو طے کرنے کا ارادہ نہ کرو کیونکہ تم تنہا اس کو قطع نہیں کر سکتے۔ اس پر شبہ ہو سکتا تھا کہ بعض اہل اللہ کا پیر ومرشد کوئی نہ تھا اور وہ بدوں مرشد کے واصل ہوگئے اس کا جواب مولانا نے یہ دیا ہے۔

ہر کہ تنہا نادرایں راہ رابرید　　ہم بعون ہمت مردان رسید

کہ جو لوگ شاذ ونادر اس راہ کو طے کرنے والے نظر آتے ہیں وہ بھی حقیقت میں تنہا منزل مقصود پر نہیں پہنچے بلکہ کسی کامل کی مخفی مدد اور پوشیدہ نظر کی برکت سے واصل ہوئے ہیں۔ ایک تو لفظ نادر بڑھا کر بتلا دیا کہ اول تو ظاہر میں بھی اس کا وقوع نادر ہے۔ دوسرے حقیقت کے لحاظ سے وہ بھی تنہا نہیں چل رہا بلکہ کسی کامل کی مدد اس کے ساتھ ہے گو اس کو خبر نہ ہو کہ کون میری مدد کر رہا ہے۔ جیسے آفتاب کی حرارت سے پھل پختہ ہوتا ہے مگر کھانے والے کو معلوم نہیں ہوتا کہ میرے لیے اس کو کس چیز نے پکایا' کس چیز نے تیار کیا۔

آفتابِ طریقت کی ضیاء باری

اسی طرح ہر زمانہ میں کوئی خدا کا بندہ آفتاب طریقت ہوتا ہے جس کی نورانیت سے اس کے زمانہ والوں کو مدد پہنچتی ہے مگر لوگوں کو پتہ بھی نہیں ہوتا ہم کو کون چلا رہا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم تنہا چل رہے ہیں مگر یہ غلط ہے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس راز کو سمجھا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تو ہمارے اعمال میں نورانیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ نورانیت نہیں رہی۔ گو ظاہر میں اعمال کا ذخیرہ بعد میں بھی بہت کچھ نظر آ رہا ہے مگر

چونکہ نورانیت ویسی نہیں تو ان کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص بادشاہ کے سامنے ہزاروں ٹوکرے امرود وانار وغیرہ کے پیش کرے مگر ہوں سڑے ہوئے تو کیا اس انبار کی محض اس لیے کہ ظاہر میں بڑا انبار تو ہے کچھ قدر ہو سکتی ہے۔ سلاطین دنیا تو سارے انبار کو ہمارے منہ پر دے ماریں گے اس لیے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے ان اعمال کے متعلق خطرہ تھا اور فرماتے تھے کہ ثواب تو بہت دور ہے۔ میں اس پر ہی راضی ہوں کہ ان پر گرفت نہ ہو اور الٹے منہ پر نہ مارے جائیں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر خوف کا غلبہ تھا اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ پر حالت رجاء غالب تھی۔ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طاعات کے باب میں یہ حالت تھی باوجود یہ کہ آج ان کے برابر کوئی بھی نہیں ہو سکتا ہے تو پھر ان اللہ کے بندوں کو جو اللہ غفور الرحیم کہہ کر ناصحین کا منہ بند کرتے ہیں۔ معاصی کے باب میں یہ خوف کیوں نہیں ہوتا کہ شاید ہماری پکڑ ہونے لگے تو آخرت سے باوجود یہ کہ اعتقادی مسئلہ ہے ہم کو اس قدر غفلت ہے کہ خبر ہی نہیں۔

اسی طرح فنائے دنیا ظاہر ہے مگر کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ ایک دن ہم بھی ختم ہوں گے جس کی دلیل یہ ہے کہ آخرت کے لیے سامان سے بے پروائی ہے نہ رہن چھوڑنے کی فکر ہے نہ قرض ادا کرنے کا خیال ہے نہ موروثی زمین چھوڑنے کا قصد ہے گویا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے کہ ان کا قرض ادا کر دیں گے۔ غرض ایک عالم لایعنی مشغلہ میں مبتلا ہے کوئی زیور کی دھن میں ہے کوئی مکان بنانے میں منہمک ہے، یہ کسی کو یاد نہیں کہ ایک دن ہم نہ ہوں گے۔

تو یہ ایسا مضمون ہے جو واقع میں ظاہر ہے مگر غفلت نے اس کو خفی بنا رکھا ہے اس واسطے اللہ تعالیٰ نے جا بجا ہم کو بار بار متنبہ فرمایا ہے جن میں سے ایک مقام یہ بھی ہے جس کو میں اس وقت بیان کرنا چاہتا ہوں۔

اللہ سے مانگنے کی ضرورت

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اے لوگو! سنو کہ تمہارے واسطے دو قسم کی چیزیں ہیں ایک وہ جو تمہارے پاس ہیں جن میں تم نے دل لگا رکھا ہے وہ تو ختم ہونے والی ہیں اور دوسری وہ چیزیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں وہ باقی ہیں اور وہ چیزیں بھی تمہاری ہی ہیں مگر تم ان سے ایسے غافل ہو گویا وہ غیر کی ہیں۔

حالانکہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کچھ تو بچہ کے پاس روپیہ ہو اور باقی سرمایہ باپ کے قبضہ میں ہو۔ بچہ کے پاس جو روپیہ ہے وہ اس کو اپنا سمجھتا ہے مگر ٹھیکرا سمجھ کر برباد کر دیتا ہے اور جو سرمایہ باپ کے پاس ہے اس کو اپنا سرمایہ نہیں سمجھتا حالانکہ وہ بھی اسی کے واسطے ہے۔ مگر باپ اس لیے اس کو نہیں دیتا کہ برباد کر دے گا، وہ اس کو خاص موقع کے واسطے اپنے بچہ کے لیے محفوظ کرتا ہے تو

جیسے وہ بچہ احمق ہے کہ باپ کے پاس کے سرمایہ کو اپنا نہیں سمجھتا ایسے ہی ہم بے وقوف ہیں کہ اپنی چیز اسی کو سمجھتے ہیں جو ہمارے ہاتھ میں ہے اور جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے ہمارے واسطے اپنے پاس رکھی ہیں ان کو اپنی نہیں سمجھتے وہ گویا کسی غیر کے لیے ہیں۔

اے صاحبو! وہ بھی ہماری ہیں مگر جب تک ان کی قدر نہ کرو گے وہ نہ ملیں گی اور قدر یہی ہے کہ ان کو مانگو، یہ تو نہیں ہوسکتا کہ مانگو یا نہ مانگو، چاہو یا نہ چاہو یعنی قدر کرو یا نہ کرو، زبردستی ہمارے سر مڑھ دی جائے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں:

اَنُلْزِمُکُمُوْھَا وَاَنْتُمْ لَھَا کٰرِھُوْنَ. (ھود آیت نمبر ۲۸)

''کیا ہم اپنی نعمت کو تمہارے سر چپکا دیں حالانکہ تم اس سے کراہت ہی کرتے رہو۔''

آخر انکو اسکی ضرورت کیا ہے کہ خواہ مخواہ تمہارے سر چپکا دیں۔ کیا خدا کے پاس جگہ نہیں ہے یا وہ دولتیں رکھی رکھی سڑ جائیں گی؟ ہرگز نہیں! خدا کے پاس جگہ کم نہیں اور نہ وہ نعمتیں سڑنے والی ہیں اس لیے بدوں مانگے نہیں ملیں گی اور مانگنے کے بعد کچھ بھی دیر نہ لگے گی۔ حدیث قدسی میں بالفظ نبوی وارد ہے۔

من تقرب الی شبر اتقربت الیه ذراعاً ومن تقرب الی ذراعاً تقربت الیه باعاً. الخ.[1]

''کہ جو شخص میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے میں اس کی طرف دو بالشت جاتا ہوں اور جو میری طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہے میں اس کی طرف دو ہاتھ بڑھتا ہوں اور جو میری طرف چل کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر جاتا ہوں۔''

پھر کیا وجہ ہے کہ ہم خدا تعالیٰ کی طرف بڑھنے کا ارادہ ہی نہیں کرتے۔

خدا سے نہ مانگنے کا نتیجہ

ایک حدیث میں آیا ہے ''**من لم اللّٰه یسئل یغضب علیه**''[2] (جو شخص اللہ تعالیٰ سے نہ مانگے اس پر اللہ تعالیٰ غصہ کرتے ہیں۔) دوسرے آقاؤں کی تو یہ حالت ہے کہ ان سے اگر برابر مانگتے رہو تو تنگ آجاتے ہیں اور جو ان سے مانگتا نہ ہو اس سے خوش رہتے ہیں اور تعریف کے طور پر کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص بڑا بے زبان ہے کبھی کچھ نہیں مانگتا مگر اللہ تعالیٰ ایسے ہیں کہ جو ان سے نہ مانگے اس سے خفا ہوتے ہیں۔ یہاں تک ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہر چیز مانگو، یہاں تک کہ جوتی کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ بھی مانگو، نمک نہ رہے وہ بھی ان ہی سے مانگو۔ یہ اس لیے فرمایا

---

[1] (انظر تخریج الحدیث: ۴) [2] (انظر تخریج الحدیث الرقم: ۱۲)

تا کہ لوگوں کے دلوں سے یہ خیال نکل جائے کہ اللہ تعالیٰ سے چھوٹی چھوٹی چیزیں کیا مانگیں؟ ظاہر میں یہ مستحسن معلوم ہوتا ہے مگر اس میں نفس کا کید ہے جس پر شارع علیہ السلام نے ہم کو متنبہ فرمایا ہے' وہ کید یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے چھوٹی چیزیں نہیں مانگتا وہ اپنے خیال میں بڑی چیزوں کو گویا اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی بڑی سمجھتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سلطنت ہفت اقلیم اور جوتی کا تسمہ برابر ہے۔ دوسرے کیا چھوٹی چیزوں کے لیے کوئی اور خدا ہے۔ اگر نہیں تو اسی سے کیوں نہیں مانگتے اور مغفرت و جنت کے مانگنے کا تو قرآن میں جا بجا امر ہے۔

وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ[1]

''اپنے پروردگار کی مغفرت اور جنت کی طرف دوڑو جس کا عرض آسمان و زمین کے برابر ہے''

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پسند فرماتے ہیں جو دعاء میں الحاح کرتے ہیں۔''

تو دیکھو ہمارے آقا کیسے کریم ہیں۔ اب بھی کوئی نہ مانگے تو اس کی محرومی اور بدقسمتی ہے۔

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر　　تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

صاحبو! اللہ تعالیٰ سے مانگو۔ انہوں نے حفاظت سے اپنے پاس تمہارے لیے بہت سی نعمتیں رکھی ہیں اور جو نعمتیں تمہارے پاس ہیں اس کو تو چور لے جائیں' ڈاکو چھین لیں مگر افسوس کہ ہم اس پر فریفتہ ہیں اور جو محفوظ ہیں ان کو اپنی حماقت سے بھولے ہوئے ہیں۔

ہماری ہر چیز پرائی ہے

اللہ تعالیٰ اسی غلطی پر ہم کو متنبہ فرماتے ہیں کہ جو تمہارے پاس ہے واقع میں وہ تو غیر کی چیز ہے۔ یعنی امانت چندروزہ ہے جو ایک وقت میں تم سے چھین لی جائے گی یا موت کے بعد وارثوں کو ملے گی اور جو ہمارے پاس ہے واقع میں وہ تمہاری چیز ہے جو ہمیشہ تمہارے پاس رہے گی مگر ہم نے اس مضمون کو بھلا رکھا ہے' علماً بھی عملاً۔ علماً ذہول کے معنی ہیں کہ اس کا استحضار نہیں ہے ورنہ اس کا عقیدہ تو ہم سب مسلمان اپنے دل میں پاتے ہیں۔

مگر جس اعتقاد سے کام نہ لیا جائے اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک زنانہ شہزادہ کی حکایت ہے کہ وہ بیٹھا ہوا تھا کہ دفعتہً سانپ نکل آیا تو وہ کہنے لگا ارے بلانا کسی مرد کو۔ کسی نے کہا حضور بھی تو ماشاء اللہ مرد ہیں' کہا ارے ہاں خوب یاد دلایا' اچھا لاٹھی لاؤ۔ پھر نا معلوم سانپ مارا یا نہیں۔ تو ظاہر

---

[1] (آل عمران نمبر ۱۳۳)

ہے کہ اس کو اپنے مرد ہونے کا اعتقاد ضرور تھا مگر ایسے اعتقاد سے کیا نفع جو وقت پر یاد نہ آئے حتیٰ کہ دوسروں کو یاد دلانے کی ضرورت پڑے۔ گو اعتقاد کے بارے میں یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ذہول کے بعد بالکل بیکار ہے کیونکہ اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ ایسا اعتقاد بھی اخیر میں کام آ جائے گا' پٹ پٹا کر اس عقیدہ ہی کی بدولت کسی وقت جنت میں پہنچ جائیں گے جس کی دلیل یہ آیت ہے:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ. (زلزال:۷-۸)

جب ذرہ بھر نیکی بھی ضائع نہیں تو ضعیف اعتقاد ایمان کی جزا بھی ضرور ملنا چاہیے اور اس کی یہی صورت ہے کہ کسی وقت یہ لوگ جہنم سے نکال لیے جائیں تو ہر چند کہ یہ اعتقاد بھی ایک درجہ میں نافع ہے مگر جب وقت پر پوری طرح کام نہ آیا اور مرتے ہی جنت میں جانا نصیب نہ ہو تو یہ اعتقاد نافع کامل نہ ہوا اس لیے میں کہتا ہوں کہ ہم لوگ اس باب میں علماً بھی کوتاہی کرتے ہیں اور عملاً بھی مگر عمل کے مقابلہ میں علم کے دو درجے ہیں۔ ایک اعتقاد ایک استحضار اور ہماری کوتاہی دوسرے درجہ میں ہے یعنی ہم استحضار میں کوتاہی کرتے ہیں۔

اب عدم استحضار کا ایک قوی سبب سنئے۔ وہ یہ کہ شیطان نے یہاں ہم کو یہ سبق پڑھا رکھا ہے کہ ہماری قسمت کہاں کہ ہم جنت میں پہلے پہنچ جائیں۔ اس لیے اس کی سعی نہیں اور اس لیے استحضار بھی نہیں۔ استحضار اسی چیز کا ہوتا ہے جس کے لیے سعی ہو۔ میں کہتا ہوں کہ سبحان اللہ! تمہاری قسمت کھانے پینے میں تو بڑی تیز ہے اس میں ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاؤ کہو کہ ہماری قسمت کہاں کہ دو وقت پیٹ بھر کے روٹی کھایا کریں۔ یہ تو بڑے لوگوں کی قسمت ہے اور اگر یہ کہو کہ چاہتے تو ہم بھی یہ ہیں کہ جنت میں مرتے ہی پہنچ جائیں تو میں کہوں گا کہ یہ چاہنا آپ کا ایسا ہے جیسے کوئی یہ چاہے کہ بدوں ہاتھ ہلائے روٹی منہ میں پہنچ جائے۔ اس کو سب یہ کہتے ہیں کہ یہ روٹی کھانا نہیں چاہتا۔ اگر چاہتا تو اس کے اسباب اختیار کرتا' ایسے ہی ہمارے بھائی یہ تو چاہتے ہیں کہ کھڑے کھڑے جنت میں پہنچ جائیں ہاتھ نہیں ہلاتے۔ اس کے اسباب اختیار نہیں کرتے اور دنیا کی جس بات کو چاہتے ہیں اس کے لیے خوب کوشش کرتے ہیں۔

پس حاصل یہ ہے کہ روٹیاں کھانا تو تم چاہو اور دین کی باتوں کو اللہ تعالیٰ چاہیں کہ اگر خدا تعالیٰ نے چاہا اور قسمت میں ہوا تو دیندار بن جائیں گے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ کامیابی اللہ تعالیٰ کے چاہنے سے ہی ہوگی مگر جس طرح دنیا کے اسباب و تدابیر کو بھی ترک کر کے بیٹھ گئے حالانکہ دنیا کے کاموں میں کوئی بھی تدبیر کو ترک نہیں کرتا۔ اس کا تو یہ حاصل ہوا کہ اپنے مطلب میں تو تم بڑے ہوشیار ہو مگر آخرت کو

مطلوب ہی نہیں سمجھتے۔اس کی وقعت دل میں نہیں جبھی تو یہ بہانے ہیں۔اس کی شکایت ہے۔

موت لوگوں کو یاد نہیں

خصوصاً عورتوں میں یہ عدم استحضار بہت ہی زیادہ ہے۔ چنانچہ جسوقت عورتیں زیور پہنتی یا کپڑے قطع کرنے بیٹھتی ہیں اس وقت یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کوسوں بھی اس کا گمان نہیں کہ ایک دن ہم نہ ہوں گے اور عام طور پر یہ ذہول اس قدر ہے کہ اگر کوئی ہمارے سامنے مرتا بھی ہے تب بھی ہم کو اپنی موت یاد نہیں آتی۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ بہت لوگوں کو اپنی موت یاد نہیں آتی جس کی دلیل یہ ہے کہ عین جنازہ کے ہمراہ ہنسی دل لگی کی باتیں ہوتی ہیں۔قبرستان میں جا کر مقدمات کے فیصلے اور تذکرے ہوتے ہیں۔ واللہ! اگر اپنی موت اس وقت یاد ہو تو انسان سب چوکڑی بھول جائے۔ (حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک شخص کو قبر پر کھڑے ہوئے ہنستا ہوا دیکھا' فرمایا بخدا میں تجھ سے عمر بھر کلام نہ کروں گا تو ایسی جگہ بھی ہنستا ہے جہاں رونا چاہیے تھا۔۱۲)

جیسے ایک بڑھیا کی حکایت ہے کہ اس کی بیٹی بیمار تھی۔ یہ محبت میں دعا کرتی تھی کہ اے اللہ! یہ اچھی ہو جائے اور اس کی جگہ میں مر جاؤں۔ایک دن اتفاق سے محلہ کی گائے نے ہانڈی میں منہ ڈال دیا اور سینگ ہانڈی میں پھنس گئے' وہ اسی صورت سے بڑھیا کے گھر میں آگھسی۔ یہ دیکھ کر ڈر گئی اور یہ سمجھی کہ جس موت کی میں تمنا کرتی تھی وہ سامنے آ گئی ہے اور بس یہ عزرائیل علیہ السلام فرشتہ ہے جو میری روح نکالنے آیا ہے تو وہ گھبرا کر کہنے لگی' اے موت میں مہتی (اس کی بیٹی کا نام ہے۔۱۲) نہیں ہوں' مہتی تو وہ پلنگ پر پڑی ہے' میں تو غریب بڑھیا ہوں۔

گفت اے موت من نہ مہتیم ‏ ‏ ‏ پیرزاں غریب محتیم

(کہا اے موت میں مہتی نہیں ہوں میں ایک غریب محنتی بڑھیا ہوں)

صاحبو! ہم اپنی موت کو یاد رکھتے تو ہوش اڑ جاتے اور اس کی علامات ظاہر ہوتیں مگر ہمارے اندر اس کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوئی اور اگر اپنی موت یاد آتی تو پھر دوسرے کے مردہ پر بھی اتنا نہ روتے کیونکہ اگر کوئی قید سے چھوٹ جائے تو اس میں اتنے رنج کی کیا بات ہے۔ گو طبعاً حزن ہوتا مگر عقلاً تو یہ خوشی کی بات ہے اس وقت اس بات کی خوشی ہونا چاہیے تھی کہ ایک دن ہم بھی قید خانہ سے چھوٹنے والے ہیں' جیسا یہ چھوٹ گیا۔ عارف اسی کو فرماتے ہیں:

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم ‏ ‏ ‏ راحت جاں طلبم وزپئے جاناں بروم

نذر کردم کہ گر آید بسرایں غم روزے تادر میکدہ شاداں و غزلخواں بروم

(وہ دن بہت اچھا ہوگا کہ اس میں ویرانہ دنیا سے جاؤں، جان کو آرام مل جائے اور محبوب کے دیدار کے لیے چلا جاؤں، میں نے نذر کی ہے کہ اگر یہ دن نصیب ہو جائے تو خوش وخرم اور غزل پڑھتا ہوا جاؤں)

شوق لقاء میں موت کی تمنا جائز ہے

اہل اللہ تو موت کے دن کی تمنا کرتے ہیں اور یہاں ہم کو اس کے نام سے بھی جاڑہ بخار چڑھتا ہے تو موت کو ہم اتنا بھولے ہوئے ہیں کہ دوسرے کو مرتے دیکھ کر بھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہ منزل ہمارے سامنے بھی ہے بلکہ یوں سمجھتے ہیں کہ بس موت اسی کے واسطے تھی اور اگر کوئی یاد بھی کرتا ہے تو بطور وظیفہ کے مگر کیا اگر کوئی لڈو مٹھائی کا نام لے کر وظیفہ پڑھا کرے تو اس سے اس کا منہ میٹھا ہو جائے گا ہرگز نہیں۔ اسی طرح موت کا وظیفہ پڑھنے سے کام نہیں چل سکتا۔ اس کو موت کی یاد نہیں کہہ سکتے۔ موت کی یاد یہ ہے کہ زیوروں کی کثرت سے نفرت ہو جائے گی۔ گھر میں زیادہ سامان اور بکھیڑا ناگوار معلوم ہو جیسے سفر میں زیادہ اسباب برا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ سفر میں اتنا مختصر سامان ساتھ لیتے ہیں جس کے عدد شمار میں آجائیں مگر ہماری یہ حالت ہے کہ سفر آخرت سامنے ہے اور گھر میں اس قدر سامان ہے جس کی تفصیل گھر والے کو بھی معلوم نہیں۔ ہم رات دن اور لاتے جاتے ہیں اور گناہوں کا بوجھ جو گردن پر لادا جا رہا ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔

اعتقاد فنائے دنیا میں عملی کوتاہی

یہ تو علمی کوتاہی تھی اور عملی کوتاہی یہ ہے کہ آخرت کے لیے کوشش نہیں کرتے، بس بڑی کوشش یہ ہوگی کہ بیٹھ کر دو آنسو بہا لیے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی نہر میں پانی کم ہو گیا تھا، دو آنسو بہا کر اللہ تعالیٰ پر احسان کیا اور ان کو خرید لیا۔ بس ان کے نزدیک دو آنسو بہانے سے سارے گناہ ان کے واسطے جائز ہو گئے۔ یہ سب کا کفارہ ہو گیا، بات یہ ہے کہ آنسو بہانے میں کوئی دقت نہیں، کچھ کرنا نہیں پڑتا، اس لیے رونا اختیار کر لیا۔

جیسے ایک بدوی کے ساتھ سفر میں ایک کتا تھا، وہ راستہ میں مرنے لگا اور بدوی رونے لگا، ایک مسافر نے رونے کا سبب پوچھا، کہا یہ کتا میرا رفیق ہے اور آج مر رہا ہے۔ اس واسطے رو رہا ہوں، کہا اس کو مرض کیا ہے؟ کہا بھوک سے مر رہا ہے، مسافر نے دیکھا کہ ایک طرف پوٹلا بندھا رکھا ہے، پوچھا اس میں کیا ہے؟ کہا روٹی کے سوکھے ٹکڑے ہیں کہا پھر کتے کو کیوں نہ کھلا دیئے جس سے تجھ کو اس قدر محبت ہے۔

گفت ناید بے درم درراہ ناں لیک ہست آب دودیدہ رائیگاں

مجھے ایسی محبت نہیں کہ رقم کی چیز اس کو کھلا دوں اور رونے کا کیا مفت کے آنسو ہیں دو گھڑی بہا لوں گا۔

یہی حال ہمارا ہے کہ ایسے مواقع پر ہم نے صرف رونا سیکھا ہے جس میں کچھ خرچ نہیں۔ صاحبو! بقسم بتاؤ کہ جتنی کوشش تم بھوک کے وقت غلہ لانے اور آٹا پسوانے روٹی پکوانی پڑیں گے۔ یہ جواب بالکل غلط ہے کیونکہ آپ کا کام صرف کوشش ہے صحت ہو یا نہ ہو۔ اگر تم کوشش میں لگ جاؤ پھر بھی کامیابی کا درجہ حاصل نہ ہو تب بھی ثواب ملے گا بلکہ دگنا ثواب ملے گا۔ ایک محنت کا اور ایک ناکامی کی حسرت اور رنج کا۔ یا یہ کہو کہ ایک پڑھنے کا ایک مشقت کا اور ناکامی پر ثواب ملنے سے حیرت نہ کیجئے۔ حدیث میں تصریح ہے: **والذی یتتعتع فیہ وھو علیہ شاق لہ اجران۔**[1]

"یعنی جو شخص قرآن میں اٹکتا ہو اور وہ اس پر دشوار معلوم ہوتا ہو اس کو دو اجر ملیں گے۔"

ناکامی بھی موجب اجر ہے

اسی بناء پر اہل اللہ نے ناکامی کو بھی سبب ثواب بنا دیا ہے۔ چنانچہ حضرت رابعہ نے جب حج کیا تو حج سے فارغ ہو کر جناب باری میں عرض کیا' یا اللہ! میں نے حج کر لیا اب ثواب دیجئے خواہ حج قبول ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ اگر قبول ہو چکا ہے تب تو حج مبرور پر ثواب دینے کا آپ کا وعدہ ہے ہی اور اگر قبول نہیں ہوا تو یہ سخت مصیبت ہے کہ

از درِ دوست چہ گویم بچہ عنواں رفتم　　　ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

(درِ دوست سے میں نے کیا کہا اور کیا درخواست لے کر گیا' میں پورے جذبہ و شوق سے آیا ہوں اور سراسر محرومی سے واپس گیا)

اور مصیبت زدہ کیلئے بھی آپ نے ثواب کا وعدہ فرمایا ہے اسلئے بہر حال ثواب دینا پڑے گا۔ غرض اس دربار میں کوشش کے بعد ناکامی بھی کامیابی ہے' تنخواہ ضرور ملے گی اور حضرت رابعہ نے جو یہ عنوان اختیار فرمایا یہ ناز کا مقام ہے جو ہر ایک کا مقام نہیں' ہمارے لیے تو یہ بھی زیبا نہیں۔

ناز را روئے بباید ہمچو ورد　　　چوں نداری گرد بد خوئی مگرد

پیش یوسف نازش و خوبی مکن　　　جز نیاز و آہ یعقوبی مکن

عیب باشد چشم نابینا وباز　　　زشت باشد روئے نازیبا و ناز

(ناز کرنے کے لیے گلاب جیسے چہرہ کی ضرورت ہے جب تم ایسا چہرہ نہیں رکھتے بدخوئی کے پاس مت جاؤ' حضرت یوسف علیہ السلام یعنی کامل کے سامنے ناز و خوبی یعنی دعویٰ اظہار کمال مت

---

[1] (الصحیح للبخاری ۹: ۱۹۳' الصحیح لمسلم کتاب صلاۃ المسافرین: ۲۴۴' سنن ابن ماجہ: ۳۷۷۹' مشکوۃ المصابیح: ۲۱۱۲)

کرو سوائے عجز و نیاز اور آہ یعقوبی کے اور کچھ مت کرو، آنکھ اندھی ہو اور کھلی ہو یہ عیب ہے چہرہ بدصورت ہو اس پر ناز ہو یہ بری بات ہے)

غرض یہ عنوان ناز کا ہے مگر معنون یہ ہے کہ جب اپنے نزدیک مقبول بنانے کی کوشش کی مگر پھر کوتاہی ہوگئی تو قاعدہ سے گو مقبول ہونے کے قابل نہیں۔ مگر وہ میں کرتے ہو کیا آخرت کے واسطے بھی کبھی اتنی کوشش کی ہے ہرگز نہیں اور اگر کوئی نصیحت کرتا ہے تو جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ توفیق دیں گے تو آخرت کا سامان کریں گے۔ گویا اس میں بھی نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کی خطا ہے ان کی کچھ خطا نہیں ہے۔ کبھی کہتے ہیں کہ ہماری تو قسمت پھوٹی ہوئی ہے ہمیں دنیا کے دھندوں سے کہاں فرصت ہے اس میں بھی اللہ تعالیٰ ہی کی خطا بتائی جاتی ہے۔ (انا للّٰہ و انا الیہ راجعون) یہ کیا دین ہے! اور جو بڑا خیال آخرت کا ہوا تو بزرگوں سے دعا کرنے کی درخواست کی جاتی ہے۔

جیسے ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ سے ایک سوداگر نے ممبئی میں کہا تھا کہ حضرت دعا فرمایئے مجھے بھی حج کی توفیق ہو جائے۔ فرمایا: ہاں ہم دعا کریں گے اور ایک کام تم کرو کہ جہاز کی روانگی کے دن مجھے اپنی ذات پر پورا اختیار دے دو کہ جو میں کہوں اس کے خلاف نہ کرو، کہا حضرت اختیار لے کر کیا کریں گے۔ فرمایا جس وقت جہاز روانہ ہوگا تم کو پکڑ کر جہاز میں سوار کر دوں گا، وہ حیلے حوالے کرنے لگا تو حضرت نے فرمایا پھر یہ نہیں ہو سکتا کہ تم بیوی کی بغل میں رہو اور رات دن گلچھرے اڑاؤ اور ہم دعا کے ہو رہیں۔

یہی حال ہمارا ہے کہ خود کچھ نہ کریں گے ہاں ناصحین سے کہیں گے کہ آپ دعا کریں۔ خصوصاً ان بوڑھی عورتوں کا تو یہ حال ہے کہ دین کا کوئی کام ہو تو سب سے کم ہمت اور دنیا کا کام ہو تو یہ شیطان کی خالہ سب سے پہلے اس کام کو کریں گی۔ اس میں سب سے زیادہ باہمت ہو جائیں گی، اللہ تعالیٰ کا دھیان بھی نہیں آتا۔ ہاں بہو بیٹوں کے لیے زیور، کپڑے کا رات دن تقاضا ہے، ہم تو ان کو کم ہمت اس وقت سمجھتے کہ یہ دنیا کے کاموں میں بھی کم ہمت ہوتیں حالانکہ خود دنیا کی یہ حالت ہے کہ کوشش سے کبھی تو حاصل ہوتی ہے اور کبھی کوشش ناکام ہو جاتی ہے اور آخرت کے لیے سعی کسی حال میں ناکام نہیں۔ اگر کوئی شخص کسی عمل آخرت کا اہتمام کرے اور وہ حاصل بھی نہ ہو یا پورا نہ ہو جب بھی اس کو ثواب ملتا ہے۔

یہاں سے عوام کی ایک اور غلطی بھی معلوم ہوگئی، وہ یہ کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ میاں قرآن صحیح کر لو تو جواب میں کہتے ہیں کہ کیا اب میری تعلیم کا وقت ہے اب بوڑھے طوطے کیا مقبول فرما کر اجر عطا فرما دیتے ہیں۔ یہ معنی ہیں عدم مقبول میں اجر کے اور یہ مضمون سالکین کے بہت کام کا ہے کہ دین

کے راستہ میں اگر کوشش ناکام بھی ہو یا کمزور ہو جب بھی اجر ملے گا۔

صاحبو! اگر وصول الی کمال العمل نہ ہو تو ثواب وقرب تو وصولی الی المقصود ہو جائے گا۔ اگر تم نے قرآن صحیح کرنے کی کوشش کی اور نہ ہوا تو کیا حرج ہے خدا تو راضی ہو گیا۔ ہمارے ایک مجمع نے ایک موقع پر ایک دینی کام کے لیے کوشش کی تھی اور ناکام رہے تو ایک بددین نے اعتراض کیا کہ ان لوگوں کو کیا حاصل ہوا۔ ایک اللہ کے بندہ نے جھلا کر جواب دیا:

سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہکن　　بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز　　اے رو سیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

مولانا فرماتے ہیں:

گر مرادت را مذاق شکر ست　　بے مرادی نے مرادی دلبر ست

(اگرچہ تمہاری مراد شکر کی طرح پسندیدہ ہے کیا بے مرادی محبوب کی مراد نہیں ہے)

ارے مراد میں تو مزہ ہے ہی مگر نامرادی میں بھی ایک مزہ ہے۔ وہ یہ کہ محبوب نے تو دیکھ لیا کہ ہم نے کسی کو طلب کیا تھا اور وہ نہیں ملا۔

ہمینم بس کہ داند ماہ رویم　　کہ من نیز ازخرید ا ران اویم

(یہی کافی ہے کہ میرا محبوب جان لے کہ میں بھی اس کے خریداروں میں سے ہوں)

کیا یہ تھوڑی دولت ہے کہ تم ان کے خریداروں میں داخل ہو گئے۔ گو ناکام ہی خریدار سہی واے اس کے حال پر جو خریدار بھی نہ بنا۔ پس آخرت وہ شے ہے کہ اس کا طالب ناکام ہو کر بھی مستحق اجر ہے مگر ایسی مد کوئی نہیں کہ کچھ بھی نہ کرو اور اجر مل جائے۔ پھر افسوس ہے کہ ہم لوگ دنیا کے لیے تو ہر طرح کی تدبیر وسعی کرتے ہیں جہاں ناکامی سراسر خسارہ ہے اور آخرت کے لیے سعی نہیں کرتے جہاں ناکامی بھی کامیابی ہے۔ سرمد ان لوگوں کے جواب میں جو اس طریق میں ناکامی کی شکایت کیا کرتے ہیں۔ کیا خوب فرماتے ہیں:

سرمد گلہ اختصاری باید کرد　　یک کا رازیں دو کاری باید کرد
یاتن برضائے دوست می باید داد　　یاقطع نظر زیاری باید کرد

(سرمد شکایت کو ختم کرو اور دو کاموں میں سے ایک کام کرو یا تو تن کو محبوب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وقف کرو یا محبوب سے قطع نظر کرو)

کہتے ہیں کہ بس ان شکایت کو ختم کرو یا تو محبوب کے ہو رہو اور اس کی رضا پر راضی رہو یا اس

محبوب سے قطع نظر کر کے کوئی دوسرا محبوب تلاش کر لو۔

پس اگر خدا تعالیٰ کسی کا بیٹا وغیرہ لے لیں تو اس کو شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں کیونکہ تم سب اپنے نہیں ہو بلکہ سب خدا کے ہو۔ جب تم اس کے ہو تو تمہاری ہر چیز اسی کی ہے۔ جب ہر چیز خدا ہی کی ہے تو تمہارا کیا اجارہ ہے اگر وہ لے لیں۔ ایسے ہی اگر تم ذکر کرو' نماز پڑھو اور مزہ نہ آئے تو تمہارا کیا بگڑ گیا۔ اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے غلام نے آقا کی زمین میں کاشت کی ہو اور پیداوار نہ ہو تو اس کو رونے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کا کیا نقصان ہے اسی طرح تم نے پڑھنا لکھنا سیکھا اور ذکر اللہ کیا اور حلاوت نہ ہوئی تو تمہارا کیا حرج ہے' تم کام میں لگے رہو کہ اس دربار کا نامراد بھی بامراد ہے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

گر مرادت را مذاق شکر ست　　　بے مرادی نے مراد دلبر ست

(اگر چہ تمہاری مراد شکر کی طرح پسندیدہ ہے کیا بے مرادی محبوب کی مراد نہیں ہے)

اور اس کو بے مرادی کہنا بھی عامل کے گمان کے اعتبار سے دنیا میں ہے اور وہاں تو اس کو پوری مراد ملے گی۔ افسوس ایسی دولت کے لیے تو ہم کوشش نہیں کرتے جس میں طالب کبھی ناکام نہیں اور دنیا مردار کے لیے ہر وقت مرتے کھپتے ہیں جس میں ناکامی کے وقت خسارہ ہی خسارہ ہے اور کامیابی بھی محض ناتمام و ناپائیدار۔

عورتوں کے دنیوی انہماک

بالخصوص عورتوں کے تو مرنے کھپنے کی یہ حالت ہے کہ اگر ان کا ایک کپڑا تیار ہوگا تو اس کے لیے بھی ایک کمیٹی منعقد ہوتی ہے کہ خالہ دیکھنا گوٹ اچھی بھی ہے یا نہیں' دیکھنا اس پر بیل لگاؤں یا لچکہ لگاؤں' کیا اچھا لگے گا اور جوان سے کہا جائے کہ دنیا بھر کو ایک کپڑے کے واسطے جمع کرنے کی کیا ضرورت ہے جو اپنے کو اچھا لگے پہن لو' تو یہ جواب دیں گی کہ واہ قاعدہ یہی ہے کہ کھائے اپنی پسند کا اور پہنے دوسرے کی پسند کا۔ مقولہ یہ بھی ہے کہ پیٹ کا کیا ہے چاہے ڈھیلے پتھروں سے بھر لو مگر کپڑا ہو عزت کا۔

صاحبو! یہ ساری مستیاں اور یہ سارے قاعدہ اس واسطے ہیں کہ یاد نہیں ہے کہ ایک دن ہم یہاں نہ ہوں گے۔ اسی لیے مجھے تو عورتوں کا تقریبات میں جانا بھی مضر معلوم ہوتا ہے۔ خاص کر کپڑے بدل بدل کر جانا تو بہت ہی اوچھا پن ہے۔ بھلا اس کی کیا ضرورت ہے کہ بچوں کو بھی بڑھیا قیمتی کپڑے پہنائے جاتے ہیں چاہے وہ ان میں ہگ ہی دیں۔ پھر لڑکیوں کو زیور سے ایسا لادا جاتا ہے کہ سر سے پیر

تک زیور ہی زیور ہوتا ہے۔ پھر وہ نا سمجھ بچی ہے، تقریبات کے ہنگامہ میں بعض دفعہ وہ زیور کو نکال کر موقع بے موقع ڈال دیتی ہیں، پھر اس کی تلاش میں تکلیف الگ ہوتی ہے اور جی برے بھلے الگ ہوتے ہیں کیونکہ عورتوں میں بدگمانی کا بہت مادہ ہے فوراً کسی کا نام لے دیتی ہیں کہ یہ کام اس کا ہے اس لیے باہر پھرنے والی بچی کو جو کہ ناسمجھ بھی ہو زیور پہنانا بڑی غلطی ہے۔ مگر عورتوں کو اس کا خبط ہے اور غضب یہ کہ بچیوں کو بھی اس کا شوق ہوتا ہے۔ اگر ان کے ناک کان نہ بندھوائے جائیں تو روتی ہیں اور ضد کر کے بندھواتی ہیں چاہے تکلیف ہی ہو مگر خوشی خوشی اس کلفت کو گوارا کرتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو بھی اپنے مطلب کی عقل تو ہوتی ہے مگر اس کو خرچ کرتی ہیں دنیا میں، دین میں خرچ نہیں کرتیں۔

اسی لیے میں کہتا ہوں کہ عملاً بھی کوتاہی ہے اور حالاً تو بہت ہی کوتاہی ہے کیونکہ جب عمل نہیں تو حال کہاں سے آئے۔ حال اسے کہتے ہیں کہ کسی چیز کی طرف ایسا خیال جم جائے کہ وہی ہر دم خیال میں رہے۔ جس کو عارف جامی اس طرح بیان فرماتے ہیں:

بسکہ در جان فگار و چشم بیدارم توئی   ہر کہ پیدا می شود از دور پندارم توئی

(میری چشم و جاں میں تو ہی سمایا ہے جو کچھ دور سے ظاہر ہوتا ہے تجھ کو گمان کرتا ہوں)

اور اس کی ایسی مثال ہے جو عورتوں کے مناسب ہے کہ جس وقت ان کو کسی کے آنے کا انتظار ہوتا ہے تو ہر وقت دروازہ کی طرف دھیان رہتا ہے جہاں کسی کی آہٹ سنی اور یہی خیال ہوا کہ وہ آیا۔ سمجھو کہ خدا نے عمل میں یہ برکت رکھی ہے کہ اس سے آخرت کا شوق ہو جاتا ہے۔ جس سے ہر وقت اسی کا خیال رہتا ہے۔ اس کو حال کہتے ہیں حال کی دوسری مثال عورتوں کے لیے اور ہے یعنی تمبا کو کیونکہ عورتوں پر کچھ بلائیں تو قدرتی ہیں ناک میں اور کان میں اور ہاتھ گلے میں زیور اور ہار اور طوق وغیرہ مگر منہ کے اندر کا حصہ بچا ہوا تھا، اس میں کوئی زیور نہ تھا تو کیسے بچتا۔ اس کے لیے انہوں نے تمبا کو اور پان تجویز کیا ہے۔ جس سے پہلے پہل تو گھمیر ہوتی ہے پھر ایسی حالت ہو جاتی ہے کہ ذرا دیر ہو جائے تو اسی میں دھیان لگا رہتا ہے۔ ایسا شوق ہو جاتا ہے کہ نہ ملنے سے پریشانی ہوتی ہے۔

بس اسی درجہ طلب کا نام حال ہے۔ نیک اعمال سے بھی ایک کیفیت شوق کی پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے خدائے تعالیٰ کا تصور ہر دم خیال میں حاضر رہتا ہے۔ جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس سے کوئی گناہ ہو جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا منوں پیشاب، پاخانہ اس پر گر پڑا اور نیک کام کر لیا تو گویا سلطنت مل گئی۔ نیک اعمال میں یہ اثر ہے کہ اس سے معاصی سے نفرت اور آخرت کی رغبت ہو جاتی ہے۔ خاص کر اگر کسی بزرگ کی نظر بھی اس پر پڑ جائے کیونکہ

نہ کتابوں سے نہ وعظوں سے نہ زر سے پیدا　　دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

بزرگوں کی نظر کا اثر

حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سارے لکھے پڑھے نہ تھے بلکہ بعضے تو حیات تک میں بالکل بھولے بھالے تھے۔ چنانچہ فتوحات اسلامیہ میں ایک صحابی کا قصہ لکھا ہے کہ سفر میں کسی شہزادی پر نظر پڑگئی اور اس سے محبت ہوگئی۔ واپس آ کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے فلاں عورت سے محبت ہوگئی ہے آپ مجھ کو لکھ کر ایک یادداشت دیجئے کہ اگر ہم کو فتح ہوگئی تو وہ عورت مجھ کو دے دی جائے' آپ نے لکھ دیا۔ چنانچہ خلفاء کے وقت میں وہاں جہاد ہوا اور وہ لڑکی گرفتاری ہوئی' انہوں نے سالار لشکر کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تحریری وعدہ دکھلا دیا۔ انہوں نے اس کو ان کے حوالے کر دیا' پھر اس لڑکی کا بھائی آیا اور ان سے کہنے لگا کہ اس کو بیچتے ہو؟ کہا ہاں! بتلاؤ کیا لوگے؟ انہوں نے کہا کہ ایک ہزار روپے' وہ ایک ہزار روپے لے آیا' تو آپ نے کہا یہ تو تھوڑے سے ہیں' میں تو سمجھا تھا کہ ایک ہزار روپے اتنے ہوں گے کہ میرا گھر بھر جائے گا۔ اس نے سالار لشکر سے شکایت کی کہ بیع کے بعد انکار کرتے ہیں۔ سالار لشکر نے ان کو مجبور کیا کہ جب بیع کر چکے ہو تو اب تم کو رکھنے کا حق نہیں۔ چنانچہ دینا پڑا۔

ایک اور قصہ حدیث میں آیا ہے کہ ایک اعرابی نے نماز کے بعد دعا کی تھی:

اللھم ارحمنی و محمدًا ولاتشرک فی رحمتنا احدًا۔[1]

''اے اللہ! مجھ پر رحمت فرمائیے اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر اور ہماری اس رحمت میں کسی کو شریک نہ کیجئے۔'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لقد تحجرت واسعاً** ''کہ تو نے ایک وسیع چیز کو تنگ کر دیا۔''

اس کے بعد وہ نماز کی جگہ سے اٹھے اور مسجد کے صحن میں پیشاب کرنے لگے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے روکا اور مہ مہ کہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب اس کا پیشاب نہ روکو' اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ سبحان اللہ! کیسی حکمت کی بات ہے کہ اب اس کو پریشان کرنے میں ایک تو اس کے جسمانی ضرر کا اندیشہ ہے' دوسرے اگر وہ بھاگا تو نہ معلوم کہاں کہاں تک مسجد کو ناپاک کرے گا۔ ایسے وقت پر سب پہلوؤں کا پیش نظر رہنا بڑا ضروری ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ پیشاب کی جگہ ایک ڈول پانی کا بہادو۔ اس کے بعد اعرابی کو بلا کر بہت نرمی اور شفقت سے سمجھا دیا

---

[1] (سنن ابی داؤد: ۳۸۰' سنن النسائی ۳: ۲۴' المسند للامام احمد بن حنبل ۲: ۲۳۹' ۲۸۳)

کہ مسجد نماز اور ذکر اللہ کے لیے موضوع ہے اس میں پیشاب وغیرہ نہ کرنا چاہیے۔
یہ اعرابی کے ساتھ معاملہ تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اور تعلیم یافتہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ساتھ یہ معاملہ تھا کہ ایک بار دیوار مسجد پر کھنگار دیکھ کر غصہ سے آپ کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا۔
غرض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم لکھے پڑھے سب نہ تھے، بعضے ان میں ایسے بھولے تھے جن کے واقعات آپ نے ابھی سنے۔ مگر ساری اُمت سے وہ افضل ہیں۔ حتیٰ کہ حضرت غوث اعظمؒ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ افضل ہیں یا اویس قرنی وعمر بن عبدالعزیز۔ فرمایا حضرت معاویہؓ کے گھوڑے کی ناک میں جو غبار لگا ہو وہ بھی اویس قرنیؒ وعمر بن عبدالعزیزؒ سے افضل ہے تو ان کے افضل ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نظر کردہ تھے۔
پس عمل کے ساتھ اگر اہل اللہ کی نظر بھی مل جائے تو پھر وہ حال اور قوی ہو جاتا ہے اور جلدی کام بن جاتا ہے مگر ٹھنڈے رہ کر حال حاصل کرنا چاہو تو محال ہے بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ جیسے تم کسی آنے والے کے انتظار میں ہر وقت دروازہ پر نظر رکھتے ہو ویسے ہی آخرت کا دھیان ہر دم رہنا چاہیے۔ تب حال کا درجہ حاصل ہوگا کہ زیور پہننے میں، کپڑا پہننے میں، کپڑا رنگنے میں، کھانے پینے میں، غرض ہر کام میں آخرت ہی کا دھیان رہے گا کہ ایک دن وہ بھی ہوگا کہ ہم یہاں نہ ہوں گے اسی کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ ایک صحابی کو کہا اے عبداللہ! شام کو صبح کا خیال نہ کرو اور صبح کو شام کا خیال نہ باندھو اور اپنے کو میت شمار کرو اور سچ یہ ہے کہ بدون حال کے محض عمل قابل اطمینان نہیں۔ عمل بلا حال کی ایسی مثال ہے جیسے ریل گاڑی کو مزدور دھکیل کر لے جائیں اور حال کے ساتھ عمل کی ایسی مثال ہے جیسے انجن ریل گاڑی کو لے جائے۔ اسی لیے عراقی فرماتے ہیں:

صنمارہ قلندر سزوار بمن نمائی ۔۔۔ کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

(مجھ کو تو طریق عشق میں چلا کے نراز ہد خشک تو بہت دور دراز کا راستہ ہے)

رہ قلندر سے عمل مع الحال اور رسم پارسائی سے زہد خشک یعنے عمل بلا حال مراد ہے کہ اس سے کامیابی دیر میں ہوتی ہے اور غیر راسخ ہوتی ہے۔ اسی لیے مولانا فرماتے ہیں:

قال را بگذار مرد حال شو ۔۔۔ پیش مرد کاملے پامال شو

(قال کو چھوڑ و حال پیدا کرو، حال پیدا کرنے کے لیے کسی کامل کی جوتیاں سیدھی کرو)

تو اے صاحبو! باوجود یہ کہ ہر طرح سے ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ دنیا ختم ہونے والی ہے پھر بھی ہم اس مسئلہ میں عملاً وحالاً کچے ہیں۔ اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

مَاعِنۡدَ کُمۡ یَنۡفَدُوَ مَاعِنۡدَ اللّٰہِ بَاقٍ (النحل۹۶) ''جو تمہارے پاس ہے وہ ختم اور فنا ہو جائے گا''

خلاصہ بیان کا یہ ہے کہ دنیا کو فانی سمجھو عملاً بھی استحضاراً بھی اور اس کو ہر وقت یاد رکھو تاکہ درجہ حال حاصل ہو جائے۔ اعتقاد میں جو شخص پختہ ہوگا اور رسوخ حاصل کرلے گا اس کو اعمال صالحہ کی زیادہ توفیق ہوگی کیونکہ اصل مرض دنیا سے جی لگانا ہے اس کا علاج یہی ہے کہ فنائے دنیا کو سوچتا رہے اور دوسری اشیاء کے فناء کے استحضار میں اگر تکلیف ہو مگر اپنی موت کا استحضار تو کچھ مشکل نہیں۔ چاند سورج کے فنا کو کہاں تک سوچو گے، تم اپنی موت کو سوچا کرو۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اکثروا ذکر ھاذم اللذات یعنی الموت.[1]

طریق عمل علاج

پس علاج کا حاصل یہ ہے کہ روزانہ ایک وقت مقرر کر کے اس بات کو سوچ لیا کرو کہ اے نفس! ایک دن تو مرے گا اور دنیا سے تجھ کو جانا پڑے گا۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور اسی مضمون کے مناسب ایک قطعہ پڑھے دیتا ہوں۔ شاید اس کا مضمون معین استحضار ہو

کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے — خوب ملک روس ہے اور سرزمین طوس ہے
گر میسر ہو تو کیا عشرت سے کیجئے زندگی! — اس طرف آواز طبل ادھر صدائے کوس ہے
صبح سے تا شام چلتا ہے مئے گلگوں کا دور — شب ہوئی تو ماہر دیوں سے کنار و بوس ہے
سنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشا میں تجھے — چل دکھاؤں تو جو قید آز کا محبوس ہے
لے گئی یکبارگی گور غریباں کی طرف — جس جگہ جان تمنا سو طرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے — یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ و حشمت دنیا سے آج — کچھ بھی ان کیساتھ غیر از حسرت و افسوس ہے

یہ دارا و سکندر وہ تھے جو کبھی تمام دنیا پر حکومت کرتے تھے۔ آج ان میں اتنی بھی قوت نہیں کہ اپنی قبر پر پیشاب کرنے والے کو ہٹا دیں۔ اسی مضمون کا ایک اور قطعہ بھی ہے:

کل پاؤں ایک کاسہ سر پر جو گیا — یکسر وہ استخوان شکستہ سے چور تھا
بولا سنبھل کے چل تو ذرا راہ بے خبر — میں بھی کبھی کسی کا سر پر غرور تھا

---

[1] (سنن الترمذی:۲۳۰۷، سنن النسائی:۴:۴، سنن ابن ماجہ:۴۲۵۸، المسند للامام احمد بن حنبل ۲:۲۹۳)

یہ اشعار محض ترقیق قلب کے لیے پڑھ دیئے ہیں کیونکہ نظم سے رقت زیادہ ہوتی ہے اور وہ محفوظ بھی رہتی ہے ورنہ ہمارے لیے اصل چیز تو کلام اللہ وحدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

پس ہر رات کو اتنا سوچ لیا کرو کہ ایک دن ہم کو جانا ہے، موت آنے والی ہے۔ جب ہمیشہ اتنا نفس کو تنگ کرو گے تب نفس اعتدال پر آ جائے گا۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ ضروری تعلقات کو ترک کر دو بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان سے جی نہ لگاؤ، اس کا یہ اثر ہوگا کہ گو یہ چیزیں نفس سے چھوئیں گی نہیں مگر ان کی ہوس نہ رہے گی اور یہی ہوس ہے جس کا علاج ضروری ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام نے اسی کا علاج بہت اہتمام سے کیا ہے۔ حدیث کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طول امل اور حرص وہوس سے کس قدر روکا ہے اور اس کے ازالہ کی کس قدر تدابیر بتلائی ہیں۔

اب دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہماری غفلت وحرص کو دور فرمائیں اور آخرت کی رغبت اور دنیا سے زہد وبے رغبتی عطا فرمائیں اور ان مرحوم کی مغفرت فرمائیں جن کے واقعہ وفات پر یہ بیان ہوا ہے اور ان کے اعزہ وپسماندگان کو صبر وجمیل اور تیاری آخرت کی توفیق ہو۔ آمین!

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ
سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ.

الباقی

بچہ جب ماں کے پیٹ کے اندر ہوتا ہے تو اسی کو دنیا سمجھتا ہے جب باہر آتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ میں تو بڑی تنگ و تاریک جگہ میں مقید تھا۔ اصل دنیا تو یہ ہے۔ یہی حالت اس عالم کی ہے جب انسان اس دنیا سے اس دنیا میں پہنچے گا تو یہی محسوس کرے گا۔ یہاں سے وہاں جانے والا مرتا نہیں، فی الواقعہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہوتا ہے نہ صرف ایک عالم سے دوسرے عالم میں چلا جاتا ہے اگر آپ اس عالم کو دیکھ لیں تو آپ مرنے والے پر کبھی نہ روئیں گے بلکہ اپنے یہاں رہنے پر روئیں گے۔

فکر آخرت کے متعلق یہ وعظ تھانہ بھون میں مولانا سعید احمد صاحب کے انتقال پر عورتوں کی تسلی اور صبر کے لیے یکم رجب المرجب ۱۳۳۱ھ کو ہوا جس پر دو گھنٹے اور پانچ منٹ لگے۔ یہ وعظ حضرت نے اپنے مکان پر بیٹھ کر فرمایا جسے مولانا محمد عبداللہ صاحب گنگوہیؒ نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ. اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ. (النحل نمبر ۹۴)

ترجمہ: ''جو چیز تمہارے پاس ہے وہ ختم ہونے والی ہے اور جو چیز اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والی ہے اور جو لوگ ثابت قدم ہیں ہم ان کے اچھے کاموں کے عوض ان کا اجر ان کو ضرور دیں گے۔''

اعلان فنا کی ضرورت

یہ وہی آیت ہے جس کا جزو اول یعنی ماعندکم ینفد کل بیان ہو چکا ہے۔ دوسرا جز ماعند اللہ باق ''یعنی جو چیز اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والی ہے'' باقی تھا۔ اس کے بیان کرنے کا اس وقت قصد ہے۔ اس آیت میں دو باتوں کی اطلاع ہے ایک یہ کہ جو چیز تمہارے پاس ہے ختم ہونے والی ہے اور دوسرے یہ کہ جو چیز حق تعالیٰ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والی ہے۔ کل اول حصہ کا ذکر کیا گیا تھا اس کا مکرر بیان کرنا ضرورت نہیں اور نیز یہ بات بھی ہے کہ اس کا کوئی انکار بھی نہیں کرسکتا۔ رہا یہ شبہ کہ جب اس قدر ظاہر بات تھی تو اس کی کیوں خبر دی۔ بات یہ ہے کہ مقصود حق تعالیٰ کا یہ ہے کہ دنیا اور دنیا کی سب چیزیں دل سے اتر جائیں اور دل سے اتارنے کا طریقہ معتاد یہی ہے کہ اس شے کا کوئی عیب بیان کر دیا جائے لیکن جو شے محبوب ہوا کرتی ہے اس کا جو بھی عیب بیان کیا جائے محب اس کی تاویل کر دے گا اور محبت زائل نہ ہوگی جیسا متنبی کہتا ہے:

عذل العواذل حول قلبی التاء   وہوی الاحبۃ منہ فی سوداء

''یعنی ملامت گروں کی ملامت تو دل کے چاروں طرف رہتی ہے اور دوستوں کی محبت سوداء قلب میں ہے''

پس اگر حق تعالیٰ دنیا و مافیہا کے عیوب بیان فرماتے تو محبین دنیا اس میں ضرور گفتگو کرتے اور دنیا دل سے نہ اترتی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے تمام عیوب میں سے ایسا عیب بیان فرمایا کہ اس کا کوئی جواب ہی نہیں ہوسکتا۔ خلاصہ یہ ہوا کہ اے محبین دنیا! ہم نے مانا کہ دنیا حسین بھی ہے۔ ہر طرح کی اس میں راحت بھی ہے سب ہنر ہیں لیکن ایک عیب ایسا ہے کہ اس نے ان سب خوبیوں کو خاک میں ملا دیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ختم ہوجانے والی ہے' ایک وجہ تو اس خبر نفاد کی یہ ہوگی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کے سوا دوسرا عیب بیان کیا جاتا تو اس کا ہر شے میں مشترک ہونا ضروری نہ تھا بلکہ کسی شے میں کوئی عیب پایا جاتا کسی میں کوئی۔ ہر شے کے دل سے اتارنے کے لیے ایک مستقل عنوان تلاش کرنا پڑتا۔ مثلاً کسی شے کے لیے کہا جاتا کہ حسین نہیں ہے کسی شے کی نسبت کہا جاتا کہ یہ نقصان کرتی ہے وغیرہ ذالک۔ نیز بعض عیوب ان میں نظری ہوتے اور بعض بدیہی' پھر نظری محل کلام ہوتا تو باوجود عنوانات کثیر اور کلام کے طویل الذیل ہوجانے کے بھی احاطہ نہ ہوتا اور نہ مفید و مسکت (خاموش کرنے والا) اس قدر ہوتا۔ اس لیے یہ صفت ایسی بیان فرمائی کہ مشترک بھی اور بدیہی بھی اور دل سے اتارنے میں پوری مؤثر۔ سبحان اللہ! کیا جامع اور معجز کلام ہے۔ غرض باوجود اس صفت کے مسلم ہونے کے صرف دنیا کی محبت دل سے نکالنے کے لیے اس کی تصریح فرمائی۔

یہاں ممکن ہے کہ کوئی دہری یہ کہے کہ سماء اور ارض تو فنا ہونے والے نہیں۔ اس کا جواب اولاً تو یہ ہے کہ دلائل عقلیہ سے ان کا حدوث ثابت ہوچکا ہے۔ ثانیاً یہ کہ حق تعالیٰ نے اپنے کلام میں ہمارے امراض کا علاج فرمایا ہے۔ یعنی جن چیزوں سے ہم کو جبی تعلق ہے ان چیزوں کی مذمت سے اس تعلق جبی کو زائل فرمایا ہے اور سماء وارض سے ہمارا تعلق جبی نہیں۔

عبادت کرنے کی فطری دلیل

اگرچہ فی نفسہ بہت تعلق ہے کہ ہم اپنی بقاء میں زمین و آسمان وغیرہ سب اشیاء کے محتاج ہیں اور زمین و آسمان ہمارے محتاج نہیں۔ اگر آدمی نہ ہوتا تو کسی شے میں کچھ نقصان نہیں۔ چنانچہ ایک زمانہ ایسا گزر چکا ہے کہ آدمی نہ تھا اور آسمان و زمین' شجر و حجر و دیگر حیوانات سب کچھ تھے۔ چنانچہ جو کسی مذہب کے پابند نہیں وہ بھی اور جو مذہب کے متبع ہیں وہ بھی سب اس کو تسلیم کرتے ہیں لیکن ایسا کوئی زمانہ نہیں گزرا کہ انسان ہوا اور کوئی شے عالم میں سے نہ ہوا اور تمام عالم تو علیحدہ رہا اگر ایک شے بھی کم ہوجائے تو زندگی وبال ہوجائے گی۔ پس سب اشیاء کام کی ہیں اور انسان کسی کام کا

نظر نہیں آتا۔ یعنی انسان نہ ہو تو کسی شے میں خلل نہیں پڑتا اور اگر ان اشیاء میں سے ایک شے بھی نہ ہو تو انسان یا تو ہلاک یا کالہلاک (مثل ہلاک) ہو جائے گا اور نیز دیکھا جاتا ہے کہ ماورا (سوائے) انسان کے اور مخلوق آپس میں ایک دوسرے کی محتاج ہیں۔ یعنی ہر ایک محتاج بھی ہے اور محتاج الیہ بھی مگر یہ انسان صاحب محتاج الیہ نہیں محتاج ہی ہیں۔ جب یہ ہے تو تمام کائنات کے خلق کی اغراض سمجھ میں آتی ہیں مگر بشر کی کوئی حلت غائی مفہوم نہیں ہوئی کہ یہ کس مصرف کا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس کی تخلیق (نعوذ باللہ) عبث نہیں اور مخلوق کے کام کا ہے نہیں۔ پس لامحالہ خالق کے کام کا ہے اور خالق کے کام کا ہونے کے یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی کام کرے۔ اللہ تعالیٰ تو سب سے غنی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس لیے بنایا ہے کہ مخلوق کا مخدوم اور ہمارا خادم ہو۔ افسوس ہے کہ ہم لوگوں نے ایسا قلب موضوع کیا ہے کہ خالق کو چھوڑ کر مخلوق کے خادم ہو گئے۔ چنانچہ کوئی مال کا خادم ہے کوئی اولاد کا' کوئی عمارت کا' کوئی باغ کا' کوئی بیلوں کا اور اس کا نام رکھا ہے کھانا کمانا۔ ہاں ایک معنی کہ کمانا ہے جیسے بھنگی کماتا ہے اسی طرح ہم کماتے ہیں' گویا بھنگی ہو گئے۔ حق تعالیٰ نے اس کو وزارت عطا فرمائی تھی' اپنا نائب بنایا تھا۔ اس نے اس سے اعراض کیا اور سائیسی اختیار کی۔ کتنی بدقسمتی کی بات ہے یہ ساری دنیا کا مخدوم ہوتا اس نے خود ہی ہر شے کی خدمت میں اپنے اوقات ضائع کیے۔ پس ثابت ہوا کہ انسان خدا کے لیے پیدا ہوا ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ کے نفع کے لیے نہیں بلکہ اس لیے کہ حق تعالیٰ کی خدمت وعبادت کر کے خود منتفع ہو۔

یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ مقصود سابق یہ ہے کہ گویا بقا میں سب کا محتاج ہو مگر اس کو آسمان و زمین سے خاص کوئی ایسی محبت نہیں جیسے دوسری استعمال کی چیزوں سے اور ان چیزوں کا فانی ہونا ظاہر ہے۔ پس اگر آسمان و زمین کا فناء اس آیت میں مذکور نہ بھی ہو تو آیت کے اصل مقصود میں کوئی خلل نہیں آتا اور عجب نہیں کہ عند کم یعنی تمہارے پاس چیزیں سے مراد یہی ہماری محبوب چیزیں ہوں' غرض یہ کہ قرآن شریف ایک طب روحانی ہے اور طب میں مرض وصحت کی حیثیت سے بحث ہوتی ہے۔ پس جن چیزوں سے ہمارا تعلق ہے اور ان کا فنا ہونا مشاہد ہے اس لیے ینفد ''ختم ہو جائے گی'' میں یہی اشیاء داخل ہوں گی اور زمین و آسمان سے کچھ بحث نہ ہوگی۔ پس اگر آسمان و زمین قدیم بھی ہوتے تو ہمارے مدعائے مقام کو مضر نہ تھا لیکن دوسرے دلائل سے ان کا حدوث وفنا بھی ثابت ہے۔ انسان کی دلچسپی گھر سے' جائیداد سے' اولاد وغیرہ سے ہوتی ہے اس لیے یہی چیزیں مراد لی جائیں۔ چنانچہ دوسرے مقام پر حق تعالیٰ نے ان اشیاء کی ایک ہی جگہ

فہرست بھی بیان فرمائی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

قُلْ اِنْ كَانَ آبَآءُ كُمْ وَاَبْنَآءُ كُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِىَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفَاسِقِيْنَ. (التوبہ آیت نمبر ۲۴)

"یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ فرمادیجئے کہ اگر تمہارے باپ دادے اور تمہارے بیٹے پوتے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیبیاں اور تمہارا کنبہ اور جو مال تم نے کمائے ہیں اور سوداگری جسکے مندا پڑ جانے کا تم کو اندیشہ ہے اور مکانات جنکو تم پسند کرتے ہو یہ چیزیں تم کو اللہ و رسولؐ سے اور اسکے راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیاری ہیں تو منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیجے اور اللہ نافرمانوں کو ہدایت نہیں دیتے۔" (التوبہ ۲۴) اور دوسرے مقام پر بعض اشیاء کیلئے ارشاد ہے۔

اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ.[۱]

"یعنی کیا تم بناتے ہو ہر اونچی جگہ پر ایک نشان کہ کھیلتے ہو اور تیار کرتے ہو مضبوط محل شاید تم ہمیشہ رہو گے۔"

واقعی آدمی ایسے مکانات بناتا ہے اور ان کو ایسا مستحکم کرتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ کے لیے یہاں ہی رہے گا اور ہنسی خوشی رہتے ہیں۔ کبھی اس کا خیال بھی تو نہیں آتا کہ یہاں سے جانا ہے۔ کیا خوب کسی نے کہا ہے:

الایاساکن القصر المعلیٰ — ستدفن عن قریب فی التراب
له ملک ینادی کل یوم — لدوا للموت وابنوا للخراب
قلیل عمر نادار و دنیا — ومرجعنا الی بیت التراب

"یعنی آگاہ رہ اے بلند محل کے رہنے والے کہ تو عنقریب مٹی میں دفن کیا جائے گا۔ اس کے لیے ایک فرشتہ ہے جو ہر دن منادی کرتا ہے کہ مرنے کے لیے جیتے رہو اور ویران ہونے کے لیے مکان بناتے رہو ہماری عمر دنیا میں بہت تھوڑی ہے اور ہم سب کا مرجع مٹی کا گھر ہے۔"

مولود کے کان میں اذان کہنے کا نکتہ

بعض اہل لطائف نے لکھا ہے کہ مولود کے کان میں جو اذان کہی جاتی ہے اس میں ایک

نکتہ۔ اشارہ اس طرف ہے کہ اس کو سنا رہے ہیں کہ اذان تکبیر ہوگئی ہے۔ اب جنازہ کی نماز کے منتظر رہو اور یہ بھی حکمت ہے کہ اذان وتکبیر میں اللہ کا نام ہے تو شروع ہی سے اس کے کان میں اللہ کا نام اس لیے لیا جاتا ہے تاکہ استعداد ایمان کی قوی ہو جائے اور شیطان اس سے دور ہو جائے اور دونوں حکمتوں میں گویا اشارہ ہے اس طرف کہ دنیا میں غافل ہو کر نہ رہنا مگر ہم لوگوں کی غفلت کا کیا ٹھکانہ ہے۔ اس پر بھی تنبیہ نہیں ہے۔

ارباب بصیرت کی ہنسی

جن لوگوں کی آنکھیں کھل گئی ہیں وہ ان سب چیزوں کو ہیچ سمجھتے ہیں بلکہ اپنے کو بھی انہوں نے ایسا مٹا دیا ہے کہ زندہ نہیں سمجھتے مردہ شمار کرتے ہیں۔ اسی واسطے ایک بزرگ اپنے بچوں کو کہا کرتے تھے' افسوس! یہ یتیم ہو گئے ہیں۔ ہمارے خیالات ہمارے مکانات دیکھ کر اہل نظر ہنستے ہیں اور ان مکانات کی خرابی ان کو بننے سے پہلے نظر آ رہی ہے۔

جیسے چند لونڈیاں جمع ہو کر ریت جمع کر کے کھیلنے کے لیے گھر بنا دیں۔ پھر ایک اس کو توڑ دیتی ہے۔ دوسری اس سے لڑتی ہے کہ تو نے ہمارا گھر توڑ دیا' ہم کو ان لونڈیوں پر ہنسی آتی ہے۔ اور کہتے ہیں یہ بھی کوئی مکان ہے جس کے توڑنے سے لڑائی ہوئی۔ اسی طرح اللہ والے ہمارے پختہ مکانات اور ان مکانات پر ہمارے لڑائی جھگڑے دیکھ کر ہنستے ہیں اور ان کی خرابیوں کو لڑکیوں کے ریت کے گھر کی طرح مشاہدہ کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ خود دیکھ لیں کہ بڑے بڑے مکانات اجڑے پڑے ہیں۔ ان کے رہنے والوں کے دماغوں میں کیا کیا تمنائیں ہوں گی اور کیسی کیسی تمنائیں ہوں گی مگر وہ سب آرزوئیں خاک میں مل گئیں۔

جیسے شیخ چلی کی حکایت ہے کہ کہیں جا رہے تھے' کسی شخص نے کہا کہ یہ گھڑا تیل کا اٹھا لو' تجھ کو ایک پیسہ ملے گا۔ شیخ چلی نے وہ گھڑا اٹھا لیا' اب چلتے چلتے آپ دل میں سوچتے جاتے ہیں کہ ایک پیسہ جو یہ ملے گا اس کا ایک بیضہ خریدوں گا' پھر اس کو بیچوں گا اور ان پیسوں کے اور انڈے خریدوں گا۔ اسی طرح جب بہت سے پیسے ہو جائیں گے تو ان کی مرغی خریدوں گا۔ جب مرغیاں بہت ہو جائیں گی تو بکریاں خریدوں گا اور بکریوں سے گائیں خریدوں گا اور گائیں سے بھینسیں' گھوڑے ہاتھی خریدوں گا' پھر بڑا عالیشان مکان بنواؤں گا اور ایک وزیر زادی سے نکاح کروں گا' بچے ہوں گے' وہ بچے کہیں گے ابا! ابا! ہم کو پیسے دے دو۔ میں ان کو دھمکا کر کہوں گا' دور ہو جاؤ' یہ لفظ کہتے ہی

سرکوحرکت ہوئی اور سر پر سے تیل کا گھڑا گر پڑا اور تمام تیل ضائع ہوگیا۔ وہ شخص ملامت کرنے لگا تو آپ کہتے ہیں بندہ خدا! تمہارا تو ایک گھڑا ہی تیل کا ضائع ہوا اور میرا تو کنبہ جاتا رہا۔

ہم کو شیخ چلی کے خیالات باطلہ پر ہنسی آتی ہے اور اگر غور کر کے دیکھا جائے تو ہم میں ہر ایک شیخ چلی ہے۔ رات دن ہوس کیا کرتے ہیں کہ کیسا اچھا ہو کہ ہماری شادی ہو جائے۔ شادی بھی ہوگئی تو اب ہوس ہے اولاد ہو جائے' اولاد ہوگئی تو اولاد کی اولاد کی تمنا ہوتی ہے۔ اسی میں موت آ جاتی ہے اور تمنا باقی رہتی ہے۔

وما قضی احد منها البانته یاینتهی رب الا الیٰ ارب

''کسی ایک کی بھی تمنا پوری نہیں ہوتی اگر ایک تمنا پوری ہوتی ہے تو دوسری شروع ہو جاتی ہے''

دین داروں کی خود فریبی

یہ تو ان کا حال ہے جن کو دین کی کچھ پرواہ نہیں اور جو دین دار کہلاتے ہیں اور جن کو آخرت کی کچھ فکر ہے وہ اس وعدہ میں ہیں کہ فلاں کام کر لیں' اس کے بعد سب ترک کر کے اللہ اللہ کریں گے۔

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم باز چوں فرداشود امروز را فردا کنم

''ہر رات ہم یہی کہتے ہیں کہ کل کو یہ خیال ترک کر دیں گے اور ذکر اللہ میں مشغول ہو جائیں گے۔ پھر کل آتی ہے تو یہی کہتے ہیں کہ کل کو ترک کر دیں گے۔ اسی طرح ساری عمر ختم ہو جاتی ہے۔''

جب موت آ جاتی ہے تو وہ حالت ہوتی ہے جس کی حکایت خود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَکُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ. (المنفقون آیت نمبر۱۰)

''یعنی جب موت آئے گی تو کہے گا اے میرے رب! تھوڑی سی مدت کے واسطے مجھ کو مہلت مل جاتی تو میں خیر خیرات کر لیتا اور نیک کاروں میں سے ہوتا۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَلَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰہُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُھَا. (المنفقون آیت نمبر۱۱)

''اور اللہ تعالیٰ کسی جان کو مہلت نہیں دیں گے جب اس کی میعاد آ جائے گی۔''

یعنی خواہ وہ نبی ہو یا ولی ہو جب میعاد ختم ہو جائے گی مہلت نہ ملے گی۔ اس وقت تمنا کرے گا کہ اگر میرے پاس دنیا کے تمام خزانے ہوں تو وہ دے کر بھی ایک دن مجھ کو مل جائے تو میں دے کر لے لوں لیکن ممکن نہ ہوگا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام سے زیادہ کون ہے۔ مسجد اقصیٰ کی تعمیر کرا رہے تھے کہ پیغام موت

آ گیا' عرض کیا کہ اے اللہ! مجھ کو اس قدر مہلت مل جائے کہ مسجد بنوالوں۔ بعد میں یہ ناتمام ہی رہ جائے گی۔ حکم ہوا کہ مہلت تو نہیں مل سکتی باقی مسجد بن جائے گی۔ تم اپنی لاٹھی پر سہارا لگا کر کھڑے ہو جاؤ۔ چنانچہ لاٹھی پر سہارا لگا کر کھڑے ہو گئے اور روح قبض ہو گئی اور اسی طرح کھڑے رہے۔ جنوں نے یہ سمجھا کہ حضرت کھڑے ہیں' برابر کام مسجد کا ہوتا رہا حتیٰ کہ مسجد پوری ہو گئی۔ برس روز میں اس لاٹھی کو کیڑے نے کھالیا تو گر پڑے۔ اس وقت حساب کرنے سے معلوم ہوا کہ برس روز سے مردہ کھڑے تھے۔

دیکھئے! سلیمان علیہ السلام نبی اور کام مسجد کا بنوانا اس کے لیے بھی مہلت نہ ہوئی تو اگر یہی انتظار کرتے رہو گے کہ جب کام سے فارغ ہوں گے اس وقت متوجہ الی اللہ ہوں گے تو یاد رکھو ایسا وقت ہرگز نہ ملے گا۔ اس کا طریقہ تو یہی ہے کہ اس کو درمیان میں سے قطع کر دیا جائے۔ ہم کو تو وہ دن دور نظر آتا ہے اور واقع میں بہت قریب ہے۔

دیکھو! باپ دادا کہاں گئے اور بعض جگہ بیٹے پوتے بھی سامنے ہی چل دیتے ہیں اور اگر ہمارے مرنے کے بعد ہی اولاد ہماری مرے تب بھی لاحاصل ہے۔ اس لیے کہ جب خود مرے تو ہماری تمناؤں پر مرنے کے ساتھ ہی پانی پھر گیا۔ لوگ اولاد کی تمنا اس لیے کرتے ہیں کہ نام ہو۔ نام کی حقیقت یہ ہے کہ باپ دادے تک تو سب کو یاد رہتا ہے کہ یہ شخص فلاں کا بیٹا فلاں کا پوتا ہے اور آگے پردادا انگردادا کا نام پوچھو تو خود اولاد کو بھی معلوم نہیں۔ یہ دنیا کچھ نہیں سب خیالات اور امنگیں ہیں اور درحقیقت کوئی شے نہیں۔ ایک تذکرہ میں مردوں کی لڑائی لکھی ہے۔ مردوں میں لڑائی کبھی نہ سنی ہو گی مگر اس سے معلوم ہو گا۔ ایک گورستان میں ایک قبر پر لکھا تھا کہ میں اس شخص کا بیٹا ہوں کہ جس کے قبضہ میں ہوا تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ سلیمان علیہ السلام کی اولاد میں سے ہے۔ دوسری قبر پر لکھا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کا بیٹا نہیں بلکہ ایک لوہار کا بیٹا ہے جس کے یہاں دھونکنی ہوتی ہے۔ خیر یہ تو ایک لطیفہ ہے باقی جن کے قبضہ میں ہوا تھی یعنی سلیمان علیہ السلام وہ بھی آج نہیں ہیں۔

نہ برباد رفتی سحرگاہ و شام سریر سلیمان علیہ السلام
بآخر نہ بینی کہ برباد رفت خنک آنکہ باعدل وباد او رفت

''سلیمان علیہ السلام کا تخت صبح وشام ہوا پر چلتا رہا۔ آخر کار تم نے دیکھ لیا کہ فنا ہو گیا وہ شخص خوش نصیب کہ عدل وانصاف کے ساتھ دنیا سے سدھارا۔''

اور اگر اولاد بھی ہوئی اور چلی بھی' وہ بھی آخر ایک روز ختم ہو جائے گی۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے بڑے بڑے عشیرے اور خاندان ختم ہو گئے۔ بڑا با اقبال وہ دنیا میں سمجھا جاتا ہے کہ جس کی عمر بڑی ہو

حالانکہ جس کی عمر بڑی ہو اس کو اور زیادہ مصیبت ہے اس لیے کہ اس کے سامنے جوان جوان عزیز مریں گے۔ اسے روئے گا اس کو روئے گا مگر یہ مصیبت ان کے اعتبار سے ہے جن کو دنیا سے تعلق ہے۔

اہل اللہ کی عدم پریشانی

جو اللہ والے ہیں ان کو کوئی چیز پریشان نہیں کرتی۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ ان کو رنج نہیں ہوتا۔ رنج طبعی تو ضرور ہوتا ہے لیکن اس رنج میں حدود سے باہر نہیں ہوتے۔ کوئی کلمہ خلاف ادب شکایت کا ان کے منہ نہیں نکلتا اور دل ان کا ہر حال میں خوش ہے۔

بظاہر شبہ پڑتا ہے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ رنج بھی ہو اور خوشی بھی۔ میں اس کو ایک مثال کی ضمن میں سمجھاتا ہوں۔ ایک شخص ہے اس کے دمبل نکل رہا ہے اور اس کو سخت تکلیف ہے۔ طبیب نے تجویز کیا کہ اس کو جب تک شگاف نہ دلاؤ گے یہ مادہ قطع نہ ہوگا۔ چنانچہ جراح کو بلایا گیا اور خوشی خوشی اس کو اجازت دی گئی کہ نشتر سے اس کو کاٹ دو۔ جراح اس کو شگاف دے رہا ہے اور تکلیف ہو رہی ہے لیکن دل خوش ہے کہ اب آرام ہو جائے گا اور اگر درمیان میں وہ نشتر ہٹا لے یا حیلہ کر کے کہیں چلا جائے تو کہتے ہیں کہ نشتر کیوں ہٹا لیا۔ میری تکلیف اور خوف کی وجہ سے تم اپنا کام نہ چھوڑو مجھ کو ڈرنے دو آرام تو ہو جائے گا۔

بعینہ یہی مثال اہل اللہ کی مصیبت دنیوی کے ساتھ ہے کہ تکلیف بھی ہے اور رنج طبعی بھی ہے لیکن دل راضی ہے کہ جو کچھ محبوب حقیقی نے ہمارے لیے تجویز فرمایا ہے عین مصلحت و حکمت ہے۔

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش　　　　کہ آنچہ ساقی ما ریخت عین الطاف ست

"رنج و راحت، قبض و بست تجویز کرنے کا تم کو کوئی حق نہیں ہے جو کچھ بھی محبوب حقیقی کی طرف سے عطا ہو جائے وہی مصلحت کے موافق اور وہی عین لطف ہے۔"

اور وجہ اس فرق کی اہل اللہ و اہل الدنیا میں یہ ہے کہ اہل اللہ خدا کو خدا سمجھتے ہیں (نعوذ باللہ) رشتہ دار نہیں سمجھتے اور اہل الدنیا کے برتاؤ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کو اپنا مقروض یا رشتہ دار جانتے ہیں۔ ارمان اور حسرتیں کرنا یہ خدا سے لڑائی کرنا ہے لیکن چونکہ ہم لوگ مبتلائے دنیا و غفلت ہیں اس لیے اس پر مواخذہ نہیں ہوتا لیکن بے ادبی اور گستاخی اور گنوارپن ہونے میں شک نہیں ہے، بہت سے گنوار ایسے ہوتے ہیں کہ حکام کے سامنے بہت واہیات بک دیتے ہیں اور حکام بوجہ ان کے کم سمجھ ہونے کے مسامحت (چشم پوشی) کرتے ہیں مگر عقلاً تو اس کو بے تمیزی ہی سمجھیں گے۔

عورتوں کی دریدہ دہنی

چنانچہ اس پر ایک حکایت یاد آئی۔ ایک تحصیلدار کے یہاں ایک گنوار اور اس کے ساتھ ایک لڑکا آیا۔ تحصیلدار نے پوچھا کہ ارے یہ لڑکا کیا تیرا ہے؟ کہا کہ ہجور میرا کدھیلڑا ہے۔ تحصیلدار نے کہا کدھیلڑا کس کو کہتے ہیں، آپ فرماتے ہیں کہ کدھیلڑا سے کہیں کہ جیسے تیرا باپو (باپ) مر جائے اور تیری ماں مجھے کرے (یعنی مجھ سے نکاح کرے) اور (توں) تو اس کی گیلون (ہمراہ) آئے تو توں (تو) میرا کدھیلڑا ہوا۔ تحصیلدار سن کر چپ ہو گیا۔

اسی طرح یہ عورتیں بڑی بدتمیز ہیں۔ ان کے منہ سے اکثر ایسے کلمات نکلتے ہیں اگر کبھی میں ٹوک دیتا ہوں تو یہ جواب دیتی ہیں کہ یہ بات تو ہمارے ذہن میں بھی نہیں آئی کہ یہ بے ادبی ہے۔ یہ صحیح ہے اور اسی واسطے امید عفو ہے لیکن گنوار پن اور بے ادبی سے تو خالی نہیں، مجھ کو تو ایسے کلمات سن کر بہت نفرت اور خوف ہوتا ہے اور دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے کہ یہ کوئی بات نہیں پھر اگر تعلیم کرو اور بتادو تو کچھ اثر نہیں اور بات بنانے بیٹھ جاتی ہیں۔

یہ بات اللہ والوں کو پسند نہیں ہوتی ہے خواہ کیسی ہی تکلیف ان کو پہنچے ہر حال میں وہ صابر و شاکر و راضی ہیں۔ حضرت ابراہیم جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جگر گوشہ کا انتقال ہوا تو حضور کی حالت یہ تھی کہ آنسو جاری تھے اور یہ فرماتے تھے:

انا بفراقک یا ابراھیم لمحزونون۔[1]

''یعنی اے ابراہیم! تیری جدائی سے ہم غمگین ہیں۔'' یہ نہیں فرمایا اس کی عمر ہی کیا ہوئی ہے ابھی دیکھا ہی کیا تھا، لو جی بڑھاپے میں یہ صدمہ پہنچا۔ ان کلمات کا کھلا مطلب یہ ہے کہ یہ واقعہ نامناسب ہوا تو گویا اللہ تعالیٰ نے نعوذ باللہ نامناسب کام کیا اور پھر حیرت ہے کہ جو ان میں جاننے والی ہیں وہ بھی تو نہیں ٹوکتی ہیں۔ اس واسطے بھی تو میں عورتوں کے جمع ہونے کو پسند نہیں کرتا، یہ ساری خرابیاں ان کے جمع ہونے سے ہوتی ہے۔ دیکھو! اگر تمہارے سامنے تمہارے باپ کو کوئی برا بھلا کہنے لگے تو کیا ناگوار نہ ہوگا۔ ایسے ہی تم کو بھی غیرت ہونا چاہیے اگر دوسری کوئی بدتمیزی کرے تو جاننے والی کو چاہیے کہ اس کو دھمکا دے کہ خبردار! کیا بکتی ہے۔ پھر ایسا کلمہ زبان سے نہ کہنا۔

اور وجہ اور منشاء ان تمام گستاخانہ کلمات کا یہ ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہوتی تو ہرگز یہ کلمات نہ نکلتے۔ دیکھو اگر پیارا بیٹا کوئی شے تلف کردے تو تم کو کچھ پرواہ نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ سے اگر محبت

---

[1] (ذکرہ ابن ابی شیبۃ فی المصنف بلفظ "انا بک لمحزونون" ۳:۳۹۳)

ہوتی اور قلب میں اس کی عظمت ہوتی تو کہتی کہ ایسے ایسے ہزار بیٹے بھی قربان ہیں اور دلیل اس کی یہ ہے کہ دیکھو اگر کسی عورت کا کوئی بیٹا روپیہ کھودے اور وہ عورت اس بچہ کو مارے کوٹے تو یوں کہا جاتا ہے کہ کیسی سنگدل ہے اس کو روپیہ سے زیادہ محبت ہے اولاد سے نہیں ہے۔ اسی طرح یہاں بھی سمجھو ان کلمات سے معلوم ہوتا ہے کہ تم کو اولاد اور عزیزوں سے زیادہ محبت ہے' حق تعالیٰ سے نہیں۔

ایک عورت تھی اس کے باپ بھائی بیٹے جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ جہاد میں گئے تھے۔ جب اس جہاد سے واپسی ہوئی تو وہ عورت مدینہ طیبہ سے باہر خبر لینے کیلئے آئی۔ کسی نے کہا کہ تمہارے باپ' بھائی وغیرہ سب شہید ہوگئے تو وہ بیتاب ہوکر پوچھتی ہے کہ مجھے یہ بتادو کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی زندہ ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ ہاں وہ تو زندہ ہیں' کہا کہ پھر تو کچھ پرواہ نہیں۔

اور پیغمبروں سے بھی زائد اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ اللہ تعالیٰ سے تو اس سے بھی زائد محبت ہونا چاہیے مگر افسوس ہے کہ محبت نہیں ہے۔ اگر محبت ہوتی تو یہ کلمات زبان سے تو کیا دل میں بھی نہ آتے۔ جیسے نشتر لگنے میں نشتر زن کی کوئی یہ شکایت نہیں کرتا کہ میاں تو کیسا آدمی ہے۔ میرے بدن میں اتنا لہو اور پیپ نکال دیا۔ اگر کہے گا تو معلوم ہوگا کہ نشتر سے راضی نہیں ہے۔

بعض عورتیں کہتی ہیں کہ صاحب! یہ تو بزرگوں کی باتیں ہیں' ہم تو دنیادار ہیں' میں کہتا ہوں کہ تم کو بزرگ بننے سے کس نے منع کیا ہے تم بھی بزرگ بن جاؤ۔ تم دنیادار کیوں بنو روح کو غذا دو ایسی ہی بن جاؤں گی' روح کو غذا اللہ کا نام لینا' خدا تعالیٰ کی نعمتوں کو سوچنا' موت کو یاد کرنا ہے۔ یہ غذائیں کھاؤ پھر دیکھو دو ہی ہفتہ میں کہاں سے کہاں پہنچو گی۔ تم تو ہر وقت دنیا ہی کے قصے سوچتی ہو جیسے جوہڑے میں رہنے والا مینڈک ہمیشہ جوہڑا ہی کھاتا ہے اس کو کیا خبر ہے کہ سمندر کیا چیز ہے۔ ساری عمر دنیا ہی کے دھندوں میں کٹ گئی ہے اگر کوئی نصیحت کرتا ہے تو اس کے مقابلہ کے لیے مستعد ہیں جیسے اس مینڈک کو اگر کوئی صاف پانی سے دھودے اور وہ غل مچائے۔

ایک بھنگی کا عطاروں کے محلّہ میں گزر ہوا۔ خوشبو جو اس کے دماغ میں آئی بیہوش ہوگیا۔ اس نے خوشبو کب سونگھی تھی' ساری عمر تو گوہ میں بسر ہوئی تھی' کسی نے اس کو لخلخہ سونگھایا کسی نے عطر اس کے دماغ کو لگایا وہ اور زیادہ بیہوش ہوگیا۔ یہی تدبیریں کر رہے تھے کہ اس کا بھائی آ گیا' اس نے جو دیکھا تو سب کو منع کیا کہ ان تدبیروں سے ہوش میں نہ آئے گا' میں اس کا علاج کروں گا' کہیں سے ایک ٹھیکرے میں گوہ لایا اور اس کی ناک کو لگایا' فوراً ہوش آ گیا۔ اسی طرح گوہ کھاتے کھاتے دنیا داروں کی حالت ہوگئی۔ پھر یہ باتیں خوشبو کی ان کو کہاں پسند آئیں۔

دنیا کی محبت کی حقیقت

دنیا کی محبت کی گندگی ایسی بری شے ہے کہ دنیا داروں میں رہ کر دیندار بھی بگڑ جاتے ہیں۔ میری رائے تو یہ ہے کہ جہاں یہ عورتیں جمع ہوں ان کی باتیں مت سنو ورنہ دو صورتیں ہیں۔ اگر تم نے ان پر نفرت ظاہر کی تو خواہ مخواہ تو تو میں میں ہوگی اور اگر سنتے رہے اور سکوت کرتے رہے تو ان دیندار صاحب کا بھی مزاج بگڑ جائے گا اور ویسا ہی دماغ ہو جائے گا۔

اس پر مجھ کو ایک حکایت یاد آئی۔ ایک عطر فروش کی لڑکی چمڑہ فروشوں کے یہاں بیاہی گئی تھی۔ وہ بے چاری عطر خانہ سے نکلی تھی، چمڑہ کی بو کی اس کو کب سہار تھی اس لیے خاموش ایک جگہ اپنے کو گھوٹ کر بیٹھی رہا کرتی۔ رہتے رہتے اس بدبو کی سہار بھی ہونے لگی۔ ساس نے ایک روز کہا کہ یہ بہو بھی کسی کام کی نہیں ہر وقت بیٹھی ہی رہتی ہے تو بہو کیا کہتی ہے کہ میں ایسے کام کی ہوں کہ جب سے میں آئی ہوں تمہارے گھر کی بدبو تک جاتی رہی۔

تو بات کیا تھی کہ بدبو نہ گئی تھی بلکہ اس کو عادت پڑ گئی تھی۔ اسی طرح گندوں میں اچھے آدمی کا مزاج بھی گندہ ہو جاتا ہے اس لیے اے بیبیو! اس گندگی سے نکلو، دوسری طرف آؤ تو تم کو عادت پڑے گی خوشبو کی۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ ہم گندگی میں تھے اور اس وقت تم کو اس خوشبو کا احساس نہیں ہے۔ اگر خوشبو کا احساس ہوتا تو یہ شکایتیں اور حکایتیں اور ارمان اور حسرتیں نہ ہوتیں۔ اگر کوئی کہے کہ زبان کو ہم نے روک لیا لیکن دل میں ہمارے یہ باتیں آتی ہی ہیں، ہم اس کو کس طرح خالی کریں۔ بات یہ ہے کہ یہ باتیں دل میں جب ہی تک آئیں گی جب تک دل میں کوئی اور شے نہیں ہے۔ بوتل جب تک خالی ہے اس میں ہوا بھری رہے گی اگر تم اس کو ہوا سے خالی کرنا چاہو تو اس کی ترکیب بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ اس میں پانی بھر دو۔ ایک قطرہ پانی ڈالو گے تو اتنی ہی ہوا نکل جائے گی حتیٰ کہ اگر بھر دو گے تو ہوا بالکل نکل جائے گی، تم بھی دل کو اللہ کے ماء الحیات سے بھر دو تو یہ چیزیں تمہارے پاس بھی نہ پھٹکیں گی۔

اس کا طریقہ یہ ہے کہ جب تمہارے دل میں یہ حسرتیں اور ارمان آئیں تو فوراً یاد کرو کہ اللہ تعالیٰ بڑے رحیم و کریم ہیں جب انہوں نے میرے لیے یہ تجویز کیا ہے تو بس اسی میں خیر ہے۔ دیکھو! حضرت خضر علیہ السلام نے لڑکے کو مار ڈالا ماں باپ کے لیے یہ رحمت ہوئی۔

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں مرنے والا اگر زندہ ہوتا تو یوں ترقی ہوتی۔ لوگوں کو اس سے فیض ہوتا۔ یہ سب حسرتیں ہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ فیض ہی ہوتا۔ خدا جانے آگے چل کر وہ کیسا ہوتا۔ پچاس پچاس

برس کی عمر کے لوگ ہم دیکھتے ہیں کہ بددین ہوجاتے ہیں۔ طریق حق پر رہ کر موت آ جانا بڑی نعمت ہے۔

حب اللہ کی ضرورت

بعض لوگ یہ مضامین سن کر کہہ دیتے ہیں کہ بس جی پھر کسی شے کی بھی محبت نہ ہونا چاہیے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کسی شے کی محبت نہ ہونا چاہیے میں یوں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت سب چیزوں کی محبت پر غالب رہنی چاہیے۔ اسی واسطے "اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِنَ اللّٰهِ" (التوبہ: ۲۴) (زیادہ پیاری ہیں تم کو اللہ تعالیٰ سے) فرمایا ہے۔ محبوبہ نہیں فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ زیادہ محبت ہونا چاہیے۔ اور یہ مطلب نہیں کہ کسی شے کی محبت نہ ہو جس کا ایک پیسہ کھویا جائے اس کو رنج تو ہوگا اور اس سے یہ معلوم ہوگا کہ محبت اس پیسہ کی تھی لیکن وہ محبت اس لیے دب گئی کہ جس نے کھویا ہے وہ اس سے زیادہ محبوب ہے اس لیے کچھ پرواہ نہیں۔

دیکھو جب آفتاب نکلتا ہے تو ستارے معدوم نہیں ہوتے بلکہ رہتے ہیں مگر نور آفتاب کا ایسا غالب ہوتا ہے کہ کچھ احساس نہیں ہوتا۔ اسی طرح جب آفتاب عشق الٰہی طلوع ہوتا ہے تو اس کے سامنے سب محبتیں مثل ستاروں کے کالعدم ہوجاتی ہیں لیکن واقع میں ہر محبت کا وجود ہوتا ہے بلکہ اللہ والوں کو تم سے بھی زیادہ محبت ان چیزوں سے ہوتی ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر کسی کو تکلیف ہوتی ہے تو ان کو زیادہ بے چینی ہوتی ہے۔ اسکی تکلیف سے کڑھتے ہیں اس لیے کہ یہ حضرت رحیم القلب اور رقیق القلب زیادہ ہوتے ہیں اس لیے کسی کی تکلیف ان سے دیکھی نہیں جاتی۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ پڑھ رہے تھے کہ حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہما بچے تھے آئے حضورؐ نے خطبہ کو قطع فرمایا اور ان کو اٹھا کر گود میں لے لیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ حضورؐ کو اس قدر محبت تھی کہ کسی کو بھی اپنے اہل کے ساتھ اس قدر نہیں لیکن فرماتی ہیں:

فاذا نودی قام کانہ لایعرفنا۔[1]

"یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ساتھ مشغول رہتے تھے، جب اذان ہوتی تھی تو اس طرح سے اٹھ جاتے تھے کہ گویا ہم کو پہچانتے بھی نہیں۔"

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی شے بھی قابل محبت کے نہیں ہے اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے ایسا عیب ان سب چیزوں کا بیان فرمایا کہ جو ظاہر الاشتراک اور بدیہی ہے یعنی جو چیز تمہارے پاس ہے وہ فنا

---

[1] (لم اجد الحدیث فی "موسوعة اطراف الحدیث النبوی الشریف")

ہونے والی ہے۔ جب فنا ہونے والی ہے تو اس قابل نہیں ہے کہ اس سے جی لگایا جائے۔
اس جزو کے متعلق قصد بیان کرنے کا نہ تھا اس لیے کہ کل ہو چکا تھا لیکن متبعاً بیان ہو گیا۔
اب مجھ کو مقصود بالبیان اس آیت کا جزو ثانی ہے اس لیے اس کو بیان کرتا ہوں۔

باقی رہنے والی چیز

فرماتے ہیں: "وَمَا عِندَاللّٰهِ بَاقٍ" (النحل:۹۶) "یعنی جو چیز اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والی ہے۔ پہلا جزو یعنی "مَا عِندَكُمْ يَنفَدُ" (جو چیز تمہارے پاس ہے وہ فنا ہونے والی ہے) تو ہم کو کھلم کھلا نظر آتا ہے کہ کل فلاں امر تھا آج فلاں۔ اس کے لیے تو ضرورت اس کی نہیں کہ ایمان والا ہی اس کو سمجھے۔ مومن، کافر، مشرک سب کھلی آنکھوں فنا اور تغیرات کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ باقی اس دوسرے جزو کے مضمون کا یقین اس شخص کو ہوگا جس کو ایمان ہوگا اور کلام الٰہی کو سچا سمجھے گا وہ یقین کر لے گا کہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں وہ باقی رہنے والی ہیں لیکن اس جملہ خبریہ سے غرض اخبار نہیں کہ پہلے جملہ سے یہ مقصود نہیں بلکہ غایت اس کی دوسری شے ہے۔ وہ یہ ہے کہ ماعنداللہ (جو چیز اللہ تعالیٰ کے پاس ہے) سے جی لگاؤ۔ اس سے ایک کلیہ مستنبط ہوا۔ وہ یہ ہے کہ جو چیز باقی رہنے والی ہے وہ قابل دل لگانے کے ہے اور یہ اہل دنیا کا بھی مسلمہ ہے کہ دل لگنے کا منبع وہ بقاء کو مانے ہوئے ہیں۔

اس کو ایک مثال کے ضمن میں سمجھئے۔ مثلاً دو مکان ہمارے پاس ہیں ایک تو عاریت کا ہے اور ایک ہم کو ہبۃً ملا ہے کہ ہم کو اس کا مالک بنا دیا گیا ہے مگر دونوں مکانوں کو اندر جا کر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ خراب خستہ پڑے ہیں، دیواریں ٹوٹی ہوئی ہیں، کڑیاں گری ہوئی ہیں۔ دونوں مرمت طلب ہیں۔ اب ایک ہزار روپیہ مرمت کے لیے تجویز کیا لیکن اب کلام اس میں ہے کہ یہ ایک ہزار روپیہ کس میں لگانا چاہیے۔ عاریت کے مکان میں یا موہوب میں۔ ظاہر ہے کہ ہر عاقل یہی تجویز کرے گا کہ جو اپنا مکان ہے اس میں لگانا چاہیے اس لیے کہ وہ ہمارے پاس باقی رہنے والا ہے اور مستعار تو قبضہ سے نکلنے والا ہے اس میں روپیہ لگانا ضائع کرنا ہے۔ معلوم ہوا کہ کوشش وسعی کا کرنا اور مال کو خرچ کرنا اسی شے کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے جو شے باقی رہنے والی ہے اور اپنے پاس رہنے والی ہے اگرچہ وہ بقا محض خیال ہی کے درجہ میں ہو اور جو شے اپنے پاس باقی رہنے والی نہ ہو بلکہ جلدی قبضہ سے نکل جانے والی ہو اس میں اگر کوئی اپنی ہمت وسعی خرچ کرے تو اس کو بیوقوف کہا جاتا ہے۔

مثلاً ایک شخص سرائے میں ایک شب کے لیے ٹھہرا اور ہزار روپیہ کما کر لایا تھا کہ بیوی بچوں کو لا کر دیں گے۔ اتفاق سے جو کوٹھڑی سرائے میں اس کو ملی وہ خراب سی تھی۔ اس نے اسی وقت

معماروں کو بلا کر وہ ہزار روپیہ اس کوٹھڑی کی مرمت میں خرچ کر ڈالے اور بیوی بچے منتظر ہیں کہ میاں باہر سے کمائی لائیں گے۔ میاں صاحب نے یہ حرکت کی۔ اب اس شخص کو بیوقوف کہو گے یا عقلمند۔ ظاہر ہے کہ بیوقوف ہے' تو یہ بیوقوف کیوں ہے صرف اس وجہ سے کہ جلدی قبضہ سے نکل جانے والی شے میں اس نے اپنا سارا سرمایہ غارت کیا۔

عمر کا بے بہا ذخیرہ

اسی طرح تم کو بھی ایک ذخیرہ و سرمایہ عمر کا حق تعالیٰ کے یہاں سے ملا تھا کہ اس کا ایک منٹ دنیا و مافیہا سے زیادہ قیمتی ہے اور دلیل قیمتی ہونے کی یہ ہے کہ اگر کسی کا دم نکلنے لگے اور اس سے کوئی یہ کہے کہ ہم فی گھنٹہ دس لاکھ روپیہ لیں گے اور اتنی مہلت تم کو دی جاتی ہے اگر اس کے پاس روپیہ ہوگا تو ہرگز دریغ نہ کرے گا بلکہ اس سے زیادہ بھی دریغ نہ ہوگی' سلطنت دینے سے بھی انکار نہ ہوگا۔

چنانچہ ایک بزرگ تھے۔ ان کو کسی بادشاہ کو نصیحت کرنا منظور تھا اس لیے انہوں نے اس بادشاہ سے کہا کہ کیوں جی! اگر تم جنگل میں ہو اور رفیقوں سے بچھڑ جاؤ اور پیاس تم کو لگے اور کہیں پانی اس جنگل میں نہ ملے حتیٰ کہ پیاس کے مارے مرنے لگو اور اس وقت کوئی شخص ایک کٹورہ پانی کا تمہارے سامنے لائے اور یہ کہے کہ آدھی سلطنت دو تو میں یہ کٹورہ پانی کا تم کو دوں' تم اسوقت کیا کرو گے؟ بادشاہ نے کہا کہ میں فوراً دے دوں گا۔

پھر کہا کہ اگر خدانخواستہ تمہارا پیشاب بند ہو جائے اور تمام اطباء اور حکماء علاج سے عاجز ہو جائیں اور کوئی تدبیر نہ ہو اور کوئی شخص یہ کہے کہ اگر نصف سلطنت مجھ کو دیدو تو تمہارا پیشاب ابھی کھل جائے' تم دیدو گے؟ کہا کہ بے شک دے دوں گا۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ بس دیکھ لو' آپ کی سلطنت کا یہ نرخ ہے۔ یعنی ایک پیالہ پانی اور ایک پیالہ موت۔

معلوم ہوا کہ عمر ہفت اقلیم کی سلطنت سے بھی زیادہ قیمتی ہے' پھر دیکھ لو اس بے بہا سرمایہ کو تم نے کہاں خرچ کیا۔ سرائے کی کوٹھڑی میں! کوٹھڑی تو اس واسطے تھی کہ سرائے میں ایک دو رات اس میں بسر ہو جائے' تم نے سارا سرمایہ ہی اس میں خرچ کر ڈالا۔ اب جب گھر پہنچو گے تو خالی ہاتھ جاؤ گے اس لیے کہ سرمایہ تو اس کوٹھڑی میں اڑا دیا جس دن قیامت کے دن بازار لگے گا وہاں حسرت ہوگی۔

کہ بازار چندانکہ آگندہ تر   تہی دست رادل پراگندہ تر

"یعنی بازار جس قدر مال و متاع سے بھرا ہوگا اسی قدر تنگ دست کا دل زیادہ پراگندہ ہوگا"

اور حسرت پر حسرت بڑھانے کے لیے کافر سے یہ کہا جائے گا کہ اس کو جنت دکھلائی جائے

گی اور کہا جائے گا کہ اگر تو مومن ہوتا تو تجھ کو یہ گھر ملتا۔ اس سے اس کو اور زیادہ افسوس وحسرت ہوگی۔ افسوس! اب نظر نہیں آتا' اس وقت تو سرائے کی کوٹھڑی میں سرمایہ لگا رہے ہیں بلکہ دنیا تو سرائے کی کوٹھڑی سے بھی زیادہ ناپائیدار ہے اس لیے کہ مسافر کو وہاں ایک رات رہنے کی تو امید ہے اور دنیا میں تو اتنی بھی نہیں۔ ہر وقت انسان موت کے سامنے ہے۔

شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود

''یعنی شاید یہی سانس آخری سانس ہو''

لہٰذا یہاں تو ایک سانس کی بھی امید رکھنا فضول ہے اس لیے کہ رات کو سو رہے ہیں ممکن ہے کہ زلزلہ آئے مکان گر پڑے' کوئی سانپ ہی کاٹ لے' غلطی سے کوئی دوا مہلک کھا جائے کہیں اوپر سے ہی گر پڑے اور یہ عوارض تو خیر کبھی کبھی پیش آتے ہیں۔ اگرچہ فی نفسہ کثیر الوقوع ہیں لیکن یہ حضرت انسان تو دو وقت معرض موت میں ہے اس لیے کہ کھانا جو دو وقت کھاتا ہے یہ موت کا پورا سامان ہے اس لیے کہ گلے میں دو سوراخ ہیں۔

ایک سے سانس آتا ہے اور دوسرے سے کھانا جاتا ہے۔ دیکھئے ہر فعل اختیاری کا اول تصور ہوتا ہے اس کے بعد صدور ہوتا ہے۔ آپ ہی بتلائیے کہ داہنے سوراخ سے جاتا ہے یا بائیں سے؟ کسی کو خبر بھی نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ نگلنا تو اختیاری ہے مگر خاص سوراخ سے نگلنا یہ اختیاری نہیں۔ جب اختیاری نہیں تو دوسری جانب اگر چلا جائے تو تمہارے پاس اس کا کیا انسداد ہے تو تم دو وقت ایسا کام کرتے ہو کہ اگر اس میں غلطی ہو جائے تو موت سے ادھر کوئی منزل ہی نہیں۔ سو کھانا نگلنا ہی کس قدر خطرناک امر ہے۔ اگر کوئی شخص وہمی ہو اور یہ امر اس کو پیش نظر ہو کہ اگر سانس والے سوراخ میں لقمہ چلا گیا تو جان پر آبنے گی تو کھانا کھانا اس کو دشوار ہو جائے گا۔ چنانچہ گاہ گاہ اگر ایسا ہو جاتا ہے تو واقعی جان پر بن آتی ہے بلکہ بعض واقعات تو ایسے ہوئے ہیں کہ جان ہی نکل گئی ہے۔ پھر اگر خیرت سے نگل بھی گئے تو یہ بھی ایک سخت خطرناک بات ہے گو ہم کو یہ خطرناک اس لیے معلوم نہیں ہوتا کہ ہم عادی ہو گئے ہیں۔

فی نفسہ یہ امر بھی بہت خطرناک ہے اس لیے کہ جو شے نگلی جاتی ہے وہ آپ کی ہم جنس نہیں ممکن ہے کہ معدہ میں جا کر ہضم نہ ہو پھر اس کے نکالنے کی فکر ہو اور اتفاق سے نہ نکلے اور سدا پیدا ہو جائے یا مثانہ میں یا آلات بول میں کوئی شے رہ جائے۔ کہئے دونوں وقت اپنے ہاتھوں مرنے کا سامان کرتے ہو یا نہیں' مقدر سے بچ جاتے ہیں ورنہ ہم تو کسر نہیں کرتے۔ اتنے اسباب کے ہوتے ہوئے اگر نظر غور سے دیکھا جائے تو مرنا تعجب کی بات نہیں بلکہ زندہ رہنا حیرت کی بات ہے۔

دنیا اور دنیادار کی مثال

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو ایک مثال کے ضمن میں بیان فرمایا ہے۔
فرماتے ہیں: **مالي وللدنيا انما مثل راكب استظل شجرة.**[1]
''یعنی مجھ کو دنیا سے کیا علاقہ ہے' میری مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی سوار راستہ پر جا رہا ہو اور کسی کے درخت کے سایہ میں ستانے کے لیے ٹھہر جائے اور ستا کر اپنی راہ لے۔''

اور اس جی لگانے والے کی مثال ایسی ہے کہ اس نے کہا کہ بڑھئی کو بلاؤ اس کو درست کرائیں گے۔ چنانچہ بڑھئی آیا اور اس ڈالے کی درستی میں تمام روپیہ خرچ کر ڈالا' دنیا میں کھپنا اور مرنا ایسا ہی ہے جیسے راستہ کے درخت پر مرنا اور کھپنا۔ ایک بزرگ دنیا کی مثال میں فرماتے ہیں:

دررہ عقبیٰ است دنیا چوں تلے　　بے بقا جائے وویراں منزلے

''یعنی راہ عقبیٰ میں دنیا کی مثال پل جیسی ہے' ایک فانی جگہ اور ایک ویران منزل ہے۔''

پل پر آدمی ٹھہرتا بھی نہیں مگر جو مثال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے اس میں تمام آثار کی رعایت ہے اس لیے کہ درخت کے نیچے پہنچنے سے کچھ راحت ملتی ہے بخلاف پل کے۔ اسی طرح دنیا ہے کہ آخر کچھ راحت ملتی ہے اور نیز درخت ہے بھی ایسی شے کہ مسافر چلتے چلتے اس کی سرسبزی اور تازگی و شادابی کو دیکھ کر اپنا بہت سا وقت اس کے دیکھنے میں صرف کر دیتا ہے۔ اسی طرح دنیا تر و تازہ نظر آتی ہے بخلاف پل کے کہ اس میں یہ رعایتیں نہیں۔ غرض راستہ کا درخت کہو یا پل کہو' دنیا جی لگانے کے قابل نہیں۔ مدار و مبنیٰ دلبستگی کا بقاء ہے اور بقا ماعنداللہ (اللہ تعالیٰ کے پاس والی چیز) کے لیے ثابت ہے اس لیے ماعنداللہ میں جی لگانا چاہیے۔

آخرت کی نعمتیں

اور نعم اخرویہ کو ماعنداللہ سے تعبیر کرنے میں چند نکتے ہیں۔

اول تو یہ ہے کہ جو شے اللہ تعالیٰ کے پاس ہوگی اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا بخلاف دنیا کی نعمتوں کے کہ ہر وقت کھٹکا لگا رہتا ہے کہ خدا جانے کس وقت جاتی رہے بخلاف اس شے کہ جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے کہ وہ سرکاری حفاظت میں ہے اس حیثیت سے بھی قابل طلب کہ آخرت کی نعمت ہوئی۔

دوسرے یہ نکتہ ہے کہ جب وہ نعمتیں اللہ کے پاس ہیں تو بغیر حق تعالیٰ کی خوشنودی کے وہ مل نہیں

---

[1] (الصحیح للبخاری ۳:۲۱۳' المسند للامام احمد بن حنبل ۱:۳۰۱' ۴۴۱' المستدرک للحاکم ۴:۳۱۰)

سکتیں اور بغیر نیک عمل کے خوشنودی نہیں ہوتی تو وہ بغیرِ عمل صالح کے نہ ملیں گی۔ جیسے خزانہ پر شاہی پہرہ ہوتو اگر کوئی شاہی خزانہ میں کچھ لینا چاہے تو بادشاہ کی خوشامد کرے اور اس کو راضی کرے۔ وہ ایک پروانہ خزانچی کے نام لکھ دے گا تو خزانہ مل جائے گا ورنہ کوئی صورت اس کے ملنے کی نہیں۔

تیسرے یہ کہ ماعنداللہ کا مصداق دنیا کی نعمتیں نہیں ہیں اگرچہ یہ بھی حقیقتاً اللہ ہی کی ملک ہیں لیکن چونکہ مجازاً اور رعایتاً ہمارا بھی ان کے ساتھ تعلق ہے اس لیے یہ ماعندکم (اور جو چیز تمہارے پاس ہے) میں جو کہ اس کا مقابل ہے داخل ہیں اور ماعنداللہ میں صرف آخرت کی نعمتیں آئیں۔

پس حاصل ہوا کہ آخرت کی نعمتیں قابل طلب کے ہیں ان کے حاصل کرنے کی تدبیر کرو اور یقینی بات ہے کہ جس شخص کو آخرت مطلوب ہوگی تو اس کا اثر یہ ہوگا کہ وہ اپنے لیے بھی اور اپنے عزیز کے لیے بھی اللہ کے پاس رہنا زیادہ پسند کرے گا بہ نسبت یہاں رہنے کے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ دو شخص سفر میں ہیں اور سفر کی مشقتیں اور متاعب (سختی) برداشت کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک کو بادشاہ وقت نے بلا بھیجا کہ تمہارے سفر کی میعاد ختم ہوگئی ہے اب تم ہمارے پاس راحت کے لیے آجاؤ۔ دوسرے شخص کو ظاہر ہے کہ اس کے جانے سے خوش ہونا چاہیے کہ اچھا ہوا اگرچہ جدائی کا رنج بھی ہوگا مگر عقلاً وہ بھی اس کو خلاف مصلحت نہ سمجھے گا بلکہ سمجھے گا کہ اچھا ہوا اپنے ٹھکانے جا پہنچا اور خود بھی متمنی ہوگا کہ وہ کونسا دن ہوگا کہ میرے سفر کی مدت بھی ختم ہوگی اور میں بھی بادشاہ کی خدمت میں جا پہنچوں گا۔

چنانچہ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے جناب حافظ صاحب شہید کے بارے میں مثنوی تحفۃ العشاق میں ایک شعر لکھا ہے:

جو کہ نوری تھے گئے افلاک پر ۔۔۔ مثل تلچھٹ رہ گیا میں خاک پر

یہاں تو یہ ہوتا ہے کہ اپنے مرنے کی تمنا تو کیا ہوتی دوسرے کی موت پر حسرتیں اور ارمان اور خلاف مصلحت ہونے کے خیالات ہوتے ہیں اور تمنا موت کی بھی کس منہ سے کریں۔ تمنا تو وہ کرے جس کے پاس نیک عمل ہوں۔ یہاں پر ایک شبہ ہوسکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو تمنا کرتے ہیں تو کیا ان کو اپنے نیک اعمال پر بھروسہ ہوتا ہے۔

نیک عمل کی خاصیت

اپنے اعمال پر بھروسہ کسی کو بھی نہ چاہیے ہرگز نہیں' ان کو بھروسہ کبھی نہیں ہوتا۔ ایک اور بات

ہے کہ ہر شے میں حق تعالیٰ نے ایک خاصیت رکھی ہے۔ نیک عمل میں یہ خاصیت ہی ہے کہ خدا تعالیٰ سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ اگر چہ یہ بھی احتمال ہو کہ وہاں اپنے برے اعمال کی سزا ملے گی لیکن پھر بھی دنیا کے عیش سے آخرت کے عذاب کو وہ ترجیح دیتا ہے اس لیے کہ ہر مسلمان مرکر اپنے رب سے ملتا ہے تو اس ملنے کی وہ مسرت ہے کہ وہ عذاب کو کچھ نہیں سمجھتا اور اس مسرت کی امید میں اسکا دل دنیا میں نہیں لگتا اور ''الدنیا سجن المومن'' (دنیا مومن کے لیے جیل خانہ ہے) کے یہی معنی ہیں اور اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہاں ان حضرات کو تکلیف ہے بلکہ معنی یہ ہیں کہ جی نہیں لگتا جیسے جیل خانہ میں جی نہیں لگا کرتا اور اپنا گھر اگر چہ جھونپڑا ہو وہاں ہی جی لگتا ہے اور یہ جی نہ لگنے کا اثر نیک عمل سے پیدا ہوتا ہے جس قدر نیک عمل ہوں گے اسی قدر آخرت کا شوق اور دنیا سے دل اچاٹ ہوگا۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں یہ کیفیت کھلی نظر آتی تھی۔ چنانچہ ایک حکایت یاد آئی کہ حضرت کی خدمت میں ایک بوڑھا آیا کہ حضرت میری بیوی بیمار ہے اور مر رہی ہے' دعائے صحت فرمائیے' حضرت نے تعجب سے فرمایا کہ دیکھو کیسا کم فہم ہے کہ ایک مسلمان جیل خانہ سے چھوٹ رہا ہے اور یہ اس پر افسوس کرتا ہے۔ بڑے میاں! ایک روز تم بھی چھوٹ جاؤ گے' میں نے اپنے دل میں کہا کہ بڈھا بچارا بیوی کو اچھی کرانے آیا تھا' حضرت نے خود اس کے مرنے کی خوشخبری سنادی۔

خلاصہ یہ ہے کہ مومن جب نیک عمل کرے گا اس کا دل خدا تعالیٰ سے ملنے کو ضرور چاہے گا۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ مثلاً دو تحصیلدار ہیں ایک تو ان میں سے رشوت لیتا ہے' ظلم کرتا ہے' کچہری سے غیر حاضر بھی رہتا ہے اور علاوہ اس کے دیگر جرائم کا مرتکب ہے اور دوسرا نیک چلن ہے نہ کسی پر ظلم کرتا ہے نہ رشوت لیتا ہے اور بہت ہوشیاری سے اپنا کام کرتا ہے۔ حاکم اعلیٰ نے دونوں کو معائنہ کے لیے بلایا۔ یہ خبر سن کر اس رشوت خور ظالم کے تو چھکے چھوٹ جائیں گے اور یہ تمنا کرے گا کہ کسی طرح یہ معائنہ کی تاریخ اور مؤخر ہو جائے اور دوسرا خوش ہوگا کہ اچھا ہوا کہ وہ وقت آ پہنچا کہ حاکم کی خوشنودی کا پروانہ مجھ کو ملے۔ گو اس کی سطوت سے خوف بھی ہو۔

ابن القیم نے ایک حدیث لکھی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ موت نہ آنا چاہیے مگر اس حالت میں کہ تیرا گمان حق تعالیٰ کے ساتھ نیک ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ مطلب اس کا یہ ہے کہ نیک عمل کرو کیونکہ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ نیک گمان ہو جاتا ہے' یہ عمل صالح ہے طریقہ حب ماعنداللہ (یعنی ان چیزوں کی محبت کا جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں)

اس سے آخرت میں رہنا تم کو اپنا بھی اور اپنے عزیزوں کا بھی زیادہ پسند ہوگا۔ یہی مضمون

ہے کہ ہم نے تو اس کو بڑی کوشش سے ثابت کیا ہے اور ایک اعرابی نے دو شعروں میں ادا کر دیا ہے۔

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عم بزرگوار کی وفات ہوئی تو ان کے بیٹے یعنی حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رنج تھا۔ ایک اعرابی آیا اور اس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دو شعروں سے تسلی دی۔ وہ یہ ہیں:

اصبر نکن بک صابرین فانما صبر الرعیة بعد صبر الراس

خیر من العباس اجرک بعده واللہ خیر منک للعباس

مطلب یہ ہے کہ آپ صبر کیجئے ہم آپ کی وجہ سے صابر بنیں گے اس لیے کہ رئیس کے صبر کے بعد رعیت کا صبر ہوتا ہے۔ بڑوں کو چاہیے کہ چھوٹوں کے سامنے تذکرہ بھی نہ کریں۔ آج کل بڑوں کی یہ حالت ہے کہ وہ چھوٹوں سے پیش قدمی کرتے ہیں۔ آگے وہ اعرابی کہتا ہے کہ تم عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات پر کیوں رنجیدہ ہوتے ہو۔ تم کو تو عباس رضی اللہ تعالیٰ سے بہتر شے یعنی ثواب مل گیا ہے اور اگر اس پر رنج ہے کہ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجھ سے جدا ہو گئے ہیں تو عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تم سے بہتر یعنی اللہ تعالیٰ مل گئے ہیں جو تم سے اچھے ہیں۔ خوش رہو کہ وہ بہت اچھی جگہ پہنچ گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ کو اس سے بڑھ کر کسی نے تسلی نہیں دی۔ یہ اس وقت کے گنواروں کی حالت تھی۔ اصل یہ ہے کہ جن کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق ہے ان کی یہی حالت ہے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی ہمشیرہ حج کو گئی تھیں۔ بہت دنوں سے خیریت معلوم نہ ہوئی، طبیعت پریشان تھی، مراقب ہوئے، دیکھا کہ ایک بڑا دفتر آیا اور اس میں جدولیں اور خانے بنے ہوئے ہیں، ایک خانہ ہے العامل، دوسرا خانہ ہے العمل، تیسرا خانہ الجزا اور اس میں ہزاروں نام لکھے ہیں، تلاش کرتے کرتے ان کی ہمشیرہ کا نام ملا جو العمل کے خانہ میں لکھا ہے۔ الحج اور جزا کے خانہ میں "فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ" (القمر:۵۵)

(اللہ تعالیٰ کے نزدیک اچھے ٹھکانے میں ہے) سمجھئے کہ حج کے بعد انتقال ہو گیا اور خدا تعالیٰ کے یہاں یہ رتبہ ملا کہ اللہ تعالیٰ کے قرب میں جگہ ملی۔ بس خوش ہو گئے اور اطمینان ہو گیا، بعد میں ان کی حیات معلوم ہوئی لیکن مقصود میرا یہ ہے کہ گمان موت سے پریشانی نہیں ہوئی تو جو اللہ تعالیٰ کے پاس رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں اور خوش رہتے ہیں، بزرگوں نے تو مرنے پر نذریں مانی ہیں۔

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے تا در مے کدہ شاداں و غزل خواں و بردم

"میں نے نذر کی ہے کہ اگر یہ (موت) کا دن نصیب ہو جائے تو محبوب کے دربار میں خوش

وخرم اور غزلیں پڑھتا ہوجاؤں گا۔"

موت کے متمنی

بعض بزرگوں نے اپنے جنازہ کے ساتھ اشعار پڑھوائے ہیں۔ چنانچہ ایک بزرگ نے وصیت کی تھی کہ میرے جنازہ کے ساتھ یہ شعر پڑھا جائے۔

شیأً للہ از جمال روئے تو
دست بکشا جانب زنبیل ما — آفریں بردست و برباز وے تو

"آپ کے دربار میں ہم مفلس ہوکر آئے ہیں اپنے جمال کا صدقہ کچھ عنایت کیجئے۔ ہماری زنبیل کی طرف ہاتھ بڑھائیے' آپ کے دست بازو پر آفریں صد آفریں ہے۔"

اور ظاہر ہے کہ یہ باتیں بڑے اطمینان اور فرصت کی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرنے کو حیات پر ترجیح دیتے تھے اس سے بڑھ کر لیجئے کہ بعض بزرگوں کو مرنے کے بعد اس پر وجد ہوا ہے۔ چنانچہ جب حضرت سلطان الاولیاء سلطان نظام الدین قدس سرہ کی وفات ہوئی ہے تو ان کے ایک خلیفہ نے جنازہ کے ساتھ یہ شعر پڑھے۔

سروِ سیمینا بصحرا امیروی — سخت بے مہری کہ بے ما میروی
اے تماشا گاہ عالم روئے تو — تو کجا بہر تماشا میروی

"اے محبوب آپ جنگل کی طرف تشریف لے جارہے ہیں' سخت بے مہری ہے کہ آپ ہم کو چھوڑ کر تنہا جارہے ہیں' اے محبوب! آپ کا رخ انور جہان کا تماشا گاہ ہے۔ آپ تماشا کے لیے کہاں جارہے ہیں۔"

لکھا ہے کہ کفن سے ہاتھ اونچا ہوگیا۔ لوگوں نے انکو خاموش کردیا' آخر انکے اندر کیا شے سمائی تھی۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد زعشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

"یعنی جس کو عشق حقیقی سے روحانی حیات حاصل ہوگئی وہ اگر مر بھی جائے تو واقع میں بوجہ اس کے کہ لذت قرب اس کو کامل درجہ کی حاصل ہوجاتی ہے اس لیے اس کو زندہ کہنا چاہیے۔"

جس کو تم سمجھتے ہو کہ مرگیا وہ واقع میں جی گیا: "بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ"

"بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں۔" مرنے کی مثال ایسی ہے جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہونا۔ جب بچہ ماں کے پیٹ کے اندر ہوتا ہے تو اسی کو عالم سمجھتا ہے۔ جب باہر آتا ہے تو دیکھتا ہے اور جانتا ہے کہ میں تو بڑی تنگ و تاریک جگہ میں مقید تھا۔ اسی طرح جب مرے گا تو معلوم ہوگا کہ میں

واقع میں جیل خانہ میں مقید تھا۔ عالم تو یہ ہے کہ تو مرتا نہیں بلکہ جی جاتا ہے۔ اس عالم سے البتہ جدا ہو جاتا ہے مگر دوسرے عالم میں چلا جاتا ہے۔ اگر تم اس عالم کو دیکھ لو تو تم مردہ کے جانے پر کبھی نہ روؤ بلکہ اپنے یہاں رہنے پر رویا کرو۔ البتہ وہاں جانے کی قابلیت پیدا کر لو۔ کسی نے خوب کہا ہے:

یاد داری کہ وقت زادن تو ! ہم خنداں بودند تو گریاں

آنچناں زے کہ بعد مردن تو ہمہ گریاں بوند تو خنداں

''یعنی تمہارے پیدا ہونے کے وقت سب ہنستے تھے اور تم روتے تھے اب تم ایسی زندگی بسر رو کہ مرنے کے وقت سب رو دیں اور تم ہنسو کہ الحمد للہ! میں جیل خان سے چھوٹ آیا۔ جیل خانہ سے جو چھوٹتا ہے وہ تو خوش ہوتا ہے۔''

دنیا کا جیل خانہ

اور دنیا فی الواقع جیل خانہ ہے۔ جیسا حدیث میں سجن (جیل خانہ) آیا ہے اور اس کی حقیقت معلوم ہونے کے بعد ہرگز بھی قابل التفات نہیں۔

حال دنیا راپر سیدم من از فرزانہ گفت یا خوابے ست یا بادے ست افسانہ

بازگفتم حال آنکس گو کہ دل دروے بہ بست گفت یا غولے یا دیوے ست یا دیوانہ

''ایک عاقل سے دنیا کی حالت کے متعلق میں نے سوال کیا تو اس نے جواب دیا کہ دنیا ایک خواب ہے یا ایک ہوا ہے یا ایک افسانہ ہے۔ پھر میں نے اس شخص کے متعلق دریافت کیا کہ جس نے اس دنیا میں دل لگایا تو اس نے جواب دیا کہ وہ یا تو غول ہے یا دیو ہے یا پاگل ہے۔''

جب یہ ایسی شے ہے تو یہاں سے تو جانے کی فکر ہونا چاہیے نہ کہ رہنے کی۔ خصوصاً اگر کوئی مرے تو زیادہ عبرت ہونا چاہیے' دنیا کی مثال ریل کی سی ہے کہ سوار ہوتے ہیں' اترتے ہیں' آج وہ پیدا ہوا' کل وہ مرا' دم بہ دم گھنٹی بجانے کے لیے بجتی ہے۔

مرا در منزل جاناں چہ امن وعیش چوں ہر دم جرس فریادمی وارد کہ بر بندید محملہا

''مجھ کو منزل جاناں میں کیا عشق و آرام کہ جب جرس شور مچاتا ہے کہ محملوں کو باندھو یعنی مجھ کو دنیا کی مستعار زندگی میں کیا راحت مل سکتی ہے جب کہ تقاضائے موت کسی وقت کسی جگہ چین نہیں لینے دیتا اور وہ گھنٹیاں یہی ہیں' اپنے دوستوں کا اپنے رشتہ داروں کا مرنا' مگر ہم ایسے خواب غفلت میں سو رہے ہیں کہ کچھ عبرت ہی نہیں ہوتی۔''

غفلت کا علاج

حق تعالیٰ نے اس آیت میں بہت مختصر لفظوں میں اس غفلت کا علاج بیان فرمایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ سوچا کرو کہ دنیا فانی ہے، جی لگانے کے قابل نہیں اور آخرت باقی ہے اور اپنی نافرمانیاں اور حساب و کتاب، قبر سے اٹھنا یہ سب باتیں سوچا کرو جہاں چوبیس گھنٹے دنیا کے کام کرتے ہو پانچ منٹ اس کام کے لیے بھی مقرر کر لو ان شاء اللہ تعالیٰ اس مراقبہ سے سب آثار جو پہلے بیان ہوئے پیدا ہوں گے۔ آگے فرماتے ہیں:

وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ. (النحل نمبر۹۶)

"یعنی ہم ضرور جزا دیں گے ان کو جو صبر کرتے ہیں۔" صبر کے معنی ثابت قدم کے ہیں، ہم میں اس کی بھی کمی ہے ایک وقت نیک عمل دوسرے وقت ندارد۔ ثبات نہیں ہے آگے فرماتے ہیں بسبب ان کے اچھے عمل کے، معلوم ہوا کہ وما عند اللہ باق "جو چیز اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والی ہے۔" کی تحصیل کا طریقہ نیک عمل ہے۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور مکرر بطور خلاصہ کے بیان کرتا ہوں کہ دنیا کے فانی ہونے اور آخرت کے باقی ہونے کا جیسا اعتقاد ہے اس کا دھیان کیا کرو تا کہ یہ اعتقاد حال بن جائے۔ (اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔ آمین!)

الدنیا والآخرۃ

قرآن کریم خداوند کریم کو دکھلانے والا آئینہ اور رب العزت تک پہنچانے والا زینہ ہے کہ اس کی شاہراہ پر پڑ کر انسان کبھی گمراہ نہیں ہوسکتا کیونکہ فی الحقیقت قرآن شریف تجلیات خداوندی میں سے ایک تجلی ہے جو شخص تجلی حق کو رہنما بنائے گا وہ اس تجلی کے مبداء یعنی خداوند حقیقی تک کیسے نہ پہنچے گا۔

اثبات معاد کے متعلق یہ وعظ ۱۸ شعبان ۱۳۴۲ھ کو مسجد شاہ گل قصاب پورہ دہلی میں منبر پر بیٹھ کر زائد از ایک ہزار کے مجمع کو سنایا گیا جس پر ۳ گھنٹے اور ۵۲ منٹ لگے۔ اسے ادریس میرٹھی متعلم دار العلوم دیوبند نے قلم بند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَ مِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ.

اَمَّا بَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ.

وَمَا ھٰذِہِ الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا اِلَّا لَھۡوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الۡاٰخِرَۃَ لَھِیَ الۡحَیَوَانُ لَوۡ کَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ. (العنکبوت: آیت ۶۴)

ترجمہ: ''اور یہ دنیوی زندگی (فی نفسہ) بجز لہو ولعب کے اور کچھ بھی نہیں اور اصل زندگی عالم آخرت ہے اگر ان کو اس کا علم ہوتا تو ایسا نہ کرتے۔''

مسئلہ معاد

اس آیت سے قبل مسئلہ معاد مذکور ہے اور اس سے قبل مسئلہ نبوت اور اس سے قبل مسئلہ توحید ہے۔ غرض یہ تینوں مضمون قریب قریب بترتیب مذکور ہیں اور یہ ہر سہ مسائل جمع مسائل قرآنیہ میں امہات المسائل شمار کیے جاتے ہیں۔ باقی جمیع مسائل ان کے لیے متمم ہیں یا تو طیہ وتمہید ہیں اور یہ اصل اصول مگر باوجود اس کے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دیگر مسائل قرآنیہ غیر مہتم بالشان اور غیر ضروری ہیں بلکہ قرآن حکیم کا ہر ہر مسئلہ ضروری اور مہتم بالشان ہے لیکن چونکہ یہ ہر سہ مسائل مرجع ومآل جمع مسائل ہیں لہٰذا جزوی فضیلت واہتمام شان بہ نسبت جمیع مسائل کے ان واسطے زیادہ ثابت کی گئی۔

پرسوں دہلی مدرسہ عبدالرب کے وعظ میں مسئلہ توحید پر بیان ہوا تھا۔ بفضلہٖ اس پر بقدر ضرورت وضاحت کے ساتھ بیان ہو چکا ہے اور کل پانی پت میں مسئلہ نبوت کا بھی کافی بیان ہو چکا ہے۔ لہٰذا آج اس وعظ میں مسئلہ معاد کو بیان کرنا زیادہ اولیٰ وانسب معلوم ہوتا ہے تا کہ جس طرح خداوند تعالیٰ نے ہر سہ مسائل کو ایک سلسلہ میں مترتباً بیان کیا ہے اسی طرح اس سفر میں ان تینوں

مسئلوں پر بترتیب قرآنی بیان ہو جائے۔

اور یہ آیت درحقیقت تمام مضمون معاد مذکور الصدر کا خلاصہ ہے تو اول تو یہ تینوں مضامین جمع مسائل قرآنیہ میں اہم ہیں۔ لہٰذا اہمیت مسئلہ معاد کے لیے ویسے ہی ثابت تھی۔ علاوہ ازیں یہ آیت خلاصہ ہے مسئلہ معاد کا اور خلاصہ کسی مضمون کا چونکہ اصل اور نچوڑ ہوتا ہے لہٰذا بہت ضروری شمار کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے خلاصہ کو روح سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اول تو خود مضمون معاد مثل اپنے دو قرین کے روح جمیع مسائل اور ضروری اور پھر اس کا خلاصہ! وہ تو اور بھی زیادہ ضروری اور روح الروح ہوگا۔ لہٰذا اہمیت اس کی کافی طور سے واضح ہوگئی۔ سامعین کو چاہیے کہ وہ اس اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے نہایت غور و یکسوئی کے ساتھ اس مضمون کو سنیں اور اس پر کاربند ہوں۔

یہ مضمون اگرچہ بالکل بدیہی اور واضح ہے کسی قسم کی دقت و نظریت اس میں نہیں۔ لہٰذا احتاج بیان بھی نہ تھا لیکن چونکہ آج کل اس مضمون سے لوگ بالکل غافل ہوگئے ہیں اور اس کو بھلا بیٹھے ہیں اس لیے متنبہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جیسا کہ عام طور سے قاعدہ ہے کہ بدیہی امر محتاج دلیل تو کبھی بھی نہیں ہوتا ہاں تغافل کے وقت تنبیہ کی ضرورت پیش آجایا کرتی ہے۔ جیسے کوئی شخص بینا ہو مگر روز روشن میں کام اندھوں کے سے کرے تو اس سے کہتے ہیں کہ میاں دن نکل رہا ہے یا سورج نکل رہا ہے، حالانکہ وہ مخاطب بھی اور تمام اہل دنیا یہ جانتے ہیں کہ سورج نکل رہا ہے اور روز روشن ہے تو چاہیے کہ اس کا یہ کہنا عبث ولغو ہوتا حالانکہ کوئی اس کو لغو نہیں کہتا۔ اس وجہ سے کہ اس تخاطب سے مقصود طلوع کی خبر دینا نہیں۔ اس وجہ سے کہ

آفتاب آمد دلیل آفتاب

''سورج کا نکلنا سورج کے وجود کی دلیل ہے''

بلکہ مقصود یہ ہے کہ تم کو جو کام طلوع آفتاب کی حالت میں کرنا چاہیے تھا تم وہ نہیں کرتے جس سے شبہ ہوتا ہے کہ تمہارے نزدیک بوجہ عدم استفادہ کے طلوع شمس نہیں ہوا۔ لہٰذا میں تم کو تنبیہ کرتا ہوں کہ ہوش میں آکر کام کرو۔

یا جیسے کوئی شخص کسی ایسے شخص سے کہے جو کہ اپنے باپ کے ساتھ گستاخی و بے ادبی سے پیش آتا ہے کہ میاں یہ تیرا باپ ہے تو کیا اس سے مقصود ابوۃ کی خبر دینا ہے ہرگز نہیں۔ اس وجہ سے کہ ابوۃ کا علم مخاطب کو قائل سے زائد ہے۔ قائل کو تو ابوۃ کا علم ابھی دو چار برس سے ہوا ہوگا اور

مخاطب نے تو جب ہوش سنبھالا ہے ابا ابا کہہ کر پیسہ مانگا ہے تو اگر یہ مقصود ہوتا تو اہل دنیا اس کو بیوقوف کے نام سے یاد کرتے۔ حالانکہ کوئی بھی اس کو بیوقوف نہیں کہتا۔ معلوم ہوا کہ یہ مقصود ہے ہی نہیں بلکہ اس کی غرض محض تنبیہ ہے اس امر پر کہ یہ تیرا باپ ہے تجھ کو چاہیے کہ حقوق ابوۃ کا لحاظ رکھو اور عظمت پدری کو مدنظر رکھو۔ یہ تیرا موجودہ رویہ شان ابوۃ کے خلاف ہے بلکہ اس طرز عمل سے ابہام ہوتا ہے کہ شاید تیرے نزدیک یہ تیرا باپ ہی نہیں ہے کیونکہ یہ طرز عمل تو اغیار کے ساتھ برتا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کا یہ قول نہایت ضروری بلکہ اس قسم کی تنبیہ کو قابل تحسین سمجھا جاتا ہے۔

تو دیکھئے! اگرچہ ابوۃ اس کی بالکل بدیہی بلکہ حسی اور ظاہر و باہر تھی محتاج بیان ہرگز نہ تھی لیکن پھر اس بیان کو تنبیہ پر محمول کر کے قابل تحسین سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ مضمون بھی گو اجلی بدیہات سے ہے اس کی ہدایت میں کوئی شک وشبہ نہیں مگر محض تغافل کی وجہ سے ضرورت بیان کی پیش آئی۔

فناءدنیا و اثبات آخرت

اب میں مضمون بیان کرتا ہوں اور یہ مضمون مرکب ہے دو جزوں سے اول تو فناء دنیا دوسرا اثبات آخرت۔ تو اگرچہ جزو اول بوجہ مشاہد ہونے کے اتنا صاف اور واضح ہے کہ اصلاً محتاج بیان نہیں لیکن دوسرا حصہ مضمون کا کہ بہ نسبت اس کے غامض و دقیق ہے وہ محتاج بیان ہے اور بہ نسبت اس کے اس لیے کہا ہے کہ وہ بھی زیادہ دقیق نہیں۔ چنانچہ اگر بنظر غور و تامل دیکھا جائے تو چونکہ مضمون ثانی مثل لازم مضمون اول کے ہے۔ لہٰذا جب ملزوم بدیہی ہوا اور وہ کافی طور سے واضح ہو گیا تو لازم خود بخود سمجھ میں آ جائے گا اور اس کا ماننا ضروری ہوگا۔ درحقیقت مضمون اول ہی اضطراراً وفطرتاً علم کرا دیتا ہے۔ مضمون ثانی کا اس وجہ سے کہ وہ محسوس ہے اور لازم محسوس خود محسوس ہوتا ہے اور محسوس محتاج بیان و وضاحت نہیں' باقی رہا کہ جزو اول مسلم ومحسوس کیوں کر اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام عقلاء کا اتفاق ہو چکا ہے فناء دنیا پر لہٰذا یہ مسئلہ متفقہ ومسلمہ ہو گیا۔

باقی رہا استلزام۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انسان کا اعتقاد وفناء دنیا کے متعلق راسخ ہو جائے گا اور اس امر کا یقین کامل ہو جائے گا کہ اس سرائے فانی سے ایک دن کوچ کرنا ہے۔ عنقریب طبل بازگشت بجنے والا ہے تو اس یقین کا لازمی اثر یہ ہے کہ اس کو دنیا ولواحقات دنیا سے نفرت پیدا ہو جائے گی۔ ہر ہر شے پر نظر واپس ہوگی' متاع دنیا سے رغبت منقطع ہوگی۔ اس وجہ سے کہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ اس کو اشیاء فانیہ سے تنفر وانقباض پیدا ہو جاتا ہے۔ طبیعت برداشتہ خاطر ہو جاتی ہے' یکسوئی ویکجہتی کی طالب ہوتی ہے روز وشب ہم اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

چنانچہ ایک مسافر شام کے وقت سرائے کے کمرے میں جا کر قیام کرتا ہے تو قبل اس کے کہ وہ اپنا اسباب اس میں رکھے، قیام کا انتظام کرے، اس کو یقین کامل ہوتا ہے کہ میں اس کوٹھڑی میں صرف رات کا مہمان ہوں، صبح ہوتے ہی مجھ کو یقیناً کوچ کرنا اور اس کمرے کو چھوڑنا ہے۔ اس سے میری ملاقات صرف چند گھنٹوں کی ہے۔ پھر میں کہاں اور یہ کہاں۔ پھر اگر یہ کوٹھڑی کہیں سے ٹوٹی ہوتی ہے تو اس کی اصلاح کا مطلق خیال نہیں ہوتا۔ اگر کوئی کڑی نکلی ہوئی ہوتی ہے تو اس کو یہ خیال بھی ہرگز نہیں ہوتا کہ اس میں دوسری کڑی ڈلوانی چاہیے یا کہیں سامان زینت میں کمی ہو تو اس کو پورا کرنے کا بھی اہتمام بالکل نہیں ہوتا حالانکہ اس کو یہاں ایک رات تو ضرور بسر کرنی ہے اور یہیں آرام کرنا ہے۔

اور فطرت انسانی کا مقتضا ہے کہ وہ اپنے آرام کے ذرائع کو مہیا کرنا چاہتی ہے لہٰذا موافق اس اقتضاء کے اس کو اصلاح کرانی چاہیے تھی لیکن نہیں کراتا۔ محض اس یقین کامل کی وجہ سے جو اس کے قلب میں راسخ ہے کہ صبح کو یہاں سے کوچ کرنا ہے۔ میرا قیام صرف چند ساعت کا ہے یہ کوٹھڑی عنقریب چھٹنے والی ہے۔

اسی طرح جب انسان کا یہ عقیدہ ثابت و راسخ ہو جائے گا کہ یہ دنیا فنا ہونے والی ہے اس سے مفارقت و مہاجرت لازمی ہے تو ضرور اس کو دنیا سے تنفر و انقباض پیدا ہوگا جیسا کہ سرائے کی کوٹھڑی سے ہوتا ہے لیکن یہ معاملہ اپنے مکان کی کوٹھڑی کے ساتھ نہیں اگرچہ سرائے کی کوٹھڑی اور مکان کا کمرہ اس حیثیت سے دونوں برابر ہیں کہ ان دونوں سے ہم کو جدا ہونے کا یقین ہے لیکن باوجود اس کے پھر جو ہم تھوڑا سا فرق دیکھتے ہیں کہ جو معاملہ آپ کا سرائے کی کوٹھڑی کے ساتھ ہے وہ مکان کی کوٹھڑی کے ساتھ نہیں، مکان کے کمرے کی اگر کڑی نکل جاتی ہے تو فوراً اس فکر میں مبتلا ہوتے ہیں کہ جلد اس میں کڑی ڈلوائی جائے۔ اگر قلعی کم ہو جاتی ہے تو فوراً سفیدی کرانے کا انتظام کرتے ہیں۔ اسباب زینت کی کمی کے وقت آپ اس کے اہتمام میں مشغول ہو جاتے ہیں تو یہ فرق کیوں ہے اس وجہ سے نہیں کہ خدانخواستہ آپ کو دنیا اور اس کے مکانات کے فنا ہونے کا یقین نہیں بلکہ یہ فرق اس وجہ سے ہے کہ آپ سرائے کی کوٹھڑی میں داخل ہونے سے قبل اس بات کا یقین کامل رکھتے ہیں کہ صبح کو ضرور اس سے کوچ کرنا ہے اور جتنا زمانہ آپ وہاں پر مقیم رہتے ہیں برابر یہی خیال اور یہی صورت مفارقت پیش نظر رہتی ہے۔ بخلاف مکان کے کہ اس کے کمرہ میں نہ داخل ہوتے وقت آپ کو اس سے نکلنے اور جدا ہونے کا خیال مستحضر رہتا ہے اور نہ قیام کے زمانہ میں قوت متخلیہ آپ کے ساتھ کبھی صورت مفارقت پیش کرتی ہے بلکہ کبھی بھولے سے بھی یہ خیال

نہیں آتا حالانکہ اس کا یقین واعتقاد راسخ ہے لیکن صرف استحضار نہیں بخلاف سرائے کے کمرے کے کہ وہاں پر یقین واعتقاد کے ساتھ استحضار بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرائے کا کمرہ توحش وہیبت ناک معلوم ہوتا ہے اس سے دلچسپی نام کو نہیں ہوتی بخلاف مکان کے کہ وہ مجسم ذریعہ دلچسپی ہوتا ہے۔ اس سے طبیعت بہلتی ہے اس کی چیزیں اچھی معلوم ہوتی ہیں اس میں آکر وحشت دور ہوتی ہے اس کی تزئین کی اُمنگیں طبیعت میں لہریں مارتی ہیں۔ حالانکہ سبب وحشت یعنی اعتقاد مفارقت ویقین مہاجرت دونوں میں مشترک ہے۔ مابہ الفرق صرف یہ ہے کہ وہاں پر اعتقاد کے ساتھ استحضار بھی ہے اور یہاں پر اعتقاد محض ہے استحضار نہیں۔

نیز ایک مابہ الفرق اور بھی ہے وہ یہ کہ فناء ومفارقت دنیا کا خیال اگر ہوتا بھی ہے تو موجودہ حالت یا حالت قریبہ میں نہیں بلکہ زمانہ مستقبل بعید میں ہے۔ بچے گمان کرتے ہیں کہ میاں ابھی تو بچے ہیں، ابھی جوان ہوں گے، زندگی کے مزے اڑائیں گے، پھر کبھی بوڑھے ہوں گے، پھر کبھی موت آئے گی، ایسے ہی جوان خیال کرتے ہیں کہ میاں ابھی تو بوڑھا ہونا باقی ہے، ابھی کیا ہے۔ ابھی تو ایک منزل ہم میں اور فنا میں حد فاصل ہے۔ ایسے ہی بوڑھے خیال کرتے ہیں کہ ابھی تو بڑھاپا ہی آیا ہے، ابتدائی پیری ہے، اس کی انتہا بھی ہوگی۔ جب کبھی موت آئے گی۔ غرض ہر شخص فنا کو اپنے لیے زمانہ مستقبل بعید میں سمجھتا ہے۔

چنانچہ میں حج کو جارہا تھا تو ایک میرے بزرگ نے کہا کہ میاں ابھی تو تم بچے ہو، ابھی کیا جلدی ہے۔ کر لینا حج جب ہماری عمر پر آؤ گے اور ایسے ہی جلدی ہے تو آئندہ سال ہم بھی چلیں گے جب ہمارے ساتھ حج کرنے چلنا۔ میں نے ان کو جواب دیا کہ حضرت آپ کی تو اتنی عمر گزر چکی۔ اگر آپ مجھ کو عمر کا پتہ لکھ دیں کہ تیری عمر بھی ہمارے برابر ضرور ہوگی تو میں بے شک اس وقت کا جانا موقوف کروں گا اور آپ کے ساتھ ہی چلوں۔ تو واقعی بات یہ ہے کہ ان کی عمر تو اتنی ہوگئی نہ معلوم ہماری عمر اتنی ہو یا نہ ہو۔ ہمارے پاس کون سا امر موجب یقین ہے کہ ہم ان کی عمر تک ضرور زندہ رہیں گے جو ہم ان کے کہنے کو قبول کر لیں۔

میرے سامنے ایک واقعہ ہوا کہ ایک جوان شخص کی ملاقات ایک بوڑھے شخص سے ہوئی جو کہ اپنی عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے۔ جب رخصت ہونے کا وقت آیا تو بڑے بوڑھے بولے کہ دیکھئے! نامعلوم اب آپ سے ملاقات نصیب ہو یا نہ ہو ہم تو عمر طبعی کو پہنچ چکے ہیں، چراغ سحری ہیں، ہر وقت منتظر موت ہیں تو اس جوان نے کہا کہ آپ تو چراغ سحری ہیں کچھ عمر تو پائی ہے لیکن ہم چراغ شام ہی ہیں، ابھی

روشن ہوئے ہیں بلکہ اچھی طرح ابھی روشن بھی نہیں ہونے پائے۔ اگر ابھی ایک ہوا کا جھونکا لگ گیا تو گل بخلاف آپ کے کہ چراغ سحری ہیں، آپ پر رات تو سلامتی کے ساتھ گزر گئی ہے۔ اب صبح ہی کو احتمال گل ہونے کا ہے اور ہمیں تو رات کے بھی صحیح و سالم گزر جانے میں شک ہے۔ لہٰذا ہماری حالت آپ سے زیادہ قابل یاس ہے اور یاس ملاقات میں ہم آپ سے اول نمبر پر ہیں۔ لہٰذا اس حسرت ملاقات کی آپ سے کوئی خصوصیت نہیں بلکہ ہم اور آپ دونوں اس میں شریک ہیں۔

ماشاءاللہ! کتنا لطیف جواب دیا ہے اور واقعی بالکل سچ بلا مبالغہ کہا کہ ہم تو چراغ شام ہیں، ایک خفیف جھونکا ہوا کا ہمارے نیست و نابود کرنے کے واسطے کافی ہے۔ یہ بالکل نیا محاورہ ہے اور قابل داد جواب ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ بوڑھے اور جوان سب کے سب چراغ ہی کے مثل ہیں مگر کوئی چراغ شام ہے اور کوئی چراغ سحر، خطرہ سے کوئی خالی نہیں۔

غرض جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ابھی تو بچے ہیں پھر جوان ہوں گے پھر بوڑھے ہوں گے، پھر بہت بوڑھے ہوں گے۔ تو حضرت بتلایئے کہ آپ کے پاس وہ کون سا اللہ تعالیٰ کے یہاں سے ٹھوفکیٹ ہے کہ جس سے آپ کو اپنے جوان اور بوڑھے ہونے کا یقین ہو گیا یا کوئی وحی آپ کے پاس نازل ہوئی کہ جس نے آپ کو اس تحدی سے دعویٰ کرنے پر مجبور کیا۔ کیا خبر ہے کہ شاید یہ ساعت وہی ساعت ہو جس کو دنیا کی آخری ساعت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود۔ اور شاید ابھی آب و ہوا دنیا کی منقطع ہونے والی ہے۔ حیات دنیوی اجل مقدر پر پہنچ چکی ہو۔

عدم استحضار فنا دنیا

غرض یہ کہ اس قسم کے خیالات کا پیدا ہونا روشن دلیل ہے عدم استحضار فناء دنیا کی۔ گو ہم کو فنا ہونے کا عقیدہ تو ہے لیکن اس وقت کا استحضار نہیں، اور اگر ہے بھی تو زمانہ مستقبل بعید میں ہے لیکن اعتقاد یقین سب کو ہے حالانکہ مقصود شریعت کا جیسا کہ آیت بھی بدلالت واضح بتلا رہی ہے۔ یہی استحضار ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی استحضار کی تحصیل کا علاج بتایا ہے کہ:

کن فی الدنیا کانک غریب. (انظر تخریج الحدیث الرقم: ۱۲)

''یعنی دنیا میں اس طرح رہو جیسا کہ ایک مسافر'' اور اس کی حیات دنیوی کو ایسا سمجھو کہ ایک مسافر کی حالت سفر میں ہوتی ہے جس طرح کہ ایک مسافر اپنے سفر کی حالت میں پڑاؤ پر یا سرائے کی کوٹھڑی میں ہر وقت رخت بردوش بسر اوقات کرتا ہے اسی طرح تم بھی دنیا میں رہ کر بسر اوقات

کرو۔ دنیا کو سفر آخرت کی سرائے اور پڑاؤ سمجھو کہ جیسا اس کا قیام مطلوب نہیں ہوتا ایسے دنیا کا قیام بھی مقصود نہ ہونا چاہیے اور آپ کے اس کلام رحمت انضمام میں تو بوجہ اس کے ہم خطاب فرمایا ہے پھر کسی قدر ہمارے مذاق کی رعایت ہے اس وجہ سے کہ اس میں لفظ غریب' سے پھر بھی ایک قسم کا قیام فی الدنیا مفہوم ہوتا ہے۔ اگر چہ ایسا ہی ہو جیسا کہ ایک مسافر کا قیام منزل پر لیکن جو ارشاد آپ نے اپنی نسبت فرمایا ہے اس میں تو اتنے قیام کا بھی ابہام نہیں وہ ارشاد یہ ہے کہ:

''میرا دنیا سے کیا علاقہ! میری تو دنیا کے ساتھ ایسی مثال ہے جیسے کوئی سوار چلا جا رہا ہو اور چلتے چلتے کسی درخت کے سایہ میں کھڑا ہو جائے۔''

اور یہ بھی درحقیقت تفسیر اسی ارشاد کی ہے تا کہ اس تفسیر سے ہر قسم کے شبہات زائل ہو جائیں اور خلاف مقصود کا ابہام بھی نہ رہے۔ یعنی یہ نہ سمجھنا کہ ہم شب کو مقیم ہیں صبح ہم کو جانا ہے جیسے کہ مسافر خیال کرتا ہے کہ صبح کو جانا ہے بلکہ یہ سمجھو کہ ہم چل رہے ہیں۔

انسان ہر وقت سفر میں ہے

ہم ہر دم مسافرت میں ہیں، ہر وقت مسافرت سفر کو قطع کر رہے ہیں۔ اب اگر کسی ظاہر بین کو یہ شبہ ہو کہ ہم تو کہیں بھی کسی کو ہر وقت چلتا ہوا نہیں دیکھتے بلکہ بعض اوقات تو ہم حرکت تک بھی نہیں پاتے۔ چہ جائیکہ قطع مسافت بلکہ حرکت کی ضد سکون موجود ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر قطع مسافت متحقق ہونا محال عقلی ہے۔ اس وجہ سے کہ اجتماع ضدین محال ہے، سکون اور حرکت کا اجتماع ناممکن ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک قطع مسافت کے واسطے حرکت لازمی ہے لیکن جناب آپ نے یہ کیسے سمجھا کہ حرکت نہیں۔ آپ کو معلوم بھی ہے کہ حرکت کی دو قسمیں ہیں ایک حرکت مکانی اور ایک حرکت زمانی۔ تو یہاں پر حرکت مکانی اور انتقال اپنی تو بے شک نہیں ہے کیونکہ ظاہراً ہم دیکھتے ہیں کہ آخرت میں پہنچنے کے واسطے اللہ پاک نے کوئی زینہ نہیں بنایا جس پر چڑھ کر ہم آخرت میں چلے جائیں نہ کوئی سیڑھی ہے جس کو لگا کر آسمان پر پہنچ جائیں نہ کوئی میل دو میل کی مسافت ہے جس کو پیادہ یا سواری میں طے کر کے اللہ تعالیٰ کے ہاں پہنچ جائیں جیسے ہم ریل یا یکہ میں بیٹھ کر ایک شہر سے دوسرے شہر میں پہنچ جاتے ہیں لیکن اس حرکت مکانی کے نہ ہونے سے یہ کیسے لازم آیا کہ حرکت زمانی بھی نہیں بلکہ یہاں پر حرکت زمانی متحقق ہے۔ یعنی اگر چہ ہم ساکن محض ہیں لیکن زمانہ حرکت کر رہا ہے۔ وہ حرکت کرتے کرتے ایک ایسی آخری ساعت پر پہنچ جائے گا کہ جس کے بعد ہم آخرت میں ہوں گے نہ کسی

سیڑھی کے ذریعے سے نہ کسی زینہ کے واسطہ سے بلکہ حرکت زمانی کے ذریعے سے جو کہ ہمارے اختیار سے باہر ہے کیونکہ ہم حرکت زمانہ کے بڑھانے اور گھٹانے پر قادر نہیں چہ جائیکہ روکنے پر۔

اگر آپ یہ چاہیں کہ ہم آٹھ ہی کے گھنٹہ میں رہیں اور نو کے گھنٹہ میں داخل نہ ہوں تو چاہے سر سے پاؤں تک زور کیوں نہ لگائیں' ناممکن ہے کہ آپ نو کے گھنٹہ میں داخل نہ ہوں بلکہ آپ ضرور داخل ہوں گے اور اضطراراً داخل ہوں گے۔ حرکت زمانہ آپ کو مجبور کرتی ہے ورنہ اگر کوئی سیڑھی آخرت میں پہنچنے کی ہوتی تو ممکن تھا کہ ہم نہ چڑھتے مگر وہ تو اللہ تعالیٰ نے سیڑھی ہی ایسی عجیب بنائی ہے جو کہ اختیار سے بالکل باہر اور غیر محسوس ہے۔

لہٰذا حرکت زمانی ضرور متحقق ہے اور انتفاع احد الحرکتین مستلزم انتفاع ثانی کو نہیں تو جو لازم قطع مسافت تھا یعنی حرکت مطلقہ وہ موجود ہے اور جو منتفی ہے یعنی حرکت مکانی وہ لازم نہیں۔ اس وجہ سے کہ حرکت مطلقہ کا تحقق کسی ایک فرد سے ہوسکتا ہے جو یہاں فرد ثانی یعنی حرکت زمانی کے ضمن میں ہے۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ ہماری مثال ایسی ہے جیسے ایک مسافر سفر کو قطع کر رہا ہو' بالکل صحیح ہو گیا۔ یقیناً ہماری مثال ایک راہرو مسافر کی سی ہے جو اپنے سفر کو قطع کر رہا ہے۔ یہی حرکت زمانی ہے جو بوجہ خارج از اختیار و کسب ہونے کے سبب تغافل بنتی ہے کہ ہمیں اپنی حالت کی طرف التفات نہیں ہوتا۔ ہم نہیں سمجھتے کہ اس ساعت سے قبل ہماری کیا حالت تھی اور اب کیا ہے اور اس ساعت کے گزر جانے سے کس قدر حصہ ہمارے اس دنیوی حیات کا ختم ہو گیا۔

اسی وجہ سے محققین نے کہا ہے کہ بچہ جس وقت پیدا ہو کر ایک ماہ کا ہوتا ہے تو اس کی ماں کہتی ہے کہ میرا بچہ ایک ماہ کا ہو گیا لیکن درحقیقت وہ سمجھی نہیں کہ اس کی عمر سے ایک مہینہ کم ہو گیا جس ساعت سے اس نے دنیا میں قدم رکھا اسی وقت سے اس کی عمر سے ہر ہر ساعت محسوب ہونے لگی ہے اور اسی قدر حصہ عمر گھٹنے لگتا ہے جیسے برف ہوتی ہے کہ اس کو جس قدر رکھا جائے اسی قدر وہ برابر گھٹتی رہتی ہے حتیٰ کہ آخر ایک ساعت ایسی آئے گی کہ برف گل کر بالکل ختم ہو جائے گی۔

اس موقع پر ایک حکایت یاد آئی کہ ایک شخص کسی گاؤں کے رہنے والے ملازمت کی غرض سے وطن سے باہر گئے اور کسی جگہ جا کر ملازمت کی۔ چند ماہ بعد ملازمت سے رخصت لے کر جب گھر جانے لگے تو جہاں اور فرمائشیں اور عمدہ عمدہ چیزیں گھر لے جانے کے واسطے انہوں نے خریدیں ان میں دو چار سیر برف بھی تھی' چونکہ سامان بہت تھا' لے جانے میں دقت کے واقع ہونے کا احتمال تھا۔ تخفیف سامان کی غرض سے دو چار شخص انہی کے گاؤں کے جوان سے ایک دن پہلے جانے والے تھے

ان کو وہ برف کا پلندہ دے دیا کہ بھئی! یہ برف ہمارے گھر پہنچا دینا، تمہاری مہربانی ہوگی۔ ہمارے بوجھ میں کچھ تخفیف ہو جائے گی۔ کل ان شاء اللہ ہم بھی آ جائیں گے۔ انہوں نے وہ برف لے جا کر ان کے گھر پہنچا دی، وہ بے چارے دیہاتی گاؤں کے رہنے والے برف کے خواص کیا جانتے، اتنا جانتے تھے کہ ٹھنڈی چیز ہے اور قاعدہ ہے کہ اس کے موقع پر اہل خانہ جس شے کو مرغوب سمجھتے ہیں اس کو آنے والے شخص پر اٹھا رکھا کرتے ہیں کہ جب وہ آئے گا اسی وقت اس کو کھائیں پئیں گے۔ اس عادت کے موافق ان بے چاروں نے برف کو ویسے ہی معمولی کپڑے میں لپٹا ہوا اٹھا کر رکھ دیا کہ کل کو انہی کے سامنے جب وہ آئیں گے استعمال کریں گے۔ اگلے دن جب وہ صاحب گھر پہنچے تو مکان پر قیام کرنے کے بعد من جملہ دیگر تحائف کے برف کا بھی ذکر چھیڑا۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے کل ایک شخص کے ہمراہ برف بھیجی تھی، وہ پہنچی یا نہیں۔ گھر والوں نے نہایت خوشی سے کہا کہ ہاں وہ برف پہنچ گئی اور اب تک تمہارے انتظار میں ویسے ہی رکھی ہے، کسی نے چھوا بھی نہیں۔ اس نے کہا ہائیں! کیا وہ برف اب تک رکھی ہے؟ تمہارا بھلا ہو بے وقوفو! تم نے برف کو ہی کھو دیا، دیکھوں تو سہی وہ اب تک کیسے رکھی ہے، وہ خوشی خوشی اٹھانے گئے کپڑا جو کھول کر دیکھا تو برف کا پتہ بھی نہیں! صرف قدرے نمی کپڑے میں باقی ہے، اتنا بڑا برف کا ڈلا ندارد۔ کفن موجود مردہ غائب۔

دیکھئے! یہ بے چارے برف کی خاصیت سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے یہ ایسی شے ہے کہ اس کو جس قدر دیر تک رکھا جائے اتنی ہی گھٹتی چلی جاتی ہے۔ بخلاف دیگر اشیاء کے کہ وہ رکھنے سے محفوظ و مصؤن ہوتی ہیں۔ یہ غلطی کی اور اسی بھولے پن اور لاعلمی کے عالم میں رہ کر انہوں نے اپنے ہاتھوں سے برف کھو دی۔ ایسے ہی برف کی طرح ہماری عمریں ہیں کہ ان میں برابر انحطاط کا عالم ہے۔

ہر ساعت انسان کی عمر گھٹتی ہے

ہر ساعت ہر لحظہ ہماری عمر کا ایک بیش بہا قیمتی حصہ برف کی طرح پگھلتا ہے اور ہم ان دیہاتیوں کی طرح غافل ہیں اور نہیں سمجھتے۔ آخر کار ہمارا انجام بھی وہی ہونے والا ہے جو ان کا ہوا تھا جس طرح انہوں نے اپنے ہاتھوں سے برف کو کھویا تھا اسی طرح ہم بھی اپنی عمر کو کھو رہے ہیں۔ کسی دن ہاتھ جھاڑ کے الگ ہو جائیں گے اور یہ گراں قیمت عمر تمام ہو جائے گی۔ اس وقت بجز کف افسوس ملنے کے اور کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔

یہی غفلت و لاپروائی بناء ہے تمام دنیا کی لذات و اہل دنیا کی دلچسپیوں کی اور یہی ہے وہ مار آستین جو نیچے نیچے ہماری جڑ کھوکھلی کر رہا ہے اور اس عزیز سفر کی منزل کو کھوٹا کر رہا ہے۔ کاش! ہم

لوگوں کی آنکھوں سے یہ غفلت کے پردے اٹھیں اور ہم ہوش میں آ کر اس تپ دق کی چارہ جوئی کریں اور اس لاعلاج مرض کی دوا کی فکر کریں۔ وہی دوا جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم جیسے مریضوں کے واسطے اس کو علاج تجویز کیا ہے وہ یہی کہ ہر وقت اپنے کو ایک راہرو مسافر تصور کریں اور دنیا کو اپنی منزل مقصود کی شاہراہ خیال کریں۔ اس وظیفہ کا ہر وقت ہر ساعت استحضار رکھیں۔ اٹھتے بیٹھتے ہر وقت اس مراقبہ میں رہیں' اپنی حیات دنیویہ کو ایک مسافر کی حالت سفری سے زائد خیال کریں جس طرح ایک مسافر اپنے سفر میں وہی کام کرتا ہے جو اس کے سفر کے معین ہوتے ہیں۔ منزل مقصود پر جلد سے جلد پہنچانے والے ہوتے ہیں اور جو چیزیں اس کے سفر کو کھوٹا بنانے والی اور مخل مقصود ہوتی ہو ان کو ہرگز اختیار نہیں کرتا۔ آپ نے کہیں نہ دیکھا ہوگا کہ ایک مسافر جو اپنے منزل مقصود پر جلد سے جلد پہنچنے کا قصد رکھتا ہے وہ راستہ میں کہیں کھیل تماشا میں مصروف ہو یا کسی دلچسپ چیز سے دل بہلانے کا خیال کرے بلکہ جو موانع اتفاقیہ پیش آ کر مخل مقصود بنتے ہیں اور نقصان منزل کا باعث بنتے ہیں ان کی وجہ سے بھی طبیعت کو سخت کوفت ہوتی ہے۔ اگر کہیں مرکب خراب ہو جاتا ہے تو نئی سواری کی کوشش کرتا ہے۔ اگر کہیں گاڑی لیٹ ہو جاتی ہے تو بے حد غمگین ہوتا ہے اگر کہیں گارڈ گاڑی کی رفتار تیز کر کے اس نقصان کو پورا کرتا ہے تو اس سے بہت مسرت انتہا درجے کی ہوتی ہے۔ غرض اگر کہیں اتفاقیہ نقصانات پیش آ جاتے ہیں تو ان کے جبر نقصان کے درپے اور تلافی مافات میں کوشاں رہتا ہے۔

سفر آخرت کا سا اہتمام

یہ شان ہمارے اسفار دنیویہ کی ہے۔ ہم کو چاہیے کہ کم از کم یہی شان اور یہی اہتمام اپنے سفر آخرت میں بھی پیدا کریں کہ جس طرح اسفار دنیویہ میں موانع سفر سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ اتفاقیہ نقصان پر طبیعتوں میں آثار غم پاتے ہیں اور جو امور معین ہوتے ہیں ان کی طرف رغبت کرتے ہیں۔ اسی طرح اس وقت ہم کو چاہیے کہ اپنی ہر ہر نقل و حرکت کو تنقیدی نظر سے دیکھیں کہ آیا یہ ہمارے سفر آخرت کے واسطے عائق ہے یا معین۔ اگر کوئی حالت یا کوئی فعل ہمارا مانع سفر ہے تو اس سے احتراز کریں اور اس کو اپنے حق میں رہزن منزل شمار کریں جس طرح کہ ایک مسافر اپنی حالت میں جان و مال کی چور ڈاکوؤں سے حفاظت کرتا ہے۔ اسی طرح ہم بھی ان امور کو اپنے حق میں رہزن و غارتگر شمار کریں اور جو امور ہمیں اس سفر میں مدد دینے والے ہیں' منزل مقصود تک جلد سے جلد پہنچانے والے ہیں ان کی طرف دوڑیں' انہیں رغبت کے ساتھ بطیب خاطر اختیار کریں۔

غرض ہر وقت اپنی حالت پر محاسبانہ نظر رکھیں اور یہ خیال رکھیں کہ کہیں کوئی خار راہ ہمارے

اس شاہراہ پر رونما نہ ہو یا کسی ظلمت کا اثر اس روشن راستہ پر نہ پڑے جس کی ظلمت میں ہم ہاتھ پیر مارتے ہوئے بھٹکتے پھریں اور صراط مستقیم سے دور جا پڑیں۔ مختصر یہ ہے کہ ہر حالت کو معین سمجھ کر اختیار کریں اور مانع سمجھ کر اس سے احتراز کریں۔

مگر افسوس! ہماری غفلت حد سے بڑھ گئی' لا پروائی کی کچھ انتہا نہیں' مادہ عقل بفضل تعالیٰ ہمارے اندر بہت کچھ موجود ہے' کاش! ہم کو ہوش آئے اور ہم غور کریں اور تامل کی نظر سے دیکھیں تو سمجھ سکتے ہیں کہ یہ امور ہمارے حق میں مضرت رساں اور نقصان دہ ہیں۔ نتیجہ ہمارے ان افعال کا بجز اضاعت وزیاں کے اور کچھ نہیں۔

نفس کی حیلہ بازی

مگر وائے بر ماد برحال کہ ہماری اس قدر ردی حالت ہوگئی ہے کہ اگر کسی وقت اپنے ان ناسزا افعال پر توبہ کا خیال بھی ہوتا ہے تو نفس حیلہ باز فوراً کہتا ہے کہ میاں ابھی کیا ہے۔ ایک مرتبہ پیٹ بھر کر گناہ کرلیں تو پھر ایک دفعہ ہی توبہ کرلیں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آج توبہ کریں اور کل پھر کسی دلچسپ گناہ کی طرف میلان خاطر ہو اور ارتکاب معصیت میں مبتلا ہوں تو فضول توبہ ٹوٹے گی' محنت ٹوٹے گی' اللہ تعالیٰ کے سامنے جھوٹے بنیں گے' منہ دکھانے کو جگہ نہ رہے گی۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ اول ایک طرف سے فارغ البالی حاصل کرلیں۔ تب دوسری طرف مائل ہوں گے' گناہ کرکے ایک دفعہ پیٹ بھرلیں پھر توبہ کی فکر کریں گے۔

افسوس! ہماری مثال بالکل اس مسافر کی سی ہے جو ایک دور دراز سفر کا عازم ہے سفر سخت اور منزل دشوار ہے وہ راستہ میں اپنے گھوڑے کی ایک ٹانگ توڑ دے اور کہے کہ دوسرا گھوڑا عمدہ لے کر سفر کریں گے۔ پھر دوسرے گھوڑے کا یہی حشر کرے۔ غرض اسی طرح سے وہ اپنے مرکب کا جانی دشمن بن جائے تو آپ ہی بتلایئے کہ کیا یہ مسافر اس منزل سے ایک قدم بھی آگے بڑھ سکتا ہے یا کوئی عاقل اس کی نسبت سوال کرسکتا ہے کہ یہ کسی صورت سے کسی زمانہ میں منزل مقصود تک پہنچ جائے گا ہرگز نہیں' اس طرح تو یہ یہاں سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔

یہی کیفیت ہماری ہے کہ رات دن معاصی میں مبتلا رہتے ہیں اور اپنے مرکب عمر کے ہر ہر قدم کو توڑ کر دوسرے مرکب کی ہوس میں ہیں' پھر کسی وقت جو کچھ ٹوٹی پھوٹی توفیق طاعات کے بجالانے کی میسر آتی ہے اور جو کچھ نماز روزہ ادا کرتے ہیں تو اس سے دوچند معاصی کا بوجھ اپنی گردن پر لاد لیتے ہیں تو بھلا کیا ہم اس مسافر کی طرح کوئی قدم بھی سفر آخرت کی طرف اٹھا سکتے

ہیں یا انچ دو انچ مسافت قطع کر سکتے ہیں ہرگز نہیں بلکہ جس طرح وہ مسافر بیچ میں پڑا ہوا ہے کہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔اسی طرح ہم ہیں کہ شاہراہ آخرت پر ایک قدم نہیں بڑھا سکتے یہی نہیں بلکہ ہم اتنے تو بدنصیب ہیں کہ اس مسافر کی طرح ایک حالت پر بھی قائم نہیں رہے بلکہ جس قدر ہم آگے بڑھتے ہیں اس سے دو چند پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

اس وقت ایک حکایت حسب حال یاد آئی کہ ایک عزیز کسی ملازمت پر مامور تھے' رخصت لے کر مکان پر آئے' رخصت ختم ہونے پر آئی۔احتیاطاً ذرا پہلے چلنا چاہا' شام کا وقت تھا' گھر والوں نے بہت روکا مگر وہ بھی تھے ضد کے پورے' کہا نا صاحب! میں تو ابھی گاؤں جاؤں گا ورنہ میرا بہت حرج ہوگا' چاہے کچھ بھی ہو۔ چنانچہ وہ اپنی ہٹ کے مطابق گھر سے چل کھڑے ہوئے۔ چلتے چلتے کچھ جھٹ پٹا سا ہو چلا تھا۔گھر سے تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ رات ہوگئی۔اتفاق سے زمانہ مہینہ کی آخری تاریخوں کا تھا۔رات اندھیری تھی اور اتفاق سے اس وقت سخت گہری گھٹا اور اس کے ساتھ کچھ ترشح بھی ہو رہا تھا۔اندھیرے کیوجہ سے راستہ بھول گئے اور اتفاق کی بات کچھ ایسا راستہ سے بچھڑے کہ ساری رات چکر لگایا مگر راستہ ہی ہاتھ نہ آیا بلکہ کچھ ایسے چکر میں پڑے کہ آدھی رات اپنے ہی گاؤں کو ہولئے۔ جب صبح ہوئی تو سامنے اپنا گاؤں دکھائی دیا۔ جب مسجد میں پہنچے تو کہیں ان کے گھر کے سامنے ایک جامع مسجد تھی اور اس میں ایک برگد کا درخت تھا تو آپ اس مسجد کو دیکھتے ہی فرماتے ہیں کہ بھئی! یہ تو بالکل ہمارے ہی ہاں کی سی جامع مسجد ہے اور کسی نے برگد بھی تو ہمارے مسجد ہی کا اکھاڑ کر یہاں لگا دیا ہے۔مگر کتنی زبردست مشابہت ہے کہ بالکل وہی معلوم ہوتی ہے ذرا بھی تو فرق نہیں' آگے جو بڑھے تو سامنے ہی سے اپنے مکان کا دروازہ دکھلائی دیا۔ دیکھ کر فرمایا: افوہ! یہ گھر تو بالکل ہمارے ہی گھر کی طرح ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بالکل ہمارا ہی گھر ہے'یعنی سارا دروازہ' چبوترہ' چوکیاں بالکل ویسے ہیں۔

مگر اس ماجرہ کے دیکھ کر اب ذرا ان کی طبیعت میں وحشت سی ہونے لگی۔ چلتے چلتے اپنے مکان کے دروازے کے سامنے پہنچے' اب تو سخت حیران کہ یاالٰہی یہ کیا ماجرا ہے! کہیں سچ مچ یہ ہمارا گھر تو نہیں' کبھی خیال آتا کہ ہو نہ ہو یہ تو ہمارا ہی گھر ہے' کبھی دل میں سوچتے کہ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا' پھر کہتے نہیں' یہ تو بیداری ہے۔ یہ دیکھو!

میرے ہاتھ پیر حرکت کر رہے ہیں' میں چل رہا ہوں۔غرض اسی کشش و پنج میں تھے کہ اتنے میں آپ کے بھتیجے نماز فجر کے لیے مکان سے نمودار ہوئے۔ چچا کو دیکھ کر سلام کیا اور پوچھا کیا ہوا'

بھتیجے میں کوئی شک نہ تھا' فرمانے لگے لاحول ولاقوۃ! لعنت ہے ہم پر اور ہماری عقل پر۔ ساری رات تو جنگل میں ٹھوکریں کھاتے پھرے' بارش میں بھیگے' میلوں کی مسافت طے کی مگر جہاں سے چلے تھے وہیں کے وہیں موجود۔ آگے ایک فرلانگ بھی نہیں بڑھے۔

جیسے تیلی کا بیل اپنے ایک ہی مرکز پر دن بھر چلتا رہتا ہے اور اپنے دل میں سمجھتا ہے کہ میں نے ایک طویل مسافت میلوں کی قطع کرلی۔ مگر درحقیقت وہ جس جگہ سے چلا تھا وہیں موجود ہے جس مرکز پر اول پھیرے میں گھومتا ہوا نظر آتا تھا۔ اسی مرکز پر اس وقت تک سرگرداں ہے۔

ایسے ہی ایک صاحب تھے کہ ان کا گھوڑا بڑا ہی ہٹی تھا اور پرلے درجے کا شریر تھا۔ من جملہ دیگر شرارتوں کے اس میں ایک شرارت یا مرض یہ بھی تھا کہ جب لید کرتا تھا تو جب تک لوٹ کر اس کو سونگھ نہ لیتا کبھی آگے نہ بڑھتا۔ وہ بے چارا راکب بھی اس کی شرارت سے عاجز آ گیا تھا مگر مجبور تھا کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا تھا۔ اس مصیبت میں اس بے چارہ کو ایک سفر کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ مجبوراً اسی ٹٹو پر سوار ہو کر چلا۔ اس نے اپنی وہی ہٹ شروع کی اور جہاں لید کی پیچھے مڑ کر سونگھا اور آگے چل دیا۔

اتفاق سے راستہ میں ایک اور شخص بھی سفر کر رہا تھا۔ اس نے گھوڑے کا یہ ڈھنگ دیکھا اور سخت متعجب ہوا۔ پوچھا' میاں! یہ گھوڑا عجیب نرالی صفت کا ہے ایسا تو نہ کہیں دیکھا نہ سنا۔ اس نے کہا میاں! کیا بتاؤں! اس کم بخت گھوڑے نے مجھ کو مصیبت میں ڈال رکھا ہے۔ اس میں ایک مرض یہ ہے جس سے میں عاجز آ گیا ہوں' پھر اس کو مفصل کیفیت سنائی۔ اس نے کہا' دیکھو! اس کا علاج میں کیا اچھا کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے اپنا گھوڑا اس کے پیچھے کرلیا اور جب وہ لید کر کے سونگھنے کا قصد کرتا تو یہ پیچھے سے ایک چابک رسید کرتا اور اس کو منہ تک نہ موڑنے دیتا' مارے خدا خدا کر کے ایک بہت سا حصہ راستہ کا پرامن عجلت کے ساتھ گزر گیا۔

آگے چل کر اس دوسرے مسافر کو کسی دوسرے راستہ پر جانا تھا' وہ ایک موقع پر اس سے جدا ہوا اور کہا کہ لو بھائی! جس قدر میرے امکان میں تھا میں نے تم کو اس مصیبت سے بچایا اب تم جانو اور تمہارا گھوڑا' میں تو اب رخصت ہوتا ہوں۔ اس بے چارے نے بہت کچھ شکریہ ادا کرنے کے بعد اس کو رخصت کیا۔

اس کے جاتے ہی گھوڑے نے گردن موڑ کر دیکھا' جب خوب اطمینان کرلیا کہ اب وہ سوار میرے پیچھے نہیں ہے اور چلا گیا ہے اب کسی قسم کا خطرہ نہیں رہا تو وہیں سے رک کر لوٹا اور جہاں

جہاں لید کی تھی اور سونگھا نہ تھا' سب کو لوٹ کر باری باری سونگھا' سوار نے بہتیرے ہاتھ پیر مارے مگر کم بخت باز نہ آیا اور اس کی ساری منزل کو کھوٹا کیا۔

یہ سب اس دوسرے رفیق سفر کی عنایت کا نتیجہ تھا۔ اگر اس کی یہ عنایت نہ ہوتی تو سفر تو کھوٹا نہ ہوتا' جتنا راستہ کٹتا جس طرح بھی اور جس زمانہ میں بھی کٹتا کچھ وصول تو ہوتا مگر یہ تو اتنی دیر کی محنت و مشقت سب بیکار گئی اور جہاں تھے پھر وہیں کے وہیں آ پہنچے۔ ہنوز روز اول کا مضمون ہوگیا۔ حالانکہ اس رفیق سفر نے اپنے خیال کے مطابق بہت بڑا احسان کیا تھا لیکن بعض وقت کا احسان بھی بدسلوکی سے بدتر ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی واقعہ سے مشاہدہ ہوگیا۔

تو واقعی بالکل اسی حکایت کے مطابق ہماری حالت ہے۔ یہ دیکھئے ہماری نفس پروری کہ ان واقعات کو سن کر تو کس قدر تعجب کرتے ہیں اور صاحب واقعہ کو افسوس ناک حالت میں خیال کرتے ہیں مگر اپنے گریبان میں منہ ڈال کر نہیں دیکھتے کہ ہم خود اس مرض کے شکار ہیں اس مسافر سے زائد افسوس ناک حالت ہماری ہے۔ بہت سے خداترس بندے ہم میں ایسے ہیں جو پچھلی رات کو اٹھتے ہیں' نوافل ادا کرتے ہیں' عاجزی کے ساتھ دعائیں مانگتے ہیں توبہ استغفار کرتے ہیں' فریضہ پنجگانہ کے پابند روزے رکھنے کے عادی ہیں۔

عبادات پر غیبتوں کا اثر

مگر افسوس کہ اس صلوۃ اللیل اور نوافل و جمیع عبادات و ریاضات پر پانی پھیرنے کے واسطے وہ ایک دو غیبتیں جو صبح اٹھتے ہی ان کے منہ سے اپنے بھائیوں کے حق میں نکلتی ہیں کافی ہو جاتی ہیں اور تمام عبادات و ریاضت کا حاصل و انجام یہ دو غیبتیں ہی ہو جاتی ہیں جو کہ عذاب اخروی کا ذریعہ کے واسطے کافی ہیں' تمام کیا کرایا خاک میں مل جاتا ہے اور جس حالت میں تھے اور جس جگہ تھے پھر وہیں لوٹ آتے ہیں جس طرح اس مسافر کو اس شریر گھوڑے نے سر راہ منزل پر لا ڈالا تھا۔ اسی طرح یہ وہ برائیاں جو کہ محض شرارت نفس کا نتیجہ ہیں پھر ہم کو ایسے غار ذلت میں لا ڈالتے ہیں' اتنی بڑی غفلت! غضب خدا کا۔ اس کی علت محض یہی ہے کہ وہی استحضار فنا دنیا نہیں جس کا رونا تھا اور وہی احساس قطع مسافرت و مسافت نہیں ہے جس کی ضرورت تھی۔ یہ نہیں سمجھتے کہ ہم مسافر ہیں' سفر کر رہے ہیں' دور دراز منزل ہمارے سامنے ہے بلکہ اپنے آپ کو مقیم سمجھتے ہیں حالانکہ ہم ہر حالت میں باعتبار حرکت زمانی کے مسافر ہیں۔ پس جس طرح ہم بوجہ حرکت مکانی کے اپنے کو مسافر سمجھتے ہیں اسی طرح بوجہ حرکت زمانی کے بھی مسافر سمجھنا چاہیے۔ فرق دونوں

مسافرتوں میں صرف یہی ہے کہ یہ سفر اول باعتبار حرکت مکانی کے سفر نہیں ہے اور یہی فرق ہے جس پر احکام عبادات کا تغیر و تبدل ہوتا ہے۔

سفر ثانیہ پر ہے یعنی مسافرت بحسب المکان ہی کو اصطلاح فقہاء میں سفر کہا جاتا ہے جس کو تم بھی اپنے روز شب کی اصطلاح میں سفر سے تعبیر کرتے ہو۔ چنانچہ جس وقت یہ انتقال مکانی ہوتا ہے اس وقت قصر کا حکم دیا جاتا ہے اور انسان مسافر سے تعبیر کیا جاتا ہے ورنہ مقیم کہا جاتا ہے اور جس سفر کا فرمان نبویؐ میں ذکر ہے جس کے اعتبار سے تم ہر وقت مسافر ہو۔ یہ منشاء اور دارو مدار تغیر احکام کا نہیں۔ اس سفر پر قصر ثابت نہیں اس کو خوب غور سے سن لو کبھی نفس و شیطان کے مغالطہ میں پھنس جاؤ کہ ہم جب بروئے حدیث مسافر ٹھہرے تو مسافر کے واسطے تو قصر کا حکم ثابت ہے۔ رباعی نماز اس کے حق میں ثنائی ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم پھر کیوں بجائے دو کے چار پڑھیں۔ اللہ دے اور بندہ لے چلو دو رکعتوں سے تو فرصت ملی۔

جس طرح ایک جاہل کی حکایت ہے کہ وہ ہمیشہ قصر کیا کرتے تھے خواہ وطن اصلی ہی میں ہوں۔ ایک شخص نے سوال کیا کہ آپ ہر حالت میں قصر کرتے ہیں خواہ سفر میں ہوں یا حضر میں یہ تو صریح مخالفت ہے احکام فقہیہ شرعیہ کی تو انہوں نے جواب دیا کہ ہمارا یہ فعل اگر فقہ کے مخالف ہے تو ہو حدیث کے تو موافق ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عابر سبیل اور مسافر کے احکام فرمائے ہیں اور ہماری حالت قیام فی الدنیا کو سفر سے تعبیر کیا ہے لہٰذا ہم اگر قصر کرتے ہیں تو کونسا برا کام کرتے ہیں۔

اسی طرح ایک اور صاحب تھے اگر ان کو ایک میل جانے کی بھی ضرورت پیش آتی تو وہ قصر کرلیا کرتے تھے۔ ان سے کسی شخص نے کہا کہ آپ کا یہ طرز عمل عجیب و نرالا ہے جو تمام روایات فقیہہ کے خلاف ہے۔ کسی امام کے مذہب پر بھی ایک میل کی مسافت میں قصر نہیں۔ آج تک کسی نے اس کو مدت سفر قرار نہیں دیا۔ جواب دیا کہ ہمیں کسی امام کے مذہب سے کیا لینا۔ جب نص صریح کلام اللہ میں موجود ہے:

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ. (النساء:۱۰۱) (اور جب تم زمین میں سفر کرو)

اس سے بڑھ کر اور کونسی نص ہوسکتی ہے کیونکہ ضرب فی الارض ایک میل کی مسافت پر بھی صادق آتا ہے۔ لہٰذا ہم بموجب اس آیت کے قصر کرتے ہیں تو اس شخص نے جواب دیا کہ اگر قصر کا ثبوت محض ضرب فی الارض سے ہے تو اس کے معنی لغوی تو زمین پر قدم مارنے اور چلنے کے ہیں۔ لہٰذا اگر مکان سے مسجد میں آ کر نماز پڑھا کریں تب بھی قصر لیا کریں۔ اس وجہ سے کہ اطلاق لغوی

موجود ہے۔ اتنی دور چلنے سے بھی آپ۔کے قول پر زمین پر پیر مارنے کا اطلاق آ سکتا ہے۔ اس میں کسی مقدار کی تعیین تو ہے ہی نہیں تا کہ اس کا لحاظ کیا جائے۔

ایسے ہی ایک صاحب تھے' چلتے چلتے مغرب کا وقت ایسی جگہ آیا جہاں سے ایک طرف مسجد تھی' بیچ میں سڑک اور ایک طرف خالی میدان' مغرب کی اذان ہوگئی۔ انہوں نے میدان کی طرف ہو کر تیمّم کیا اور نماز پڑھنا شروع کی' نماز کے بعد کسی نے پوچھا ان سے کہ پانی تو سامنے مسجد میں موجود تھا آپ نے تیمّم کیوں کیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ میاں میرے پاس تو پانی نہیں' مسجد میں اگر ہے تو میں کیا کروں اور قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے۔

فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا. (النساء:۴۳-المائدہ:۶)

''پھر تم کو پانی نہ ملے تو تم پاک زمین سے تیمّم کر لیا کرو۔''

بتلاؤ کہ میرے پاس پانی کا وجود کہاں ہے۔ لہٰذا رخصت شرعی میرے حق میں ثابت ہے۔

غرض ان حکایات کے بیان کرنے سے یہ ہے کہ ہم لوگوں کا مذاق بگڑ گیا ہے کہ جہاں تک ہوتا ہے نفس کی سہولتیں تلاش کرتے ہیں کہ کسی طرح نفس پر بار نہ پڑے اور ویسے ہی جان چھوٹ جائے۔ لہٰذا بموجب اس مذاق کے کہیں آپ یہ نہ سمجھ جائیں کہ جب ہم اس حدیث کے موافق مسافر بن گئے تو آج سے بس قصر کرنا شروع کر دیں' چلو دو رکعت سے جان چھٹی اب ایسی ترکیب کریں کہ ان دو سے بھی جان چھوٹ جائے۔ خواہ وہ غرض جس کے اعتبار سے منطوق حدیث مسافرت کو ثابت کرتا ہے حاصل ہو یا نہ ہو اس کا کوئی ثمرہ مرتب ہو یا نہ ہو' دنیا اور اس کے متعلقات سے نفرت پیدا ہو یا نہ ہو' بس نفس کو کسی طرح سے آرام مل جائے اس کے آسائش کی صورتیں پیدا ہو جائیں۔

سود پر اصرار............زکوٰۃ سے گریز

چنانچہ ہم نے ایسی بزرگ ہستیاں بھی سنی ہیں جو خوب دھڑلے سے سود لیتے ہیں۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ سود لینا تو حرام ہے تو کیوں لیتے ہو؟ تو نہایت بے باکی سے جواب دیتے ہیں کہ ہندوستان دارالحرب ہے اور دارالحرب میں سود لینا بعض علماء کے مذہب میں جائز وحلال ہے' ہم ان لوگوں ہی کے مذہب پر عمل کرتے ہیں۔ بتلاؤ اس میں کیا حرج ہے لیکن جب زکوٰۃ دینے کا وقت آتا ہے اور ان سے زکوٰۃ دینے کا سوال ہوتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بھائی ہمارا تو سارا مال حرام ہے' سودی ہے اور غیر کا حق ہے' حق غیر میں زکوٰۃ کہاں! اس وجہ سے ہم زکوٰۃ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ تم ہی بتلاؤ کہ ہم کیوں کر زکوٰۃ ادا کریں' اگر ہمارا مال سودی نہ ہوتا تو ہم بھی بطیب خاطر زکوٰۃ ادا کرتے۔ دیکھئے! نفس کی کتنی

زبردست چال ہے، کیسا عجیب بہانہ چھانٹتا ہے کہ لینے کے وقت تو جو کچھ بھی آ جائے حلال ہے اور اگر نہ بھی حلال ہو تب بھی حلال ہے۔ اور دینے کے وقت حرام اعلیٰ درجہ کا حرام بلکہ تمام دنیا کے حرام مالوں سے بڑھ کر حرام کیونکہ اس وقت دینا بھی پڑتا ہے، غرض ہر وقت نفس اس قسم کے بہانے تراشتا رہتا ہے اور سہولت کی صورتیں چھانٹتا رہتا ہے۔ حضرت شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

چوں شتر مرغے شناس ایں نفس را   نے بردبارد نہ پرد بر ہوا
گر بہ پرگوئیش گوید اشترم   در نہی بارش بگوید طائرم

یعنی نفس کی مثال شتر مرغ کی سی ہے کہ جب اس سے اڑنے کو کہا جاتا ہے تو کہتا ہے میاں! تم بھی عجیب آدمی ہو۔ اڑنے کو مجھ سے کہتے ہو، کہیں اونٹ بھی دنیا میں اڑا ہے۔ میں تو اونٹ ہوں اونٹ، تم میرا نقشہ اور صورت نہیں دیکھتے۔ بتلاؤ میں اونٹ سے کس بات میں کم ہوں اور جب کہا جاتا ہے کہ اچھا اگر تم اڑنے سے اس لیے معذور ہو کہ تم اونٹ ہو تو پھر اونٹ ہی کے سے کام کرو، بوجھ لادو اور آگے آگے چلو تو جواب دیتا ہے کہ میاں تم بھی آنکھوں سے اندھے، عقل سے خارج معلوم ہوتے ہو، تم کو میرے دو بڑے بڑے بازو اور لمبے لمبے پر نظر نہیں آتے۔ کہیں پرندوں نے بھی بوجھ لادا ہے وہ تو اس واسطے وضع کیے گئے ہیں کہ اڑتے پھریں۔ غرض جس صورت میں عافیت نظر آتی ہے اسی کو اختیار کرتا ہے، اگر اونٹ بننے میں بوجھ لادنا پڑتا ہے تو پرندہ بن جاتا ہے اور پرندہ بننے میں جب اڑنے کی مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے تو اونٹ بن جاتا ہے۔

اسی طرح نفس ہے کہ جب عیش و عشرت کے سامان ہوتے ہیں اور دلچسپیوں کا انتظام ہوتا ہے تو قوی ہو جاتا ہے خوب ہاتھ مارتا ہے، دل کھول کر گناہ کرتا ہے اور جب کبھی نماز روزہ کا ذکر ہوتا ہے تو ضعیف بن جاتا ہے، بہانے تراشتا ہے، اگر کوئی بے چارہ خدا سے بہت کچھ خوف کر کرا کے پچھلی رات کو اٹھنے کا قصد کرتا ہے تو اسے تھپک کر یہ اطمینان دلا کر سلاتا ہے کہ ابھی بہت رات باقی ہے، ابھی اٹھ کر پڑھ لیں گے۔ اسی طرح تھپک تھپک کر سلاتا رہتا ہے اور اطمینان دلاتا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ صبح ہو جاتی ہے۔

اسی طرح اگر کسی خدا کے بندے پر بہت کچھ خوف و خشیت غالب ہوتا ہے۔ ہیبت خداوندی طاری ہوتی ہے گناہوں کی بھیانک صورتیں اس کے سامنے عذاب کو کھینچ کر لاتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں تو توبہ کا قصد کرتا ہے مگر نفس فوراً سدراہ بن کر عائق ہوتا ہے کہ واقعی ضرور توبہ کرنا چاہیے مگر ذرا ایسا تو ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں عہد شکن اور بدعہد تو نہ کہلائیں۔ یہ ایک گناہ اور کر لیں تو واقعی ضرور توبہ کریں گے۔ للہ در القائل ما احسن قال

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم   باز چوں فرداشود امروز رافر داکنم

(ہر رات کہتا ہوں کل اس خیال کو ترک کردوں گا جب کل ہوتی ہے تو کہتا ہوں کل کردوں گا)

روز کہتا ہے کہ کل ضرور توبہ کروں گا آج تک جو کچھ گناہ ہونے تھے ہو گئے اگر ایک آدھ اور کوئی باقی رہے گا تو ہو جائے گا۔ پھر خوب مضبوط توبہ ہوگی' پھر جب کل ہوتی ہے تو اس سے اگلی کل پر حوالہ کرتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی نفس کا ایک بہانہ ہے کہ حرام مال کھانے کے وقت ہندوستان کو دارالحرب مان لیا اور بے خوف وخطر سود کھایا اور جب زکوٰۃ دینے کا وقت آیا تو حرام مال بتلا دیا۔ پھر مسئلہ بھی کیسا من گھڑت تراشا ہے بالکل بے اصل اور بے بنیاد کیونکہ زکوٰۃ کا وجوب محض مال کے مملوک ہونے پر ہے۔ اگر کسی کی ملک میں بقدر نصاب مال موجود ہے خواہ وہ حلال ہو یا حرام سے مخلوط ہو تو زکوٰۃ ضرور واجب ہوگی اور اگر مال مخلوط بہ حرام سے زکوٰۃ ادا نہ کی جائے گی تو دو سزائیں مرتب ہوں گی۔ ایک تو حرام مال کھانے کمانے کی (جس کا اقرار اپنے منہ سے کرتے ہیں) دوسرے زکوٰۃ کے ادا نہ کرنے کی بخلاف زکوٰۃ ادا کرنے کی صورت کے کہ اس وقت صرف ایک جرم عائد ہوگا کہ مال حرام کیوں کمایا تھا' زکوٰۃ دینے کے جرم میں تو ماخوذ نہ ہوگا' اگرچہ عذاب اخروی کے لیے پہلا جرم بہت کافی ہے مگر خیر کچھ کمی تو ہو جائے گی۔

حاصل یہ ہے کہ ہمیں اپنے آپ کو باعتبار سفر اخروی کے مسافر سمجھنا چاہیے تھا۔ اس میں تو مقیم سمجھا (کیوں؟ محض اس وجہ سے کہ اگر اپنی حالت سفر کو مدنظر رکھیں گے تو پھر ان لذائذ سے دلچسپیاں کون لے گا' ان عیش وراحت کے سامانوں کا لطف کون اٹھائے گا) اور اصطلاح فقہاء کے اعتبار سے اپنے کو مقیم سمجھنا چاہیے تھا' وہاں مسافر بن بیٹھے' کیوں؟ محض اس وجہ سے کہ یہاں سہولت نظر آتی ہے' فریضہ وقتی میں تخفیف ہوتی ہے بجائے چار کے دو ہی پڑھنی پڑتی ہے حالانکہ جس اعتبار سے ہماری یہ حالت حالت مسافرت ہے یعنی انقضاء عمر دنیا اس کا بالکل خیال ہی نہیں گزرتا کہ وہ کونسی منزل مقصود ہے جس پر ہم کو یہ دور دراز مسافرت قطع کر کے پہنچنا ہے۔

عملی اور دائمی مراقبہ کی ضرورت

یہی وجہ ہے کہ ہم دنیا کی دلچسپیوں میں سرشار ہیں' اسباب عیش ونشاط مہیا ہیں' عیش وطرب میں مست ہیں' کچھ دنیا و مافیہا کی خبر نہیں۔ کاش! کہ استحضار اس سفر اخروی کا ہو جائے اور اس کا جزم کامل واعتقاد راسخ ہو جائے کہ ہم کو اس دنیا سے ضرور کوچ کرنا ہے یا ہم اس دنیا میں ایک غریب مسافر کی طرح کسی منزل کے رہرو اور کسی شاہراہ کے طے کرنے والے ہیں۔ کوئی عظیم

الشان منتہی ہماری اس مسافرت شدیدہ کی ہے جس کے اہتمام شان کے باعث ہم کو اتنی کاوشیں اس سفر کے قطع کرنے اور اس تک پہنچنے میں برداشت کرنا ضروری ہیں مگر اس کا تو کوسوں بھی گمان نہیں۔ ہاں چار رکعت کی دو رکعت کرنے کے لیے ہر دم آمادہ ہیں۔ صاحبو! جس وقت ہمارا یہ وظیفہ عملی اور دائمی طور سے سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے یہی مراقبہ ومعائنہ ہو جائے گا تو اس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ دنیا سے طبیعت برداشتہ ہو جائے گی۔ بجائے دلچسپی کے وحشت پیدا ہوگی۔

اسباب تنعم وآلات تلذذ انتہادرجہ کے موحش ومؤلم بن جائیں گے۔ ہر چیز سے جی گھبرانے لگے گا' ایک ساعت بھی دنیا میں ٹھہرنا دشوار ہوگا۔ خواہ مخواہ طبیعت کا اقتضا ہوگا کہ جس طرح بھی ہو چلو۔ جب یہاں دوام وخلود ہی نہیں تو پھر ان چیزوں کا ہم سے ایک نہ ایک دن چھوٹنا ضروری ہے۔ لہٰذا ابھی سے ہم ہی ان کو چھوڑ کر چلیں اور ایسی جگہ چلیں کہ جہاں پر دوام وخلود ہو' سکون و اطمینان سے زندگی بسر کریں۔

یہ تو بالکل موٹی سی بات ہے کہ جب کسی آدمی کو کسی جرم پر جیل خانہ بھیج دیا جاتا ہے تو اس کی وہ جیل کی کوٹھڑی سخت ہیبت ناک اور وحشت سے پر معلوم ہوتی ہے۔ ایک ساعت بھی جی نہیں لگتا ہر وقت یہی فکر رہتی ہے کہ جس طرح بن پڑے یہاں سے نکل چلو۔ اسی طرح جب اس استحضار کے باعث دنیا سے جی اچٹ جائے گا تو اس وقت وہی دنیا جو عیش ونشاط کا مرکز ودلچسپیوں کا سرچشمہ' لذائذ کا منبع تھی' اس کی حقیقت بجز ایک وحشت کدہ اور حسرت ناک' ہیبت انگیز مجلس کے اور کچھ نہ رہے گی۔ ہر طرف سے مہیب صورتیں نظر آنے لگیں گی۔ اس وقت دنیا یا اس کی کسی دل بہلانے والی چیز سے دل لگانا ناممکن ہوگا' ترک دنیا کے اسباب وذرائع کی فکر ہوگی۔ تحصیل آخرت کے وسائط وذرائع کی طلب ہوگی۔

وعدہ خداوندی

وعدہ خداوندی یہ ہے: وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا. (العنکبوت:۶۹)

''اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے قرب وثواب یعنی جنت کے راستے ضرور دکھاویں گے۔''

لہٰذا بموجب وعدہ کے سفر آخرت جس کی سعی وکوشش میں تم سرگرداں ہو گے' سہل ہو جائے گا' راستہ منکشف ہوگا' اس شاہراہ مقصود سے غفلت ولاپروائی کی تاریکی دور ہو جائے گی' اسکے بعد کامیابی کی مبارک صورتیں نظر آئیں گی۔ منزل مقصود قریب تر اور سہل الحصول معلوم ہوگی۔ یہ تو

نقلی دلیل ہے استلزام مذکور کی۔ نیز جب کہ استحضار فنا و مفارقت دنیا ہونے کے بموجب محبت دنیا منقطع ہوگی اس کی ظلمت کے آثار کافور ہوں گے۔ اس انقطاع حب دنیا سے وہ ظلمات دنیویہ جن میں اب تک ملوث تھے دور ہو جائیں گی۔ جہالت کی تاریکیاں یک طرف ہوں گی تو اس وقت لازمی طور پر ایک نور پیدا ہوگا جس سے قلب روشن ہو جائے گا' راستہ سفر آخرت کا منور ہو جائے گا۔ یہ شاہراہ عمل جگمگا اٹھے گی جس کے بعد سفر کرنا نہایت آسان اور منزل مقصود پر پہنچنا نہایت سہل ہوگا۔ امیدیں قرب الٰہی کی قوی ہوگی۔ اس طرح سے کہ اسی نور میں یہ نظر آئے گا۔

کیونکہ مخلوقات خداوندی بے کار و بے فائدہ نہیں۔ ان حوادث کی کوئی غرض و حکمت ضرور ہے۔ منجملہ ان حکمتوں کے ایک حکمت یہ بھی ہے کہ کوئی فعل حسب عادت اللہ اثر سے خالی نہیں رکھا گیا۔ خواہ عتاب ہو یا ثواب۔ یہ نہیں ہے کہ کوئی بندہ اس دار المحن میں کوئی فعل یا کوئی عمل کرے اور اس پر ثواب یا عقاب مرتب نہ ہو اور ہم بعض افعال و اعمال کو دیکھتے ہیں کہ ان پر دنیا میں کوئی ثواب و عقاب مرتب نہیں ہوتا۔

مثلاً ایک شخص ہے کہ اس نے آج کوئی مستحسن شرعی فعل کیا تو ہم اس پر کوئی خاص اثر یا کوئی خاص ثواب مرتب ہوتا ہوا نہیں دیکھتے' یا کوئی شخص ہے کہ وہ نہایت ہی قبیح امر کا مرتکب ہوتا ہے' شراب پیتا ہے یا زنا کرتا ہے اس پر کوئی گناہ کا اثر یا کسی قسم کا عذاب وغیرہ نہیں پاتے' بس جب اس عالم میں بعض اعمال پر آثار مرتب ہوتا ہوا نہیں دیکھتے تو معلوم ہوا کہ کوئی نہ کوئی اور عالم ماسوا اس عالم کے ضرور ہے جس میں ان اعمال کے آثار مرتب ہوں گے اور ثمرات ان اعمال کے ضرور ملیں گے۔ یہ استلزام کی عقلی دلیل ہے۔

لیکن میں لزوم عقلی اصطلاحی کا دعویٰ نہیں کرتا بلکہ عقلی بمعنی ترجح کا مدعی ہوں۔ یعنی ممکن کی دونوں جانبیں وجود و عدم کی مساوی ہیں۔ ان میں سے عقلاً ایک جانب کا رواج ہونا بصورت عدم تحقق مانع کے۔ چنانچہ معاد بھی فی نفسہ ایک امر ممکن مساوی الطرفین ہے یعنی عدم وجود اس کے دونوں فی نفسہ مساوی' نہ وجود ضروری ہے نہ عدم لازمی ہے لیکن عقل اس کے جانب وجود کو ترجیح دیتی ہے بوجہ انعدام مانع کے کیونکہ آج تک کوئی دلیل عقلی قابل اعتماد اس کے امتناع پر قائم نہیں ہوئی۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ معاد ممکن عقلی بمعنی مذکور ہے اور ترجیح دلیل عقلی مذکور سے ثابت ہے۔ اب ترجیح سے آگے رہا وجوب' سو وہ نصوص قطعیہ شرعیہ سے واجب ثابت ہے۔ لہٰذا معاد کا ثبوت جو ممکن عقلی تھا' مخبر صادق کا قول اس کو وجوب شرعی کی جانب لے آیا۔ پس اب وہ ممکن عقلی واجب شرعی ہو گیا۔ یہی معاد ہے لیکن اس معاد کے ثبوت کی طرف التفات کیوں ہوا۔ محض اس وجہ سے کہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ اشیائے فانیہ کے مشاہدہ فناء سے ان سے طبیعت برداشتہ ہوتی۔ پھر جب دنیا سے طبیعت گھبرائی اس

وقت دوسرے عالم کی طلب ہوئی۔ (چنانچہ بتقریر مذکور یہ امر واضح ہوچکا) لہٰذا معلوم ہوا کہ مضمون اول یعنی استحضار فناء دنیا کے واسطے معاد و بقاء آخرت کا خیال لازم ہے۔ اول چونکہ بدیہی ظاہر و باہر ہے لہٰذا اس کا جو لازم ہے وہ بھی بدیہی اور واضح ہوگا کیونکہ ظاہر کا لازم ظاہر ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ اس لزوم کی تقریر بھی مذکور ہوچکی۔ پس معلوم ہوا کہ فی نفسہ تمام مضمون ظاہر ہے مگر عارض کے سبب جو غفلت ہے اس لیے تنبیہ کی حاجت ہے۔ پس اسی تنبیہ کے لیے اس وقت یہ بیان کیا جاتا ہے۔

دنیا بجز لہو ولعب کے کچھ نہیں

چنانچہ اسی غفلت کے ازالہ کے لیے ارشاد ہے:

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ[۱] (العنکبوت ۶۴)

"یعنی یہ دنیا اور جس قدر اس کے متعلقات ہیں سب من کل الوجوہ لہو ولعب ہیں، بجز اس کے اور کچھ اس کی حقیقت نہیں۔" باری تعالیٰ نے اس مقام پر یعنی مقام اثبات معاد میں اس آیت کو ذکر فرمایا حالانکہ اثبات معاد کا علم اوپر آیت معاد سے بھی ہوچکا اور آگے:

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ. (اور اصل زندگی عالم آخرت ہے) سے زیادہ اور ہو جائے گا پھر جو دنیا کے لہو ولعب ہونے کا ذکر فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ مقصود اللہ تعالیٰ کا کسی ایسی بات کی طرف اشارہ کرنا ہے جسے آیت ماقبل و مابعد نے ادا نہ کیا تھا اور وہ بھی کہ اگرچہ معاد کا یقین تو

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا.[۲] (العنکبوت ۵۸)

اور وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ.[۳] (العنکبوت ۶۴)

"اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کیے ہم ان کو جنت کے بالا خانوں میں جگہ دیں گے۔" اور "اصل زندگی عالم آخرت ہے۔"

سے بھی ہوگیا ہے اور اعتقاد آخرت کے واسطے تو یہ بھی کافی ہے لیکن مقصود محض آخرت کی خبر دینا اور صرف معاد کا علم کرانا ہی نہیں ہے بلکہ اس یقین واعتقاد پر جو ثمرہ مرتب ہونا چاہیے وہ معظم مقصود ہے یعنی عمل للآخرۃ جس سے شغل دنیا مانع تھا۔ گویا اس جگہ استدلال سبب سے ہے۔ مسبب پر اس طرح کہ دنیا و مافیہا کا جب لہو ولعب میں داخل ہونا متحضر ہوگیا تو یہ سبب ہوجائے گا استعداد للآخرۃ کا۔ پس مسافر آخرت سے ہرگز یہ امید نہیں کی جاتی کہ وہ منہیات میں مشغول ہوکر اپنے عزیز سفر اور کٹھن منزل کو کھوٹا کرے جبکہ ایک مسافر اسفار دنیویہ میں اس قسم کے افعال سے گریز کرتا ہے تو ایک مسافر آخرت کو تو لازمی طور سے اس پر کاربند ہونا اور منہیات سے اعراض کرنا چاہیے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ مقصود خداوندی اس آیت اثبات معاد کے سلسلہ میں بیان کرنے سے یہ ہے کہ جس طرح اعتقاد ویقین معاد مطلوب ہے اسی طرح اعراض عن الدنیا بھی مقصود ہے جو مفضی الی العمل ہے۔ گویا مقصود کے دو جزو ہیں اور ان دونوں اجزائے ترکیبیہ سے مل کر وہ مقصود تیار ہوتا ہے۔ ایک علم دوسرا عمل۔ پہلی اور مابعد کی آیت پر علم آخرت کی طرف متوجہ کیا تھا۔ اس آیت میں اعراض عن الدنیا کی تعلیم دے کر عمل للآخرۃ پر متوجہ کیا ہے اور خداوند تعالیٰ نے جہاں بھی علوم کا تذکرہ کیا ہے ان سے مقصود محض علوم ہی نہیں ہوتے بلکہ اعمال بھی مقصود ہوتے ہیں جن کے لیے علوم وسیلہ ہوتے ہیں۔

محض اعتقاد کافی نہیں

بہت سے لوگ خوش ہیں کہ ہم آخرت کے قائل ہیں۔ معاد پر ہمارا ایمان ہے ہمیں کس بات کا فکر ہے۔ سو ہوشیار رہو، یہ بھی نفس کا ایک دقیق مغالطہ ہے۔ محض اعتقاد مقصود کے اتمام کے لیے ہرگز کافی نہیں، یہ ایمان بدون عمل کے بدرجہ کمال معتبر نہیں (گو کسی درجہ میں مفید ضرور ہے) آج کل لوگوں کا عجیب مذاق بگڑا ہے کہ محض اعتقاد ہی کو نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ عمل کی گویا کوئی ضرورت ہی نہیں۔

اس کا سبب محض غلبہ جہل ہے اور جہل کا سبب یہ ہے کہ آج کل لوگوں نے علم اور اہل علم سے موانست ومجالست ترک کر دی۔ بزرگان دین کے پاس جا کر بھی نہیں پھٹکتے۔ جن مجالس میں علوم دینیہ کا تذکرہ ہوتا ہے وہاں جی نہیں لگتا جس کا ثمرہ یہی ہے کہ اس قسم کی غلطیوں میں پڑتے ہیں اور گمراہ ہوتے ہیں اور اعمال تو اعمال آج کل تو اعتقادات کے اندر بھی جس کو سب ضروری سمجھتے ہیں عجیب گڑبڑ ہے۔ اعتقادات کی تصحیح بھی بدون مجالست اہل علم کے دشوار ہے۔ پس اول تو اعتقاد محض کافی ہی نہ تھا اور اگر ان کے زعم میں کافی تھا تو حیرت ہے کہ اس کی بھی تکمیل نہیں کرتے۔

چنانچہ اس وقت بہت کم لوگ ایسے ملیں گے جن کے اعتقادات موافق اصول شریعت ہوں اور وہ اس فرقہ اہل حق میں داخل ہوں جن کی نسبت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری اُمت تہتر فرقوں میں منقسم ہوگی جس میں سے بہتر فرقے ناری ہوں گے اور ایک فرقہ ناجی ہوگا۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہ کون سا فرقہ ہے جو ناجی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "ماانا علیہ واصحابی"[1] (یعنی جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ) سو اس طریق پر بہت کم لوگ ہیں اور جو تھوڑے سے ہیں وہ بھی اس غلطی میں گرفتار ہیں کہ ان سے بعض لوگوں نے اس "ماانا علیہ" کو اعتقادات کے اندر منحصر کر رکھا ہے۔ یعنی وہ

[1] (تفسیر ابن کثیر ۴: ۲۳۰، تفسیر القرطبی ۴: ۱۶۰، ۱۲: ۱۳۰، ۱۳۰، اتحاف السادۃ المتقین (۲: ۵۱، ۸: ۱۳۹، ۱۴۱)

کہتے ہیں کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے ساتھ محض اعتقادات میں بھی مطابقت ہوگئی تو فرقہ ناجیہ میں داخل ہونے کے واسطے یہی کافی ہے حالانکہ یہ ان کی سخت غلطی ہے کہ انہوں نے مطابقت کو صرف اعتقادات میں منحصر کر دیا ہے اور ما کو خاص کر دیا ہے علوم یقینیہ کے ساتھ۔ حالانکہ یہ مطابقت عام ہے جمیع افعال و اعمال کو جس کی بناء یہ ہے کہ "ماانا علیہ" میں لفظ ما عام ہے اس میں کسی قسم کی تخصیص نہیں پس جس طرح یہ اعتقادات کو شامل ہے اسی طرح عادات، افعال، اخلاق، اعمال کو بھی شامل ہے۔ گویا جس طرح فرقہ ناجیہ میں داخل ہونے کے واسطے تصحیح عقائد ضروری اور لازم ہے اسی طرح اس کے دیگر متممات کا ہونا بھی ضروری اور لازم ہے مگر آج کل بہت لوگ اس قسم کے پائے جاتے ہیں جو محض تصحیح عقائد کے بعد اہل حق ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے کو "ماانا علیہ واصحابی" کے زمرے میں داخل کرتے ہیں اور بڑے غضب کی بات یہ ہے کہ یہ نام نہاد خوش اعتقاد لوگ جن بزرگوں سے تعلق رکھتے ہیں اور جن سے وابستہ ہوتے ہیں وہ بزرگ بھی صرف تصحیح عقائد پر ہی اکتفا کرتے ہیں اور ان افعال و اعمال سے اصلاً تعرض نہیں کرتے بلکہ خوش ہو کر فرماتے ہیں کہ بھئی فلاں صاحب بڑے خوش عقیدہ ہیں۔ یہ گویا ان کی بڑی تعریف اور لیاقت کی توصیف ہوتی ہے اور اگر ان کے اعمال کو دیکھا جائے تو خواہ ایک فاسق سے بھی بڑھ کر کیوں نہ ہوں مگر ان سب سے قطع نظر کر لی جاتی ہے۔

حالانکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو کہ بدون عمل کے یہ تصحیح اعتقاد بھی محض زبانی جمع خرچ ہے، پورا اعتماد بھی نہیں کیونکہ اعتقاد جازم کے لیے عادۃ افضاء الی العمل لازم ہے۔ پس یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص کے دل میں اعتقادات شرعیہ راسخ ہوں اور عقائد میں وہ "ماانا علیہ واصحابی" کے طریق پر ہو اور اعمال اس قسم کے ہوں جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب و تبعین کے اعمال میں یوں ہو اور فساق دنیاداروں سے بڑھ چڑھ کر ہو۔

اور اس آفت کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے زمرہ میں جو لوگ اہل حق کہلاتے ہیں ان کے اوپر یہ رحمت خدا کی ہے کہ وہ بھی "ماانا علیہ واصحابی" میں اعتقادات کو کافی سمجھتے ہیں اور ان کے عادات اخلاق سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ جب یہ تعرض ترک کرتے ہیں اور مسامحت سے کام لیتے ہیں تو وہ بھی آزاد ہو جاتے ہیں اور جوان کا نفس پسند کرتا ہے وہی عمل اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ بعضے ان میں سے اہل باطل اور ہوا پرستوں کا طرز معاشرت اور دنیا داروں کا فیشن اختیار کرتے ہیں۔ بزرگان دین کے طرز طریقہ کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ اہل حق کی تعلیمات کو دقیانوسی خیالات سے

تعبیر کرتے ہیں تو اہل حق کی یہ سخت غلطی ہے بلکہ نفس کی ایک بڑی زبردست چال ہے کہ اس نے ان بزرگوں کو ایک غیر مستحسن شرعی فعل کے تعرض سے باز رکھا ہے۔

غرض جس طرح موافقت اعتقادات میں شرط ہے دیگر اعمال وافعال میں بھی ضروری اور لازمی ہے اور اس سے معلوم ہوا کہ اہل سنت والجماعت میں اہل حق ہونے کا وہی لوگ دعویٰ کر سکتے ہیں جن کے عقائد کی طرح تمام اعمال وافعال وطرز معیشت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے طرز پر ہو۔ ان کے اخلاق نمونہ ہوں، اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اور ان کے معاشرت ایسی ہی مستحسن ہو جیسی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی تھی۔ نیز بزرگان دین کے شعائر کو جان سے زائد عزیز سمجھیں، دلوں میں ان کی قدر ہو، آنکھوں میں وقعت ہو، شعائر اہل باطل سے نفرت ہو۔

اہل فیشن کے شبہات مع حل

آج کل کے نوجوانوں کی طرح نہ ہوں کہ انہوں نے اپنے اعتقادات میں اس بات کو بھی شامل کر لیا ہے کہ اہل حق کا شعار ٹھکرا دینے کے قابل ہے اور جو نیا فیشن ایجاد ہو تو وہ بدل وجان قبول کرنے کے لائق ہے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اہل حق بننے کے واسطے تو اعتقادات کی طرح اور چیزیں بھی ضروری ہیں جن کو تم چھوڑے ہوئے ہو اور یہ دعویٰ تمہارا اس وقت صحیح ہوگا جب کہ تم اپنے باطن کی طرح ظاہر کو بھی اہل حق کے ساتھ ملا لو گے اور ان کے جیسے عادات واخلاق، ان کا سا طرز معیشت، انداز معاشرت بھی اختیار کرو گے۔

تو فوراً بادی النظر میں ایک زبردست شبہ پیش کرتے ہیں کہ جناب! اگر آپ ایسے ہی عموم کے مدعی ہیں تو پہلے اپنی ہی خیر منائیں، ہماری بعد میں خبر لیجئے کیونکہ خیریت سے آپ بھی فرقہ اہل حق سے خارج ہوئے جاتے ہیں اور "مااناعلیہ واصحابی" (جس پر میں اور میرے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں) کے طریق مستقیم سے ہٹے جاتے ہیں۔

چاہ کن راچاہ درپیش

(جو دوسرے کے لیے گڑھا کھودتا ہے خود گڑھے میں گرتا ہے)

آپ ہمیں ہٹا ہوا بتلاتے تھے آپ خود ہٹ گئے، بتلائیے کہ ایسی چولی دار اچکنیں اور سینہ کھلے ہوئے انگرکھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور اصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے کب پہنے تھے اور اس قسم کے سلیم شاہی جوتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب نے کب پہنے تھے۔

صفحات تاریخ اس قسم کے طرز معاشرت نبویؐ کے بیان کرنے سے بالکل معرا بلکہ منکر ہیں۔ یہ آپ کے غرارے دار تنگ موہری کے پاجامے اس کا پہننا کون سی احادیث نبوی میں آیا یا آثار صحابہ سے ثابت ہے بلکہ اوراق تاریخ پر زوردار الفاظ کے ساتھ اور احادیث واضح بیان کے ساتھ ہم کو یہ بتلا رہی ہیں کہ بحیثیت مجموعی تمام صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم و آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لباس مبارک میں تین کپڑے ہوتے تھے۔ ایک تہ بند اور ایک کرتہ ٹخنوں کے قریب تک اور چادر، اور جو لوگ بہت زیادہ غریب ہوتے تھے وہ بے چارے ایک کرتے یا ایک تہ بند ہی میں گزر کرتے تھے۔ ہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم و نیز متمول صحابہ سے عمامہ اور قبا کا بھی ثبوت ملتا ہے اور جوتے وہی تسمہ دار ہوتے تھے۔ بہر حال یہ لباس اور اس قسم کے جوتے کہیں بھی پہننے ثابت نہیں ہوتے اور حضرت! یہ تو فرمائیے کہ یہ پلاؤ قورمے، بریانیاں اور یہ نفیس نفیس کھانے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے کب کھائے تھے۔ اکثر اوقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بسر اوقات جو یا خرما پر تھی۔ شاذ و نادر آپ سے گیہوں کا استعمال ثابت ہے۔ لہٰذا آپ بھی "ما انا علیه و اصحابی" کے طریق پر ہونے کے واسطے ان مرغن کھانوں کو چھوڑ کر نان جویں پر بسر اوقات کیجئے اور اس کے بعد اہل حق ہونے کا دعویٰ کیجئے۔

لیکن یہ شبہ بھی ہوائے نفس کا ایک پیچیدہ جال ہے حل اس شبہ کا یہ ہے کہ اگرچہ میں بحیثیت افراد تعمیم ہے اور ہر چیز اس میں داخل ہے لیکن پھر بھی ایک قسم کی تخصیص اس میں موجود ہے جس کے بعد مقصود اس جملہ کا یہ متعین ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیئت و وضع کو ہر بات میں اختیار کیا جائے لیکن وضع و ہیت سے مراد محض وضع متعارف یعنی وضع فعلی ہی نہیں بلکہ اس کے تحت میں اجازت قولی بھی (جس کو اگر وضع قولی کے نام سے تعبیر کیا جائے تو بہت مناسب ہے) داخل ہے یعنی جس طرح اس امر کو اختیار کرنا جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عملدرآمد رہا ہے۔ ما انا علیہ کا مصداق ہے اسی طرح ہر اس عمل کو اختیار کرنا جس کے اختیار کرنے کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت فرمائی ہے۔ اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل نہ کیا۔ ہو نیز ما علیہ کا مصداق ہے اور ہر دو قسم کے اعمال ما انا علیہ یعنی وضع نبویؐ کے تحت انا میں داخل ہیں اور اہل حق بنانے کے واسطے کافی ہیں۔ لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ اس قسم کے انگرکھے، اچکنیں جوتے نہیں پہنے اور اس قسم کے کھانے پلاؤ زردے نہیں نوش فرمائے لیکن اس قسم کے توسعات کے حاصل کرنے کی آنحضرت نے اجازت دی ہے جس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ یہ مسلم امر

ہے کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بڑھ کر کوئی ما انا علیہ پر عمل پیرا نہیں ہوسکتا بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نمونہ عملی نبویؐ ہیں۔ چنانچہ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اقتداء کو بھی ذریعہ نجات اخروی کا قرار دیا اور صفحات تاریخ کی ورق گردانی سے یہ توسعات وتنعمات صحابہ زمانہ خلافت راشدہ وعروج اسلامی میں صاف ظاہر ہیں جو کہ زمانہ ابتداء اسلام وحیوۃ نبویؐ میں نہ تھے۔ نیز حیوۃ نبویؐ میں ابتداء زمانہ اسلام وانتہاز مانہ اسلام میں صحابہ کی حالت میں تغیر ہونا اور فقر کے بعد اسباب راحت کا اختیار کرنا بالکل ظاہر وباہر ہے۔ چہ جائیکہ بعد از حیوۃ نبویہؐ۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ ہر ایک قسم کے تنعمات حاصل کرنے اور خوشی عیشی کے اسباب اختیار کرنے کی بشرطیکہ حدود شرعیہ میں داخل ہوں اجازت نبویؐ سنت قولی سے ثابت ہے۔ لہٰذا اس پر عمل کرنے کے بعد بھی فرقہ اہل حق میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں۔ اگرچہ سنت فعلی وخاص طریقہ عمل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ نہ ہو۔ لہٰذا جو کی روٹی کھانا سنت ضرور ہے اور اس پر عمل کرنا اور اعلیٰ وافضل اور بہت خوب ہے۔ اگر ممکن ہو اور وسعت میں داخل ہو کیونکہ ہر ایک سنت پر عمل کرنے کا ہر ایک کا حوصلہ نہیں۔

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک مرتبہ حضرت خواجہ بہاء الدین صاحب نقشبندیؒ کی نظر سے وہ حدیث گزری جس میں طرز معیشت صحابہ کا منقول ہے کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم جو کو پیستے تھے اور پھونک کر جو کچھ موٹے موٹے چھلکے ہوتے ان کو اڑا دیتے اور بغیر چھانے ہوئے ویسے ہی گوندھ کر روٹی پکاتے اور تناول کرتے تھے۔ اگرچہ یہ حدیث سینکڑوں مرتبہ نظر سے گزری ہوگی لیکن اس مرتبہ یہ بات یہ قلب پر اثر کر گئی اور التفات خاص ہوا کہ کیا وجہ ہے کہ ہماری معیشت معیشت نبویؐ وطریقہ صحابہؓ کے موافق نہ ہو اور ہم پر تکلف کھانے کھائیں تو آپ نے تلامذہ سے ارشاد فرمایا کہ ہم آج سے ایسی جو کی روٹی بلا چھنے آٹے کی کھایا کریں گے۔

چنانچہ مطابق ارشاد دوسرے دن جو کی روٹی اسی طرح تیار ہوئی اور آپ نے تناول فرمائی چونکہ تمام اناج میں جو کی بھوسی سخت ہوتی ہے اور بغیر چھانے روٹی پکائی گئی تھی اس وجہ سے سب کے پیٹ میں درد ہوگیا اور ایسی سخت تکلیف ہوئی کہ دوسرے وقت کھانے کی ہمت نہ ہوئی۔

اللہ اکبر! ان حضرات کے مراتب عالیہ ان مقالات سے منکشف ہوتے ہیں اگر کوئی ہم جیسا نفس پرست ہوتا تو معاً یہ خیال ہوتا اور خیال کیا معنی بلکہ بہت سے منہ پھٹ زبان سے یہ کہتے کہ میاں اچھا سنت پر عمل کیا کہ پیٹ ہی کو پکڑے پکڑے پھرتے ہیں۔ اگر دو چار مرتبہ اور سنت پر عمل کیا تو شاید دنیا ہی سے چل بسیں، ہم باز آئے ایسی سنت پر عمل کرنے سے مگر ان حضرات کا ادب دیکھئے کہ

آئندہ کے لیے جو کے کھانے کو تو چھوڑتے ہیں مگر اس طرح کہ سنت نبویؐ پر ذرا برابر بھی غبار نہ آنے پائے اور آپ نے یہ بھی نہیں کہا کہ نفس کش اور سخت پیروں کی طرح سے جو کا کھانا لازم کر لیتے کہ جو چاہے ہو گزرے۔ اگر چہ پیٹ میں درد ہو لیکن جو کھانا نہ چھوڑیں گے بلکہ کمال یہ کیا کہ جو بھی چھوڑ دیا اور سنت پر بھی الزام نہ آیا۔ آپ نے ان دونوں باتوں کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ جمع کر دیا۔

چنانچہ فرماتے ہیں کہ ہم نے بے ادبی کی کہ من کل الوجوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وصحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مساوات کا قصد کیا جو کہ من وجہ مساوات کا دعویٰ ہے۔ ہمارا یہ دعویٰ مساوات محض غلطی تھی جس کی ہم کو سزا دے دی گئی۔ سنت پر کسی قسم کا الزام نہیں بلکہ درحقیقت ہم میں قصور ہے کہ ان مراتب عالیہ کی تحصیل اور ان کے تحمل سے ہمارا نفس قاصر ہے۔ یہ طریقہ حضرات صحابہ ہی کے مناسب ہے، وہی اسی کے متحمل تھے، ہم کو اس کی ہوس نہ کرنا چاہیے۔

شیوخ کے فرائض

چنانچہ مولانا ارشاد فرماتے ہیں:

چار پارا قدر طاقت بار نہ ‏ ‏ ‏ ‏ بر ضعیفاں قدر ہمت کار نہ

(چوپاؤں پر ان کی طاقت کے موافق بوجھ رکھو، کمزوروں سے طاقت کے موافق کام لو)

گو اس شعر میں مولانا تعلیم فرما رہے ہیں شیوخ کو کہ طالبین سے ان کی ہمت و طاقت کے موافق کام لو، طاقت سے زیادہ کام نہ لو ورنہ

طفل راگر ناں وہی بر جائے شیر ‏ ‏ ‏ ‏ طفل مسکیں را ازاں نامردہ گیر

بچہ کو دودھ کی جگہ روٹی دینا اس کو ہلاک کرنا ہے۔ حافظ شیرازی بھی اس شعر میں اس مضمون کو کس خوبی سے ادا کرتے ہیں:

خستگاں راچو طلب باشد و قوت نبود ‏ ‏ ‏ ‏ گر تو بیداد کنی شرط مروت نبود

(کمزوروں کو جب طلب ہو اور قوت نہ ہو تو ان کی قوت سے زیادہ کام لے کر تم ظلم کرتے ہو جو شرط مروت کے خلاف ہے)

بعض لوگ حافظ شیرازی پر بے ہودہ حملہ کرتے ہیں کہ صاحب وہ مدہوش شرابی کبابی تھے۔ ان کا کلام عارفانہ کہاں سے آیا تھا، سو یہ کہنا محض ان کی غلطی اور خباثت نفس کی دلیل ہے مگر اس میں کچھ حضرت حافظ کی تخصیص نہیں، اس قسم کے اعتراضات اہل کمال پر ہمیشہ ہوتے رہے ہیں اس سے ان کی شان پر کسی قسم کا دھبہ نہیں آتا بلکہ اور زیادہ کمال ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے علوم

ایسے عالی ہیں جہاں تک ہر ایک کی عقل نہیں پہنچتی۔

حضرت حافظ کے کلام سے نہایت اہم مسائل تصوف مستنبط ہوتے ہیں۔ان کے کلام کی لطافت ان کے عرفان اور اہل دل ہونے کے شاہد ہے۔ان کی عالی دماغی ان کے اعلیٰ مضامین سے ٹپکتی ہے۔یہ ناممکن ہے کہ ایک نا قابل اور غیر مستعد مدہوش شخص کے کلام سے اس قدر مسائل تصوف مستنبط ہوں۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ "میاں جو ہوتا ہے وہی نکلتا ہے" یعنی کسی کے مضمون یا کلام سے اعلیٰ مضامین یا پیچیدہ مسائل علمیہ اسی وقت نکالے جا سکتے ہیں جب کہ اس میں ان مضامین کا اندراج قصداً ہو ورنہ کسی رند کے کلام سے تو تم یہ مسائل نکال دو۔ لہٰذا حضرت حافظ شیرازی کے کلام سے اس قسم کے مسائل تصوف کا مستنبط ہونا ان کے شیخ کامل ہونے کی دلیل ہے۔وہ خود فرماتے ہیں:

خستگاں را چو طلب باشد و قوت نبود ۔۔۔ گر تو بیداد او کنی شرط مروت نبود

(کمزوروں کو جب طلب ہو اور قوت نہ ہو تو ان کی قوت سے زیادہ کام لے کر تم ظلم کرتے ہو جو شرط مروت کے خلاف ہے)

یہ بھی تعلیم ہے سخت مزاج شیوخ کو کہ وہ اپنے مریدین پر سہولت کریں اور حسب استعداد قوت ان سے کام لیں' ایسا نہ ہو کہ ان کی صحت جسمانی میں بھی نقصان واقع ہو اور دل و دماغ بھی خراب ہو جائے پھر کسی کام کے نہ رہیں۔

اناڑی شیوخ کا طرز عمل

مثلاً کسی بے چارے کا دل شوق محبت سے لبریز ہو' خدا کی طلب اعلیٰ پیمانہ پر ہو لیکن ساتھ ہی ضعف و پیری کی یہ حالت ہو کہ کمر جھک گئی ہو' تھوڑی دور چلنے سے سانس پھول جاتا ہو' اس کو چوبیس ہزار بار ورد اسم ذات شریف کا ورد کرنے کی طاقت نہ ہو' وہ بے چارا کسی شیخ کا مرید ہوا اور شیخ نے فرمایا کہ چوبیس ہزار ورد اسم ذات شریف روزانہ کیا کرو۔اس نے کہا کہ اجی حضرت! چوبیس ہزار بار اسم ذات کر کے میں کہاں کا رہوں گا' ایک ہی دن میں مر مٹوں گا' فرمایا کچھ حرج نہیں' اگر مر گئے تو شہید ہو گئے' طلب خدا میں مشغول ہو' ایسے وقت کی موت شہادت کے ثواب کی مستحق بلکہ اعلیٰ درجہ کا شہید بنا دیتی ہے۔خوب درست فرمایا' واقعی اس بیچارے کی شہادت میں تو کچھ کلام نہیں یہ تو ضرور شہید ہو گا لیکن آپ بھی ہوشیار رہیں' اس کے شہید کرنے والے تم ہی ہو' اس کو تو جام شہادت نصیب ہوا لیکن آپ کے نامہ اعمال میں ایک قتل عمد کا جرم لکھا گیا اور قاتل کا خطاب مل گیا۔

چنانچہ ایک شیخ تھے دہلی میں، وہ تمام مریضوں کو ایک ہی لکڑی سے ہانکتے، کسی ضعیف وقوی کا کوئی امتیاز نہیں رکھتے تھے، ان کے ہاں جوان بوڑھے سب کا وظیفہ عمل یکساں تھا۔ چنانچہ ایک شخص مرید ہوا، اس کو آپ نے صلوٰۃ معکوس تعلیم فرمائی، اس نے شیخ کا فرمان ہرگز قابل روگردانی نہ سمجھا اور بے چارے نے موافق تعلیم شیخ کے صلوٰۃ معکوس پڑھی تو دم نکل گیا۔ تو جب ان سے تذکرہ ہوا تو فرمایا، کچھ حرج نہیں، اچھا ہوا شہید ہوگیا، تزکیہ نفس کامل طور سے ہوگیا۔

اس کی مثال وہی تھی جیسے ایک طبیب تھے مگر خدا کے فضل سے علم سے کورے اناڑی محض تھے۔ ان کے پاس ایک مریض آیا، آپ نے اس کے واسطے مسہل تجویز کیا اور نہایت سخت اجزاء تجویز کئے اور کہا کہ جا کر کھالو اس سے دست ہوں گے، مریض نے ادھر دوا کھائی، ادھر دست آنے شروع ہوئے، جب دستوں کی تعداد متعارف سے زائد ہوگئی تو اہل خانہ کو تشویش پیدا ہوئی۔ حکیم صاحب کے پاس گئے اور کہا کہ حضرت دست بے حد آ رہے ہیں، مریض پر ضعف وقتاً فوقتاً بڑھتا جارہا ہے کہا کہ ابھی کیا ہے میاں آخر مسہل ہے، کوئی ہنسی کھیل تو نہیں، دست تو آئیں گے ہی اور ضعف بھی ضرور ہوگا تم کیوں گھبرائے جاتے ہو خود بند ہو جائیں گے۔ بے چارے چپکے ہوکر چلے گئے، تھوڑی دیر اور انتظار کیا مگر دست اس بلا کے چھوٹے تھے کہ رکنے ہی کو نہیں آتے تھے۔ جب دیر ہوگئی اور دست بند نہ ہوئے تو بہت گھبرائے اور پھر حکیم صاحب کے پاس پہنچے کہ حکیم صاحب اتنا وقت ہو چکا ہے اور مریض کا دم لبوں پر ہے، دست ایک منٹ کو بند نہیں ہوتے تو جواب دیا کہ میاں مریض سے پہلے تمہارا دم نکلا جاتا ہے۔ ارے بھائی! اگر دست آرہے ہیں تو اچھا ہے، مادہ فاسد نکل رہا ہے، اگر اس وقت رک گیا تو تمام عمر پریشان کرے گا۔ وہ بیچارے پھر چپ ہوکر چلے گئے مگر دست بند نہ ہوئے حتیٰ کہ بے چارہ کا دم نکل گیا، لوگوں نے حکیم جی سے آکر کہا کہ صاحب دست نہ رکنے تھے نہ رکے، آخر مریض ہی چل بسا، آپ نے تعجب سے فرمایا، افوہ ارے مادے نکلنے پر تو یہ کیا، اگر رکتا تو جانے کیا حال کرتا۔

اس بے وقوف سے کوئی پوچھے کہ وہ اور کونسا حال تھا جو رکنے کے بعد ہوتا۔ مرنے سے تو بڑھ کر کوئی اور حالت نہیں۔ انسان کے واسطے انتہائی حال موت ہے اگر رک جاتا تو زائد موت موت آجاتی تو جس طرح اس مریض کی موت کے باعث اور اس بے چارے کے قاتل یہ حکیم صاحب ہوئے اسی طرح اس مرید کو اگرچہ درجہ شہادت ملا مگر آپ کے نامہ اعمال میں ایک قاتل ناحق کا بدنما دھبہ لگا جو مٹائے بھی نہیں مٹ سکتا۔

غرض حافظ شیرازی اس شعر میں اس قسم کے درشت مزاج شیوخ کا ظالم اور اس قسم کے طرز عمل کو بیداد سے تعبیر فرماتے ہیں اور شرط مروت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ صاحب واقعی بڑا ظلم ہے کہ یہ حضرات بیچارے مریدوں کی حالت پر ذرا غور نہیں کرتے بلکہ سب کو ایک لکڑی سے ہانکتے ہیں۔ ضعفاء اور اقویا سب کے ساتھ ایک سا برتاؤ کرتے ہیں۔

شیوخ کامل کا طریق عمل

ہمارے حضرت کا کیا پر شفقت طرز عمل تھا کہ مریدوں کی حالت کو پیش نظر رکھنا ان کے ہاں سب سے پہلا اصول تھا، اگر کوئی قوی الاعضاء سلیم الصحتہ ہوتا تو اس کی پوری مقدار پر ورد اسم ذات تعلیم فرماتے۔ کسی کو دس ہزار، کسی کو پانچ ہزار، کسی کو پانچ سو مرتبہ، غرض جس قدر جس میں وسعت ہوتی اس کے موافق اس سے کام لیتے اور اس تشدد کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ یہ جو آج کل دیکھا جاتا ہے کہ مساجد میں ہر نماز کے بعد لوگ سلام پھیرتے ہی تین ضربیں لا الہ الا اللہ کی لگایا کرتے ہیں تو حقیقت اس کی یہ ہے کہ کسی شیخ نے اپنے کسی بہت ہی ضعیف و کمزور مرید کے واسطے ہر نماز کے بعد یہ ذکر جہر تعلیم فرمایا تھا کہ تم سے زیادہ تو کیا ہوگا بس ہر نماز کے بعد تین ضربیں لگا لیا کرو۔ دنیا کا قاعدہ ہے کہ خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے۔ لوگوں نے اس کو دیکھ دیکھ کر یہ طریق۔ اختیار کر لیا حتیٰ کہ ہر کس و ناکس ہر نماز کے بعد ایسا ہی کرتا ہے۔ گویا ایک رسم ہے اور دنیا کی اور رسموں کی طرح اس کو بھی پورا کرتے ہیں۔ گویا اس ذکر نے بھی ایک رسم کی صورت اختیار کر لی اور جو اصلی حقیقت اس کی تھی وہ مٹ گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا سے اب حقائق مٹ گئے، رسوم باقی رہ گئے مگر ابتدا اس عادت کی ضعفاء کی رعایت تھی۔ اس مذاق کے متعلق ہمارے حضرت ہی کا شعر ہے:

گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالہ و فریاد ہم ۔۔۔ بس ہے اپنا ایک نالہ بھی اگر پہنچے وہاں

یعنی وصول کے لیے تو ایک دفعہ بھی اللہ کہہ لینا کافی ہو جاتا ہے کچھ زیادہ ضربیں لگانے ہی پر وصول موقوف نہیں بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ تم اپنی ہمت کے موافق طلب ظاہر کرو جتنی جس میں ہمت ہو اس سے زیادہ نہ کرو۔ غرض یہ ہے کہ حضرت کی تعلیم بہت ہی آسان و سہل ہوتی تھی جس سے مرید کو کسی قسم کی گرانی معلوم نہیں ہوتی تھی، نہایت خوشی سے اوراد و اشغال کو انجام دیتے تھے۔ میں تو حضرت کی تعلیم دیکھ دیکھ کر کہا کرتا تھا:

برنگ اصحاب صورت را بو ارباب معنی را ۔۔۔ بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد

(اس کے عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل وجاں کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل وجان کو بو سے تازہ رکھتی ہے)

بس کسی کو ہلکا پھلکا کر رکھا تھا' وہ ہنستا کھیلتا مقصود پر پہنچا تھا اور کسی کو خوب جکڑ رکھا تھا' وہ احوال وواردات سے مغلوب تھا۔

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں است   بعند لیب چہ فرمودہ کہ نالاں است

''گل کے کان میں کیا کہہ دیا کہ خنداں ہے بلبل سے کیا فرمادیا کہ نالاں ہے۔''

کوئی قاعدہ آپ کے یہاں ایسا نہ تھا جس کی پابندی سب پر لازمی تھی' کوئی ضابطہ ایسا نہ تھا جس کا اہتمام سب کو ضروری ہوتا بلکہ جس کو جیسا مناسب سمجھا بتلا دیا اور محققانہ شان اس سے ظاہر ہوتی تھی کہ جس کو تھوڑا کام بتلایا اس کو وہ تھوڑا سا بھی اس قدر کافی وافی ہوتا تھا کہ تمام امراض کا دفعیہ اسی سے ہوجاتا کسی اور عمل یا ورد کی ضرورت نہیں پیش آتی تھی۔ اللہ اکبر! واقعی یہ بڑا دشوار کام ہے اور اس کے لیے بڑے محقق کی ضرورت ہے' سب کو ایک لکڑی ہانکنا ناواقفی کی دلیل ہے۔

جیسے بعض ڈاکٹر ہوتے ہیں کہ وہ امراض بخار کے واسطے عموماً کونین تجویز کرتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ بخار کس قسم کا ہے' فصلی ہے یا وبائی' مزاج حار ہے یا یابس' ضعف کس قدر ہے۔ بس ان کی مرغی کی ایک ٹانگ جہاں بخار دیکھا اور کونین دے دی۔ بخلاف ایک حاذق طبیب یا ماہر ڈاکٹر کے کہ وہ ہر ایک امر کا لحاظ کر لینے کے بعد مناسب دوا دیتا ہے۔ اگر کونین مناسب ہوگی تو کونین تجویز کرے گا ورنہ نہیں یا اس کا مصلح اس کے ساتھ ضرور تجویز کرے گا تاکہ مرض کے اندر شدت نہ ہو اور مریض کو نقصان نہ پہنچے۔ اسی طرح یہ طرز عمل اختیار کرنا بھی ایک بڑے محقق اور باکمال شخص کا کام ہے کہ وہ کافی طور سے اپنے مرید کے حالات سے باخبر ہو جس کی ہر پہلو پر نظر ہو۔

تو اگر کوئی اس قسم کا درشت مزاج پیر اور ایسا ہی سخت مزاج شیخ ہوتا جن کے ہاں مریض کی حالت کی طرف نظر کرنا مخل مقصود شمار کیا جاتا ہے تو وہ یہاں بھی یہی فرماتے ہیں کہ خواہ درد ہو یا مریں کچھ بھی ہو مگر جو کھانا ہرگز نہ چھوٹے' سنت نبوی کو چھوڑنا ناممکن ہے چاہے جان ہی سے کیوں نہ ہاتھ دھونا پڑے۔ اگر مر گئے تو شہید ہوجائیں گے کیونکہ ہمارے واسطے تو عزیمت جو کھانا اور اف نہ کرنا ہے۔

جیسے ایک مولوی صاحب ریل کا سفر کر رہے تھے۔ جب نماز کا وقت آیا تو انہوں نے گاڑی سے اتر کر نماز پڑھنے کا قصد کیا' لوگوں نے منع کیا کہ حضرت اس اسٹیشن پر گاڑی زیادہ نہیں ٹھہرے گی' آپ نماز پلیٹ فارم پر نہ پڑھیں بلکہ اندر گاڑی میں آ کر پڑھ لیں۔ انہوں نے فرمایا واہ! یہ کیونکر

ہوسکتا ہے کہ چلتی گاڑی میں نماز پڑھیں ہم تو یہیں پڑھیں گے چاہے گاڑی چھوٹے یا رہے۔ اس قسم کی تشدد پسند ہستیاں ہمیشہ اور ہر زمانہ میں موجود رہی ہیں مگر بعضے محقق بھی ہوتے ہیں چنانچہ ایسے مولوی صاحب بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ گاڑی کے اندر ہی کو جگہ تنگ ہی ہو جس طرح سے ممکن ہو نماز ضرور پڑھ لے لیکن اس قسم کی نماز جس میں رکوع یا سجدہ کی بجائے ہجوم کی وجہ سے اشارہ کیا ہو اس کا اعادہ علی سبیل الاحتیاط کر لینا چاہیے' یہ نہیں کہ اتر کر ہی پڑھو جیسے ان مولوی نے کیا تھا۔

اعمال میں عزیمت ورخصت

ان متشدد لوگوں کا نقطہ نظر یہ ہے کہ عزیمت پر عمل کرنا اصل حکم شرعی ہے اور موجب امر کثیر ہے اور رخصت پر عمل کرنا موجب تقلیل اجر ہے اس لیے وہ رخصت پر عمل کرتے اور خیال کرتے ہیں کہ یہ رخصتیں تو سخت تنگی کے وقت عوام کے لیے ہیں کہ وہ احکام شرعیہ کی سختی سے تنگ دل نہ ہوں اور ہم تو خواص ہیں ہم خواہ مخواہ کیوں اپنے کو اجر قلیل کا مستحق بنائیں۔

لیکن یہ ان کی سخت غلطی ہے کہ وہ رخصت کو اصل حکم شرعی نہیں سمجھتے۔ نیز اس کو موجب اجر قلیل خیال کرتے ہیں حالانکہ نصوص فقہیہ صراحتاً اس کے مخالف ہیں۔ یہ مسئلہ مجمع علیہ ہے کہ رخصت وعزیمت جب کہ اپنے موقع پر ہوں اجر میں برابر ہیں اور دونوں حکم شرعی ہیں اور ہر ایک حکم اپنی خاص حالت کے واسطے حکم اصلی ہے اگرچہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خواص کے واسطے عزیمت پر عمل کرنا اولی وانسب ہے بہ نسبت رخصت کے لیکن اپنا تو یہ خیال ہے کہ خواص کو بھی مواقع رخصت پر بہ نسبت عزیمت کے رخصت پر ہی عمل کرنا اولیٰ وانسب معلوم ہوتا ہے۔

اس وجہ سے کہ خواص کے طرز عمل کو عوام اپنے واسطے نقشہ عمل سمجھتے ہیں۔ ان کی پیروی جمیع افعال وعبادات میں کرتے ہیں تو جب کہ خواص ایسے مواقع رخصت میں عزیمت پر عمل کریں گے اور عوام کو رخصت پر عمل کرنے کی تعلیم کریں گے تو عوام سمجھیں گے کہ اصلی حکم شریعت کا یہی ہے جس کو یہ لوگ کرتے ہیں اور یہ سہل احکام بوجہ سہولت اور آسانی کے ہم کو تعلیم فرمائے گئے ہیں پھر اس کے ساتھ ایک مقدمہ وہ اپنی طرف سے لگا لیتے ہیں کہ اچھی سہولت ہوئی کہ ایک طرف جس قدر آسانی بڑھائی دوسری طرف اسی قدر ثواب کم کر لیا۔ اب وہ عوام چکر میں ہیں کہ اگر عزیمت پر عمل کرتے ہیں تو دشواری میں پڑتے ہیں اگرچہ اجر کثیر ملتا ہے اور اگر رخصت پر عمل کرتے ہیں تو اس میں سہولت تو اگرچہ ہے مگر اجر کثیر ہاتھ سے جاتا ہے تو ان کو یہ وسوسہ ہوتا ہے کہ ایسی آسانی سے تو وہ سختی ہی اچھی تھی کہ اس میں یکسوئی اور اطمینان تو ایک جانب پر تھا' اگرچہ سختی وتشدد بھی تھا مگر اب تو ایک گومگو کی حالت

ہوگئی کہ اسے اختیار کریں یا نہ کریں۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے ہماری مصلحت ومنفعت کی تکمیل نہیں فرمائی۔ لہٰذا اس قسم کے شبہات سے بچانے اور اعتقاد عوام کو صحیح وسالم رکھنے کے واسطے مناسب یہ ہے کہ خواص بھی رخصت پر عمل کریں اور سخت تعجب ہے کہ خواص اپنی خصوصیت کی وجہ سے اپنے واسطے عزیمت کو ترجیح دیتے ہیں حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کہ اخص الخواص اور احکام خداوندی پر جان دینے والے تھے جن کے نزدیک مشکل سے مشکل کام آسان تھا اور اعلیٰ درجہ کی مشقت بھی سہل تھی آپ نے تو اضع رخصت ہی پر عمل کیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

ماخير رسول الله صلى الله عليه وسلم بين امرين الا اختار ايسر هما حتى[۱]

کہ بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے رخصت کو سہل سمجھ کر یہ خیال کیا کہ شاید رخصت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی خاص ہوگی کیونکہ آپ کا بڑا درجہ ہے، آپ کو زیادہ مجاہدہ کی ضرورت نہیں اور یہ خصوصیت ظاہر ہے کہ ہم میں نہیں کجا ہم اور کجا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

(زمین کو عالم پاک سے کیا نسبت)

لہذا ہم اس آسانی اور سہولت کے مستحق نہیں۔ ہم کو زیادہ مجاہدہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے رخصت پر عمل کرنے سے احتراز کیا اور چاہا کہ عزیمت پر ہی عمل کریں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا یہ ارادہ معلوم کر کے فرمایا کہ:

مابال اقوام يتنزهون عن الشئ اصنعه فوالله انى لاعلمهم بالله واشدهم له خشية. (متفق عليه)[۲]

اور ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کے ایسے ہی قول و ارادہ کے موقع پر فرمایا تھا:

انتم الّذين قلتم كذا وكذا ماوالله انى لاخشاكم لله واتقاكم له لكن اصوم وافطر واصلى وارقد واتزوج النساء فمن رغب عن سنتى فليس منى. (متفق عليه)[۳]

ترجمہ: "تم لوگوں میں سے بعض نے ایسا ایسا کہا ہے حالانکہ اللہ کی قسم میں تم سب سے زیادہ

---

[۱] (سنن ابی داؤد: ۴۷۸۵، کتاب التمهيد لابن عبدالبر ۸: ۱۴۸، ۱۴۹)

[۲] (الصحيح للبخاری ۸: ۳۱، ۹: ۱۲۰، مشكوة المصابيح: ۱۴۶، كنز العمال: ۵۳۲۰)

[۳] (الصحيح للبخاری ۷: ۲، مشكوة المصابيح: ۱۴۵، شرح السنة للبغوی ۱: ۱۹۶)

اللہ سے ڈرتا ہوں اور تقویٰ اختیار کرتا ہوں لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں اور نماز بھی پڑھتا ہوں اور آرام بھی کرتا ہوں اور میں نے عورتوں سے نکاح بھی کئے ہیں اور جو میری سنت سے روگردانی کرے گا وہ مجھ سے نہیں ہے۔"

چنانچہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے کے بعد رخصت ہی پر عمل کیا تو جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رخصت پر عمل کیا ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو اس پر عمل کرنے کے واسطے امر فرمایا تو یہ خیال کرنا کہ خواص کو مواقع رخصت میں عزیمت پر عمل کرنا مناسب ہے ایک بدیہی غلطی ہے کیا کوئی یہ خیال کرسکتا ہے کہ آنحضرتؐ یا صحابہ کرامؓ اعمال شاقہ پر عمل کرنے سے دل تنگ ہونے والے یا شدائد میں پڑنے سے جان چرانے والے تھے' خیال تو کجا تو ایسا وہم بھی معصیت ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ مواقع رخصت میں رخصت ہی اصل حکم شرعی ہے۔ لہٰذا ہر زمانہ کے خواص کو مناسب ہے کہ وہ خود بھی مسنون مواقع پر رخصتوں پر عمل کر کے فائدہ اٹھائیں اور دوسروں کو بھی تعلیم کریں کہ وہ بھی ان خداداد سہولتوں سے فائدہ مند ہوں اور یہ خیال نہ کریں کہ رخصت اصلی حکم شرعی نہیں اور نہ اس کا خیال کسی دوسرے کو ہونے دیں' نہ کسی اپنے قول سے نہ کسی فعل سے تاکہ لوگوں کی احکام شرعیہ پر عمل پیرا ہونے کی رغبت بڑھے اور نہایت فرحت اور انبساط کے ساتھ احکام کو قبول کریں۔

جیسے دیوبند کے دو بزرگوں کا واقعہ ہے جن میں ایک اکبر تھے دوسرے کبیر' وہ اکبر مرض وفات میں وضو کیا کرتے تھے ان سے کبیر نے کہا کہ حضرت آپ وضو ایسی حالت میں کیوں کرتے ہیں۔ آپ کے واسطے تو اس وقت تیمّم کرنا جائز ہے' آپ تیمّم کیجئے تاکہ اس مشقت سے نجات ملے۔ انہوں نے کہا کہ میں عزیمت پر عمل کرتا ہوں۔ ان کبیر نے کہا کہ مولانا اس وقت آپ کا تیمّم نہ کرنا اس خیال سے ناشی ہے کہ آپ تیمّم کو وضو کے برابر طہارت کاملہ نہیں سمجھتے' ناقص سمجھتے ہیں اور یہ درحقیقت شریعت پر ایک اعتراض ہے کہ شریعت نے ایک عمل ناقص کو ہمارے لیے تجویز فرمایا اور اس خیال سے عزیمت پر عمل کرنا باعث اجرائی ہوا۔ چنانچہ وہ سمجھ گئے اور پھر رخصت پر عمل کرنا شروع کر دیا۔

تو دیکھئے! تیمّم کرنا جائز تھا' ان بزرگ نے اس پر عمل نہ کیا اور برابر عزیمت پر عمل کرتے رہے اور وضو کو ہی اصل حکم شرعی سمجھتے رہے حالانکہ قرآن شریف میں خداوند تعالیٰ نے ایسے مواقع تکلیف میں تیمّم کرنے کی اجازت عطا فرمائی ہے جس سے معلوم ہوا کہ ان مواقع میں تیمّم وہی کام دیتا ہے جو وضو سے ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح وضو کرنے سے طہارت کاملہ حاصل ہوتی ہے اسی

طرح تیمّم کرنے سے بھی طہارت کاملہ حاصل ہو جاتی ہے۔

شکر کی توفیق اور اس کا طریقہ

چنانچہ خداوند تعالیٰ نے اجازت تیمّم کے بعد اس کی علت تطہیر و اتمام نعمت بیان فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں:

وَلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ. (المائدہ آیت نمبر۶)

ترجمہ: ''لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہے کہ تم کو پاک صاف رکھے اور یہ کہ تم پر اپنا انعام تام فرمادے۔''

جس سے معلوم ہوا کہ تیمّم سے طہارت کاملہ ہو جاتی ہے اور اس میں ایک اور مزید انعام ہے جو اس وقت کے وضو میں نہ تھا۔ یعنی اتمام نعمت (بالتفسیر الآتی) گویا تطہیر کے ساتھ ہی اتمام نعمت بھی مقصود ہے چنانچہ اسی اتمام نعمت پر ''لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ'' کا ترتب فرمایا ہے۔ یہ سب سے بڑا نکتہ ہے رخصت میں اور اس میں اشارہ ہے اس طرف کہ ہمارا مقصود تم پر انعام و احسان کرنا بھی ہے تا کہ تم کو دل و جان سے شکر کی توفیق ہو۔ اس وجہ سے کہ جب تم تیمّم کرو گے اور یہ تیمّم ہمارا ایک انعام اور احسان ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی کسی پر احسان کرتا ہے یا انعام دیتا ہے تو منعم علیہ منعم کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ لہٰذا تیمّم کر کے بے ساختہ ہمارا شکریہ ادا کرو گے کہ سبحان اللہ! کیسی رحمت اور شفقت ہے کہ حق تعالیٰ ہماری تکلیف کو گوارا نہیں فرماتے۔ قدم قدم پر آسانی کر دی ہے یہ بات وضو کر کے بھلا کہاں حاصل ہوتی۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میاں اشرف علی! پانی خوب ٹھنڈا پیا کرو' گرم پانی نہ پیا کرو کیونکہ گرم پانی پیو گے تو اگرچہ زبان سے الحمد للہ نکلے گا لیکن اندر سے دل شریک نہ ہوگا حق شکر ادا نہ ہوگا اور اگر ٹھنڈا پانی پیو گے تو ایک زبان ہی سے الحمد للہ نہ نکلے گا بلکہ ہر بن مو سے الحمد للہ نکلے گا' طبیعت خوش ہو جائے گی' دل باغ باغ ہوگا' اب جو شکر ادا ہوگا وہ اعلیٰ درجہ کا ہوگا۔

تو اسی طرح وضو کرنے میں سخت دشواری و مشقت پیش آنے کا یقین ہے اور دل وضو کرنے سے گھبراتا ہے تو ایسے وقت تیمّم کرنے سے کس قدر طبیعت خوش ہوگی اور کس قدر شکر ادا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس رخصت کی بدولت سردی سے بچے طرح طرح کی کلفتوں سے نجات ملی۔ اگرچہ وضو کر لینا بھی ممکن تھا جو کچھ ہوتا دیکھا جاتا لیکن دل کا ہراس اور مرض کا ظن غالب دل کو پریشان کرنے کے واسطے کافی تھا۔ غرض تیمّم کے وقت تیمّم کرنے سے لازمی طور پر دل سے شکر نکلتا ہے اور ایک شکر نہیں بلکہ ہر رگ و پے اور ہر سانس سے شکر ہی شکر خداوند تعالیٰ کا ادا ہوتا ہے۔

اور یہ تجربہ و مشاہدہ ہے کہ شکر باعث ازدیاد محبت ہوتا ہے اس وجہ سے کہ شکر کا ترتب نعمت و

احسان پر ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ منعم و منعم علیہ میں ازدیاد محبت کا اعلیٰ ذریعہ مشاہدہ احسان و نعمت ہوتا ہے۔ لہٰذا شکر بھی دلیل ازدیاد محبت ہے اور ہر فرد بشر اور ہر رہرو طریقہ کا مقصود محبت خداوندی ہے تو رخصت میں اس بارے میں ایک مصلحت یہ ہوئی کہ اس سے حق تعالیٰ کی محبت بڑھتی ہے۔

مصائب کی قسمیں

مگر اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ کیا مصائب سے محبت نہیں بڑھتی۔ عارفین اہل مصیبت تو مشاہدہ کررہے ہیں کہ ہم کو تو ہر مصیبت موجب ازدیاد محبت ہوتی ہے۔ تو سمجھ لو کہ مصیبت بھی زیادتی محبت کا سبب ہوتی ہے لیکن سب مصائب نہیں بلکہ بعض اور بعض مصائب موجب ازدیاد محبت نہیں ہوتے۔ اب رہا اس کا معیار اور مصائب للمحبۃ وغیرہ موجب للمحبۃ میں طریق امتیاز‘ سو سمجھو کہ مصائب دو قسم کے ہیں:

ایک تو وہ مصائب جو منجانب اللہ نازل ہوتے ہیں جن میں بندے کے کسب کو بالکل دخل نہیں ہوتا بلکہ ان کا منشا محض مشیت ایزدی ہوتی ہے۔ اس قسم کے مصائب تو واقعی اہل محبت کے لیے ہمیشہ موجب ازدیاد محبت ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ اہل محبت میں سے بعض لوگوں کے ماں باپ عزیز و اقارب مرتے ہیں اور اس سے ان کو کلفت بھی ہوتی ہے لیکن ان کا جو معاملہ خداوند تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے بحالہ باقی رہتا ہے۔ اس میں کسی قسم کا نقصان نہیں آتا کیونکہ انہیں یقین ہے کہ خدا نے اس کی عمر اتنی ہی لکھی تھی اس کی موت اسی وقت مقرر تھی۔ اپنی موت سے مر گیا۔

اور ایک وہ مصائب ہوتے ہیں جو بندہ پر اس کے کسب و اختیار سے آتے ہیں خود وہ یا اس فعل کا نزول مصائب کا سبب بنتا ہے اس قسم کے مصائب موجب ازدیاد محبت نہیں ہوتے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص باوجود تیمم کے جائز ہونے کے وضو کرے اور کہے کہ یہ عمل شاق ہے اس سے نفس کو تکلیف پہنچتی ہے اس لیے اس سے محبت خداوند تعالیٰ کی بڑھے گی۔ چنانچہ بعض لوگ ایسے موقع پر کہا کرتے ہیں کہ بھئی اس وقت ہم نے باوجود مشقت کے وضو کیا تھا تو خوب مزہ آیا‘ طبیعت خوش ہوگئی‘ قلب منور ہوگیا تو وہ سمجھ لے کہ یہ بھی نفس کا ایک بہت بڑا وسوسہ ہے کہ انسان اس سرور و لطف کو سرور محبت خداوندی سمجھتا ہے حالانکہ یہ سرور محض حظ نفس ہے اور یہ نور محض عجب نفس کی روشنی ہے یہ بھی نفس کی ایک زبردست تلبیس اور مکاری ہے کہ وہ اس نور کو نور الٰہی اور اس سرور کو سرور محبت خداوندی بتلاتا ہے۔ حالانکہ اس سرور کا منشاء صرف اپنی ہمت پر ناز کرنا ہے ورنہ اصل سرور وہ ہے جو انسان کو حدود شرعیہ میں رہ کر عمل کرنے سے حاصل ہو اور اس پر فرحت بخش اثر ظاہر ہو‘ وہی ہے نور حقیقی جس کو محبت الٰہی سے تعبیر کیا جاتا ہے جو کہ مقصود سالک ہے۔ اسی طرح یہاں اگر کوئی ایسا ہی نفس کے فریب میں پھنسا ہوا ہوتا تو

کہتا کہ جو ہی کھاؤ چاہے مر ہی کیوں نہ جاؤ۔ اس مرنے میں ایسی لذت ہوگی جو تمام لذائذ حیات سے بہتر ہے اور ایسا لطف آئے گا کہ تمام عمر اس کا سرور نہ جائے گا۔ محبت الٰہی سے سینہ روشن ہو جائے گا مگر یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ بس یہی کہ چند روز عمل کرنے کے بعد سنت سے انقباض ہو جاتا ہے' سنت کی وہ وقعت جو ابتداء میں بغیر عمل کئے تھے وہ بھی نہ رہتی۔ گویا یہ عمل بالسنّت مفضی ہوتا ترک سنت بلکہ انقباض عن السنتہ کی طرف اور اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ کیا ہے۔

عزیمت ورخصت کی واضح مثال

اس وقت ایک اور دقیقہ یاد آیا جس سے اس مقام کی توضیح میں کافی بصیرت ہو جائے گی وہ یہ کہ جو شخص کسی فعل عزیمت کو اختیار کرتا ہے اور اعمال شاقہ پر عمل کرتا ہے تو اس کا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ یہ شخص اس عمل سے فارغ ہو کر ثمرات کا انتظار شروع کر دیتا ہے اور ثمرات بھی وہ اعلیٰ پیانہ کے جو اس عمل کے مناسب ہوں یعنی خیال کرتا ہے کہ میری مشقت اور کام کی دشواری تو ظاہر ہے لہٰذا اس مشقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مجھ کو ثمرہ مساوی ملنا چاہیے بخلاف اس شخص کے جو رخصت اور امر سہل پر عمل کرے گا۔ یہ شخص نہ تو اس عمل سے فارغ ہو کر ثمرہ کا منتظر ہوگا اور نہ کسی خاص اثر اور نتیجہ کا طالب ہوگا۔ اس وجہ سے کہ وہ سمجھتا ہے کہ میں نے عمل ہی کیا کیا ہے۔ میں نے تو خود ہی رخصت پر عمل کیا ہے اور سہولت و آسانی کو تلاش کیا ہے جب کوئی کام ہی نہیں کیا تو ثمرات ہی کیا ملتے۔

مثلاً ایک شخص ہے کہ دس پانچ ہزار بار ورد اسم ذات کرتا ہے لیکن ساتھ میں سوتا بھی ہے کھاتا بھی ہے پیتا بھی۔ دیگر مشاغل دنیوی کو بھی انجام دیتا ہے۔ غرضیکہ وہ عمل کرتا ہے لیکن اس سہولت کے ساتھ کہ نفس پر شاق نہیں گزرتا اور ایک وہ شخص ہے جو کہ اعلیٰ مقدار پر ذکر اسم ذات کرتا ہے اور مجاہدہ بھی کرتا ہے' سوتا بھی نہیں' کھانا بھی سد رمق ہی کھاتا ہے' مشاغل دنیوی سے احتراز کرتا ہے' تعلقات دنیوی سے کنارہ کشی اختیار کرلی ہے۔ غرض یہ کہ اعلیٰ پیانہ پر سلوک کو طے کر رہا ہے۔ جمیع مندوبات اور ضروریات پر نہایت پابندی سے عمل کرتا ہے۔ یہ شخص اپنے ہر ہر فعل اور ہر ہر مجاہدہ کے بعد منتظر ثمرہ عظیمہ وانعامات کثیر کا رہتا ہے اور انتظار ہی نہیں بلکہ وہ خود بخود ہی اپنے اعمال کی مشقت کو دیکھ کر ثمرات وانعامات کا تعین بھی کر دیتا ہے کہ مجھے کشف ہو بسط ہو واردات ہوں مراتب علیا حاصل ہوں اور جس قدر انتظار کی گھڑیاں زیادہ گزرتی جاتی ہیں اور ان ثمرات مجوزہ کے حاصل ہونے میں دیر لگتی ہے تو یہ شخص منقبض ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ جس قسم کے ثمرات میرے ان اعمال پر مرتب ہونے چاہئیں تھے جن کا میں مستحق تھا مجھے وہ نہیں ملا بلکہ استحقاق سے کم دیا گیا' حق شناسی سے کام نہیں لیا گیا۔

بخلاف اول الذکر شخص کے کہ وہ کسی امر کا منتظر نہیں اور خیال کرتا ہے کہ میں نے کیا ہی کیا ہے جو مجھ کو انعام ملے یا کوئی ثمرہ مرتب ہو۔ اب اس حالت میں اس کو جو کچھ بھی ملے گا اس کو غنیمت سمجھے گا اور انعام ایزدی و فضل یزدانی سمجھے گا اور اس نعمت واحسان پر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرے گا کہ منعم حقیقی نے مجھ کو نعمت بے کراں عطا فرمائی جس کا میں مستحق بھی نہ تھا۔ غرض یہ کہ ہمیشہ شاکر رہے گا اور وہ شا کی۔

شرعی آسانیوں کا اثر

لہٰذا معلوم ہوا کہ جو سہولتیں شریعت نے دی ہیں ان پر عمل کرنا موجب ازدیاد شکر ہے اور ازدیاد شکر سے ازدیاد محبت ہوتا ہے۔ لہٰذا شرعی آسانیوں پر عمل کرنا چاہیے تاکہ خدا کی محبت زیادہ ہو مگر آسانیوں کا یہ مطلب نہیں کہ بالکل نفس کے مطیع ہو جاؤ کہ جس امر میں نفس کو آسانی معلوم ہوئی اسی کو اختیار کر لیا اور باقی احکام کو پس پشت ڈال دیا۔

جیسے کسی اکال نے کسی سے پوچھا کہ تم کو کلام مجید میں کون سی آیت زیادہ پسند ہے۔ اس نے کہا کہ ''کُلُوْا وَاشْرَبُوْا'' (کھاؤ اور پیو) تو دیکھیے اس کا نفس چونکہ کھانے کا شیدا تھا لہٰذا تمام اوامر قرآنیہ میں سے آپ کو یہی دو امر پسند آئے کیونکہ اس آیت کے مضمون سے نہایت سہولت و اطمینان کے ساتھ کھانے کو ملتا ہے۔

سو سہولت سے اس قسم کی سہولت مراد نہیں اور نہ یہ محمود ہے بلکہ شرعاً مذموم ہے وہاں وہ سہولت محمود ہے جو حدود شرعیہ میں رہ کر خود شارع علیہ السلام نے بطور انعام عطاء فرمائی ہیں نہ کہ شریعت سے بھی ایک ہاتھ آگے بڑھ جاؤ۔

میرے ایک دوست تھے' وہ کہتے تھے کہ علی الاطلاق اعمال شاقہ کرنے میں اجر زائد ملتا ہے' میں نے ان سے پوچھا کہ یہ مطلق ہے یا مقید' انہوں نے کہا کہ نہیں اعمال شاقہ مطلقاً ہی موجب اجر جزیل ہیں۔ اتفاق سے عصر کی نماز کا وقت آ گیا تو میں نے ان سے کہا کہ اب نماز کے واسطے وضو کرنے کے دو طریق ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہیں مسجد کے کنویں سے پانی لے کر وضو کیا جائے اور دوسرا یہ کہ جلال آباد سے پانی لا کر وضو کیا جائے۔ بتلایئے! کون سی صورت اختیار کرنا مناسب ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہی مناسب ہے کہ مسجد کے کنویں سے پانی لے کر وضو کیا جائے۔ میں نے کہا اب وہ آپ کا اطلاق کہاں گیا کیونکہ مشقت تو اسی میں زائد ہے کہ جلال آباد سے پانی لا کر وضو کیا جائے تو بات یہ ہے کہ مطلقاً مشقت کو موجب اجر زائد کہنا غلط ہے بلکہ اول تو یہ مقاصد کے ساتھ مخصوص ہیں اور جو چیزیں کہ قربات' یا اعمال مقصود بذاتہا نہیں ہیں بلکہ شرائط وغیرہ نہیں۔ ان میں تو رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے بھی ہمیشہ سہولت ہی کو اختیار فرمایا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ:

ماخیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی امرین الااختار ایسر ھما. الخ[1]

ترجمہ: ”جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب دو کاموں میں سے کسی ایک کا اختیار دیا جاتا تو آپ دونوں میں سے آسان کو اختیار فرماتے۔“

لہٰذا اسی حدیث کے موافق ہم کو یہی عمل کرنا چاہیے کہ ایسے مواقع پر رخصت ہی کو اختیار کریں چنانچہ وضو بھی قربات مقصودہ سے نہیں بلکہ شرائط صلوٰۃ میں سے ہے لہٰذا اس کے بارے میں سہولت کو اختیار کرنا مناسب ہے دوسرے مقاصد میں بھی جس محل میں رخصت میں کوئی شرعی مصلحت ایسی ہو جو کہ عزیمت میں نہ ہو وہاں مشقت اور عزیمت اختیار نہیں کی جاتی بلکہ رخصت و سہولت کو ترجیح ہوتی ہے۔

اور جیسے وضو قربت مقصودہ نہیں اسی طرح جو کا کھانا بھی گو سنت نبویؐ تو ضرور ہے اور تعامل صحابہ بھی یقیناً ہے لیکن یہ قربات میں سے نہیں بلکہ عادات میں سے ہے اور وہ بھی ان لوگوں کے واسطے جو قوی المعدہ تھے تو اب جو لوگ اپنے اوپر یہ اعتماد رکھتے ہیں کہ بے چھنے جو کھانے سے ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی پیٹ کو پکڑے پکڑے نہ پھریں گے، ان لوگوں کے واسطے جو کھانا مضائقہ نہیں بلکہ اولیٰ وانسب ہے اور نیت اتباع کے ساتھ باعث ثواب کثیر ہے۔

عمل بالسنہ کے معنی

اور اگر ضعیف المعدہ حضرات نے سنت نبویؐ پر عمل کرنے کی شوق میں آکر ایک وقت بے چھنے جو کی روٹی کھائی اور شام کو جب نماز کے واسطے کھڑے ہوئے تو پیٹ میں ایسا درد شدید ہوا کہ قیام پر بھی قادر نہ ہو سکے، بیٹھ کر نماز پڑھنا پڑی تو ان جوؤں اور چھلکوں کے کھانے میں ان کو اتنا ثواب واجر کثیر نہ ملے گا جس قدر ترک قیام سے فضیلت نماز فوت ہوگئی اور اپنے ہاتھوں ہوئی۔

مگر جو کے کھانے سے اس طرح احتراز کرنا کہ سنت نبویؐ پر بھی کوئی الزام نہ آئے اور جو کا کھانا بھی ترک ہو جائے۔ یہ اضداد کا جمع کرنا ہے، یہ انہیں حضرات کا کام تھا۔ سبحان اللہ! کیا لطیف طریقہ سے دست کشی فرمائی کہ بھائی ہم نے گستاخی کی اور بے ادبی سے کام لیا کہ جو کھائے۔ گو ہم نے مساوات شان نبویؐ وصحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا دعویٰ کیا کہ جو امران کی شایان شان تھا اس کو اختیار کیا حالانکہ ہم میں وہ قوت کہاں ہے کہ اس قسم کا مجاہدہ کر سکیں یہ انہیں حضرات کی ہمتیں تھیں جو ہم لوگوں کے واسطے نمونہ عبرت پیش کر گئے۔ غرض عمل بالسنۃ کے معنی یہ ہیں کہ

---

[1] (انظر تخریج الحدیث الرقم: ۳٦)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی مخالفت نہ ہو، باقی عمل میں پوری طرح مطابقت لازم نہیں کہ عادات و معمولات کو بعینہا ادا کیا جائے۔

پس "ماانا علیه واصحابی"[1] (جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں) کے اعوام واطلاق پر جو شبہ وارد ہوتا تھا کہ آج کل جس قدر ملبوسات ماکولات ہیں یہ تو سب ہی سنت نبویؐ وتعامل صحابہ کے خلاف ہیں۔ تو ہندوستانی جوتا بھی ماانا علیہ کے تحت میں داخل نہیں جس طرح انگریزی داخل نہیں اور اسی طرح اچکن انگرکھے جس طرح کوٹ، پتلون داخل نہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ اس زمانہ کے مولوی ہم کو کوٹ پتلون اتارنے پر مجبور کرتے ہیں اور خود اچکنیں اور انگرکھے نہیں اتارتے۔ سو بفضلہ تعالیٰ اس تقریر سے اس شبہ کا دفعیہ طالب حق کے واسطے کافی ہو گیا اور معلوم ہو گیا کہ ما کے تحت میں دو قسم کے امور داخل ہیں۔ ایک فعلی یعنی جس پر تعامل آنحضرت اور صحابہ کا رہا ہے اور ایک قولی یعنی جس پر عمل تو آپ کا ثابت نہیں لیکن ان کی اجازت صراحۃً آپ نے دی ہے یا کسی کلیہ کے تحت میں داخل ہیں۔ بشرطیکہ کوئی دلیل شرعی حرمت کی موجود نہ ہو۔ پس اس اصل پر ہندوستانی جوتہ تو اجازت کے تحت میں آسکتا ہے بخلاف انگریزی جوتے کے کہ اس میں تشبہ بالکفار علت حرمت موجود ہے اس کا جواز کسی طرح ثابت نہیں۔

مگر پھر بھی بعض لوگ اہل حق ہونے کا دعویٰ کر کے لباس و وضع میں اہل حق کا طرز اختیار نہیں کرتے حالانکہ معیار اہل حق ہونے کا اور فرقہ ناجیہ کے زمرہ میں داخل ہونے کا یہی تھا کہ جمیع امور میں "ماانا علیه واصحابی" (جس پر میں اور میرے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں) پر عامل ہوں۔ اس کے جمیع اجزاء کو ضروری اور لازمی سمجھنا چاہیے، کسی ایک جزو کو کافی سمجھ کر دوسرے جزو کو نہ چھوڑ دینا چاہیے جیسے ان حضرات نے جملہ امور میں سے اصول اور جزو اعظم یعنی اعتقادات کو کافی سمجھ کر تصحیح اعتقاد ہی کو معیار اہل حق ہونے کا بنا رکھا ہے اور اپنی جماعت میں ہر صحیح الاعتقاد شخص کو بلا تعرض افعال واعمال کے داخل سمجھتے ہیں حالانکہ یہ نص شرعی کے صریح خلاف ہے۔

علم سے مقصود عمل ہی ہوتا ہے

جیسا اوپر مذکور ہو چکا اسی اصل پر اس آیت کا مضمون ہے جس کی تلاوت کی گئی اس میں بتلا دیا گیا کہ محض علم کافی نہیں عمل بھی ضروری ہے، اس پر تنبیہ کرنے کے لیے صرف اثبات آخرت پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ ساتھ ہی دنیا کے خست وذمات کو بھی بیان فرمایا تاکہ اس کا استحضار مفضی الی العمل ہو جیسا کہ اس کا بھی بیان ہو چکا ہے کہ علم سے مقصود عمل ہی ہوتا ہے اور میں یہ دعویٰ ہر علم میں کرتا ہوں۔

---

[1] (انظر تخریج الحدیث الرقم: ۳۵)

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ''مَاهٰذِهِ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا الخ'' کا بیان کرنا صاف دلیل ہے۔ اس امر کی کہ مقصود محض اعتقاد ووقوع آخرت نہیں بلکہ اعراض عن الدنیا واستحضار فناء دنیا بھی مقصود ہے ورنہ اگر صرف اعتقاد معاد ہی مقصود ہوتا تو اسی مضمون کے ادا کرنے کے واسطے تو آیت وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ. (العنکبوت:۶۴) (اور اصل زندگی عالم آخرت ہے اگر ان کو اس کا علم ہوتو ایسا نہ کرتے)

بہت کافی تھی باوجود اس کے پھر اس جگہ اس مضمون کو اس آیت کے ذیل میں بیان کرنا میرے دعویٰ کی روشن دلیل ہے ورنہ لازم آئے گا کہ یہ آیت بلا کسی فائدہ کے طول لاطائل میں داخل ہو حالانکہ اس قسم کا خیال کرنا بھی کلام باری کی نسبت معصیت ہے۔

علوم کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کا علم فی نفسہ بھی مقصود ہے اور دوسری قسم جن کا علم مقصود برائے اعمال ہے۔ ان دو قسموں میں سے ثانی قسم میں تو ہم اور عامہ اہل علم دونوں شریک ہیں کہ جس طرح ہم اس جگہ اعمال وعلوم دونوں کو مقصود قرار دیتے ہیں اسی طرح وہ بھی ہماری موافقت کرتے ہیں اور دونوں کو مقصود میں داخل کرتے ہیں۔ گو لنفسہ ولغیرہ کا فرق ہو۔ مثلاً طریقہ وضو کا علم حاصل کرنا کہ یہ خود مقصود بالذات نہیں بلکہ اس وجہ سے مقصود ہے کہ یہ طریقہ ادائے فرض کا جو شروط صلوٰۃ میں سے ہے لہٰذا صرف وضو کے طریقہ کا جان لینا اتفاقاً کافی نہ ہوگا بلکہ وضو کر کے جب نماز ادا کر لی جائے گی اس وقت مقصود کی تکمیل ہوگی یہ مسئلہ تو مجمع علیہ ومسلم ہے۔

رہی پہلی قسم علم کی جس کا علم فی نفسہ بھی مقصود ہے اس میں عامہ اہل علم صرف علوم ہی کو مقصود قرار دیتے ہیں اور ان کو اعمال کیلئے کسی درجہ میں مقصود نہیں سمجھتے جیسا کہ مسئلہ مجوث عنہ سے واضح ہے اور ہم یہ کہتے ہیں کہ اس جگہ گو علوم مقصود اصلی اور مطلوب بالذات ہیں لیکن اعمال بھی مقصودیت میں شرکت رکھتے ہیں اور ان کی تعلیم اس لیے بھی کی گئی ہے تاکہ اعمال میں ان سے کام لیا جائے بغیر اس کی تکمیل مقصود نہیں ہوتی۔

مسئلہ تقدیر

چنانچہ سورہ حدید کی ایک آیت سے اس مضمون کا پتہ چلتا ہے۔ خداوند تعالیٰ مسئلہ تقدیر کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

مَآاَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرٌ. الخ (الحدید: ۲۲)

یعنی جو کچھ بھی دنیا میں ہوتا ہے خواہ وہ تصرف نفوس میں ہو یا اس کے ماسوا میں یہ سب کچھ کتاب خداوندی میں قبل از پیدائش خلق لکھا جاچکا ہے لہٰذا کوئی تصرف دنیا میں مخالف مرقوم فی الکتاب کے نہیں ہوسکتا۔ آگے اس کتابت کی غایت بیان فرماتے ہیں:

لِکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَافَاتَکُمْ. (الحدید: ۲۳)

ترجمہ: ''یہ بات بتلا اس واسطے دی ہے تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہے تم اس پر رنج (اتنا) نہ کرو۔''

یہ لام متعلق ہے اخبر کے یعنی تم کو ہم نے جو یہ مسئلہ تعلیم کیا ہے اور تحریر فی الکتاب کی اطلاع دی ہے اس کی غرض و غایت یہ ہے کہ اس علم کے بعد اشیاء مفقود پر تم کو حزن و ملال نہ ہو اور اشیاء حاصلہ و موجودہ پر فرحت بصورت تکبر و غرور نہ ہو۔

اور فقدان اشیاء مرغوبہ پر تاسف و رنج و ملال کا نہ ہونا معنون اور حاصل ہے صبر کا اور صبر ایک مامور بہ ہے۔ لہٰذا اس نہی عن الحزن سے مقصود مراد ہے صبر کا گویا حاصل یہ نکلا۔ عمل صبر کی تکمیل کی غرض سے ہم نے تم کو مسئلہ قدر کی اطلاع دی ہے تکمیل صبر کے واسطے یہ خبر لازمی ہے کیونکہ بدون مسئلہ قدر کے مسئلہ صبر تام نہیں ہوتا ان دونوں میں اچھا خاصا علاقہ لزوم ہے۔

چنانچہ اس لزوم کے واسطے مشاہدات مؤید ہیں کہ اگر آج کسی قائل تقدیر اور کسی مومن بالقدر کا لڑکا مرجائے اس کو صبر بہت جلد حاصل ہو جائے گا بخلاف ایک منکر تقدیر کے کہ وہ ہمیشہ اس اندوہناک حادثہ پر قلق و تاسف میں رہے گا کہ افسوس! علاج میں قصور ہوا۔ فلاں حکیم کا علاج کرتا تو ضرور آرام ہو جاتا' فلانے ڈاکٹر کے علاج سے فلاں مریض کو آرام ہوا تھا' اگر میں بھی اس کا علاج کرتا تو یقیناً آرام ہوتا۔ غرض یہ حسرت اس کے واسطے لازم غیر منفک ہو جائے گی اور کس طرح زائل ہوسکتی ہے جبکہ خود ارشاد باری تعالیٰ اس قسم کے باطل العقیدہ لوگوں کے متعلق یہ ہے:

لِیَجْعَلَ اللّٰہُ ذٰلِکَ حَسْرَۃً فِیْ قُلُوْبِھِمْ. (آل عمران: ۱۵۶)

ترجمہ: ''تاکہ اللہ تعالیٰ اس بات کو ان کے قلوب میں موجب حسرت کردیں۔''

تقریر مقام کی یہ ہے کہ منافقین جو یہ کہتے ہیں کہ:

لَوْ کَانُوْا عِنْدَنَا مَامَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا. الخ (آل عمران: ۱۵۶)

ترجمہ: ''اگر یہ لوگ ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے۔''

یہ کہنا ان کا محض عدم ایمان علی القدر کی دلیل ہے چنانچہ دوسری جگہ فرمایا ہے کہ اگر تمہارا یہی خیال ہے کہ ان مقتولین کے قتل کا باعث ان کا میدان مبارزت میں جنگ کی غرض سے جانا ہے اور اپنے

شہروں اور مکانوں میں رہنا موت سے بچا سکتا ہے تو پھر مہربانی کر کے ذرا تم اپنے نفسوں سے تو موت کو روک دو، تم تو کہیں میدان کارزار میں نہیں جاتے، پھر گھروں میں بیٹھے بیٹھے کیوں مر جاتے ہو۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ نہ میدان کارزار میں جانا موجب موت ہوسکتا ہے اور نہ گھر میں رہنا مانع ہوسکتا ہے بلکہ موت تو خدا کے اختیار میں ہے اور مرقوم فی الکتاب ہے جس وقت اجل مقرر تمام ہو جائے گی خواہ مکانوں کی بند کوٹھریوں میں ہوں خواہ میدان کارزار میں ہوں موت کے چنگل سے رستگاری ہرگز نہیں ہوسکتی۔

"وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ" (النساء:۷۸) (اگر چہ تم قلعی چونہ کے قلعوں ہی میں ہو۔

منکر تقدیر بے صبرا ہوگا

لیکن چونکہ یہ منافق منکرین تقدیر ہیں اس وجہ سے ان کو حکم خداوندی پر صبر آ نہیں سکتا بلکہ ہمیشہ حسرت ہی میں مریں گے کہ ہائے ہمارے عزیز میدان میں نہ جاتے تو مارے نہ جاتے زندہ ہی رہتے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ جو شخص منکر تقدیر ہے اس کو کبھی صبر نہیں آئے گا بلکہ ہمیشہ قلق و اضطراب میں رہے گا اور علاج ہی کی کوتاہی اور تدبیر علاج ہی کا قصور بتاتا رہے گا۔ بخلاف اس شخص کے جو سچے دل سے تقدیر پر ایمان لایا ہے اور تمام تغیرات وتصرفات احیاء وامانت کو خدا کی طرف منسوب کرتا ہے اور مرقوم فی الکتاب ہونے کا قائل ہے۔ گو یہ شخص بھی باقتضاء طبعی وفاۃ ولد زوجہ وغیرہ پر حزن وملال کا اثر اپنے قلب میں پائے گا اور اس کا نفس بھی کسی وقت نقص علاج وغیرہ کو سبب بنا کر پیش کرے گا لیکن معاً اس کو یہ خیال پیدا ہوگا کہ درحقیقت اس کا وقت ہی آ گیا تھا' حیات مستعار ختم ہو چکی تھی اور اے نفس! جس طرح اس کی عزیز عمر اس ساعت تک مقدر تھی اور اس کے بعد کوئی سانس اس کے واسطے باقی نہیں رہا تھا اسی طرح نقص علاج بھی اس کے واسطے مقدر تھا اور جب اس کی موت کے واسطے خداوند تعالیٰ نے عالم ظاہر میں نقص علاج ہی کو علت بنایا تھا تو کوئی قوت دنیا میں ایسی نہ تھی جو اس کے نقصان علاج کو پورا کر دیتی۔ بس اس کے بعد اس کو صبر آ جائے گا اور کسی قسم کا رنج وملال' قلق واضطراب کا اثر اس کے قلب پر نہ رہے گا۔

غرض دیکھئے کہ اگر چہ مسئلہ قدر ان مسائل میں سے ہے جن کا عمل مقصود بالذات ہوتا ہے اور جن کا علم جزو ایمان ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس سے تکمیل صبر کا بھی مقصود ہونا نص سے ثابت ہے جو کہ من جملہ دیگر اعمال کے ایک علم ہے۔ لہٰذا اس آیت سے تائید ہوتی ہے میرے اس قول کی کہ

علوم مقصودہ فی حد ذاتہا بھی تتمیم اعمال میں مؤثر ہیں اور ان کی تعلیم سے اصلاح اعمال بھی مقصود ہے۔ پس در اصل صحیح الاعتقاد وہ ہے جس کے اعتقاد کا اثر عمل میں بھی ظاہر ہو گیا ہو ورنہ وہ ناقص الاعتقاد ہے اور اصل معنی میں صحیح الاعتقاد نہیں۔

نیز اس مضمون کی تائید ایک حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ خداوند ذوالجلال والاکرام آخر شب میں نزول فرماتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک خبر ہے۔ مقصود اس سے نزول خداوندی کی اطلاع دینی ہے لیکن اس کو موقع احیاء لیل میں فرمانا دلیل ہے اس کی کہ اس سے محض خبر ہی مقصود نہیں بلکہ مقصود اس سے ترغیب ہے قیام لیل اور صلوٰۃ تہجد کی حالانکہ یہ علم تجلی حق بھی ان علوم میں سے ہے جو اعتقادی کہلاتے ہیں لیکن اس کی غایت بھی تکمیل ہے ایک عمل کی۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ جمیع علوم خواہ وہ مقصود فی حد ذاتہا ہوں یا نہ ہوں ان سے اعمال بھی ضرور مقصود ہیں۔ اسی طرح آیت متلوہ میں جیسا علم مقصود ہے یعنی اعتقاد آخرت اسی طرح یہ عمل بھی مقصود ہے یعنی اعراض عن الدنیا۔

اَسرارِ خداوندی کا تجسس

مگر ہمارا یہ حال ہے کہ ہم اعمال سے تعرض ہی نہیں کرتے' ہماری تحقیقات کا دروازہ اور ہماری کوششوں کا مرکز صرف علوم ہی ہیں۔ ہمیشہ ذات وصفات کے مسئلہ میں الجھتے رہتے ہیں۔ آج نزول کے مسئلہ کو ثابت کیا ہے تو کل تجلی ذاتیاں کے ثبوت کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اس سے فرصت ملی تو تو "اِسْتَوَا عَلَى الْعَرْشِ" کے مسئلہ کی فکر میں ہیں اور تمام اشکالات واستحالات عقلیہ کو خود ہی وارد کرتے ہیں اور خود ہی ان کے جوابات تجویز کرتے ہیں حالانکہ یہ بحث ومباحثہ اور ان مسائل کے اندر تحقیقات وتدقیقات کا چھانٹنا بر خود خلاف سنت ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان علوم کے اندر گفتگو کرنے کے متعلق فرمایا کہ "**ابھموا ما ابھمہ اللّٰہ تعالیٰ**"۔ یعنی جس مسئلہ کو خود خداوند تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے اور واضح نہیں فرمایا تم بھی اس کو مبہم ہی رکھو' تمہارا امتثال امر یہی ہے کہ تم اس مبہم کو مبہم سمجھتے ہوئے ایمان لے آؤ۔

ایک بزرگ نے ایک بزرگ سے دریافت کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے معراج کی شب کیا کیا باتیں ہوئیں اور کیا واقعات پیش آئے۔ انہوں نے فرمایا کہ:

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد باغباں   بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد

"اب کس کا دماغ ہے کہ باغباں سے پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا اور پھول نے کیا سنا اور صبا نے کیا کیا۔"

یعنی جب خدا تعالیٰ نے ان واقعات و اسرار کو "فَاَوْحیٰٓ اِلیٰ عَبْدِہٖ مَآ اَوْحیٰ" (النجم:١٠) (پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے پر وحی نازل فرمائی جو کچھ نازل فرمائی تھی) میں مبہم رکھا ہے تو ہماری کیا مجال ہے کہ ہم کچھ لب کشائی کر سکیں۔ جب ان کے ہاں اتنا ابہام مدنظر ہے تو ہم ان کے خلاف سنت کیا کہہ سکتے ہیں۔ ہمارا کام تو یہ ہے کہ جو امور ہمارے سامنے وضاحت و تفصیل کے ساتھ بیان کر دیئے گئے ان کی مفصل تحقیق کریں اور جن چیزوں کو ہمیں بتلایا گیا اور ابہام ہی کو مصلحت سمجھا گیا ہے اس پر ابہام ہی کے ساتھ ایمان لاکر "اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ" (البقرہ:٣) (وہ خدا سے ڈرنے والے لوگ ایسے ہیں کہ یقین لاتے ہیں چھپی ہوئی چیزوں پر) کے مقبول زمرہ میں داخل ہوں نہ یہ کہ ہم اس کی تحقیق و تنقیح کے درپے ہو جائیں اور عقل کے گھوڑے دوڑائیں۔

ہماری مثال تو ایسی ہونی چاہیے جیسے کوئی شخص کسی کے ہاں مہمان ہو اور میزبان نے اس کو اپنا ایک بہت بڑا وسیع مکان قیام کے واسطے جس کے متعدد کمرے عجیب عجیب سامانوں سے مملو ہیں اور نادر نادر چیزوں سے لبریز ہیں لیکن یہ کہہ دیا کہ یہ چار کمرے جن کے دروازے کھلے ہوئے ہیں ان کی سیر و تفریح سے تم اپنا دل بہلاؤ اور جن کمروں کے دروازے بند ہیں ان کو نہ کھولنا۔ اب ہم کو چاہیے کہ جن کمروں کی سیر و تفریح کی ہمیں اجازت دی گئی ہے ان کی سیر و سیاحت سے تو ہم اپنا دل بہلائیں اور جن کمروں کے کھولنے کی ہم کو اجازت نہیں ہے ان کو ہاتھ نہ لگائیں۔ اگر ہم ان چاروں دروازوں کے بھی قفل توڑ ڈالیں گے یا ان کے بند کرنے کی علت دریافت کریں گے کہ یہ کیوں بند ہیں اور یہ کیوں کھلے ہیں تو یہ خلاف تہذیب اور اخلاقی جرم سمجھا جائے گا۔

اسی طرح جن امور کی تحقیق اور غور و خوض کا دروازہ بغرض افہام و تفہیم کے کھول دیا گیا ہے ان میں ہم کو بحث و مباحثہ کرنا چاہیے اور جن امور سے ہم کو لب کشائی کرنے سے منع کر دیا گیا ہے ان میں ہمارا کلام کرنا دخل در معقولات اور معصیت و نافرمانی سمجھا جائے گا اور انحراف امتثال امر میں داخل ہوگا۔ اسی کو فرماتے ہیں:

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں　　بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

"اب کس کا دماغ ہے کہ باغبان سے پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا اور پھول نے کیا سنا اور صبا نے کیا کیا۔"

کیا مجال ہے کسی کی کہ ان اسرار و رموز کی حقیقت کو معلوم کر سکے۔ کیا ہستی ہے ہمارے عقول کی کہ ایسی پرخطر راہ میں قدم رکھ سکے۔ اسرار خداوندی میں قدم رکھنا قوت بشریہ سے خارج

ہے۔ذات وصفات خداوندی کی کنہ معلوم کرنا امکان سے باہر ہے حتیٰ کہ جمیع عقلاء کا اس پر اتفاق ہے کہ علم بالکنہ خداوند تعالیٰ کی ذات وصفات کا ممتنعات سے ہے ہم تو صرف یہ ہی کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح وہ ذات قدوس غیر مدرک بالکنہ ہے ایسا ہی اس کی شان کے شایان اس کا نزول ہے اور ایسے ہی جاء ربک میں مجئی بھی ان کے مرتبہ وعظمت کے مناسب ہے جیسا جائی ویسی ہی مجئی۔اس مجیئۃ کی تعیین ایسے وقت ہوسکتی ہے جب کہ اس موصوف کی حقیقت معلوم کی جائے اس وجہ سے کہ مجئی کی کوئی ایسی حقیقت متعینہ نہیں جس میں ہر جائی بلا امتیاز شریک ہو اور مجئی سب میں ایک حقیقت مشترک ہو بلکہ ہم برابر دیکھتے ہیں کہ جہاں اختلاف جائی ہوتا ہے مجئی بھی مختلف ہو جاتی ہے اور اس مجئی کا علم موقوف ہوتا ہے اس جائی کی ادراک حقیقت پر۔

چنانچہ دیکھئے جاء زید میں ایک مجئی کا حکم ہے۔اس کی حقیقت معلوم کرنے کے واسطے اول ذات زید کا علم ضروری ہے۔حقیقت زید معلوم کرنے کے بعد معلوم ہو کہ مجئی بامشی ہے یعنی یہ ذات چل کر آنے کی وجہ سے متصف مجئی کے ساتھ ہوئی بخلاف جاء المدینہ کے کہ یہاں پر امکنہ کی حقیقت معلوم کرنے سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ یہ مدینہ کا آنا اس طرح سے تھا کہ کوئی بات متحرک خود چل کر اس مدینہ میں داخل ہوئی۔یہ مدینہ اپنی جگہ سے نہیں سرکا' اسی طرح قوت خیالیہ میں کسی امر کا آنا کہ میرے ذہن میں یہ بات آئی تو یہاں نہ ذہن چلتا ہے نہ بات چلتی ہے بلکہ یہاں افکار کی مجئی بذریعہ تخیل ہوتی ہے' افکار کی گردش سے کسی ایک رائے یا فکر کا متعین کر لینا اس کا نام ذہن میں آنا رکھا ہے ایسے ہی جاء الصبح وغیرہ۔

اب دیکھئے کہ یہ تینوں آنے والے موصوف آنے کے ساتھ ہیں لیکن آنے والوں کی تغائر حقیقت سے مجئی کی حقیقت میں زمین وآسمان کا تفاوت ہو گیا کہ ایک مجئی پر دوسری ہرگز صادق نہیں آسکتی۔

لہٰذا جس طرح کہ یہ اشتراط (**للّٰہ درہ ثم للّٰہ درہ لعمری لقد کشف العظاء ولم یبق لاحد محل امتراء ۱۲ ظ**) ممکنات میں مشاہد ہے کہ بغیر ذات جائی کا علم حاصل کئے حقیقت مجئی کی تعیین نہیں کر سکتے ایسے ہی یہ اشتراط وہاں پر بھی ہے کہ پہلے ذات خداوندی کی حقیقت کا اعتراف کر لو پھر مجیئہ ونزول کی کیفیت ہم بتلا دیں گے اور حقیقت خداوندی کا ادراک ناممکن ہے جس سے تم عاجز ہو۔لہٰذا اس کے افعال کی حقیقت کا ادراک بھی ناممکن جس سے ہم تم دونوں عاجز۔لہٰذا اس بحث میں پڑنا محض اضاعت وقت ہی نہیں تو اور کیا ہے بلکہ خلاف سنت مظنہ ضلالت بھی ہے۔

اور اسی وجہ سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ متکلمین کے پیچھے نماز پڑھنی مکروہ بتلایا کرتے تھے۔ ان متکلمین سے وہی مراد ہیں جن کو غلو فی الکلام ہو اور جنہوں نے اعتدال سے گزر کر حقائق ممتنعہ

الادراک کے معلوم کرنے کا تہیہ کرلیا ہو پھراس میں وہ ایسے سرگرداں ہوجاتے ہیں کہ جہاں پر عقل کے گھوڑے نہیں چلتے اور یہ کارآمد ہتھیار بیکار ہوجاتا ہے وہاں پر طرح طرح کے ضعیف بے محل تاویلیں کرتے ہیں اور وہ متکلمین مراد نہیں جو رد بدعات واعتراضات اہل باطل کی غرض سے کلام کرتے ہیں کہ ان کا مطمع نظر صرف بدعات کا رد کرنا اور مسائل دینیہ پر سے اعتراضات کا دفع کرنا ہوتا ہے۔ ادراک حقیقت کا نہ وہ قصد کرتے ہیں اور نہ دعویٰ اور اگر کہیں ایسی بحث اجمالاً کرتے ہیں تو وہ حقیقت میں دعویٰ نہیں ہوتا منع ہوتا ہے۔ یعنی دوسرے کے کسی دعویٰ میں ایک احتمال نکال دیا جاتا ہے اس قسم کا کلام محمود مستحسن شمار کیا جاتا ہے۔

غرض یہ کہ جیسے ان کی شان ویسا ہی نزول۔ نہ ہم ان کی حقیقت کو جانیں کہ وہ کیسی ذات ہے جو اجسام اور مادیات بلکہ مجردات ممکنہ سے بھی پاک اور حرکات وسکنات سے مبرا ہے اور متصف بکمالات عجیبہ ہے نہ ہم ان کی ان صفات عجیبہ کو جانیں اور اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ ہم اس ذات قدوس کی حقیقت اور اس کے اوصاف کی ماہیت سے جاہل ہیں کیونکہ بہت سی چیزیں دنیا میں ایسی ہیں جن کو ہم آج تک نہیں جانتے اور یہی نہیں کہ صرف بڑے بڑے رازوں اور پوشیدہ ملکوں سے ہم ناواقف ہیں بلکہ اکثر وہ ایسی معمولی چیزیں ہوتی ہیں جو ہر وقت ہم سے قریب رہتی ہیں مگر پھر بھی ہم ان کو نہیں جانتے بلکہ جب ان کا علم ہوتا ہے تو تعجب ہوتا ہے کہ اتنی معمولی سی بات اور ہم آج تک اس سے جاہل تھے تو پھر اگر ہم ایک ذات قدوس بعید عن الادراک عائب عن النظیر غیر محدود الاوصاف کے ادراک سے جاہل اور ناواقف رہیں تو کون سا ہماری شان میں بدنما داغ لگ جائے گا۔ افسوس! ایسی معمولی اشیاء کی جہالت سے تو ہماری قابلیت میں نقصان نہ آئے اور ایک ایسی باسطوت وجبروت ذات کی حقیقت معلوم نہ ہونے سے ہماری قابلیت میں بٹہ لگ جائے اور ہم تو کیا چیز ہیں ہماری ہستی ہی کیا ہے۔ یہاں تو ایسے ایسے جلیل القدر عارف کہ جن کی تمام عمر علوم واسرار ومعارف ہی میں گزرتی ہے کوئی لمحہ ان کی عمر کا عرفان سے خالی نہیں ان کا یہ حال ہے کہ شیخ فرماتے ہیں:

دور بینان بارگاہ الست　　غیر ازیں پے نبردہ اند کہ ہست

''سو جو لوگ شقی ہیں وہ تو دوزخ میں ایسے حال سے ہوں گے کہ اس میں ان کی چیخ وپکار پڑی رہے گی (اور) ہمیشہ ہمیشہ کو اس میں رہیں گے جب تک آسمان وزمین قائم ہیں ہاں اگر خدا کو (نکالنا) منظور ہو تو دوسری بات ہے۔''

ایسے ہی عارف شیرازی فرماتے ہیں:

عنقاء شکار کس نشود دام باز چنیں　　کیں جا ہمیشہ باد بدست ست دام را

''جس طرح عنقا کو کوئی شکار نہیں کر سکتا، جال پھیلانا اور کوشش کرنا لا حاصل ہے، اسی طرح ذات باری تعالیٰ کا ادراک نہیں کر سکتا اس لیے فکر و سوچ بیکار ہے۔''

عنقا کنانیہ ذات باری تعالیٰ سے ہے کہ یہاں عقل کا جال نہ پھیلاؤ، یہاں بجز ہوا کے جال میں اور کچھ نہ آئے گا۔ مولانا رومی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

در تصور ذات او را گنج کو　　تادر آید در تصور مثل او

''ہمارے تصور میں اللہ تعالیٰ کی ذات غیر محدود کیسے آسکتی ہے تصور میں جو کچھ آتا ہے وہ مثل ہے۔''

یعنی خداوند تعالیٰ کے مثل کا تصور بھی ناممکن ہے اس وجہ سے کہ تصور مثل موقوف ہے۔ تصور ممثل لہ پر کیونکہ ادراک مماثل کے شرائط میں مثلین کا انکشاف بھی ہے اور ممثل لہ یعنی ذات خداوندی کا ادراک وانکشاف ناممکن۔ لہٰذا انکشاف تصور مثل بھی نہیں ہو سکتا اور یہاں تو کیا حقیقت باری تعالیٰ کا انکشاف تو آخرت میں بھی نہ ہو گا محض دیدار ہو گا۔ پس جب اس عالم میں جو کہ انکشاف حقائق کا عالم ہو گا یہ حقائق منکشف نہ ہوں گے تو اس عالم میں تو کیا توقع ہے اور اس مسئلہ پر عرفاء و علماء سب کا اتفاق ہے۔

اور بعض صفات جو واجب و ممکن میں بظاہر مشترک ہیں جیسے علم و قدرت وغیرہا ان سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے کہ صفات ممکن کا تو ادراک بالکنہ ممکن ہے اور بوجہ اشتراک کے وہی حقیقت ہو گی صفات واجب کی۔ پس صفات واجب کا ادراک بالکنہ ممکن ہو گیا۔

جواب یہ ہے کہ یہ اشتراک باعتبار حقیقت کے نہیں محض اعتبار اسم کے ہے اور حقیقت دونوں کی جدا جدا ہے۔ اس اصل پر ایک آیت کی تفسیر نہایت سہل ہوئی جاتی ہے۔ اسکی تقریر کرتا ہوں۔ وہ آیت یہ ہے:

فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّشَهِیْقٌ خَالِدِیْنَ فِیْهَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَاشَاءَ رَبُّکَ. الخ[1]

(سو جو لوگ شقی ہیں وہ تو دوزخ میں ایسے حال سے ہوں گے کہ اس میں ان کی چیخ و پکار پڑی رہے گی (اور ہمیشہ (ہمیشہ) کو اس میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم ہیں ہاں اگر خدا ہو کر (نکالنا) منظور تو دوسری بات ہے)

وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خَالِدِیْنَ فِیْهَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَاشَاءَ رَبُّکَ. الخ[1] (هود ۱۰۸)

"اور رہ گئے وہ لوگ جو سعید ہیں سو وہ جنت میں ہوں گے اور وہ اس میں (داخل ہونے کے بعد) ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے جب تک آسمان وزمین قائم ہیں ہاں اگر خدا ہی کو (نکالنا) منظور ہو تو دوسری بات ہے۔"

یہاں دو سوال ہیں۔ایک یہ کہ آیت میں خداوند تعالیٰ نے دونوں مقام میں **خالدین فیھا** کے بعد **مادامت السموت والارض** فرمایا ہے یعنی خلود دوام جب تک ہوگا جب تک آسمان وزمین باقی ہیں اور ظاہر ہے کہ حشر ونشر کے وقت جب صور پھونکا جائے گا تو جمیع مخلوقات کی طرح آسمان وزمین بھی فنا ہو جائیں گے تو جبکہ سموات والارض فنا ہوئے اور ان کے واسطے دوام نہ ہوا تو جو خلود اس کے ساتھ ہوگا وہ خلود غیر محدود نہ ہوا تو یہ خلود نہ کفار کے واسطے دوزخ میں ہوا نہ مومنین کے واسطے جنت میں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جن آسمان وزمین کے ساتھ تجدید اور ظرفیت دوام کی اس جگہ فرمائی گئی ہے وہ آسمان وزمین ہمارے اس عالم فانی کے سموات وارض نہیں ہیں بلکہ ان سے اس عالم کے سموات وارض مراد ہیں اور ان کا دوام غیر محدود ہے اور اس پر تعجب نہ کرو کہ کیا وہاں بھی آسمان و زمین سے ہوں گے۔سو سمجھ لو کہ وہاں کے آسمان وزمین تو یہاں کے آسمان وزمین سے بھی بڑے ہیں۔اسی کو مولانا رومیؒ فرماتے ہیں:

غیب را ابرے و بادے دیگر ست　　آسمانے آفتابے دیگر ست

وہاں کا بادل اور ہی پانی اور ہی پانی ہے' وہاں کا آسمان وآفتاب ہی جدا بلکہ میں اس سے زیادہ عجیب بات سناؤں۔خود اس عالم میں ایسی چیز موجود ہے یعنی روح جس میں آسمان وزمین اس آسمان وزمین سے زیادہ عجیب موجود ہیں۔اس کو حکیم سنائی فرماتے ہیں:

آسماں ہاست در ولایت جاں　　کارفرمائے آسمان جہاں

دررہ روح پست وبالاہاست　　کوہ ہائے بلند و صحرا ہاست

"ولایت جان میں بہت سے آسمان ہیں جو ظاہری آسمان میں کارفرما ہیں' روح باطن کے راستہ میں پست وبالا کوہ وصحرا موجود ہیں۔" اسی طرح ایک مبصر نے اشارہ کیا ہے:

ستم است گر ہوست کہ بسیر سرو سمن درآ　　تو زغنچہ کم نہ دمیدہ دردل کشابہ چمن درآ

"تمہارے اندر خود چمن ہے اس کا پھاٹک تمہارے ہاتھ میں ہے جب جی چاہے سیر کرلو"

اسی کو عارف شیرازی فرماتے ہیں:

خلوت گزیدہ رابہ تماشاچہ حاجت است　　چہ کوئی دوست ہست بصحراچہ حاجت است

"خلوت نشین کو تماشا کی کیا ضرورت ہے جب محبوب کے کوچہ میں ہے تو صحرا کی کیا ضرورت ہے۔"

اسی کو مولانا رومی فرماتے ہیں:

اے برادر عقل یک دم با خود آر　　دمبدم در تو خزاں ست و بہار

''اے بھائی تھوڑی دیر کے لیے ذرا عقل درست کر کے دیکھ خود تیرے اندر دم بہ دم خزاں اور بہار موجود ہے۔''

غرض یہ کہ جب اس عالم فانی کے مصالح کے لیے سموات وارض ہیں تو اس عالم باقی کے مصالح تو اس کے زیادہ مستحق ہیں اور وہ بھی باقی ہیں۔ لہٰذا ''مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ'' (سورہ ھود: ۱۰۸) (جب تک آسمان و زمین قائم ہیں) خلود و دوام کے منافی نہیں۔

مشیت و مصالح خداوندی

البتہ یہ خلجان ہوتا ہے کہ پھر اس تجدید کی ضرورت کیا تھی جبکہ مومنین و کفار کے لیے دوام و خلود آخرت میں بتلا دیا تو پھر اس خلود کی تجدید کیوں فرمائی گئی۔ اگرچہ اشیاء دائمہ ہی کے ساتھ کی گئی مگر اس میں فائدہ زائدہ ہی کیا ہوا۔ سو اس خلجان کا دفع یہ ہے کہ اس میں ایک عجیب لطیفہ ہے اور مقصود اس سے تاکید ہے خلود کی جو کہ ایک عجیب و غریب طریق سے کی گئی ہے جو محض خَالِدِیْنَ فِیْھَا سے حاصل نہ ہوئی تھی۔

اس کو ایک مثال سے سمجھنا چاہیے جیسے کسی شخص کو ایک مکان دیا جائے اور ہمیشہ رہنے کے واسطے دیا جائے تو اس ہمیشگی اور دوام کی تاکید کا کوئی عنوان اس سے بہتر نہیں کہ اس سے یہ کہہ دیا جائے کہ جب تک یہ گھر باقی ہے اس وقت تک کے واسطے تم کو یہ گھر دیا جاتا ہے۔ اب آپ ہی بتلایئے اس سے بڑھ کر اور کونسی تجدید یا تاکید ہے جس سے اس دوام کی توضیح اور تاکید ہو جائے تو اسی طرح اللہ پاک نے ارشاد فرمایا ہے کہ تم کو جنت اور اس کے اندر رہنے کی اجازت ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے دی جاتی ہے اور کیسی ہمیشگی ہے کہ جب تک جنت قائم رہے اس وقت تک تمہاری اور تمہارے باپ دادا کی ہے تم کو اس زمانہ قیام قیامت تک نہ نکالا جائے گا اور ظاہر ہے کہ جنت خود دائمی ہے اور ابد الآباد تک کے واسطے ہے۔ تو گویا اس تاکید............ سے ایک ایسا لطیف مضمون ادا کیا گیا کہ ہزار تصریحات ہوں ان سے بھی اس پختگی کے ساتھ یہ مضمون نہیں ادا ہو سکتا۔ بحمد اللہ ''مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ'' تو یہ شبہ بالکل رفع ہو گیا اور یہ تحقیق اس مقام پر مقصود نہ تھی تبعاً بیان کر دی گئی۔

مقصود دوسرے سوال کا جواب دینا ہے جو مبنی ہے تغایر و تمایز میں صفات الممکن و صفات الواجب پر۔ وہ سوال یہ ہے کہ اسی آیت میں آگے چل کر ایک استثناء فرمایا ہے۔ ''اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّکَ'' یہاں پر استثناء بظاہر خَالِدِیْنَ فِیْھَا سے معلوم ہوتا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مومنین کا

جنت میں اور کافرین کا دوزخ میں ہمیشہ رہنا یقینی نہیں۔ مشیت سے اس میں استثناء بھی ہوسکتا ہے کہ کسی وقت اگر چاہیں گے نکال بھی دیں گے' ساری عمر کا وعدہ نہیں ہے اور یہ ایک ایسی بات ہے جس سے جنتیوں کی تو کمر ٹوٹ گئی ہوگی کہ ہماری ساری تمناؤں اور آرزوؤں کا مدار یہی خلود اور دوام تھا کہ دنیا کی نعمتوں کو ہم نے اسی مداومت پر قربان کردیا ہے۔ اپنی امیدوں کا مرکز عالم آخرت کی بوجہ اس کے دوام ہی کے بنایا تھا لیکن قسمت سے وہاں پر بھی دوام سے محروم اور خلود سے ترستے رہے اور دوزخیوں کے غنچہ آرزو کھل گئے ہوں گے کہ بھئی خلود فی النار کو سن کر تمام دنیا کے مزے تلخ ہو رہے تھے چلو اس کھٹکے سے نجات ملی۔

سو جواب اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں پر ما مصدر بمعنی ظرف ہے جیسے آتیک حقوق النجم۔ پس ماشاء ربک کے معنی یہ ہیں۔ "اِلَّا اَنْ یَّشَآءَ رَبُّکَ" یعنی خلود تو ہمیشہ رہے گا لیکن اگر خدا تعالیٰ کی مشیت اس کے خلاف کے ساتھ معلق ہو جائے تو خلود نہیں ہوگا لیکن چونکہ دلائل سے یہ امر یقینی ہے کہ مشیت رب کبھی اس کی مقتضی نہ ہوگی کہ مومنین کو جنت سے یا مشرکین کو دوزخ سے نکالا جائے لہٰذا خلود کے خلاف کبھی واقع نہ ہوگا تو خلود ثابت رہا اور کوئی خدشہ خلود میں نہیں رہا۔

باقی یہ کہ نکتہ اس استثناء میں کیا ہوا اور " اِلَّا اَنْ یَّشَآءَ رَبُّکَ" کے زائد کرنے کا فائدہ کیا ہوا تو وہ فائدہ یہ ہوا کہ اس سے مخلوق کے بقاء اور رب العزت کے بقاء میں فرق ظاہر ہو گیا تا کہ کسی غیر محقق کو یہ خیال نہ ہو کہ افوہ! اب تو ہم کو بھی دوام کا سرٹیفکیٹ مل گیا۔ چلو اب تک جو ہم وجوب کے درجہ سے گرے ہوئے تھے اس فرق کی علت یہی گرانمایہ موتی دوام کا تھا جو آج ان کی فیاضی سے ہم کو مل گیا جس کے باعث آج امتیاز کا پردہ اٹھ گیا اور آج سے ہم بھی واجب بن گئے اور ان تخیلات وتوہمات کے شرک ہونے میں کوئی شک نہیں۔ لہٰذا اس قسم کے تخیلات موجبہ للشرک سے بچانے کے لیے "اِلَّا اَنْ یَّشَآءَ رَبُّکَ" فرمایا کہ اس عنوان خَالِدِیْنَ فِیْهَا کے معنون دوام سے پھول نہ جانا۔ یہ نہ سمجھنا کہ ہم مساوی واجب کے ہو کر ممکنیت کے پیراہن سے خارج ہو گئے' نہیں بلکہ تم ممکن ہی ہو اور ہم واجب ہی ہیں۔ دوام اگرچہ تمہارے حصہ میں بھی آ گیا لیکن تمہارا یہ دوام تو داخل تحت المشیت ہے۔ ہمارے ارادہ پر موقوف ہے کہ جب تک ہم چاہیں تم کو اس دوام میں رکھیں اور جب چاہیں کان پکڑ کر نکال باہر کریں' گو نکالیں گے نہیں' مگر پھر بھی تحت المشیت ہے بخلاف ہمارے دوام کے کہ ہمارا دوام مستقل بالذات ہے کسی کی مشیت پر موقوف نہیں کوئی احتمال اس دوام کے فنا ہونے کا نہیں ہے۔

اس نکتہ کی طرف شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں بہت سہل

عنوان سے اشارہ فرمایا ہے کہ اس سے مقصود صرف یہ بتلانا ہے کہ یہ دوام تحت المشیت ہے یہی تھی وہ اصل تغائر وتمائز بین صفات الممکن وصفات الواجب کی جس کا اوپر ذکر تھا۔

اوراس ممکنات کے دوام پر ایک حکایت یاد آئی کہ کسی گاؤں کا ایک گنوار کلکٹر کے پاس آیا اور بہت ادب سے سلام کیا اور نہایت عاجزی سے پیر دبانے لگا۔ کلکٹر نے منع کیا کہ بس رہنے دو، مطلب کہو کس واسطے آئے ہو؟ کیا کام ہے؟ مگر اس نے پیر نہ چھوڑے دباتا رہا۔ آخر جب اس نے بہت کچھ منع کیا اور مطلب دریافت کیا تو اس نے کہا کہ میں تو تہارے (تمہارے) سے ایک بات پوچھوں کہ مجھے یہ بتادے کہ موروثی کسے کہیں (کہتے ہیں) اس نے کہا، جا کسی پٹواری سے جاکر پوچھ،اس نے کہا کہ نا صاحب! میں تو تہارے ہی سے پوچھوں۔ کوئی کچھ بتلائے کوئی کچھ بتلائے۔ اس نے بتلایا کہ موروثی اسے کہتے ہیں کہ کوئی کاشتکار کسی زمین دار کی زمین میں ۱۲ برس تک کاشت کرتا رہے تو اس کے بعد اس زمیندار کو کاشتکار سے زمین لے کر کسی دوسرے کاشتکار کو دینے کا حق باقی نہیں رہتا۔ اس نے کہا کہ دیہہ دیہہ گجب (غضب) ہوگیا۔ تھارے تصیلدار (تحصیلدار) کو شاملی کی تصیل میں گیارہ برس تو ہو گئے، بس ایک برس میں تصیل اس کی موروثی ہوجائے گی، پھر نہ تیرے باپو سے جانہ میرے باپو سے جا۔ غرض اس نے ایسے مزے سے کہا کہ کلکٹر اس کے مطلب کو خوب سمجھ گیا کہ یہ تحصیلدار کی شکایت کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ حالات تحقیق کئے اور وہ تحصیلدار اس تحصیل سے تبدیل کر دیا گیا۔

تو دیکھئے! حکام دنیوی میں کوئی حاکم اپنے عہدے ومنصب پر اپنے اختیار سے دائم نہیں رہ سکتا بلکہ ہر حاکم پر ایک حاکم اعلیٰ ہے جس کا یہ ماتحت ہے اور وہ اس کو اس عہدہ سے علیحدہ کرنے کا اختیار رکھتا ہے تو تحصیل جو کہ ایک نہایت ادنیٰ محکمہ ہے تو وہ کسی کے واسطے موروثی ہو نہیں سکتا اور جنت الفردوس جو راس النعیم ہے جس کے وعدہ سے مومن کی روح تازہ ہوتی ہے بدن میں قوت آتی ہے، ایسی بڑی نعمت ہمارے واسطے موروثی ہوجائے کہ خدا کو بھی نعوذ باللہ اس سے علیحدہ کرنے کا اختیار نہ رہے۔ کیا خوب! لہٰذا ابدیت اور دوام اگرچہ ممکن کے واسطے ثابت ہے لیکن دوام واجب کے ہرگز مساوی نہیں ہوسکتا بلکہ دونوں میں حقیقت تغائر نوعی ہے۔ پس خداوند تعالیٰ نے اس شرک اور باطل پرستی سے بچانے کی غرض سے اس استثناء کو بڑھا دیا ہے۔ تو دیکھئے کہ دوام منجملہ دیگر صفات خداوند قدوس کے ایک صفت ہے اور ممکن بھی اس میں مشارکت عرضی رکھتا ہے لیکن پھر بھی تغائر وامتیاز دونوں دواموں میں ایسا موجود ہے جس کی وجہ سے ہر ایک دوسرے سے ممتاز ہے

اس ذات قدوس کا دوام اعلیٰ و برتر ہے۔ اس ذات ممکن کا دوام ادنیٰ وانقص ہے۔

چہ نسبت خاک رابا عالم پاک

(خاک کو عالم پاک سے کیا نسبت)

جب دونوں میں ایسا تغائر ہے تو صفات ممکن کے ادراک سے صفات واجب کے ادراک کا امکان لازم نہیں آتا' خواہ آخرت میں ہو یا دنیا میں کسی جگہ بھی ادراک وانکشاف حقیقت واجب تعالیٰ یا ان کی صفات کا بالکنہ نہیں ہوسکتا۔ استحالہ عقلی وامتناع نقلی ہر دو موجود ہیں۔ چنانچہ جمیع عقلاء زمانہ وفلاسفہ متقدمین اور متاخرین کا اس پر اتفاق بھی ہو چکا ہے کہ ادراک ماہیت واجب تعالیٰ کا بالکنہ عقلاً مستحیل ہے اور نقلاً بھی حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ آخرت کی سب سے بڑی نعمت اور اعلیٰ ترین انعام رویت خداوند ذوالجلال ہے کہ اس روز جمیع حجب وموانعات اس ذات کبریائی کے چہرہ انور سے اٹھ جائیں گے اور تشنہ لب دیدار سے سیراب ہوں گے۔

"ولایبقی علی وجه حجاب الا رداء الکبریا"[1]

ایک حجاب یعنی رداء کبریا اس وقت بھی نہ اٹھے گی اور نہ اس کے بعد اٹھنے کی امید ہے کیونکہ منشاء اس کا وجوب بالذات ہے۔ جب وجوب منفک نہیں ہوسکتا تو اس کا لازم یعنی امتناع ادراک بالکنہ بھی منفک نہیں ہوسکتا۔ اس لیے میں نے کہا ہے کہ وہ نہ رداء اٹھے گی اور نہ اس کے اٹھنے کی امید ہے اور یہ وجوب جس طرح لازم ہے اسی طرح اخص صفات سے بھی ہے۔

اس پر ایک کام کا مضمون یاد آ گیا۔ وہ یہ کہ عامہ متکلمین وحکماء میں ایک اختلاف ہوا ہے۔ حکماء تو صرف وجوب وقدم بالذات کو خاص کہتے ہیں۔ باری تعالیٰ کے ساتھ اور قدم بالزمان اور تجرد کو غیر واجب کے لیے بھی مانتے ہیں اور متکلمین ان سب کو خاص لکھتے ہیں۔ اسی بناء پر قائلین بالمجردات کی تکفیر کرتے ہیں اور محققین وجوب بالذات وقدم بالذات و بالزمان کو خاص کہتے ہیں اور تجرد کو خاص نہیں کہتے اور خود بھی مجردات حادثہ بالزمان کے قائل ہیں اور ان کے لطائف کہتے ہیں جن میں ایک روح بھی ہے جس کو حادث بھی مانتے ہیں اور مجرد بھی۔ چنانچہ وہ روح کی حقیقت جوہر مجرد حادث قبل البدن بتلاتے ہیں اور اسی تجرد کی بناء پر وہ روح مجرد کو خارج از امکنہ مانتے ہیں اور لامکانی سے تعبیر کرتے ہیں اور اعجازاً کہہ دیا کرتے ہیں کہ وہ مکان میں رہتی ہے اور صوفیاء نے اسی توجیہ پر لطائف کی نسبت کہا ہے کہ وہ فوق العرش ہیں جن کے معنی یہ نہیں کہ وہ عرش کے اوپر

---

[1] (لم اجده فی "موسوعة أطراف الحدیث النبوی الشریف" التی رتبها أبوهاجر محمد السعید بن بسیونی زغلول)

رہتے ہیں جیسا کہ لفظی ترجمہ اور ظاہری معنی سے متبادر ہوتا ہے بلکہ عرش چونکہ منتہی اور محدود ہے امکنہ ثابت بالدلیل کا لہٰذا فوق العرش بمعنی لا مکان ہے اور لطائف چونکہ امکنہ سے منزہ اور مجرد ہیں اس لیے فوق العرش کنایہ ہوا غیر مکانی ہونے سے۔ان کے نزدیک کسی ایسے مجرد کا قائل ہو جانا جو ممکن اور حادث بمعنی مسبوق بالعدم الواقعی ہو موجب تکفیر نہیں۔البتہ جو شخص وجوب بالذات یا قدم بالذات یا بالزمان کو غیر باری کے لیے ثابت کرے اس کی وہ بھی تکفیر کرتے ہیں کیونکہ یہ اخص صفات باری تعالیٰ سے ہے۔یہ استطرادًا اس اختلاف کا بیان ہو گیا۔

اب مقصود مقام کی طرف عود کرتا ہوں کہ جب منشاء انتباہ ادراک بالکنہ کا وجوب بالذات ہے جس کا انفکاک محال ہے اس لیے آخرت میں بھی خداوند تعالیٰ کی ذات وصفات کا انکشاف ہونا ناممکن اور محال ہے اور اسی وجہ سے عرفاء نے کہا ہے کہ مسئلہ قدر کا انکشاف آخرت میں بھی نہیں ہوگا جیسا کہ نہیں ہوا اس وجہ سے کہ یہ مسئلہ بھی راجع ہے اور ایک کنہ ذات وصفات کی طرف اور ذات وصفات کا علم بالکنہ نہ دنیا میں ہو سکتا ہے نہ آخرت میں، ہر دو جگہ ناممکن ہے۔لہٰذا جو اس پر موقوف ہے اس کا علم بھی دونوں جہاں میں نہ ہوگا نہ یہاں نہ وہاں تو جب ایسے عرفاء وفضلاء نے اپنی ہمتوں کو قاصر سمجھ لیا اور یقین کر لیا کہ ان مسائل ذات صفات کا حقیقی علم نہیں ہو سکتا تو اب ہم جیسے جاہلوں کا ان مسائل میں لب کشائی کرنا محض بے ادبی اور تضیع اوقات ہے بلکہ خلاف فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم وصحابہ کرامؓ ہے۔ہم کو ایسے علوم میں تو الہام پر اکتفا کرنا چاہیے اور اعمال کے اہتمام میں لگنا چاہیے جس کو میں نے اوپر بیان کیا ہے جس کا سلسلہ دراز ہوتا چلا آیا۔اور وہ بیان یہ تھا کہ یہ آیت یعنی

لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَافَاتَكُمْ. (الحدید آیت نمبر ۲۳)

ترجمہ: ”یہ بات بتلا اس واسطے دی ہے تا کہ جو چیز تم سے جاتی رہے تم اس پر رنج (اتنا) نہ کرو۔“ مؤید ہے اس دعویٰ کہ یہ علوم مقصودہ فی نفسہا سے بھی مقصود محض علوم ہی نہیں ہوتے بلکہ مثل علوم کے اعمال بھی مقصود ہیں۔لہٰذا جس طرح کے مقصود اس حدیث ”ینزل ربنا تبارکت تعالیٰ“ سے اطلاع نزول باری تعالیٰ ہے اسی طرح مقصود ترغیب قیام لیل بھی ہے مگر ہمارا حال یہ ہے کہ ہم محض علم کو بے سود سمجھ کر ینزل ویحییٰ وغیرہ کی تحقیق کے پیچھے پڑ گئے اور جو مقصود یعنی قیام لیل تھا اس کو ترک کر دیا۔

اسی طرح آیت ”ماهذه الحيوة الدنيا“ (العنکبوت: ۶۴) (اور یہ دنیوی زندگی (فی نفسہ) بجز لہو ولعب کے اور کچھ بھی نہیں) صاف دلیل ہے کہ صرف علم واعتقاد آخرت ہی مقصود نہیں بلکہ اس سے عمل میں کام لینا بھی مقصود ہے۔یعنی جس طرح ہم کو فناء دنیا کا اعتقاد ویقین ہے اسی

طرح اعراض عن الدنیا واستحضار فناء دنیا کو بھی اختیار کریں جو اس علم واعتقاد کا مقصود ثانی ہے۔ گویا اعتقاد فناء دنیا کی غرض اس وقت تام ہوگی جبکہ اعراض عن الدنیا بھی ساتھ ساتھ ہو اور اس کا استحضار بھی ہر وقت رہے تاکہ اس علم واعتقاد کی غرض وغایت مرتب ہو ورنہ یہ علم واعتقاد درجہ مقصودیت میں کامل نہ ہوگا۔ چنانچہ عنوان اس آیت کا کس خوبی سے اس مضمون کو ادا کر رہا ہے۔

(ماشاءاللہ! کس قدر طویل الذیل اور قابل قدر مضمون اس مختصر سی آیت میں بلا کسی تدقیق ومشقت اور بغیر کسی دلالت خفیہ کے بیان فرمایا ہے)

یہ نہیں کہ کسی قسم کی تکلیف یا کھینچ تان کے ذریعے سے یا توجیہات بعیدہ کی مدد سے ان مضامین کو اخذ کرنا پڑا بلکہ ان مسائل کا استنباط اس آیت سے ایسا ہی ہے جیسے کنویں میں پانی نہ ہوتا تو کس طرح نکل آتا۔ لہٰذا پانی کا برآمد ہونا یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس کنویں میں ضرور پانی تھا۔

قرآن کریم ایک تجلی ہے

اسی طرح ان مضامین کا اس وضاحت کے ساتھ اس آیت سے مستنبط ہونا بتلا رہا ہے کہ یہ مضامین فی الواقع اس آیت میں تھے اور حقیقتاً یہ مضامین صرف ایک حصہ ہیں ان مضامین کا جو اس آیت میں واقع میں رکھے ہوئے ہیں کیونکہ کسی شخص کی قدرت میں نہیں کہ وہ کسی آیت کی تفسیر اور تشریح اس قدر کر سکے جس کے بعد اس کے تحت میں مسائل نہ رہیں۔ نکات ومضامین عالیہ قرآن شریف کے ختم ہونے والے نہیں ہیں۔ یہی تو اعجاز ہے کلام مجید کا جس نے تمام دنیا سے کلام الٰہی ہونے کی تصدیق کرا دی ہے۔

چیست قرآن اے کلام حق شناس   رونمائے رب ناس آمد بناس

''اے کلام حق کے پہچاننے والے قرآن پاک کیا ہے وہ یہ ہے کہ لوگوں کی طرف رب کا رہنما ہے۔''

حرف حرفش راست دربر معنے   معنے در معنے در معنے!

''اس کا حرف حرف با معنی بالکل صحیح ہے معنی اندر معنی کے ہے۔''

یعنی قرآن شریف کیا چیز ہے وہ ایک خدا کو دکھلانے والا آئینہ اور رب العزت تک پہنچانے والا زینہ ہے کہ اس کی شاہراہ پر پڑ کر انسان کبھی گمراہ نہیں ہو سکتا۔ مقصود حقیقی تک ان شاءاللہ ضرور پہنچ جائے گا کیونکہ فی الحقیقت قرآن شریف ایک تجلی ہے تجلیات خداوند تعالیٰ سے اور ظاہر ہے کہ جو شخص تجلی حق کو رہنما بنائے گا وہ کیونکر اس تجلی کے مبدا یعنی خداوند حقیقی تک نہ پہنچے گا۔ اگرچہ اس قرآن کو متکلمین کلام لفظی سے تعبیر کرتے ہیں لیکن کلام لفظی ہونا تجلی ہونے کے منافی نہیں کیونکہ یہ واضح رہے

کہ قرآن خداوند تعالیٰ کا کلام لفظی ایسا نہیں جیسا کہ ہمارا تمہارا کلام لفظی ہوتا ہے کہ اس کو گو ہمارے ساتھ ایک خاص تعلق اور ایک بلاواسطہ نسبت ہوتی ہے مگر اس کو ہماری ذات سے باہر تکلم کے انفصال ہوجاتا ہے کیونکہ اس کا مبدائے ظہور ہماری زبان ہے اور زبان کے ساتھ ساتھ بعد تکلم کے کلمات قائم نہیں رہتے۔ سو یہ نسبت وعلاقہ خدا کے کلام لفظی کو اس کی ذات سے نہیں اگرچہ متکلمین نے اس پر کلام لفظی کا اطلاق کیا ہے اور کلام لفظی ہی سے اس کی تعبیر کیا جاتا ہے لیکن پھر بھی کلام لفظی الٰہی کو اپنے کلام لفظی پر قیاس کرنا غلط ہے اور گو اس کی کوئی مثال حقیقی بیان نہیں ہوسکتی جیسا عارف رومی فرماتے ہیں:

اے بروں از وہم قال و قیل من　　　خاک برفرق من و تمثیل من

''اے اللہ آپ میرے وہم وخیال اور قیل وقال سے پاک ہیں میرے سر اور تمثیل پر خاک پڑے۔''

مگر تقریب الی الفہم کے لیے ہیں اس کی ایک مثال بیان کرتا ہوں کیونکہ بدون مثال کے فرق واضح نہیں ہوتا۔ جیسا مولانا فرماتے ہیں:

بندہ نشکیبد ز تصویر خوشت　　　ہردمت گوید کہ جانم مفرشت

''بندہ کو بغیر تصور صبر نہیں آتا اور تصور بغیر مثال کے ناممکن ہے' پس ہر وقت اپنی جان کو پیش کرتا رہتا ہے۔''

یعنی گو مثال مشابہ ممثل لہ کے نہیں ہوسکتی بلکہ کوئی شے دنیا میں ایسی نہیں جس کو تشبہ کافی یا کسی درجہ میں مماثلت واقعیہ خداوند تعالیٰ کے ساتھ ہو لیکن تسلی بدون اس کے نہیں ہوتی۔ لہٰذا عوام کو سمجھانے اور خلجان کو رفع کرنے کے واسطے اس کی اس طرح مثال دی جاسکتی ہے۔

جیسے ایک تو آفتاب کی ذات ہے یعنی قرص آفتاب اور ایک وہ نور ہے جو آفتاب کے ساتھ قائم ہے اور ایک وہ لمبی لمبی تیز شعائیں ہیں جو دور تک پہنچتی ہیں اور ایک آئینہ ہے کہ اول اس پر شعائیں پڑتی ہیں اور ایک زمین ہے جس پر وہ لمبی لمبی شعائیں آئینہ میں سے آکر پڑتی ہیں تو ذات خداوند تعالیٰ تو بمنزلہ ذات آفتاب کے ہے اور ان کا کلام نفسی جو کہ بمرتبہ صفات لازمہ لاعین ولاغیر ہے۔ یہ بمنزلہ نور آفتاب کے ہے اور کلام لفظی بمنزلہ ان شعاؤں کے ہے جو قرص سے نکل کر دور دور منتشر ہوتی ہیں اور قلب مبارک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بمنزلہ آئینہ کے ہے اور ہم بمنزلہ زمین کے ہیں۔

غرض اس مثال کے بیان کرنے سے یہ ہے کہ ازالہ شبہ کافی طور سے ہوجائے اور اس کلام لفظی کے اطلاق سے ایسا ہی کلام لفظی مفہوم ہوا جیسا ہمارا کلام ہوتا ہے اور فرق واضح ہوجائے۔ اگر شبہ ہو کہ کلام لفظی کو تو مخلوق کہا گیا ہے پھر اس کلام میں اور ہمارے کلام میں کیا فرق ہے؟

جواب یہ ہے کہ وہ فرق مجہول الکنہ ہے۔ اس فرق کا اثر یہ ہے کہ ہم سے کلام صادر ہوتا ہے اس کو کلام حق کہنا جائز نہیں اور قرآن کے مرتبہ کلام لفظی کو کلام حق کہنا جائز ہے اور اسی مثال سے یہ بات بھی معلوم ہو جائے گی جس طرح ہم منتشر عوام زائد خاص نور تجلی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے جس کا سبب ہمارا ضعف استعداد ہے۔

اور اسی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سوال کیا اور تجلی کی درخواست کی تو ان کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ ''لن ترانی'' یعنی (تم ہم کو نہیں دیکھ سکتے) یعنی ہم میں تو مرئی ہونے کی قابلیت تام ہے، کوئی شے ہماری رویت سے مانع نہیں اس لیے لن اریٰ نہیں فرمایا۔ مگر تم میں اس وقت رائی ہونے کی قابلیت نہیں کیونکہ ہم نور محض ہیں اور تم جس کثیف سے متلبس ہو جو ہمارے پرتو نور کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ گو بتلا دیا کہ اس وقت تم میں اتنی استعداد نہیں کہ ہم کو دیکھ لینے کے بعد صحیح و سالم رہو۔ ہر چند کہ یہاں بھی نہ ہونے کے سبب کو صاف طور سے بتلا رہا ہے اور اس کے سن لینے کے بعد ہر ایک مؤمن کو عقیدہ اپنی عدم قابلیت کا کافی طور سے ہونا لازم ہے۔ چہ جائیکہ موسیٰ علیہ السلام کو یہ عقیدہ ہو۔

لیکن چونکہ موسیٰ علیہ السلام عاشق تھے اس لیے گو عقیدہ کے اعتبار سے ان کو اپنی عدم استعداد کا یقین ہو گیا تھا لیکن شوق اور جذبہ دیدار الٰہی کا حد سے بڑھا ہوا تھا۔ اس کی تیزی اب تک کم نہ ہوئی تھی لہٰذا آگے خود ہی ان کی اس حالت کی رعایت سے ارشاد فرماتے ہیں کہ لیکن اگر تمہیں اب بھی شوق ہے تو............ **نظر الی الجبل الآیہ**............ تم اس پہاڑ کی طرف دیکھتے رہو۔ اگر یہ پہاڑ صحیح و سالم رہا اور ہماری تجلی کا متحمل ہو گیا تو تم کو بھی نہ محروم رکھا جائے گا۔ چنانچہ **''فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ الآیہ''** ''جب اس پر تجلی فرمائی تو پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہو کر گر پڑے) اور اطمینان شافی ہو گیا اور عدم قابلیت کا مشاہدہ بھی ہو گیا کہ جب پہاڑ باوجود اس قدر عظیم الجثہ اور شدت کے نہ ٹھہر سکا تو میں کیا ٹھہر سکوں گا۔

اگر یہ شبہ کیا جائے کہ پہاڑ کو موسیٰ علیہ السلام سے کیا نسبت تھی۔ یہ جماد محض اور وہ انسان باکمال صاحب نبوت کلیم اللہ۔ لہٰذا یہ قیاس اور سمجھ میں نہیں آتا جو کہ ''فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ'' میں استقرار جبل و رویت موسیٰ کے درمیان ثابت کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی روحانی قوت کی وجہ سے تجلی کے متحمل ہو جاتے۔

تو جواب اس کا یہ ہے کہ جس تجلی کا موسیٰ علیہ السلام کو پہاڑ سے زیادہ تحمل تھا وہ تو ان کو اس درخواست سے پہلے ہی حاصل تھی یعنی تجلی بالقلب و بالروح مگر اس وقت تو انہوں نے آنکھ سے

دیکھنے کی درخواست کی تھی اور آنکھ سے رویت تجلی بالروح نہیں بلکہ بالجسم ہے تو اس صورت میں تجلی خداوند تعالیٰ کی موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ آنکھ کے ہوتی اور آنکھ ایک جسمانی شے ہے مگر نہایت ضعیف اور نازک عضو ہے اور پہاڑ بھی ایک جسم ہے اگرچہ غیر جان دار ہی سہی۔ مگر آخر جسمیت میں آنکھ کا مشارک ہے ہی اور باوجود اس کے نہایت ثقیل وقوی ہے کہ ہر ایک بھاری سے بھاری بوجھ کو سہہ سکتا ہے۔ چنانچہ خود خداوند تعالیٰ فرماتے ہیں:

ءَ اَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَاءُ بَنٰهَا الآیہ. (النازعات :۲۷)

''بھلا تمہارا (دوسری بار) پیدا کرنا (فی نفسہ) زیادہ سخت ہے یا آسمان کا اللہ نے اس کو بنایا۔''

اور فرماتے ہیں:

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ. (المؤمن :۵۷)

''بالیقین آسمانوں اور زمین کا (ابتداء) پیدا کرنا آدمیوں کے دوبارہ پیدا کرنے کی نسبت بڑا کام ہے۔''

اشدیت واکبریت سماوات وارضین کی انسان سے اس آیت سے ظاہر ہے کہ باعتبار مادہ کے آسمان وزمین انسان سے سخت تر ہیں۔ لہٰذا جلال وجمال خداوندی کے جلوہ کا تحمل جب ایک ایسا جسم سخت وقوی نہ کر سکا تو موسیٰ علیہ السلام کی آنکھ تو کیا جمال جہاں آراء کی تاب لا سکتی تھی اور وہ خود کیونکر قائم رہ سکتے تھے۔ لہٰذا اپنے ضعف اور پہاڑ کی شدت کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب انہوں نے پہاڑ کا یہ حال دیکھا تو ان کو مشاہدہ سے اطمینان اپنے غیر متحمل ہونے کا ہو گیا اور یہاں بظاہر ایک شبہ ہوتا ہے کہ اس تقریر سے تو معلوم ہوا کہ تجلی نہ ہوئی لیکن لفظ تجلی جو آیت میں واقع ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تجلی ہوئی کیونکہ موسیٰ علیہ السلام تجلی کے بعد بیہوش ہوئے۔ چنانچہ آیت میں ''فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا الآیہ''(الاعراف :۱۴۳) سے صاف ظاہر ہے کہ اول تجلی ہوئی اور اس کے بعد پہاڑ بھی ٹکڑے ہوا اور موسیٰ علیہ السلام بھی بیہوش ہوئے۔ لہٰذا موسیٰ علیہ السلام کے لیے ثبوت تجلی اس آیت سے بالکل واضح ہے۔

تو جواب یہ ہے کہ یہ تو مسلم ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا بے ہوش ہونا تجلی سے مؤخر ہے لیکن تاخر کی دو قسمیں ہیں ایک زمانی' دوسرے ذاتی تو موسیٰ علیہ السلام کا بیہوش ہونا ذاتاً تجلی سے مؤخر ہے نہ کہ زماناً۔ بلکہ زماناً بجائے تاخر کے اقتران تھا اگر تاخر زمانی کا ثبوت ہو جاتا تب تو تجلی کا ثبوت ہو جاتا مگر محض تاخر ذاتی سے اس کا ثبوت دشوار ہے کیونکہ زماناً معیت تھی۔ نیز تجلی کے معنی ظہر کے ہیں اور ظہور مستلزم ادراک ورویت کو نہیں۔ پس ذات خداوندی کا ظہور تو ضرور ہوا چنانچہ

اس کے اثر سے پہاڑ ٹکڑے ہو گیا لیکن اس کا ادراک موسیٰ علیہ السلام کو نہیں ہوا بلکہ آپ فوراً بیہوش ہو گئے۔ لہٰذا تجلی خداوند تعالیٰ کی فی نفسہ ممکن ہے اور ہو سکتی ہے مگر ہم میں ابھی اتنی قابلیت نہیں کہ ہم اس کے متحمل ہو سکیں بلکہ وہاں تو تجلی کا خود تقاضا ہے۔ چنانچہ عارف جامی فرماتے ہیں:

نکور و تاب مستوری ندارد   چودر بندی سراز روزن برآرد

(حسین مستور ہونے کی تاب نہیں رکھتے اگر تم دروازہ بند کرلو تو روزن سے سر نکالتے ہیں)

اور ان الفاظ کا ظاہری مدلول مراد نہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ ادھر سے تو ظہور ہی کا تقاضا اختیاری ہے بوجہ غایت رحمت ورافعت کے کہ آؤ اور ہماری تجلی سے مستفیض ہو مگر کیا کریں ہم مجبور ہیں۔ ہم میں اتنی قابلیت ہی نہیں کہ ہم اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اگر ہم میں ہمت ہوتی تو ضرور مستفیض ہوتے۔ چنانچہ تجلی کلامی لفظی کے تحمل کی طاقت ہم میں تھی لہٰذا ہم کو اس سے فیض یاب کیا گیا لیکن یہ نہ سمجھنا کہ یہ ہماری ذاتی قابلیت کے طفیل ہے اور ہمارے اندر بھی کوئی ذاتی جوہر اگرچہ بقدر قلیل ہو رکھا ہوا ہے جس سے ہم خود اس کے متحمل ہو گئے بلکہ درحقیقت یہ قدرت اور طاقت بھی خداوند تعالیٰ ہی نے ہم کو دی ہے یہ بھی انہیں کی عنایات کا ثمرہ ہے کہ آج اس نور کی بدولت ہمارے قلوب روشن ہیں۔

تجلی کے اثرات

نیز اس تحمل سے یہ بھی نہ خیال کرنا چاہیے کہ اس تجلی کلامی نے اپنی عظمت کو چھوڑ کر نقص اختیار کر لیا ہے جس کی بناء پر ہم متحمل ہوئے بلکہ وہ اپنی اسی شدت وصولت پر باقی ہے جیسے اصل میں تھی جس کا یہ اثر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زانو پر سر رکھے ہوئے لیٹے تھے کہ نزول وحی ہونا شروع ہوا۔ وہ صحابی فرماتے ہیں کہ اسی وقت ثقل سے یہ حالت تھی کہ قریب تھا کہ میرا زانو پھٹ جائے۔

نیز ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اونٹنی پر سوار تھے کہ آپؐ پر نزول وحی ہوا۔ اونٹنی اس شدت کو برداشت نہ کر سکی اور بیٹھ گئی۔

اس سے معلوم ہوا کہ باوجود یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ممتاز تحمل عطا فرمایا گیا تھا مگر پھر بھی آپؐ پر اس قدر شدید اثر ہوتا تھا مگر ہم جو آج اس کلام مجید کو پڑھتے ہیں اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور یہ شدت ہم کو نہیں ہوتی اس کی وجہ محض یہ ہے کہ اول اس کے نزول میں جبرائیل علیہ السلام وارد ہوئے اور اس میں خفت ہوئی۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کا نزول ہوا تو اور خفت ہوئی۔ اب ان واسطوں کے بعد ہم اس کے متحمل ہو سکے کہ ہم اس کو پڑھ سکیں

اور یاد کر سکیں۔ باقی اس کی اصل عظمت کہیں نہیں گئی۔ ان دونوں حضرات نے اس کی صولت کو برداشت کر لیا۔ اب ہمارے واسطے سہل ہو کر ہم تک پہنچا ہے جیسے بچے سے بوجھ اٹھوانا ہو تو ماں باپ سہارا لگا دیتے ہیں تو بچہ اس کو اٹھا لیتا ہے لیکن اب تک بھی اگر موانع مرتفع ہوں تو اس تجلی کا اتنا بڑا اثر باقی ہے کہ بعض وقت جب نہایت خشوع و خضوع سے تلاوت کی جاتی ہے تو ایک عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے حتیٰ کہ بعض اولیائے کرام تو ان آیات کلام مجید کو سن کر اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ اس جہان سے رحلت فرما گئے اور ان حضرات کے قلوب تو اعلیٰ درجہ کے نورانی تھے جو اس سے متاثر ہوئے مگر ہم سیاہ کاروں پر بھی اتنا اثر تو ضرور ہے کہ بسا اوقات جب قرآن شریف کو قرآن کی طرح پڑھا جاتا ہے تو ایک عجیب کیفیت اور رقت طاری ہو جاتی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہم کو قرآن شریف پڑھنا ہی نہیں آتا ورنہ اگر حق قرأت ادا کیا جائے اور خشوع و خضوع ہو تو اس کے کوئی معنی نہیں کہ یہ لذت حاصل نہ ہو۔ چنانچہ عرب میں ایک ادنیٰ درجہ کا فقیر یا معمولی آدمی بھی قرآن شریف پڑھتا ہے تو اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ واقعی حق تو وہی لوگ ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک معمر اور نابینا بی بی فاطمہ تھیں جو باب عمرہ پر برابر بیٹھا کرتی تھیں۔ واقعی ان کے پڑھنے میں ایک عجیب لطف آتا تھا کہ ہر وقت سننے والوں کی ایک بھیڑ لگی رہتی تھی اور صاحب اہل عرب ہی پر کیا موقوف ہے جو اہل دل ہوتے ہیں ان کے پڑھنے میں ضرور اثر ہوتا ہے۔

چنانچہ میرٹھ میں ایک حافظ ایک مسجد میں تراویح پڑھاتے تھے' وہ مسجد برلب سڑک واقع تھی۔ تمام آنے جانے والے حتیٰ کہ انگریز تک بھی کھڑے ہو کر سنا کرتے تھے۔ اس سے زیادہ اور کیا تجلی کا اثر ہوگا کہ اگر معتقد بھی نہ ہو مگر خالی الذہن ہو اس کے قلب کو بھی نہایت قوت کے ساتھ اپنی طرف کھینچتا ہے قطع نظر اس کے کہ وہ مومن ہو یا کافر اس کی کشش سب پر اپنا اثر دکھاتی ہے۔

چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مکہ میں رہنے کے لیے کفار کی ایک یہ شرط ٹھہری تھی کہ آپ کلام مجید زور سے نہ پڑھا کریں' ہماری عورتوں پر اثر پڑتا ہے خدا کی شان کہ جاہل عورتیں وہ بھی ادنیٰ الطبع مگر اس کی تریاق قوت وہاں بھی رنگ لاتی تھی۔ چنانچہ بہت سے لوگ محض قرآن سن سن کر ایمان لائے اور داخل زمرہ اسلام ہوئے۔

غرض قرآن شریف تجلی الٰہی ہے اس وقت ہم اس قدر تجلی کے قابل تھے تو حق تعالیٰ نے اس کے ذریعے سے ہم کو اپنا جلوہ دکھایا ہے۔ گو اس وقت وہ یوں فرما رہے ہیں:

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل   ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

یہ شعر زیب النساء متخلص بہ مخفی کا ہے اور اس کے متعلق ایک قصہ ہے وہ یہ کہ شاہ ایران کی زبان پر ایک دفعہ یہ مصرعہ بے ساختہ موزوں ہو گیا تھا۔

در ابلق کسے کم دیدہ موجود

بادشاہ نے شعرائے ایران سے درخواست کی کہ اس کا دوسرا مصرعہ لگاؤ۔ کسی سے بھی دوسرا مصرعہ نہ بن سکا تو بادشاہ نے شاہ ہندوستان کو لکھا کہ شعرائے ہند سے درخواست کی جائے کہ اس مصرع پر مصرع لگائیں۔ اس کی اطلاع زیب النساء کو بھی ہوئی۔ یہ بھی بڑی شاعرہ تھی اس لیے اس کو بھی فکر ہوئی۔ ایک دن اتفاق سے صبح کے وقت سرمہ لگا رہی تھیں، سرمہ کچھ آنکھیں میں لگا اور اس کے اثر سے ایک قطرہ سرمہ آلود ٹپکا تو فوراً اس کا ذہن اس شعر کی طرف منتقل ہوا اور کہا:

در ابلق کسے کم دیدہ موجود مگر اشک بتاں سرمہ آلود

''ابلق کا موتی موجودہ لوگوں میں سے بہت کم کسی نے دیکھا ہوگا سوائے سرمہ آلود حسینہ کے''

اس نے شاہ ہند کو اطلاع دی کہ مصرع ثانی بن گیا۔ آپ شاہ ایران کو اطلاع کر دیں۔ چنانچہ وہاں یہ مصرع پہنچا تو شاعر کی بڑی تعریف ہوئی مگر یہ کسی کو خبر نہ تھی کہ شاعر عورت ہے۔ شاہ ایران نے وہاں سے بہت کچھ انعام و خلعت بھیجا اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ شاعر کو ہمارے پاس بھیج دیا جائے۔ شاہ ہند نے زیب النساء سے کہا کہ ایران سے تیرا بلاوا آیا ہے۔ بتائیں میں کیا جواب دوں؟ اس نے کہا کہ آپ جواب میں میری طرف سے یہ شعر لکھ بھیجئے کہ شاعر نے یہ جواب دیا ہے:

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

''میں شعر و سخن میں مخفی ہوں جس طرح پھول کی خوشبو پھول کے پتہ میں چھپی ہوتی ہے جو مجھ سے ملاقات کرنا چاہے میرے کلام کا مطالعہ کرے۔''

چنانچہ یہ شعر لکھ دیا گیا اور شاہ ایران سمجھ گیا کہ شاعر عورت ہے۔ بہر حال اس شعر میں مخفی نے یہ کہا ہے کہ جس کو میرے دیدار کا شوق ہو مجھے میرے کلام میں دیکھ لے۔ تو کیا مخفی کا کلام متکلم کو دکھائے اور خدا کا کلام خدا کو نہ دکھائے یہ نہیں ہو سکتا۔ پس حق تعالیٰ بھی گویا اس وقت یہی فرما رہے ہیں کہ جو مجھے دیکھنا چاہے وہ میرے کلام میں مجھے دیکھ لے۔ اسی کو فرماتے ہیں:

چیست قرآن اے کلام حق شناس رونمائے رب ناس آمد بناس

واقعی قرآن مجید رونمائے حق ہے۔ حاصل اس تمام تقریر کا یہ ہے کہ کلام مجید بڑی عجیب چیز ہے۔ خدا کا عجیب و غریب لذیذ و پر اسرار کلام ہے جس کی تہ کو پہنچنا اور اس کے جمیع نکات و معنی کو

سمجھنا قوت بشریہ سے خارج ہے۔ آپ لوگوں کو چاہیے کہ خداوند تعالیٰ کی اس عظیم الشان نعمت کی قدر کریں اور اس کی تلاوت کی طرف خاص توجہ کریں اور اس کے نکات و معنی سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کریں اور اس کی ہدایات پر عمل کریں۔

فناء بقاء کا اعتقاد ضروری ہے

چنانچہ ایک یہی آیت ہے جسکو میں نے تلاوت کیا اور اسکے مطلب اور مفہوم کو آپکے سامنے واضح کر کے بیان کیا ہے۔ آپکو چاہیے کہ اس سے نفع حاصل کریں یعنی اعتقاد بقائے آخرت اور یقین فنائے دنیا سے نفرت اور آخرت سے محبت پیدا کریں اور دنیا کی جن غافل کردینے والی اشیاء سے نفع اٹھایا جاتا ہے اسکو مقصود اصلی نہ قرار دیں اور اس معمولی فائدہ و آرام کو اپنا مطمع نظر اور مبلغ پرواز نہ بنائیں۔

غرض چونکہ اعتقاد برائے آخرت فنائے دنیا کا لازمی نتیجہ اعراض عن الدنیا تھا لہٰذا اس آیت میں دنیا کو لہو ولعب سے تعبیر کیا گیا:

"مَاهٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ"[۱] (العنکبوت ۶۴) (اور یہ دنیوی زندگی (فی نفسہ) بجز لہو ولعب کے اور کچھ بھی نہیں)۔ گویا دنیا کی حقیقت کو محصور کر دیا صرف دو چیزوں میں ایک لہو دوسرے لعب کو دنیا بجز اسکے اور کچھ نہیں۔ یہاں پر دو لفظوں کا استعمال کیا گیا ایک لہو اور دوسرا لعب اگرچہ یہ دونوں لفظ بظاہر بالکل مترادف معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقتاً ان میں قدرے تفاوت ہے۔ لعب کہتے ہیں کسی لغو عبث فعل کو اور لہو کہتے ہیں غفلت میں ڈالنے والی بات کو۔ حاصل یہ ہوا کہ دنیا میں دو صفتیں ہیں۔ ایک صفت عبث ہونیکی دوسری موجب غفلت ہونیکی۔ اول کو لعب فرمایا ہے اور دوسری کو لہو۔

لیکن اس پر ایک شبہ پڑتا ہے کہ جب دنیا بجمیع اجزائہا لغو و عبث ہوگئی تو لازم آیا کہ جمیع مخلوقات خداوندی بے فائدہ اور مہمل محض رہ جائیں حالانکہ خداوند تعالیٰ کی طرف یہ بات منسوب کرنا کہ وہ حکیم ذات ایک ایسی مخلوق کو پیدا کرے جو مہمل محض ہو، سخت گستاخی ہی نہیں بلکہ ایک قسم کا جرم ہے۔ علاوہ ازیں خود دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ۔[۱]

یہاں پر استفہام انکاری ہے یعنی کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ ہم نے تم کو عبث اور لغو محض پیدا کیا ہے بالکل غلط ہے۔ نیز ایک آیت میں ارشاد ہے:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا[۲]

''اے ہمارے پروردگار آپ نے اس کو لایعنی پیدا نہیں کیا۔'' (آل عمران:۱۹۱)

''اے ہمارے پروردگار آپ نے اس کو لایعنی پیدا نہیں کیا۔''

جواب شبہ کا یہ ہے کہ فی الواقع کوئی شے مخلوقات خداوندی سے عبث اور بے کار نہیں' البتہ تعین فوائد ایک امر اہم ہے اور اس میں غلطی ہوسکتی ہے' یہ ضروری ہے کہ دنیا سے قابل قدر فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔ انسان ان کے فوائد سے اپنی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ یہ سب کچھ دنیا کے منافع میں داخل ہیں لیکن ہم لوگوں نے ان جمیع منافع میں سے بعض منافع کو جو کہ واقعی منافع تھے' نظر انداز کر دیا اور دنیا کے منافع کا انحصار صرف ان منافع کے اندر کر دیا جو کہ حظ نفسانی سے لبریز ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان منافع سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہم بداہتہ دیکھتے ہیں کہ ہر شخص ان سے فائدہ اٹھاتا ہے آرام پاتا ہے لیکن ان کی وجہ سے وہ حظ وافر جو اہم نفع اور قابل قدر فائدہ تھا اس کو ہم بھول جاتے ہیں اور اس نسیان کے باعث صرف یہی فوائد ملتے ہیں جو چند روز کے لیے ہم کو حظ نفس کا مزہ چکھا دیتے ہیں اور مقصود اصلی کی انفعیت کو چھڑوا دیتے ہیں۔

اب ان لذتوں اور دلچسپیوں کو ہی فائدہ اور نفع قرار دے لینا اور انہیں پر قناعت کر لینا اس کی مثال تو بعینہ اس شخص کی سی ہے کہ جو ایک دور دراز ریل کا سفر کر رہا ہے اور رستہ میں کسی جگہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہوئی سنے اور وہاں جا کر کھڑا ہو جائے اور اس گھنٹی کو مزے لے لے کر سنتا رہے اور بجاتا رہے اور اس طرف گاڑی چھوٹنے والی ہو۔ انجن نے سیٹی دے دی ہو اور جب اس سے کہا جائے کہ ارے ظالم! گاڑی چھوٹنے والی ہے' انجن نے سیٹی دے دی تو وہ یہ کہے واہ صاحب! مجھ کو تو اس کی ٹن ٹن میں مزہ آ رہا ہے میں تو اس کو نہیں چھوڑ سکتا چاہے گاڑی جائے یا رہے۔

تو جس طرح اس شخص کو اس گھنٹی کی آواز اور لذت نے ایسا مست کر دیا کہ نتیجہ یہ ہوا کہ گاڑی چھوٹ گئی سفر کھوٹا ہوا۔ اسی طرح اگر آپ بھی ان لذات دنیوی اور دلچسپ اشیاء کی دلچسپیوں میں پڑے رہیں گے تو آپ کا بھی انجام یہی ہوگا کہ مقصود اصلی سے محروم ہو کر کوئی حظ وافر نہ حاصل کر سکیں گے تو دیکھئے کو آرام پہنچنا اور دل کا خوش ہونا یہ بھی منافع کی فہرست میں داخل ہے لیکن پھر وہ کس قدر مضرت رساں اور نقصان دہ ثابت ہوا کیونکہ اس نے ایک ضروری اور قابل قدر منفعت سے غافل بنا دیا۔

دنیا کی کوئی چیز بیکار نہیں

اسی طرح دنیا کی ہر چیز فی نفسہ حکم ومصالح ومنافع سے لبریز ہے۔ عبث وفضول کوئی نہیں مگر جب وہ مقصود اصلی سے مانع ہو جائے تو اس وقت یہی فائدہ جس کو ہم نے منافع دنیویہ کا اصل سمجھ رکھا ہے اور وقعت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں انہیں کو لہو ولعب سے تعبیر کیا جائے گا یعنی جس صورت سے تم دنیا کے

ساتھ انتفاع اور اشتغال رکھتے ہو اسی صورت میں وہ تمہارے لیے لہو ولعب سے زیادہ نہیں گو فی نفسہ اس میں بہت مصالح ومنافع ہیں مگر وہ منافع ایسے نہیں جن میں پڑ کر منافع آخرت کو بھلا دیا جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن منافع کے لیے یہ اشیاء وضع کی گئی ہیں ان کے اعتبار سے اس سے عبثیت و باطلیت کی نفی کی گئی ہے اور جو منافع اہل ہوا نے خود تراشے ہیں جو کہ واقع میں مضار ہیں ان کے اعتبار سے اس کو لہو ولعب فرمایا ہے۔ بہر حال یہ دنیا اگر آخرت سے اعراض کا سبب بن جائے تو یہ لغو وعبث ہے۔ چنانچہ مقابلہ میں اس کے فرماتے ہیں کہ:

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (العنکبوت:۶۴) (اور اصل زندگی عالم آخرت ہے)

اس طرف تو دنیا کو لہو ولعب سے تعبیر فرمایا اور اس طرف دار آخرت کو حیوان سے تعبیر کیا کیونکہ لہو ولعب باعتبار اپنے ثمرات کے مثل مردہ ہیں اور موت ثمرات دلیل ہے موت اصل کی بخلاف دار آخرت کے کہ اس کو حیوان بمعنی حیوۃ مراد زندہ سے تعبیر کیا کیونکہ اس کے ثمرات باقی و زندہ رہنے والے ہیں اور حیات ثمرات دلیل ہے حیات اصل کی لہٰذا آخرت خود بھی زندہ ہے۔ باقی فوائد دنیویہ دراصل فانی ومردہ ہی ہیں تو زندہ فوائد کو چھوڑ کر مردہ فوائد کو کیا کریں۔ کارآمد چیز کو چھوڑ کر بیکار شے کے پیچھے پڑنا اگر حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟

چنانچہ آگے ارشاد فرماتے ہیں لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ. (العنکبوت:۶۴) (اگر ان کو اس کا علم ہوتا تو ایسا نہ کرتے)

کہ کاش کہ یہ لوگ اپنی دینی منفعتوں کا احساس کرتے اور دنیوی مضرتوں کو جان لیتے اور سمجھتے کہ یہ دنیا اور اس کے لواحق سخت مضرت رساں ہیں اور آخرت اور اس کے متعلقات نفع رساں اور راحت بخش ہیں۔ یہاں پر استعمال کیا گیا ہے حرف ''لو'' کا جو کہ تمنا کے واسطے بھی آتا ہے اور یہاں یہی معنی ہیں تو اس سے انتہا درجہ کی شفقت ورحمت مترشح ہوتی ہے کہ جیسے ایک شفیق باپ اپنے بچے سے پیار کی باتیں کرتا ہے اور محبت میں خود بھی توتلا بن جاتا ہے۔ بلاشبہ اسی طرح خداوند تعالیٰ کی ذات سے کسی امر کی تمنا کرنا اور بالکل مستبعد اور ان کی شان کے خلاف ہے کیونکہ آرزو ہمیشہ اسی چیز کی کی جاتی ہے جو حاصل نہ ہو اور خود اس کے نفع کا محتاج ہو اور خداوند تعالیٰ قادر قیوم اور مالک کل شئی ہے۔ اس کے واسطے کوئی شے ایسی نہیں جو حاصل نہ ہو۔ دوسرے وہ نفع کا محتاج نہیں پھر آرزو کیسے کرتے لیکن باوجود اس کے محض اپنے بندوں کی دلدہی کی خاطر ان کے مذاق کے موافق ان سے معاملہ فرمایا جس سے غرض ومقصود محض تقریب وتفہیم ہے اور تفہیم کی دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ تم ہمارے موافق ہو جاؤ دوسرے یہ کہ خیر ہم ہی تمہارے موافق ہو جائیں

لیکن چونکہ تم میں اتنی قابلیت واستعداد نہیں کہ تم ہمارے موافق ہو جاؤ یا ہم سے قریب ہو سکو لہٰذا چلو ہم ہی تمہاری خاطر تمہارے موافق ہوئے جاتے ہیں۔

لہٰذا جن مواقع پر قرآن شریف میں الفاظ تمنا و ترقی مستعمل ہیں ان سے تمنا و ترقی حقیقی مراد نہیں ہوتی ایسے ہی جہاں کہیں قرآن شریف میں تعجب کے صیغے مستعمل ہیں ان سے بھی تعجب حقیقی مراد نہیں ہوتا۔ یعنی خداوند تعالیٰ کسی امر پر تعجب نہیں کرتا کیونکہ تعجب کے واسطے متعجب فیہ سے جہل ہونا لازم ہے۔ مثلاً کسی شخص کو معلوم نہ ہو کہ میرا بھائی آئے گا اور وہ اتفاقاً بغیر کسی اطلاع کے آ جائے تو اس پر تعجب ہوگا کہ ہائیں! تم کیسے پہنچ گئے۔ غرض کہ تعجب کے واسطے ہمیشہ جہل لازم ہے اور خداوند تعالیٰ جہل سے منزہ ومبرا ہیں۔ ان کی ذات عالم جمیع جزئیات وکلیات ہے اس کا علم محیط ہے جمیع اکوان کو۔ لہٰذا اس کے واسطے کوئی امر یا کوئی واقع موجب تعجب یا حیرت نہیں ہو سکتا بلکہ مراد اس سے تعجیب ہوتی ہے (یعنی تعجب دلانا) یعنی یہ امر اس قابل ہے کہ تم لوگ اس پر تعجب کرو اور متحیر ہو۔ ہم تو کیا تعجب کریں ہماری نظروں میں کوئی شے عجیب نہیں۔ اسی طرح تمنا ہے کہ ہمارے پاس تمام اشیاء موجود ہیں تمام کائنات ہماری مخلوق اور مملوک ہیں لہٰذا ہمیں تو کیا آرزو ہوتی ہاں بیشک یہ امر تم لوگوں کی آرزو اور تمنا کے قابل ہے۔

اللہ! اللہ! کیا شان ایزدی ہے اور کیا رحمت خداوندی ہے کہ جب دیکھا کہ یہ اتنے بے حس ہو گئے کہ ان کو اپنے نفع رساں اور مفید اشیاء کے ملنے کی آرزو بھی نہیں رہی تو خود اپنی طرف آرزو کو منسوب کر کے متنبہ کر دیا کہ یہ امر قابل تمنا ہے۔ جیسے ایک شفیق باپ کہتا ہے کہ کاش! یہ میرا بچہ پڑھ جاتا۔ حالانکہ اس کے پڑھ جانے سے اس کو کچھ بھی نفع نہیں مگر مقصود اس کا یہ ہے کہ میرے بیٹے کو احساس ہو کہ پڑھنا بھی کوئی قابل تمنا چیز ہے۔

استغنا بہ حق تعالیٰ کی حقیقت

اسی طرح اگر ہم لوگوں کو یہ متمنی یہ علم بھی حاصل ہو جائے تو کیا خیال کیا جا سکتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کو ہمارے اس علم سے کسی قسم کا نفع پہنچے گا۔ (نعوذ باللہ من ذالک) وہ تو مستغنی ہیں، احتیاج سے مبرا ہیں، صرف ہمارا ہی نفع ہے اور میں نے جو حق تعالیٰ کو مستغنی کہا ہے اس استغناء کے وہ معنی نہیں جو آج کل جاہلوں میں مشہور ہیں کیونکہ آج کل لوگوں نے استغناء کے معنی بے توجہی اور لاپروائی کے سمجھ رکھے ہیں۔ چنانچہ کتنا گندہ محاورہ ہے کہ جب کوئی شخص جوان دو چار بچے چھوڑ کر مر

جاتا ہے تو جہاں دو چار آدمی مل کر بیٹھتے ہیں تو ان میں سے کوئی تو کہتا ہے کہ کیا جوان موت ہوئی۔ دوسرا کہتا ہے کہ ہاں بھئی! کیسے چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ مرا ہے، بیچارے بالکل بے وارث رہ گئے۔ تیسرا بولتا ہے کہ ہاں میاں! اللہ پاک کی ذات بڑی بے پرواہ ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے، وہاں چارہ دم زدن نہیں۔ غضب خدا کا اس موقع پر بے پرواہ کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہے کہ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) خداوند تعالیٰ کو اپنے بندوں کے مصالح پر بالکل توجہ نہیں۔ ان کے حالات سے غافل اور لاپرواہیں۔ ان کے یہاں کوئی انتظام نہیں، سو یہ کتنی سخت بے ادبی ہے۔ اگر آپ کسی غلام کو اس کی مصلحت کے لیے دوائے مسہل پلا دیں اور اس لیے اس کے گھر والوں سے جدا کر کے خلوت گاہ میں رکھیں تا کہ طبیعت یکسو ہو کر مادہ کو دفع کرے اور کوئی صاحب اس پر افسوس کریں کہ دیکھو میاں! کیسے لاپرواہ آدمی ہیں کہ بے چارے غلام کو گھر والوں سے الگ کر دیا تو کیا آپ کو اس شخص کا کہنا برا نہ معلوم ہوگا اور کیا آپ نہ کہیں گے کہ میاں ہم نے اس کو اسی مصلحت سے گھر سے الگ کیا ہے اب عنقریب گھر والوں میں رہنے سہنے لگے گا۔

سو جب آپ کو اتنا سا کہنا ناگوار گزرتا ہے تو کیا اللہ تعالیٰ کو جو کہ ہر وقت اپنے بندوں کی راحت رسانی اور فلاح میں ہیں اور باوجود ان کے عصیان اور نافرمانی کے پھر عنایات فرماتے ہیں تو ان کو اپنے بندوں کی یہ احسان فراموشی اور یاوہ گوئی ناگوار نہ گزرے گی؟ تم کو کیا خبر ہے کہ جس کو تم نے بے توجہی سمجھا ہے وہی ان کے حق میں عین توجہ اور عنایت ہو۔ خدا تعالیٰ کی حکمتوں سے کوئی شخص مطلع نہیں ہو سکتا۔

غرض کہ استغناء کے معنی بے التفاتی و بے توجہی کے کرنا سخت غلطی ہے اور منشاء غلطی کا محض یہ ہے کہ لفظ استغناء عربی اور اردو دونوں میں مستعمل ہے مگر عربی میں اس کے معنی عدم احتیاج کے ہیں۔ اس معنی میں یہ خدا کی صفت ہے اور اردو محاورہ میں بے پروائی کے معنی بھی آتے ہیں۔ بس آپ لوگوں نے قرآن میں غنی اور استغنی اللہ کا دیکھ کر اردو محاورہ سے ترجمہ کر لیا اور استغناء کو یہ لوگ لاپروائی سمجھ بیٹھے مگر یہ بالکل غلط ہے کیونکہ جیسے خداوند تعالیٰ نے اپنے آپ کو غنی حمید کہا ہے ایسے ہی رؤف رحیم سے بھی تو متصف کیا ہے تو اگر استغناء کے معنی بے توجہی اور عدم مراعات و بے انتظامی کے ہیں تو پھر رؤف کے کیا معنی ہوں گے، رافت اور عدم مراعات میں تو تناقض ہے۔ رافت کے معنی تو غایت شفقت اور رحمت کے ہیں اور عدم مراعات و بے توجہی ایک سخت دل اور غیر منصف شخص کا کام ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ استغنی کے یہ معنی نہیں بلکہ استغناء خداوندی کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے افعال یا اعمال ہمارے واسطے مضرت رساں یا نافع نہیں ہو سکتے ہم تمہارے کسی

فعل کے محتاج نہیں اور نہ تم ہمیں کسی قسم کا نفع یا ضرر پہنچا سکتے ہو۔

چنانچہ "اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ" (العنکبوت:٦) (اور نہ) خدا تعالیٰ کو (تو) تمام جہان والوں میں کسی کی حاجت نہیں) کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ "مَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا یُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ" (العنکبوت:٦) جو کوئی محنت کرتا ہے اور حسنات پر عمل کرتا ہے وہ اپنے لیے کرتا ہے۔ "اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ" اس سے بھی یہی مفہوم ہوا کہ جو شخص کفر وشرک کرتا ہے وہ اپنے آپ کو غار مذلت میں ڈالتا ہے اور مخلد فی النار بنتا ہے جیسا کہ حسنہ کا خدا تعالیٰ محتاج نہیں تھا اسی طرح کفر اس کے لیے باعث نقصان نہیں۔ یہ معنی ہیں استغناء کے اور اگر آپ یہ کہیں کہ صاحب ہماری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک شخص کے چھوٹے چھوٹے چار بچے ہوں جن کی ماں مر چکی ہے اور خداوند تعالیٰ ان کے باپ کی بھی روح قبض کر لیتا ہے تو یہ کس طرح رافت میں داخل ہو سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کیا عدم رعایت اور بے انتظامی ہوگی؟

تو حضرت! آپ کی سمجھ پر پڑیں پتھر آپ کو کیا خبر ہے حقیقت حال کی۔ بچہ بھی انہیں کا ہے ان کا باپ بھی انہیں کا ہے' دونوں ان کے مملوک ہیں۔ ان کی مصلحتوں کا آپ زیادہ خیال کر سکتے یا وہ جس طرح اس نے اس باپ کو اتنا بڑا کر دیا ایسے ہی وہ ان کی بھی پرورش کرے گا۔ تم کون ہوتے ہو بیچ میں دخل دینے والے اور رائے زنی کرنے والے۔ غضب خدا کا کس قدر اصرار ہے اور لوگ کیونکر بے التفاتی اور عدم مراعات کے ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں حالانکہ وہاں کے آداب کا حال یہ ہے کہ اثبات کمال میں بھی سلیقہ کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ حمد وثناء کے اندر بھی ادب کے ملحوظ رکھنے کی سخت تاکید ہے۔

چنانچہ ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے' بارش ہونے لگی' سخت گرمی پڑ رہی تھی' پانی کو لوگ ترس رہے تھے' ایسے موقع پر جو بارش ہوئی تو بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا کہ سبحان اللہ! آج کیا موقع پر بارش ہوئی ہے فوراً بارگاہ صمدیت سے ان پر عتاب ہوا کہ بے ادب! بے موقع کون سے روز ہوئی تھی جو موقع کو آج کے ساتھ مقید کرتا ہے۔

غرض کہ اس بارگاہ میں اثبات کمال کے واسطے بھی سلیقہ چاہیے اور حق یہ ہے کہ ہم تو کسی طرح بھی ان کی مدح نہیں کر سکتے یہ بھی ان کی رحمت ہے کہ حمد وثناء کا طریقہ بھی خود بتلا دیا ورنہ ہماری ثناء کی تو یہ حقیقت ہے:

شاہ را گوید کسے جولاہہ نیست   ایں نہ مدح است اومگر آگاہ نیست

''بادشاہ کو اگر کوئی کہے کہ جولاہا نہیں ہے یہ اس نے بادشاہ کی تعریف نہیں کی اگرچہ اس کو اس کا علم نہیں ہے۔''

صاحبو! ان بزرگ نے تو تعریف ہی کی تھی مگر چونکہ تھی غیر مہذب الفاظ میں اس وجہ سے اس قدر عتاب ہوا وہاں پر بڑا سنبھل سنبھل کر قدم رکھنا پڑتا ہے اور واقعی بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ جو بظاہر کچھ سخت معلوم نہیں ہوتے مگر موقع و محل سے مناسب نہ ہونے کی وجہ سے اور کبھی مخاطب کی شان کے اختیار سے وہ الفاظ سخت بے ادبی اور گستاخی میں داخل کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان بزرگ پر ہی محض لفظ آج کی بناء پر اتنی سختی ہوئی حالانکہ ظاہر میں ہمارے خیال سے یہ لفظ کچھ گستاخانہ نہ تھا۔

تو جب اس ذرا سے طرز بدل جانے اور الفاظ کے محاورہ کے خلاف ہونے پر اس قدر عتاب ہوا تو اثبات نقص پر تو جو کچھ عتاب بھی ہو' تھوڑا ہے کیونکہ شان خداوندی میں اثبات نقص ایک بہت بڑا جرم اور گستاخی ہے ایسے موقع پر لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ لو صاحب ایک ذرا سی بات پر کس قدر سخت گرفت ہوئی' ایسی بھی کیا سختی ہے حالانکہ وہ لوگ غور و تامل سے کام نہیں لیتے ورنہ وہ سمجھ جائیں کہ ان کا یہ کہنا بھی جہالت کی علامت ہے کیونکہ یہ باتیں ذرا سی نہیں ہیں بلکہ یہ وہ باتیں ہیں جن پر عام طور سے ہمارے محاورات میں بھی گرفت ہوتی ہے۔

مثلاً آپ کچہری روزانہ وقت پر جاتے ہیں اور وقت معینہ پر پہنچ جاتے ہیں کسی روز آپ کا حاکم کہہ دے کہ صاحب آج تو آپ بہت ٹھیک وقت پر آئے تو آپ کو کس قدر ناگوار معلوم ہوگا کہ لو صاحب روز تو ہم صحیح وقت پر یہاں پہنچ جاتے ہیں وہ کہتا ہے کہ آج تو آپ بہت صحیح وقت پر پہنچے گویا اور کسی دن صحیح وقت پر آئے ہی نہیں۔

ایسے ہی اگر کوئی آقا اپنے کارگزر ملازم کو کسی کام کے واسطے بھیجے اور جب وہ کام کر آئے تو کہے بھئی! آج تو خوب کام کیا تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس ملازم کے دل کو کس قدر سخت تکلیف ہوگی۔

تو جب ہم لوگوں کا یہ حال ہے کہ اس ہی محاورہ سے ہم اس قدر تنگ دل ہوتے ہیں اور اس قدر یہ الفاظ تکلیف دہ ثابت ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو یہ الفاظ کیوں نہ ناگوار گزریں گے اور ان کے ہاں کیوں نہ ان پر گرفت ہوگی حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ کبھی قید اتفاقی بھی ہوا کرتی ہے مگر نہیں چونکہ محاورہ ہی سخت ہے اس وجہ سے یہ باتیں ضرور چھبتی ہیں۔ تو جب ایک ادنیٰ انسان کا یہ حال ہے تو احکم الحاکمین کے دربار کا تو کیا ٹھکانہ ہے۔ یہ گفتگو تو لفظ ''لو'' پر سے چلی تھی کہ لفظ تمنی کے استعمال سے اس طرح شفقت کا اظہار ہوگیا کہ ہمارے علم سے ان کو کچھ نفع نہیں مگر پھر بھی صیغہ تمنی سے اس کو ظاہر فرمایا۔

دنیا و آخرت کی حقیقت سمجھنا

اب لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ. کو سنئے۔ قرآن کے نکات اور مضامین لطیفہ بھی کیسے کیسے عجیب ہیں

کہ لفظ لفظ میں ایک علم کا دریا ہے۔ اس آیت میں لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ. سے ایک دقیق اور لطیف اشارہ ہے اس طرف کہ یہ دنیا باوجود اس میں اس قدر منہمک ہونے کے اس دنیا کی حقیقت سے ہی بالکل بے بہرہ اور ناواقف ہیں، دین سے تو کورے تھے ہی دنیا سے بھی جاہل ہیں۔ اسی لیے ایک آیت میں آخرت کے ساتھ دنیا کی حقیقت سمجھنے کی بھی ترغیب دی ہے۔

کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ. (البقرہ:۲۱۹، ۲۲۰)

''یعنی اللہ تعالیٰ اس آیت کو اس لیے بیان کرتے ہیں کہ تم دنیا و آخرت کی حقیقت میں خوب غور و فکر کرلو'' اور اس سے معلوم ہوا کہ یہ دنیا جس پر تم جان دیتے ہو تماشا ہے کہ تم اس کی حقیقت سے بھی جاہل ہو، لو آؤ! اس کی حقیقت ہم سے سن لو اور اس کے قبائح و نقائص پر غور کرو۔ اس کے ساتھ ہی آخرت کی بھی حقیقت معلوم کرلو جس سے تم بالکل غافل ہو اور اس کے محاسن و محامد میں تامل کرو اور پھر دیکھو کہ اب تک تم ایسی نفع رساں اور مفید شے سے غافل اور ایک عبث شے کے پیچھے سرگرداں تھے۔ لہٰذا اب اس دنیا سے اعراض کرو اور اس کی دلچسپیوں کو ٹھکرا دو اور اس آخرت یعنی دار بقا کی طرف رغبت کرو اور اس تک پہنچنے کی کوشش کرو۔ اسی واسطے لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ فرمایا۔ دوسرے دنیا کی حقیقت بتلاتے ہیں یہ بھی فائدہ ہے کہ و بضدہا تتبین الاشیاء یعنی آخرت کی حقیقت کامل طور پر جبھی واضح ہوسکتی ہے جب دنیا کی حقیقت بھی آشکارا ہو۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی بدصورت عورت کو برقعہ پہنے ہوئے دیکھے اور اس کے ظاہری تناسب اعضاء اور رفتار گفتار کو دیکھ کر دل و جان سے شیفتہ و فریفتہ ہوجائے تو جس طرح اس کا ایک کارگر علاج یہ ہے کہ اس کی نوعروس بیوی کا چہرہ جو کہ اس سے بدرجہا حسین و خوبصورت ہے۔ نقاب اٹھا کر دکھلا دیا جائے تاکہ مقابلہ میں پھر اس کو احساس ہو کہ واقعی میری بیوی اس سے بدرجہا خوبصورت و حسین ہے ورنہ تو تذبذب ہی میں رہتا کہ نہ معلوم اس کے جہاں سوز حسن کی کیا کیفیت ہوگی اور اس کے جمال کا کیا عالم ہوگا۔ غرض یہ کہ برقع رہتے ہوئے کافی طور سے استیصال اس مادہ عشق کا نہ ہوگا اور نقاب اٹھاتے ہی حقیقت حال واضح ہوجائے گی اور پھر بجائے رغبت کے نفرت اور بجائے الفت کے کلفت ہوگی۔

اسی طرح عروس آخرت کی قدر اس وقت معلوم ہوگی جبکہ اس ڈائن دنیا کی مکروہ صورت بھی اچھی طرح دیکھ لو اور اس کے قبائح معلوم کرلو۔ اگر دنیا کا کچا چٹھا کھول کر نہ دکھا دیا جاتا اور محض آخرت کی ہی خوبیاں بیان کی جاتیں تو اس قدر اہمیت آخرت کی نہ ہوتی اور دنیا کا خیال دل سے نہ نکلتا۔ اسی

لیے حکم مطلق نے دنیا اور اس کے نقصانات کی بھی شرح اور آخرت اور اس کے مفاد کو بھی بیان کیا تا کہ حب دنیا قلب سے کافی طور پر منقطع ہو کر اس میں رغبت آخرت کی پیدا ہو جائے۔ یہ بھی خدا کی خاص رحمت اور عنایت ہے کہ اس نے محض ہمارے نفع کیلئے اس مبغوض دنیا کا ذکر بھی فرمایا۔ حالانکہ بظاہر اس کا کلام معجز نظام میں اشیائے مبغوضہ کا تذکرہ مستبعد ہے۔

اس استبعاد پر ایک قصہ یاد آیا۔ ایک مرتبہ حضرت رابعہؒ کی مجلس میں کچھ بزرگ دنیا کی مذمت اور اس کے نقائص وعیوب بیان کر رہے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ **"قوموا عنی فانکم تحبون الدنیا"** انہوں نے جواب دیا کہ ہم تو دنیا کی مذمت کر رہے ہیں۔ فرمایا کہ **"من احب شیئا اکثر ذکرہ"** تمہارا اس کے تذکرہ میں مشغول ہونا گو بصورت ذم ہی ہو محبت کی علامت ہے کہ اگر کسی ظالم بادشاہ سے کوئی سخت گفتگو ہوئی ہو اس کا ذکر کرتا ہے اور اگر کسی چمار سے ایسی گفتگو ہوئی ہو اس کا تذکرہ نہیں کرتا ہے۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ بادشاہ کو باعظمت سمجھتا ہے اور اس سے دلیرانہ گفتگو کو فخر سمجھتا ہے اس لیے اس کو نقل کرتا ہے بخلاف چمار کے معلوم ہوا کہ مذمت بھی عادتاً باوقعت چیزوں کی کی جاتی ہے۔ پس اسی طرح دنیا کی مذمت کرنا متضمن ہے اس دعویٰ کو کہ ہم ایسی چیز کے تارک ہیں۔ یہ معنی ہیں **تحبون الدنیا** کے۔

دیکھئے! اس مبغوضہ کا ذکر مجلس اولیاء میں مستبعد سمجھا گیا۔ چہ جائیکہ کلام حق مگر اس ظاہری استبعاد کے پھر بھی خداوند تعالیٰ نے تذکرہ دنیا کا اس لیے فرمایا ہے کہ اس میں ہمارے حال کی رعایت ہے کہ ہم بدون بتلائے اس کی حقیقت معلوم نہ کر سکتے تھے۔ پس جیسا کلام مجید میں تمثیل اصنام کی غرض سے مکھی اور مچھروں کا ذکر کیا گیا ہے ایسا ہی یہاں تقبیح کی غرض سے اس مبغوض دنیا کا بھی ذکر کیا اور مقابلہ کے لیے آخرت کو بھی بیان فرمایا۔

اور اگر یہاں کوئی سوال کرے کہ جس طرح خداوند تعالیٰ کے ذکر دنیا کو تم نے حکمت پر محمول کیا اسی طرح رابعہ بصریؒ نے ان حضرات کے تذکرہ کو اس حکمت پر کیوں نہ محمول کیا؟ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب اس کا یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کے کلام میں تو حکمت ظاہر ہے کیونکہ ہم کو مطلع کرنے کی ضرورت تھی لیکن ان حضرات کے کلام میں ایسی حکمت اس لیے نہ تھی کہ ان شیوخ کے پاس کون سا دنیا دار بیٹھا ہوا تھا جس کو **"تنفروا عراض عن الدنیا"** کی ترغیب دینا مقصود تھا۔ لہٰذا ان کا یہ فعل متضمن ہوگا۔ ایسی باوقعت چیز کے ترک کے دعوے کو جیسے زاہد کسی فعل زہد کو اظہار زہد کے واسطے بیان کرتا ہے جیسے کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص ہمارے پاس اتنا اتنا روپیہ لایا ہم نے ایک حبہ بھی نہ

لیا' سب واپس کر دیا یہ بھی ایک بڑی بھاری لغزش ہے۔ اس قسم کی لغزشوں کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

چنانچہ ایک بزرگ دوسرے بزرگ کے گھر مہمان تھے۔ میزبان نے خادم سے کہا کہ شیخ کو اس صراحی سے پانی پلانا جو ہم اپنے دوسرے حج میں مکہ سے لائے تھے۔ شیخ نے کہا اے شخص تو نے ایک کلمہ ریاء سے اپنے دونوں حج کا ثواب باطل کر دیا۔

لغزشیں تو سب ہی سے ہوا کرتی ہیں کیونکہ عصمت بجز ملائکہ وانبیاء کے اور کسی کے واسطے ثابت نہیں لیکن لغزشوں کا ادراک یہ بھی ایک اہم مرحلہ ہے ایسے لوگ بہت کم پائے جاتے ہیں جن کو اپنی لغزشوں پر تنبیہ ہو جایا کرے۔ لہٰذا کیا تعجب ہے کہ یہ حضرات رابعہؒ کی مجلس والے بھی اسی مرض میں مبتلا ہوں اور اسی وجہ سے ان کی زبان سے یہ مذمت دنیا صادر ہوئی ہو اور حضرت رابعہ بصریؒ کو اس مرض کا احساس ہو گیا ہو۔

اسی طرح بوجہ انقباض ذکر مبغوض کے یہ شیطان پر لعنت بھی نہ کیا کرتی تھیں کہ کون اتنی دیر شیطان کے پیچھے پڑے۔ ذکر محبوب ہی میں کیوں نہ پڑیں اور یہ بھی ہے کہ عدم لعنت پر تو مواخذہ نہ ہوگا نہ کسی قسم کی باز پرس بخلاف ترک ذکر کے کہ اس پر باز پرس ہوگی۔ حاصل یہ ہے کہ جتنی دیر ہم شیطان پر لعنت کریں اس سے بہتر یہ ہے کہ اس وقت کو ذکر الٰہی میں گزاریں تاکہ خدا کے ہاں باز پرس سے بچیں تو یہ بھی ممکن ہے کہ اس طرح انہوں نے ان حضرات کو تذکرہ دنیا سے منع کیا ہو کہ اس میں چنداں فائدہ نہیں جس قدر ذکر الٰہی میں نفع ہے لہٰذا کیوں وقت کو عبث ضائع کرتے ہو۔

تو جب خدا کے مقبول بندے دنیا کو اس قدر برا سمجھتے ہوں کہ اپنی مجالس میں اس کی مذمت کو بھی گوارا نہ کریں۔ نام تک لینا اضاعت وقت سمجھیں تو پھر یہ خداوند تعالیٰ کے کلام میں تو کیونکر قابل ذکر ہوگی مگر مع ہذا پھر خدا نے تذکرہ دنیا کا کیا تاکہ ہم لوگوں کو تنبیہ ہو اور ہوش میں آ جائیں۔ یہ کمال رحمت ہے کہ اپنے بندوں کی خاطر ایک ایسے امر کے ذکر اختیار کیا جائے جو کہ مبغوض ہے۔ غرض یہ ہے کہ اتنی سی تو آیت اور اس میں کس قدر عنایات واحسانات کہ ہر پہلو سے بیدار کیا اور ہر جانب سے ہوشیار فرمایا۔

تزکیہ نفس کے طریقے

خلاصہ تمام آیت کا یہ ہے کہ ہر وقت وظیفہ اور مطمع نظر صرف دو چیزوں کو رکھے۔ اول "تنفروا انقباض عن الدنیا" مع استحضار فنائے دنیا اور دوسرے رغبت اور طمع آخرت اور اس کی تحصیل کے ذرائع واسباب کی تلاش اور یہ مطلق استحضار تو ہر وقت اور ہر ساعت ہی کا وظیفہ ہے

لیکن خاص استحضار کے لیے بھی کم از کم ایک دن میں ایک مرتبہ ضرور وقت مقرر کر لینا چاہیے۔ وہ اس طرح کہ روزانہ سوتے وقت چار پائی پر لیٹے تو اپنے تمام دن کے افعال حسنہ وسیۂ، طاعات و معصیت کو پیش نظر رکھ کر ان میں سیئات و معصیات کو علیحدہ کرے اور حسنات کو علیحدہ اور پھر جو نافرمانیاں کی ہیں ان پر جو وعیدیں ہیں اور ان پر جو سزائیں وعذاب وارد ہیں ان کا تصور کرے اور یہ سمجھے کہ گویا میں خدا کے سامنے کھڑا ہوں اور حساب و کتاب ہو رہا ہے اور اتنے میرے گناہ ہیں جن پر یہ عذاب میرے واسطے تجویز ہوا ہے۔ یہ خاص استحضار ہے دنیا وآخرت کا۔

اور استحضار کے بعد دو کام اور کرے ایک تو توبہ اور خداوند تعالیٰ سے وعدہ کہ آئندہ پھر ارتکاب معاصی سے بچوں گا اور دوسرے اس وعدہ پر باقی رہے اور توبہ پر ثابت رہنے کی دعا کرے کہ خدایا مجھ کو توفیق دے کہ میں اس توبہ پر قائم رہوں۔ توبہ کی ضرورت تو ظاہر ہے اور دعا کی ضرورت اس لیے ہے کہ انسان کی قدرت سے یہ باہر ہے کہ خود وہ کسی وعدہ کو پورا کر دے یا کسی دعویٰ کو نباہ دے بدون خدا کی عنایت و اعانت کے۔ نیز اس استحضار کا تتمہ یہ بھی ہے کہ جس قدر دن بھر میں خدا کے احسانات ہوئے ہیں ان پر بھی ایک تفصیلی نظر ڈالے۔ افوہ! باوجود اس قدر نافرمانیوں کے پھر خداوند تعالیٰ نے مجھ پر اس قدر انعامات فرمائے تو اگر میں ان نافرمانیوں سے بچوں گا تو نہ معلوم کس قدر احسانات وانعامات ہوں گے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ اگلے ہی دن رغبت طاعت کی طرف بہت زیادہ ہو جائے گی۔ یہ دستور العمل ہمیشہ کے واسطے مقرر کرے اور پابندی کے ساتھ اس پر عمل کرے۔

نیز اس کے ساتھ ہی کوئی خاص وقت مقرر کرنا چاہیے جس میں کچھ ذکر کر لیا کریں تاکہ قلب تازہ رہے اور روح کے اندر ایک حیات روحانی باقی رہے لیکن یہ واضح رہے کہ محض ذکر ہی کافی نہیں بلکہ کسی بزرگ سے تعلق اور نسبت بھی ضرور رکھنی چاہیے تاکہ تزکیہ نفس بھی ہو جائے اور اس کی مدد سے ہر قسم کی لغزشوں سے بھی بچتا رہے بدون اس کے کامیابی دشوار ہے بلکہ احتمال ہے کہ جادہ استقامت سے نہ ہٹ جائے اور افراط وتفریط میں مبتلا ہو جائے۔ اگر زندہ بزرگوں میں سے کسی کے ساتھ عقیدت نہ ہو تو ان بزرگان دین کے تذکرے اور کتابوں ہی کا مطالعہ کیا کرے جو وفات پا چکے ہیں۔ اول وہی نافع ہوں گی اور اگر نہیں تو پھر رغبت وتلاش پیدا ہوگی اور ضرور کسی پیر طریقت کے ساتھ عقیدت ہو جائے گی اور کامیابی کی صورتیں مہیا ہو جائیں گی۔

باقی سب سے بڑا مراقبہ وہی ہے جس کو میں اول بیان کر چکا ہوں اور مکرر عرض کرتا ہوں کہ ہر وقت یہ خیال پیش نظر رکھے کہ میں اس وقت سفر کر رہا ہوں۔ آخرت کی دور دراز منزل میرے

سامنے ہے جس کی شاہراہ بہت کٹھن ہے۔اس میں بہت سے موانعات پیش آیا کرتے ہیں اور منزلیں کھوٹی ہو جایا کرتی ہیں۔لہٰذا جس قدر امور معاون اور مقصود میں مددگار ہیں ان کو اختیار کرنا چاہیے اور جو امور مضرت رساں اور نقصان دہ ہیں ان کو چھوڑنا چاہیے۔

لیکن یہ سب کچھ موقوف ہے خدا کی عنایت پر۔جب تک اللہ تعالیٰ کی نظر رہے گی اس وقت تمام مشکل سے مشکل ہو جائیں گے اور سب دقتیں آسان ہو جائیں گی اور جہاں اس فیض سے محروم ہوئے تو پھر آسان سے آسان کام بھی دشوار اور ناقابل برداشت ہوں گے۔لہٰذا مناسب ہے کہ امداد خداوندی کی دعا ضرور کرے۔یہی امداد وہ چیز ہے کہ سالکین کو اس کی بہت فکر رہتی ہے ان کی آنکھیں روشن ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ بدون اس کی عنایت کے ہم اس شاہراہ پر نہیں چل سکتے۔

شیوخ کے حلقہ وتوجہ کی حقیقت

ایں ہمہ گفتیم ولیک اندر بسیچ　　بے عنایات خدا ہیچم وہیچ !

بے عنایات حق وخاصان حق　　گر ملک باشد سیاہ ہستش ورق

”یہ تمام جو کچھ ہم نے بیان کیا ارادہ بغیر عنایت خداوندی کے ہم ہیچ ہیں، بغیر حکم خداوندی اور خاصان خدا کی عنایت کے اگر فرشتہ بھی ہو تو اسکا ورق بھی سیاہ ہے۔“

دوسرے شعر میں مولانا نے حصول عنایات حق کی صورت بتلائی ہے کہ خدا کے خاص بندوں کی عنایت حاصل کرو۔اس کو فضول نہ سمجھو اور یہ نہ خیال کرو کہ ایک آدمی کی عنایت سے کیا ہوتا ہے۔صاحبو! یہ بھی بہت مفید ہے اور بہت سی مضرتوں سے محفوظ رکھتی ہے اور ان کی عنایات اور توجہ یہی ہے کہ وہ اپنے متعلقین اور مریدین پر توجہ رکھیں۔ہر وقت ان کا خیال رکھیں اور ان کی مضرتوں سے بچنے کی ہدایت کریں، منافع حاصل کرنے کی تدبیریں بتائیں۔غرضیکہ ہر وقت ان کو اپنی زیر نظر رکھیں۔اگر سامنے آ کر بیٹھیں تو خاص تفقد رکھیں، یہی عنایت ہے۔یہی توجہ ہے۔

ہمارے شیوخ پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ حضرات مریدین پر توجہ نہیں ڈالتے نہ کوئی حلقہ باندھتے ہیں نہ کوئی خاص وقت مقرر کرتے ہیں لیکن یہ لوگ ناواقف ہیں۔نہیں سمجھتے کہ ہمارے شیوخ کی توجہ ہم پر ہر وقت رہتی ہے جو لوگ حلقہ باندھ کر بیٹھتے ہیں اور خاص اوقات میں توجہ ڈالتے ہیں ان کی توجہ ان خاص اوقات ہی میں رہتی ہے۔ہمارے بزرگوں کی توجہ ہر وقت ہمارے ساتھ ساتھ ہے۔فی الحقیقت توجہ کے واسطے حلقہ باندھنے یا کسی خاص انتظام کرنے کی ضرورت نہیں۔کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر نہ تھی

حالانکہ نہ وہاں پر کوئی حلقہ باندھا جاتا تھا نہ توجہ کا کوئی خاص وقت مقرر تھا نہ کوئی اس کا خاص اہتمام وانتظام تھا۔ مگر بایں ہمہ آپ کی توجہ ان کے ساتھ ہر وقت لازم غیر منفک تھی۔ کسی وقت آپ کی توجہ سے خالی نہیں رہتے تھے۔ اسی طرح ہمارے حضرات اپنے معتقدین کو خلوت میں ہوں یا جلوت میں کبھی توجہ سے خالی نہیں رکھتے' برابر ان کا خیال کرتے ہیں۔

جس طرح ایک شفیق استاد اپنے شاگرد کا ہر وقت خیال رکھتا ہے کہ وہ اگر سامنے بیٹھا پڑھ رہا ہے تب بھی اس کی حرکات وسکنات کا خیال ہے اور اگر گھر چلا جاتا ہے اور دیر میں آتا ہے تب بھی اس سے پوچھتا ہے کہ اتنی دیر میں کیوں آیا کہاں گیا تھا جس سے معلوم ہوا کہ استاد کو گھر جانے سے پہلے اور عدم موجودگی میں بھی اس شاگرد کا خیال تھا چنانچہ مولانا اسی مضمون کو اس شعر میں ادا فرماتے ہیں:

دست پیراز غائباں کوتاہ نیست   قبضہ اش جز قبضہ اللہ نیست

''پیر کا ہاتھ (توجہ) غائبوں سے کوتاہ نہیں ہے اس کا سوائے اللہ کے دوسرے کے قبضہ میں نہیں ہے۔''

غرض کہ عنایات وتوجہ شیخ کا ہونا ضروری ہے اور اس قسم کے تعلقات شیخ سے رکھنے چاہئیں جن سے اس کی تمام عنایات کو اپنے حق میں مبذول کرلے اور اس کی رغبت کو اپنی طرف کھینچ لے لیکن یہ رغبت وعنایت شیخ کی خدمت کرنے' پیر دبانے' ہدایا بھیجنے سے حاصل نہیں ہوتی۔

جس طرح ایک شاگرد اپنے بے غرض استاد کے پاس روزانہ مٹھائیاں لے جائے' دوسرے تیسرے روز نذرانہ دیتا رہے۔ آٹھویں دسویں دن دعوت کرتا رہے مگر پڑھنے لکھنے سے کورا ہو' محنت سے بھاگتا ہو تو ایسے شاگرد سے ایسے استاد کو ہرگز محبت نہ ہوگی' بخلاف اس شاگرد کے جو نہ مٹھائی لاتا ہے نہ دعوتیں کرتا ہے نہ نذرانے پیش کرتا ہے لیکن سبق خوب محنت سے یاد کرتا ہے۔ ہر وقت پڑھنے لکھنے میں مشغول رہتا ہے کھیل کود سے نفرت کرتا ہے' ایسے طالب علم سے استاد کو خالص محبت ہوگی اور اس کے دل میں پڑھانے لکھانے کی اُمنگیں پیدا ہوں گی' خود بھی محنت کرے گا اس سے بھی محنت لے گا۔ اسی طرح مشائخ محققین کا حال ہے کہ وہ اس شخص سے کبھی خوش نہیں ہوتے کہ جو ان کو تحفہ تحائف بھیجا کرے' نذرانہ خوب پیش کیا کرے مگر کام کچھ نہ کرے تو نہ ان کو ایسے لوگوں کی طرف توجہ ہوتی ہے نہ ان کی اصلاح کا خیال ہوتا ہے۔ ہاں ان کی توجہ ان لوگوں پر مبذول ہوتی ہے جو اس وقت طلب حق میں مشغول رہتے ہیں۔ ان کا التفات ان لوگوں کی جانب ہوتا ہے جن کے دلوں میں خدا کی محبت ہوتی ہے اور سچی دھن ہوتی ہے۔

غرضیکہ ان دونوں مراقبوں میں یہ بھی لازم ہے کہ ان مراقبوں کے فائدہ تامہ حاصل کرنے

کے لیے کسی شیخ کا دامن پکڑا جائے اور اس کے ساتھ تعلق خاص اتباع رکھا جائے خواہ بیعت ہو یا نہ ہو زمرہ مریدین میں داخل ہو کہ نہ ہو۔ محض تعلق اتباع بھی کافی ہے ان شاء اللہ اس طرز عمل کرنے کے بعد نجات یقینی ہے فلاح دارین اور نجات کونین حاصل کرنے کی صورت میں صرف یہی ہے کہ موافق مذکورہ بالا طلب حق کی کوشش کی جائے اور سعی سے کسی وقت قدم نہ ہٹایا جائے تو ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور کامیابی ہوگی اور مقصود حاصل ہوگا۔

چنانچہ اسی رکوع کے اخیر میں وعدہ خداوندی ہے:

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ (العنکبوت نمبر ۶۹)

یعنی جو لوگ طلب حق کی کوشش کرتے ہیں اور ہم سے ملنے کی تمنا رکھتے ہیں ہم ان کے واسطے اپنے راستے کھول دیتے ہیں اور چلنے میں ان کی رہبری کرتے ہیں۔ دنیا کا قاعدہ ہے کہ بسا اوقات انسان محنت کرتا ہے مگر بے کار ثابت ہوئی ہے' سعی ہوتی ہے مگر بجائے کامیابی کے ناکامیابی کی صورتیں نظر آتی ہیں۔ بخلاف اس کے ہمارے یہاں یہ قاعدہ نہیں کہ ہم کسی کی محنت کو بیکار کریں۔ ہمارے ہاں تو جو کوئی اس کورس میں محنت کرے گا' کوشش کرے گا' اس کو ملازمت ضرور مل جائے گی' چاہے کتاب آئے یا نہ آئے' ہاں محنت کرنا شرط ہے۔

غرضیکہ خداوند تعالیٰ نے ہمارے متعلق صرف سعی و مجاہدہ سپرد کیا ہے۔ اب اس پر ثمرات کا مرتب ہونا یہ منجانب اللہ ہے۔ وہ خود اس کے ذمہ دار ہیں۔ انہوں نے وعدہ دیا ہے کہ تم ہمارے لیے کوشش کرو ہم اس کا ثمرہ تم کو ضرور دیں گے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ کوشش محض ہمارے واسطے ہو۔ جیسا فینا کا مفہوم ہے طلب دنیا کا شائبہ بھی نہ ہونا چاہیے ورنہ پھر اگر ترتیب و ہدایات سہل نہ ہو تو کچھ بعید نہیں کیونکہ ہمارا وعدہ تو اسی وقت تک ہے جب تک طلب حق کے واسطے مجاہدہ و سعی کرتے رہو گے اور ہم سے ملنے کی کوشش کرتے رہو گے۔ اگر تم دنیا طلب کرتے ہو تو تم جانو اور تمہارا کام۔ ہم سے کچھ واسطہ نہیں' دنیا کے طلب کرنے میں ہم تمہارے معاون و مددگار نہیں کیونکہ دنیا ایک قبیح شے ہے اس کی طلب بھی قبیح۔ لہٰذا ہم ایک عمل قبیح کے حاصل کرنے میں تمہاری معاونت کا وعدہ کیسے کر سکتے ہیں اور مراد اس دنیا سے جس کو لہو و لعب فرمایا گیا ہے۔ دنیا مذموم ہے دنیائے محمود نہیں۔

دنیا کی قسمیں

کیونکہ دنیا کی دو قسمیں ہیں ایک محمود اور ایک مذموم۔ پس مذموم کو آخرت سے بعد ہے کہ

اس کو آخرت سے کوئی تعلق ہی نہیں مگر محمود کو آخرت سے بعد نہیں اور یہاں سے ایک شبہ کا حل ہو گیا جو میری تقریر پر وارد ہو سکتا تھا وہ یہ کہ مذکورہ بالا تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ طلب دنیا مذموم ہے حالانکہ بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم جو غزوہ احد میں پہاڑ کے مورچہ پر سے غنیمت حاصل کرنے کو چلے آئے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت وہاں سے ہٹنے کی نہ تھی مگر جب انہوں نے دیکھا کہ لشکر عدو بھاگ گیا ہے اب یہاں رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ چلو غنیمت کو کیوں چھوڑا جائے۔ یہاں پر بیٹھے رہنے سے کیا فائدہ۔ خداوند تعالیٰ نے ان کی نسبت ارشاد فرمایا: "**مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا**" (آل عمران آیت نمبر ۱۵۲) (تم میں سے بعض تو وہ شخص تھے جو دنیا کو چاہتے تھے) جس سے ان کا طالب دنیا ہونا معلوم ہوتا ہے تو کیا صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو فعل مذموم کا مرتکب کہا جائے گا۔

اس شبہ کے ازالہ کی صورت یہ ہے کہ دنیا کی دو قسمیں ہیں جیسا بیان کیا گیا ہے۔ ایک مذموم اور اس کی طلب بھی مذموم۔ وہ طلب الدنیا للدنیا ہے اسی کا نام لہو ولعب ہے اور ایک دنیائے محمود اس کی طلب بھی محمود۔ وہ دنیا للآخرت ہے۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طرف ارادہ دنیا کی نسبت کی گئی ہے وہ طلب للدنیا نہ تھی بلکہ **طلب الدنیا للآخرت** تھی کہ مال غنیمت حاصل ہوگا تو آلات حرب تیار کر کے دشمنان اسلام کا مقابلہ کریں گے۔ اپنے حال کو درست کر کے شوکت اسلامی بڑھائیں گے اور قرآن شریف میں صرف **یرید الدنیا** فرمایا ہے اور ان کے حال سے للآخرت کی قید معلوم ہوئی۔ پس اشکال رفع ہو گیا۔

اور اگر اس پر یہ شبہ ہو کہ پھر عتاب کیسا؟ حالانکہ یہ طلب دنیائے مذموم نہ تھی!

اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے نص کے ہوتے ہوئے اجتہاد پر کیوں عمل کیا؟ لہٰذا اس بناء پر یہ عتاب ہوا' نہ یہ کہ فی نفسہ وہ دنیائے قبیح کے مرتکب ہوئے تھے!

حاصل آیت کا یہ ہے کہ تم ہمارے واسطے محنت کرو' مجاہدہ کرو تو ہم تمہارے پہنچنے کے واسطے اپنے راستے کھول دیں گے اور رہبری کریں گے۔ یہ ہمارا وعدہ ہے اور "**اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ**" (آل عمران:۹) (ذرا شک نہیں بلاشبہ اللہ تعالیٰ خلاف کرتے نہیں وعدے کو) دیکھئے! خدا کی شان کہ اتنا بڑا وعدہ کیا کہ تم محض کوشش کرو۔ مطلوب دینے کے ہم ذمہ دار ہیں پھر ہماری بدگمانی کی طرف نظر فرما کر کہ شاید اپنی تنگ دلی کی وجہ سے اتنے بڑے وعدہ کو سن کر مطمئن نہ ہوں کس قدر تاکیدات فرمائیں کہ اول میں لام تاکید لائے آخر میں نون ثقلیہ لائے تاکہ وعدہ خوب موکد ہو جائے۔ نیز صیغہ لائے جمع متکلم کا۔ "**اھدینھم**" نہیں فرمایا تاکہ ہمارے مذاق کی پوری پوری رعایت ہو جائے کیونکہ ہمارے محاورہ میں وعدہ مقارن قدرت کو صیغہ جمع ہی ظاہر کرتے ہیں۔

اور ایک لطیفہ اشارہ اس طرف بھی ہے کہ ہم وہ کام کر سکتے ہیں جو ایک جماعت مل کر بھی نہیں کر سکتی۔ کبھی تم کو یہ خیال ہو کہ مجاہدہ وسعی کرنے والے تو سینکڑوں ہوں گے خدا کیونکر ان سب

کو ہدایت کرے گا۔ اگرچہ ایک مسلمان کی قوت ایمانیہ ہرگز تقاضا نہیں کرسکتی کہ وہ ایسا خیال کرے لیکن توہمات کے درجہ میں ایسے وساوس پیدا ہوجاتے ہیں ان کے رفع کرنے کی غرض سے صیغہ متکلم اختیار کیا کہ اگرچہ ہم تنہا ہیں لیکن ہم وہ کام کرسکتے ہیں کہ تمام دنیا مل کر بھی نہیں کرسکتی۔

اور آیت میں لفظ سبلنا سے ایک مسئلہ تصوف کی طرف بھی نہایت لطیف اشارہ ہے وہ مسئلہ ہے کہ "طریق الوصول الی اللہ بعد انفاس الخلائق" کیونکہ یہاں پر لفظ سبل میں صیغہ جمع اختیار کیا اور دوسری طرف نھدین کا مفعول بھی جمع کی ضمیر ہے۔

طریق وصول الی اللہ

پس مقابل جمع بالجمع سے معلوم ہوا کہ ہم تک پہنچنے کا طریقہ صرف ایک ہی نہیں بلکہ بہت سے طریقے ہیں یعنی ہر شخص کے لیے جدا ہے جس طرح کہ اصلی اجزاء نسخہ کے ایک ہی ہوتے ہیں لیکن طبیب خصوصیات طبائع پر نظر کرکے کمی بیشی کے ساتھ یا اختلاف ترکیب کے ساتھ کسی مریض کے واسطے کسی طرح تجویز کرتا ہے اور کسی مریض کے واسطے کسی دوسرے طریقہ پر تجویز کرتا ہے اور کسی مریض کے واسطے انہی اجزاء کے نسخہ کے ساتھ بدرقہ بھی تجویز کرتا ہے اور کسی کو محض نسخہ ہی لکھ دیتا ہے۔ غرضیکہ اصلی اجزاء ایک ہی ہیں لیکن طبیب مریضوں کی کیفیت کو ملحوظ رکھ کر اس کے موافق نسخہ تجویز کرتا ہے۔ اسی طرح اصل شریعت غرا واحد ہے۔ مقصود محض وصول الی اللہ ہے لیکن بعض اعمال کے اعتبار سے ان کے طریق متفرق ہیں۔

جیسے حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے پاس ایک بیمار شخص آیا اور اس نے عرض کیا کہ حضرت میں بیمار ہوگیا تھا اور افسوس ہے کہ میں مسجد حرام میں نماز نہ پڑھ سکا۔ آپ نے اس کے واسطے دعائے صحت فرمائی اور رخصت کیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد جب عرفا کا مجمع رہ گیا تو فرمایا کہ یہ شخص عارف ہوتا تو ہرگز قلق نہ کرتا کیونکہ جس طرح وصول کی یہ صورت ہے کہ عذر سے گھر میں نماز پڑھ کر حرم کو ترستے رہو۔ اس لیے عارف کی نظر میں دونوں حالتیں وصول کا سبب ہیں اور ایک سی ہیں۔ عارف تو ایک بندہ رضا جو ہے اس کا مقصد ادائے صلوٰۃ ہے۔ اگر مسجد حرام میں ہوسکتا تو وہاں ادا کرتا اور اگر عذر یا بیماری کی وجہ سے وہاں ادا نہ کرسکتا تو اپنے گھر پر ادا کرتا۔

لہٰذا شیخ اور حکیم استعداد کے موافق کوئی طریقہ خاص کردیتے ہیں جو اسکو منزل مقصود پر پہنچانے کا سہل طریقہ ہوتا ہے جس طرح مکہ شریف کے جانے کا راستہ بمبئی سے ہے ایسے ہی ایک راستہ کراچی سے بھی ہے۔ راستے اگرچہ متفاوت ہیں لیکن جس جگہ پہنچنا ہے وہ ایک ہی ہے وصول الی الحق سے جاؤ چاہے ادھر سے جاؤ۔ اسی طرح مقصود ایک ہی ہے وصول الی الحق کا اور طریق متفاوت ہیں۔

اب شیخ کے پاس ایک شخص آتا ہے اس کے نفع کی صورت کثرت تلاوت ہے تو اس کے واسطے کثرت تلاوت قرآن شریف تجویز کرے گا اور ایک دوسرا شخص آتا ہے اس کے اندر مرض کبر ہے اس کے

واسطے وہ ایسی تجویزیں اختیار کرتا ہے جس کے کبر رفع ہو جائے پھر اس میں بھی تعدد ہوتا ہے۔ چنانچہ دیکھئے اس مرض کبر کے ازالہ کی صورت جیسے یہ ہے کہ اس سے سڑک پر جھاڑو دلوائی جائے اسی طرح یہ بھی علاج ہے کہ اس سے نمازیوں کے جوتے اٹھوائے جائیں۔ مقصود دونوں صورتوں سے اور دونوں علاجوں سے مرض کبر کا دفع کرنا ہے۔ غرض کہ طریق اگرچہ متفاوت ہیں لیکن مقصود ایک ہی ہے۔

پھر آگے اس پر جزاء مرتب فرمائی: "اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ" (العنکبوت: ٦٩) (اور بے شک اللہ تعالیٰ (کی رضا و رحمت) ایسے خلوص والوں کے ساتھ ہے) تو اس پر نظر کر کے خلاصہ آیت یہ ہوا کہ تم ہمارے بتلائے ہوئے طریقہ کے موافق عمل کیے جاؤ۔ مجاہدہ و سعی سے ہمت نہ ہارو اس سے تم محسن بندوں میں شامل ہو جاؤ گے اور پھر یہ جزاء مرتب ہوگی کہ ہم اس طائفہ محسنین کو اپنی معیت کی دولت عطا فرمائیں گے اور معیت کا وعدہ اس صیغہ سے فرمایا: "اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ" یوں نہیں فرمایا: "اِنَّ الْمُحْسِنِيْنَ مع اللّٰه" اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ ہم تک پہنچنے کی اگرچہ ایک متحمل صورت یہ بھی ہے کہ تم ہم سے آ کر مل جاؤ مگر یہ تمہاری قدرت سے باہر ہے۔

نگردد قطع ہرگز جادہ عشق از دویدنہا   کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

لہٰذا ہم نے دوسری صورت اختیار کر لی ہے کہ ہم محسنین کے ساتھ مل جائیں گے۔ اب محسنین کی حقیقت سمجھئے جس کو اوپر وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا سے تعبیر فرمایا ہے۔

احسان کی حقیقت حدیث شریف میں یہ آئی ہے: "ان تعبد اللّٰه کانک تراہ" یعنی خدا کی عبادت اس طرح خوبی و ادب و توجہ سے کرو کہ اگر تم اس کو دیکھتے ہوتے اس وقت جس طرح کرتے اس پر یہ شبہ ہوگا کہ جب ہم دیکھتے نہیں تو اس حالت کا اثر ہم کیسے لے سکتے ہیں؟ اس کا جواب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتھ ہی دیدیا ہے: فان لم تکن تراہ فانہ یراک۔[1]

اگر تم خدا کو نہیں دیکھتے تو وہ یقیناً تم کو دیکھ رہے ہیں اور رویت حاکم للمحکوم پر وہی ہوتا ہے جو رویت محکوم للحاکم کا اثر ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح ایک محکوم اپنے حاکم کو دیکھ کر اس کے سامنے نہایت ادب اور متانت کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے اور تمام کام نہایت ہوشیاری سے کرتا ہے ایسے ہی تم بھی اپنے خدا کے سامنے کھڑے ہو کر جو احکم الحاکمین ہے نہایت خشوع و خضوع سے عبادت کرو یہ پہلے جملے کا مطلب ہوا۔

لیکن اگر یہ کہا جائے کہ حاکم دنیا اگر ہمارے سامنے اس طرح کھڑا ہو کہ ہم اس کو دیکھتے ہوں تو اس کے رعب ادب کی وجہ سے کام نہایت خوش اسلوبی سے ہوتے ہیں اور خدا چونکہ ہمیں نظر نہیں آتا تو ہم وہ رعب و ادب کہاں سے لائیں؟

---

[1] (الصحیح للبخاری ۱: ۲۰، الصحیح لمسلم ۱: ۵، سنن النسائی ۸: ۹۹، ۱۰۲، سنن الترمذی: ۲۶۱۰، کنز العمال: ۱۳۶۴)

دوسرے جملہ میں اس کا جواب ہے کہ تمہاری عبادت و اطاعت کے سنوارنے اور ادب و قاعدہ کے ملحوظ رکھنے کے لیے مثل طریقہ مذکورہ کے ایک دوسرا طریقہ یعنی محض خداوند تعالیٰ کا تم کو دیکھنا اور تمہارا اس پر یقین کر لینا کافی ہے کہ وہ تم کو ہر حال میں دیکھ رہا ہے اور اس کے تم معتقد ہو ہی کہ ہم کو خدا ہر وقت دیکھتا ہے اور ہم ان کی نظروں کے سامنے ہیں۔ لہٰذا جب تمہیں اس کے دیکھنے کا یقین ہے تو تم اگرچہ نہیں دیکھتے لیکن جس کو تمہیں اپنی عبادت دکھانی مقصود ہے تو وہ دیکھ رہا ہے لہٰذا سنوار کر اور متانت کے ساتھ تمہیں اپنا کام کرنا چاہیے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک خادم کو معلوم ہوا کہ آقا میرے تمام کاموں کو چلمن کے پیچھے بیٹھا دیکھ رہا ہے اب اگرچہ یہ اس کو نہیں دیکھ رہا لیکن یہ سارا کام اسی احتیاط سے کرے گا جیسا کہ وہ نظروں کے سامنے ہوتا تو اس وقت کرتا اور وہی رعب و ادب بھی ہوگا جو کہ سامنے کھڑے ہوئے ہوتا۔ یہ حاصل ہے احسان کا اور اس کو مجاہدہ سے تعبیر فرمانا اشارہ ہے اس کے طریق حصول کی طرف کہ وہ مجاہدہ ہے اور مجاہدہ کے وہ متعارف معنیٰ نہیں کہ مدتوں خاک چھانے کیونکہ احسان کی جو حقیقت بیان کی گئی ہے۔ وہ بفضلہٖ تعالیٰ اول ہی روز میں حاصل ہو سکتی ہے اور یقیناً حاصل ہو سکتی ہے کیونکہ "وَاللّٰہُ بَصِیْرٌ بِمَا یَعْمَلُوْنَ" (البقرہ:۹۶) (اور حق تعالیٰ کے سب پیش نظر ہیں ان کے اعمال بد) کا ہر مسلمان کا عقیدہ ہے۔ صرف اس کے استحضار کی ضرورت ہے اور یہی استحضار ہے جو نفس کی آزادی کے خلاف ہونے کے سبب اس پر قدرے شاق ہے اور یہی مجاہدہ ہے۔

پس افسوس اسی کا ہے کہ ہم لوگوں نے عقائد کو محض علم و دانستن کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ اعمال میں ان سے کام نہیں لیتے۔ اسی لیے یہ کوتاہیاں ہو رہی ہیں، ان سے عمل میں کام لو تو کیفیت حاصل ہو۔ پھر اس کیفیت میں رسوخ پیدا ہو کر ایسا ذوق میسر ہو کہ پھر کبھی عمل نہ چھوٹے اور نہ کبھی سیری ہو اگرچہ وصول الی الحق بھی ہو جائے۔ بمقتضائے شعر:

دل آرام در بردل آرام جوے   لب از تشنگی خشک برطرف جوے

نہ گویم کہ برآب قادر نیند   کہ برساحل نیل مستسقی اند

"محبوب حقیقی پاس ہے تو پھر اس کو ڈھونڈ رہے ہو جیسے پیاسا پانی تلاش کرتا ہے باوجود دریا کے کنارہ کھڑا ہو کر، میں یہ نہیں کہتا کہ پانی پر قادر نہیں، لب دریا ہوتے ہوئے جلندھر کے بیمار کی طرح ہیں۔"

اب میں وعظ کو ختم کرتا ہوں اور خداوند تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ قادر قیوم مجھے اور آپ لوگوں کو توفیق عطا کرے کہ ہم آپ سب اس پر عمل کریں۔ آمین ثم آمین

الحمدللہ رب العالمین

هم الآخرة

محض حرص دنیا مذموم نہیں بلکہ اس کے مقتضاء پر عمل کرنا مذموم ہے۔ اسی طرح جب مال بھی مطلقاً مذموم نہیں بلکہ ایک درجہ اس کا مطلوب بھی ہے۔ مثلاً اتنی محبت جس سے مال کی حفاظت کا اہتمام ہو سکے مطلوب ہے کیونکہ مال کا ضائع کرنا حرام ہے۔ اگر اتنی محبت بھی نہ ہوگی تو یہ مال کی بے قدری کرے گا اور اس کو ضائع و برباد کر دے گا جس کی شرعاً ممانعت ہے۔

انہماک فی الدنیا وفقدان فکر فی الآخرت کے متعلق یہ وعظ ۵ ذیقعدہ ۱۳۴۵ھ کو حضرت نے اپنے مکان پر ۳۰ کے قریب جمع شدہ افراد کے مجمع میں بعض مستورات کی فرمائش پر کرسی پر بیٹھ کر فرمایا جو چار گھنٹوں میں ختم ہوا اور مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ. اَمَّا بَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ.

یَعۡلَمُوۡنَ ظَاھِرًا مِّنَ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَھُمۡ عَنِ الۡاٰخِرَۃِ ھُمۡ غَافِلُوۡنَ. (الروم نمبر ۷)

ترجمہ: ”یہ لوگ صرف دنیوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں اور یہ لوگ آخرت سے بے خبر ہیں۔“

عظیم الشان پیشین گوئی

یہ ایک آیت ہے سورہ روم کی اس سے قبل حق تعالیٰ نے ایک پیشین گوئی بیان فرمائی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق رسالت میں کیونکہ پیشین گوئی کا ایسے شخص کی زبان سے نکلنا جس نے اس کے اسباب کو حاصل نہ کیا ہو اور دعویٰ نبوت کا کرتا ہو پھر پیشین گوئی بھی ہو بہو واقع ہو جائے۔ یہ علامت ہے اس کی اس شخص کو عالم غیب سے تعلق ہے اور اس حالت میں یہ معجزہ ہوگا کہ پیشین گوئی کے بعد اسی کے مطابق وقوع ہو جائے۔ خصوصاً پیشین گوئی بھی ایسی معمولی نہیں جس کو طبیب بھی ظاہری آثار سے معلوم کرلیں جیسا کہ آج کل بعض جاہلوں کی پیشین گوئیاں ہوتی ہیں کہ فلاں شخص اتنی مدت میں ہلاک ہو جائے گا یا فلاں مرض میں مبتلا ہوگا بلکہ ایسی عظیم الشان پیشین گوئی ہے جس کا تعلق دو سلطنتوں سے ہے اور تعلق بھی ایسا عجیب جو عقول ظاہرہ کے خلاف اور آثار موجودہ سے مستبعد ہے۔ پھر پیشین گوئی بھی مہمل نہیں بلکہ صاف صاف تحدید کے ساتھ اور اس میں دعویٰ یہ کیا گیا ہے کہ اس وقت جن سلطنتوں کو غلبہ ہوا ہے چند سال میں اس کو مغلوبیت ہوگی اور مغلوب سلطنت کو غلبہ حاصل ہوگا۔ اور اس مدت میں اس کا وقوع بھی ہو گیا۔ تو یہ علامت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت کی اور یہ علامت اس وقت تھی جب کہ نبوت ختم نہ ہوئی تھی اور اب جبکہ نبوت ختم ہو چکی اگر کوئی پیشین گوئی کرے اور اس کی پیشین گوئی بھی غلط نہ ہو تب بھی وہ نبی نہ ہوگا اور نہ یہ نبوت کی علامت ہوگی بلکہ

اگر وہ ولی متبع شریعت ہے تو اس کو کرامت کہا جائے گا اور غیر متبع شریعت ہے تو استدراج ہوگا۔

رہا یہ شبہ کہ اگر وہ پیشین گوئی کرنے والا دعویٰ نبوت بھی کرے اور اس کے ساتھ اس کی پیشین گوئی غلط بھی نہ ہو تو کیا جب بھی یہ نبوت کی علامت نہ ہوگی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ احتمال محض فرض و تقدیر ہے جو واقعات کے خلاف ہے یعنی عادۃ اللہ میں ایسا نہیں ہوسکتا اور ایسے احتمالات فرضیہ حقیقت واقعہ میں قادح نہیں ہوتے اور یہ سوال ایسا ہے جیسے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شاگرد نے سوال کیا تھا جو درس کے وقت ہمیشہ خاموش رہتا تھا۔ ایک دن امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بھائی تم کوئی سوال نہیں کرتے تم بھی کچھ پوچھا کرو اس نے کہا کہ بہت اچھا، اب سوال کیا کروں گا۔ چنانچہ اس کے بعد امامؒ نے ایک دن یہ مسئلہ بیان فرمایا کہ غروب آفتاب کے بعد فوراً افطار کرلینا چاہیے تو وہ شاگرد پوچھتے ہیں کہ حضرت اگر کسی دن آفتاب غروب ہی نہ ہو تو کیا کرے؟ امام ہنسنے لگے اور فرمایا کہ بھائی تمہارا خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔

تو اس سوال کا منشا محض فرض و تقدیر پر تھا اس ہی اس سوال کا مبنی ہے اور ایسے احتمالات قابل التفات نہیں ہوتے اور بفرض محال اگر اس کو فرض بھی کرلیا جائے تو جواب یہ ہے کہ یہ علامت اس وقت ہے جب کسی نص قطعی سے نبوت ثابت نہ ہو چکی ہو ورنہ ایسا واقعہ علامت نہ ہوگی۔

اللہ کا وعدہ خلاف نہیں ہوتا

حاصل آیت کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ اس جگہ بہت بڑی پیشین گوئی فرما کر ارشاد فرماتے ہیں کہ:

وَعْدَ اللّٰهِ لَايُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ (الروم نمبر ۴)

''یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کیا کرتے'' تو یہ پیشین گوئی ضرور واقع ہوگی اور پیشین گوئی کے صحیح طور پر واقع ہونے کا مقتضی یہ تھا کہ لوگ آپ کی نبوت کو مان لیتے مگر بہت لوگ پھر بھی منکر رہے ہیں۔ حق تعالیٰ اس آیت میں اس کی وجہ اور سبب بتلاتے ہیں۔ چنانچہ اس سے پہلے ارشاد ہے:

وَعْدَ اللّٰهِ لَايُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَايَعْلَمُوْنَ (الروم آیت نمبر ۴)

اس کے جملہ اخیرہ شکایت ہے کہ لوگوں کو اس کی خبر ہی نہیں (کہ معجزات علامات نبوت ہیں اور پیشین گوئی بھی بوجہ اخبار عن الغیب ہونے کے معجزہ ہے) اور خبر نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو اس کا عقیدہ نہیں یا عقیدہ تو ہے مگر اس کے موافق علم نہیں اور چونکہ علم کے واسطے عمل لازم ہے گو درجہ التزام ہی میں ہو۔ جب عمل نہ ہوا تو اس سے علم کی بھی نفی ہوتی ہے اس لیے لا یعلمون

فرمایا اور میں نے جو یہ قید بڑھائی ہے کہ گو درجہ التزام ہی میں ہو اس سے دفعہ دخل مقدر ہے۔ ایک اشکال کو میں نے رفع کیا ہے وہ یہ کہ بہت سے مسلمان نماز نہیں پڑھتے' روزہ نہیں رکھتے حالانکہ وہ ان کی فرضیت کے معتقد ہیں تو کیا عدم عمل سے یہاں بھی علم کی نفی کی جائے گی؟

جواب یہ ہے کہ التزام عمل بھی عمل کا ایک درجہ ہے اور یہ لوگ گو عمل نہیں کرتے مگر فرضیت عمل کے ملتزم تو ہیں اور کفار تو التزام بھی نہ کرتے تھے۔ غرض جس کا یہ عقیدہ ہوگا کہ پیشین گوئی معجزہ ہے اور معجزہ علامت نبوت ہے وہ پیشین گوئی کے موقع پر ضرور ایمان لائے گا اور یہی عمل ہے کیونکہ ایمان عمل قلبی ہے تو اس اعتقاد سابق کی وجہ سے ایمان و تصدیق ضرور پیدا ہوگی اس درجہ میں اعتقاد کو عمل سے تخلف نہ ہوگا۔

رہا اظہار باللسان توفیها بینه وبین اللّٰه. یہ رکن ایمان نہیں یہ مسئلہ متکلم فیہ ہے۔ مگر مذہب منصور یہ ہے کہ ترک اظہار صرف معصیت ہے جب کہ اظہار پر قدرت ہو۔ یعنی اگر باوجود قدرت کے اظہار نہ کیا تو عنداللہ مومن تو ہوگا مگر عاصی بھی ہوگا۔

رہا ایمان عندالناس و فی احکام الدنیا تو اس کے لیے اظہار شرط ہے جب تک کوئی زبان سے اپنے کو مسلمان نہ کہے گا ہم اس کو کافر ہی کہیں گے بالخصوص جب کہ وہ اظہار پر قادر بھی ہو اور کفار مکہ تو مغلوب و عاجز نہ تھے بلکہ مسلمان خود ان سے ڈرتے تھے۔ اس حالت میں ہم کو کیسے احتمال ہو سکتا ہے کہ ان کے دل میں ایمان ہے اور اگر فرضاً کسی کے دل میں ایمان ہوتا بھی تب بھی ان کا برتاؤ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے ایسا تھا جو امارات تکذیب سے تھا جیسے انفائے مصحف فی القاذ ورۃ امارت تکذیب ہے۔ اسی طرح کفار کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذاء دینا اور مسلمانوں سے مقابلہ مجادلہ کرنا بھی امارت تکذیب سے تھا۔ اس کے ساتھ ان کا وہ ایمان قلبی عنداللہ بھی معتبر نہ ہوتا کیونکہ ایمان عنداللہ کے لیے صرف تصدیق قلبی کافی نہیں بلکہ یہ بھی شرط ہے کہ امارات تکذیب سے احتراز کیا جائے۔

اب میں ایک اشکال طالب علمانہ کا جواب دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ بعض آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کفار کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا علم تھا۔ چنانچہ ارشاد ہے:

اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ. (المومنون آیت نمبر ۶۹)

''یا تب لوگ اپنے رسول سے واقف نہ تھے اس وجہ سے ان کے منکر ہیں۔''

اس میں استفہام انکاری ہے جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو رسول کا رسول ہونا معلوم تھا۔ دوسری جگہ اہل کتاب کے متعلق صاف طور پر ارشاد ہے:

یَعْرِفُوْنَهٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ هُمْ. (البقرہ آیت نمبر ۱۴۶)

"وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔"

تو سمجھ لیجئے کہ یہ معرفت اضطراریہ تھی اور معرفت اضطراریہ ایمان نہیں بلکہ ایمان عمل اختیاری کا نام ہے۔

عہد الست اور اس کا اثر

اس معرفت اضطراریہ کی ایسی مثال ہے جیسے دھوپ کو دیکھ کر ہر شخص اعتقاد ضیاء پر مضطر ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے والے آپ کی معرفت میں مضطر تھے مگر اختیار سے تصدیق سب نے نہیں کی اور اعتقاد توحید میں تو ہر شخص مضطر ہے کوئی دہری کوئی ملحد کوئی کافر اس سے خالی نہیں اور یہ اثر ہے عہد الست کا کیونکہ حق تعالیٰ اس عہد کی حکمت میں خود فرماتے ہیں:

اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا کُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ. (الاعراف نمبر ۱۷۲)

کہ یہ عہد ہم نے اس واسطے لیا تا کہ تم قیامت کے دن یوں نہ کہنے لگو کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے۔ معلوم ہوا کہ اس عہد کے بعد توحید سے بے خبر کوئی نہ رہا۔ سب کو اس کا اصل مضمون یاد ہے۔ شاید کسی کو شبہ ہو کہ ہم کو تو وہ عہد یاد نہیں اس کا جواب یہ ہے کہ یاد کے یہ معنی نہیں کہ تمام تفاصیل و خصوصیات بھی یاد ہوں کہ عہد کس وقت اور کس جگہ لیا گیا تھا اور اس وقت ہمارے دائیں بائیں کون تھا بلکہ یاد کے معنی یہ ہیں کہ اصل مضمون یاد ہو۔

دیکھئے! آمدن کے معنی آنا سب کو یاد ہیں جس نے بھی آمد نامہ پڑھا ہے مگر خصوصیات وقت، علم یاد نہیں کہ کس استاد نے پڑھایا تھا اور کہاں کس جگہ کس دن پڑھایا تھا اور اگر شاذ و نادر کسی کا حافظہ بہت ہی قوی ہو اور اسے سب خصوصیات بھی یاد ہوں تو ایسی مثال عہد الست کے بارے میں بھی مل سکتی ہیں۔ چنانچہ عارفین میں بعض اہل کشف کو عہد الست کی خصوصیات یاد تھیں۔

ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ ہم کو عہد الست کا لیا جانا خوب یاد ہے جس وقت اللہ تعالیٰ نے الست بربکم فرمایا ہے اس وقت تمام روحیں سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منہ تک رہی تھیں کہ پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم جواب دیں تو پھر ہم بھی جواب دیں۔ چنانچہ سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلیٰ اس کے بعد سب نے کہا بلیٰ۔

ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ حدیث میں جو وارد ہے:

الارواح جنود مجندة فما تعارف منها ائتلف وما تناکر منها اختلف.[1]

---

[1] (الصحیح للبخاری: ۲۰، کتاب الانبیاء: ۲، باب الارواح جنود مجندة. ۳۳۳۶، الصحیح لمسلم کتاب البر والصلہ: ۴۹، باب الارواح جنود مجندة: ۱۵۹)

کہ روحیں لشکروں کی طرح جمع کی گئی تھیں جن میں باہم وہاں تعارف ہوگیا ان میں یہاں بھی الفت ہوگئی اور جن میں وہاں تعارف نہیں ہوا ان میں اختلاف ہوگیا۔ تو وہ بزرگ کہتے ہیں کہ اس تعارف وتناکر کی صورت یہ ہوئی کہ جب ارواح جمع کی گئی ہیں تو بعض روبرو تھے ان میں تو طرفین سے الفت ہوگئی اور بعض رودر پشت تھے کہ ایک کا منہ دوسرے کی طرف اور اس کی پشت دوسرے کی طرف۔ ان میں ایک تو دوسرے سے الفت ہوگئی جس کا منہ دوسرے کی طرف تھا اور دوسرے کو اس سے نفرت ہوئی جس کی پشت اس کی طرف تھی اور بعض پشت در پشت تھے کہ اس کی پشت اس کی طرف اس کی پشت اس کی طرف۔ ان دونوں میں دنیا میں بھی نفرت ہوئی اور اپنے اصحاب سے فرمایا کرتے تھے کہ فلاں میری داہنی طرف تھا فلاں بائیں طرف تھا وھکذا۔

حضرت سلطان نظام الدین رحمتہ اللہ کا ارشاد ہے کہ جب اول روح کو جسم میں داخل ہونے کا حکم ہوا تو اس وقت حق تعالیٰ کا کلام روح نے سنا اور وہ فلاں لہجہ میں تھا جو مجھ کو یاد ہے اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اسی کی لذت میں مست ہوکر روح جسم میں داخل ہوگئی۔ یہ وہ جسم ہے جس میں روح کو داخل کر کے عہد الست لیا گیا۔

یہاں یہ شبہ ہوگا کہ حق تعالیٰ کا کلام تو صوت سے منزہ ہے چنانچہ حضرت شیخ فرید کا قول ہے:

قول اورالحن نے آواز نے "ان کے قول کی نہ آواز ہے نہ لحن"

بعض خشک اہل ظاہر حضرت فرید کو شیخ نہیں سمجھتے بلکہ خالی صوفی سمجھتے ہیں کیونکہ وحدۃ الوجود میں ان کے بعض اشعار ذرا زیادہ تیز ہیں جن سے اہل ظاہر کو بوجہ اصطلاحات سے واقف نہ ہونے کے دھوکا ہوا ہے۔ چنانچہ ان کا ایک طویل قصیدہ ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے:

چشم بکشا کہ جلوۂ دلدار متجلی ست از در ودیوار

"آنکھ کھولو کہ محبوب حقیقی کا جلوہ در ودیوار سے روشن ہے۔"

مگر یہ ان صاحبوں کی غلطی ہے حضرت شیخ فرید بہت بڑے عارف ہیں۔ مولانا رومیؒ ان کی بہت تعریف فرماتے ہیں: چنانچہ ارشاد ہے:

ہفت شہر عشق راعطار گشت ماہنوز اندر خم یک کوچہ ایم

"حضرت عطارؒ نے عشق کے سات شہر طے کیے ہم ابھی عشق کے ایک کوچے کے موڑ وخم پر ہیں۔"

اور مصلح ومربی بھی ہیں چنانچہ ان کا پندنامہ اس پر شاہد عدل ہے۔ اسی میں قبر پرستوں کے خلاف ارشاد ہے:

دربلایاری مخواہ ازہیچ کس　　　زانکہ نبود جز خدا فریاد رس

''مصیبت میں کسی سے مددمت چاہ کیونکہ اللہ کے علاوہ کوئی اور فریاد کو سننے والا نہیں ہوتا۔''

ایسا شخص خالی کیسے ہوسکتا ہے یہ تو ان کا قول ہے اعمال توحیدیہ وشرکیہ میں اور عقائد میں ان کا یہ قول ہے:

قول اورالحن نے آواز نے　　　''ان کے قول کی نہ آواز ہے نہ لحن''

جو بالکل اہلسنت کا مذہب ہے پھر ان کو خالی کیسے کہا جا سکتا ہے۔

اللہ کا کلام صوت سے منزہ ہے

غرض اتنے بڑے عارف کا یہ قول ہے کہ حق تعالیٰ کا کلام صوت سے منزہ ہے اور آئمہ متکلمین نے بھی اس پر اتفاق کیا ہے۔ پھر حضرت سلطان جی کے ارشاد کے کیا معنیٰ؟

تو اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اس وقت حق تعالیٰ کے کلام کی تجلی مثالی ہوئی تھی اس تجلی مثالی میں کلام الٰہی صوت سے مقترن تھا اور یہ ایسی ہی تجلی تھی جیسے شجرہ طور پر تجلی مثالی ہوئی تھی جس کی وجہ سے درخت سے آواز آنے لگی وہ صوت بھی کلام الٰہی کی نہ تھی بلکہ کلام الٰہی کی تجلی مثالی کا اثر تھا کہ شجرہ میں آواز پیدا ہوگئی مگر ظاہر ہے کہ گو تجلی مثالی عین صفت نہیں مگر اس کو صفت الٰہی سے بہ نسبت دوسرے حوادث کے ایک خاص تعلق ضرور ہے تو اس کو مجازاً کلام الٰہی کہنا صحیح ہے اور اس میں بہت سے آثار حقیقی کلام الٰہی کے موجود ہوتے ہیں۔ من جملہ ان کے یہ اثر بھی ہے کہ اس میں لذت بے حد ہوتی ہے کیونکہ اس کو کلام الٰہی حقیقی سے غایت درجہ قرب ہے۔ بہر حال اب کوئی اشکال نہیں تو حضرت سلطان جی کو وہ صوت اب تک یاد تھی۔ سبحان اللہ! ایسے ہی حضرات کی نسبت شیخ شیراز فرماتے ہیں:

الست ازازل ہمچناں شان بگوش　　　تفریاد قالوابلیٰ درخروش

''الست بربکم کی ندا عاشقان صادق کے کان میں ہنوز ہورہی ہے' قالوا بلیٰ کی فریاد شور کررہے ہیں''

غرض شاذ ونادر یہاں بھی بعض افراد ایسے موجود ہیں جن کو عہد الست کی خصوصیات یاد ہیں مگر سب کو یہ خصوصیات یاد نہیں کیونکہ سب کا صاحب کشف ہونا ضروری نہیں اور جیسے شاذ ونادر صحیح علم کی خصوصیات بعض کو یاد رہ جاتی ہیں اسی طرح غلط علم کی بھی یاد رہ جاتی ہے۔

بچوں کے لیے متبحر عالم ہونا چاہیے

کانپور میں ایک طالب علم نے ضرب کے مثال دادن کے معنی میں آنے کا انکار کیا میں نے

کہا کہ تم ضرب کے یہ معنی پڑھ چکے ہو کہا کس کتاب میں؟ میں نے کہا منشعب میں' اس پر ان کو بڑی حیرت ہوئی اور کہنے لگے کہ منشعب میں یہ معنی ہرگز مذکور نہیں۔ میں نے منشعب منگائی اور ان سے کہا کہ اس میں ضرب کے جو معنی لکھے ہیں پڑھو' انہوں نے پڑھا الضرب زدن رفتن برروے زمین وپدید کردن' یہاں آ کر وقف کردیا' میں نے کہا کہ پدید کردن پر ٹھہر کیوں گئے؟ آگے پڑھو' تو وہ آگے پڑھتے ہیں: مثل تصرفه ضرب یضرب فهو ضارب. الخ

میں نے کہا یہ کیا' یہ مثل تصریفہ کیسا؟ کہنے لگے مجھے تو فلاں مولوی صاحب نے یونہی پڑھایا تھا' میں نے کہا بندہ خدا؟ آخر تم نے یہ بھی دیکھا کہ اور سب جگہ تو تصریفہ ہے یہاں مثل تصریفہ کیوں ہوگیا؟ کہنے لگے ہاں اب خیال ہوتا ہے کہ واقعی بڑی غلطی تھی اسی لیے میں کہا کرتا ہوں کہ بچوں کی تعلیم کے لیے متبحر اور لائق عالم کو تلاش کرنا چاہیے ورنہ بہت باتیں غلط بتائی جائیں گی اور بچپن کی غلطیاں ذہن میں مرکوز ہوجائیں گی۔ بہرحال النادر کالمعدوم' باقی اکثر تو خصوصیات یاد نہیں رہتیں مگر کسی کے نزدیک بھی یاد کے لیے سب خصوصیات کا یاد ہونا ضروری نہیں سمجھا جاتا بلکہ اصل مضمون کا یاد ہونا کافی سمجھا جاتا ہے۔

اضطراری اعتقاد معتبر نہیں

سو اس طرح عہد الست کا مضمون بھی سب کو یاد ہے' ملحد بھی گو زبان سے وجود صانع کے منکر ہیں مگر دل سے ان کو بھی اقرار ہے۔ چنانچہ بعض ملحدوں نے بعد میں اقرار کیا۔

ایک ملحد کا قول ہے میں نے اس امر کی مشق کرنا شروع کی کہ اپنے ذہن سے ہر چیز کی نفی کرسکوں۔ چنانچہ میں سب کی نفی پر قادر ہوگیا اور ہر چیز سے اپنے ذہن کو خیالی کرلیتا تھا (اور یہ محض مشق سے کچھ کمال نہیں) پھر وہ کہتا ہے کہ کچھ دنوں کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اور تو سب چیزوں کی نفی کرلیتا ہوں مگر ابھی اپنی ہستی کی نفی پر قادر نہیں ہوا تو میں نے عرصہ تک اس کی مشق کی اور اس میں بھی کامیاب ہوگیا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ ابھی ایک چیز اور باقی ہے جس کی نفی نہیں ہوئی اور وہ ہستی صانع عالم کا اعتقاد ہے۔ میں نے عرصہ دراز تک اس کی نفی کی کوشش کی مگر اس کی نفی پر قادر نہ ہوسکا۔ بالآخر مجبور ہوکر میں نے صانع عالم کے وجود کا اقرار کیا مگر توحید کا منکر ہونا چاہا۔ عرصہ تک میں نے توحید صانع عالم کی نفی میں کوشش کی اس میں بھی کوشش کی اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔ بالآخر توحید کا بھی قائل ہونا پڑا تو دیکھئے! عہد الست کا مضمون ایسا یاد ہے کہ انسان ذہن سے اپنے وجود کی نفی پر قادر ہوسکتا ہے مگر وجود صانع اور توحید صانع کی نفی پر قادر نہیں ہوسکتا۔ اس سے بڑھ کر

یاد اور کیا ہوگی۔

مگر یہ اعتقاد اضطراری ہے' یہ ایمان کے لیے کافی نہیں۔ ایمان اعتقاد اختیاری ہے کہ اپنی طرف سے بھی دل کو اس طرف مائل کرے۔ کفار مکہ و اہل کتاب میں معرفت اضطرار یہ ہی تھی جس کو اَمْ لَمْ یَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ. (المؤمنون:٦٩) "یا تب لوگ اپنے رسول سے واقف نہ تھے اس وجہ سے ان کے منکر ہیں۔" یَعْرِفُوْنَهٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَاءَ هُمْ. (البقرہ:١٤٦) "وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔" میں ظاہر کیا گیا ہے کہ اعتقاد اختیاری نہ تھا اسی لیے ان کو کافر کہا گیا اور اسی واسطے میں نے کہا تھا کہ "وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ" کا مطلب یہ ہے کہ کفار کو پیشین گوئی کا معجزہ ہونا اور معجزہ کا علامت نبوت ہونا معلوم نہیں یا علم تو ہے مگر عمل نہیں اور علم کے واسطے لازم ہے گو درجہ التزام ہی میں ہو۔ اس درجہ التزام ہی کا نام اعتقاد اختیاری ہے اور یہی شرط ایمان ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ حق تعالیٰ یہاں اس بات کا سبب بتلاتے ہیں کہ یہ لوگ باوجود دلائل معجزات قائم ہونے کے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو کیوں نہیں مانتے۔

معجزات کی ضرورت اور حقیقت

صاحبو! یہاں ایک بات اور سمجھ لو کہ معجزات کی ضرورت عوام کے لیے ہے اہل فہم کے لیے تو سب سے بڑا معجزہ اور تھا وہ کیا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجموعی حالت' اہل فہم و بصیرت کے لیے صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات ہی کافی معجزہ تھی۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: فلما تبینت وجه عرفت انه لیس بوجه كذاب

نبی کا چہرہ تو بھلا کیوں ممتاز نہ ہو جب کہ ولی کے چہرہ کی یہ حالت ہے کہ

مرد حقانی کی پیشانی کا نور — کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

اور

نور حق ظاہر بود اندر ولی — نیک بیں باشی اگر صاحب ولی

"انوار الٰہی ولی میں نمایاں ہوتے ہیں اگر تو اہل دل ہے تو اس کا ادراک کر سکتا ہے۔"

اور یہ نور دیکھنے ہی سے مدرک ہو سکتا ہے اس کو ایک عارف کہتے ہیں:

گر مصور صورت آں دلستاں خواہد کشید — لیک حیرانم کہ نازش راچساں خواہد کشید

''اگر یہ تسلیم کر لیں کہ مصور دلبر کی تصویر واقعی اتارے گا تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس کے ناز و ادا کی عکاسی کیسے کرے گا۔''

اور یہی مطلب ہے بعض علمائے محققین کے اس قول کا کہ معجزات دلیل نبوت نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اہل بصیرت و اہل فہم کے لیے دلیل نبوت کا انحصار معجزات میں نہیں ان کے اخلاق بھی دلیل ہیں۔ باقی عوام کے لیے تو معجزات ہی ضروری ہیں اور کفار عوام ہی ہیں اور دنیا میں اہل فہم کم ہیں عوام ہی زیادہ ہیں۔ اس لیے نبی کے واسطے صاحب معجزہ ہونا ضروری ہے اور جب عوام کے حق میں معجزات دلیل نبوت ہیں تو اہل فہم کے حق میں تو دلیل نبوت کیوں نہ ہوں گے ان کے لیے تو بدرجہ اولیٰ دلیل نبوت ہوں گے۔

عظیم پیشین گوئی

اب میں مختصر طور پر اس پیشین گوئی کا قصہ بیان کرتا ہوں جس کی تفصیل کتب سیر میں مذکور ہے کہ ہجرت سے پہلے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تھے اس وقت ایک سال فارس و روم میں لڑائی ہوئی اور اہل فارس کو رومیوں پر غلبہ ہوا جس سے کفار قریش کو خوشی حاصل ہوئی اور انہوں نے مسلمانوں سے کہنا شروع کیا کہ تم بھی اہل کتاب ہونے کے مدعی ہو اور رومی بھی اہل کتاب ہیں اور اہل فارس تمہارے نزدیک مشرک ہیں تو اہل فارس کا رومیوں پر غالب ہونا ہمارے لیے نیک فال ہے کہ اسی طرح ہم بھی تم پر غالب ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ کفار کا منہ بند کرنے کے لیے پیشین گوئی فرماتے ہیں کہ نو سال کے اندر اندر رومی فارسیوں پر غالب آئیں گے اور یہ پیشین گوئی بہت بڑی پیشین گوئی ہے معمولی بات نہیں کیونکہ اس کا تعلق دو سلطنتوں سے ہے۔ پھر پیشین گوئی بھی ظاہر حالت کے خلاف ہے جو کسی کی عقل میں نہیں آ سکتی کیونکہ روم کی سلطنت فارس کے مقابلہ میں چھوٹی بھی تھی اور جدید حادث بھی تھی اور فارس کی سلطنت بڑی بھی تھی اور پرانی بھی تھی۔ ابتداء میں ایک ہی خاندان میں چلی آ رہی تھی کیونکہ مؤرخین کا قول (اور واللہ اعلم کہاں تک صحیح ہے) کہ کیومرث جو آدم علیہ السلام کا پوتا یا پر پوتا ہے وہ اس سلطنت کا اول بادشاہ ہے اور اس وقت سے اخیر تک ایک ہی سلسلہ میں سلطنت رہی۔ کسی غنیم سے اس میں تغیر و تبدل نہیں ہوا اسی لیے اس کے خزائن بہت زیادہ تھے۔ ہزاروں برس کی بادشاہت میں ظاہر ہے کہ کس قدر خزائن ہوں گے اور اس کی فوجیں بھی بہت شائستہ اور مستحکم تھیں۔ ان میں بڑے بڑے بہادر موجود تھے پھر وسعت رقبہ کی وجہ سے اس کی رعایا بھی زیادہ تھی اس لیے اس کی فوجیں بھی بہت زیادہ تھیں تو ایسی سلطنت کے متعلق یہ پیشین گوئی کہ وہ ایک چھوٹی اور نئی سلطنت سے مغلوب ہو جائے گی بہت بڑی پیشین گوئی ہے۔

پھر قرآن کی باتیں صاف صاف ہوتی ہیں۔ گول مول پیشین گوئی نہیں ہے جیسے آج کل نجومی پیشین گوئی کیا کرتے ہیں۔ اول تو وہ کثیر الوقوع واقعات بیان کیا کرتے ہیں کہ اس نے کہیں راستہ میں کچھ کھایا ہے' ظاہر ہے کہ اس سے بچا ہوا کون ہے' راستہ میں کچھ نہ کچھ کھا ہی لیتے ہیں اور کچھ نہ ہو تو پان ہی کھا لیتے ہیں۔ یا کہتے ہیں کہ اس نے جنگل میں ایک جگہ پیشاب کیا ہے ایسا بھی سفر میں اکثر ہو جاتا ہے۔ پھر پیشین گوئی بھی کرتے ہیں تو مجمل اور مبہم۔

چنانچہ ایک نجومی سے جب کوئی پوچھتا کہ میری بیوی کا حمل ہے' بتلاؤ! کیا ہوگا؟ تو وہ زبان سے کچھ نہ کہتا بلکہ ایک پرچہ پر یہ عبارت لکھ دیتا کہ ''لڑکا نہ لڑکی'' اگر لڑکا ہوا تو کہہ دیتا کہ ہم نے کہا نہ تھا کہ ''لڑکا ہوگا نہ کہ لڑکی'' اور لڑکی ہوتی تو کہتا کہ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا ''لڑکا نہ بلکہ لڑکی ہوگی'' اب یہ ''نہ'' پہلے کے ساتھ لگ گیا اور جو اسقاط ہو گیا اور کچھ نہ ہوا تو اب وہ ''نہ'' دونوں سے لگ گیا کہ ''لڑکا نہ لڑکی''۔ کتابت میں لہجہ تو ہوتا نہیں اس لیے وقوع کے بعد وہ جس طرح چاہتا لہجہ بدل کر اسے اپنے موافق کر لیا کرتا' لہجہ کو بھی مطالب کے ادا کرنے میں بہت بڑا دخل ہے۔ اسی لیے حنفیہ کے نزدیک عمل صحابی (خلاف رویت) موجب خلل ہے کیونکہ ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لہجہ اسی طرح دوسرے قرائن مقامیہ میں نہیں دیکھا اور صحابی نے یہ سب کچھ دیکھا ہے اس لیے ممکن ہے کہ جو مراد ہم نے الفاظ سے سمجھی ہے وہ صحیح نہ ہو۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں کہہ رہا تھا کہ قرآن کی پیشین گوئی نجومیوں کی پیشین گوئی کی طرح مجمل و مبہم نہیں ہوتی۔ نیز یہ بھی نہیں کہ قیامت تک کی پیشین گوئی ہو۔ **سیغلبون** پر سین داخل کر کے قرب کو بتلا دیا ہے کہ بہت جلد عنقریب رومی غالب ہوں گے۔ پھر **فی بضع سنین** کے ساتھ مقید کر کے اس کو بالکل واضح کر دیا کہ نو سال کے اندر اندر ایسا ہوگا۔

ایسی پیشین گوئی نہیں جیسا کہ ایک پاگل نے اس زمانہ میں پیشین گوئی کی تھی کہ فلاں عورت سے میرا نکاح ہوگا۔ جب اس کا نکاح دوسرے سے ہو گیا تو دعویٰ کیا گیا کہ یہ بیوہ ہو جائے گی اور پھر میرے نکاح میں آئے گی مگر ایسا بھی نہ ہوا اور وہ یہ حسرت لے کر ہی قبر میں چلا گیا تو اس کے تابعین نے اس پیشین گوئی میں یہ تاویل کی کہ اس عورت کی اولاد میں سے کوئی لڑکی اس کے مدعی کی اولاد میں سے کسی لڑکے کے نکاح میں آئے گی۔ سبحان اللہ! ایسی بے تکی تاویل سے بھی اگر پیشین گوئی سچی ہو سکتی ہے تو ہر شخص کی پیشین گوئی سچی ہو جایا کرے گی اور کسی کی کوئی بات بھی غلط نہ ہوا کرے گی۔

سو قرآن کی پیشین گوئیاں ایسی نہیں ہوتی بلکہ صاف اور واضح ہوتی ہیں اور حق تعالیٰ نے روم کے غلبہ اور فارس کی مغلوبیت کی پیشین گوئی اس لیے بیان فرمائی کہ کفار مکہ نے فارس کے غلبہ سے یہ فال لی تھی کہ ہم بھی مسلمانوں پر اسی طرح غالب ہوں گے حق تعالیٰ نے اس دلیل کے مقدمات پر کلام نہیں فرمایا کہ ایک قوم کے دوسری قوم پر غالب ہونے سے اس کی نظیر کا غلبہ دوسری نظیر پر غالب نہیں بلکہ یوں فرماتے ہیں کہ چند سال میں اس کے برعکس کا وقوع ہوگا کہ روم کو فارس پر غلبہ ہوگا۔ اس وقت تم کو اس کے خلاف فال کا قائل ہونا پڑے گا۔ سبحان اللہ! کیا عجب طرز مناظرہ ہے اور یہ الزامی جواب ہے۔

اس کے بعد پھر مسلمانوں کو ایک دوسری واقعی اور حقیقی مسرت سناتے ہیں کہ غلبہ روم سے تو تم کو یہ خوشی ہوگی کہ کفار کی پہلی فال کا لغو ہونا واضح ہو جائے گا اور اس کے ساتھ ہی عین اسی زمانہ میں تم کو حقیقی مسرت بھی حاصل ہوگی۔

وَيَوْمَئِذٍ يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰهِ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ. (الروم آیت نمبر ۴، ۵)

اس دن تم کو کفار مکہ پر غالب ہونے سے حقیقی خوشی بھی حاصل ہوگی بخلاف کفار مکہ کے کہ ان کو اس وقت محض خیالی مسرت ہے اور آئندہ ان کو حقیقی ذلت اور رسوائی حاصل ہوگی تو حق تعالیٰ نے اس جگہ دو پیشین گوئیاں بیان فرمائی ہیں۔ ایک غلبہ روم کی فارس پر، دوسری غلبہ اہل اسلام کی کفار پر۔ یہ تو کفار کی بات کا جواب تھا۔

عطائی طبیبوں کا طریق علاج

پھر چونکہ قرآن مجید طب روحانی ہے اس لیے حق تعالیٰ محض پیشین گوئی پر اکتفا نہیں فرماتے بلکہ اس کے بعد بتلاتے ہیں کہ اس پیشین گوئی کے وقوع پر کفار کو ایمان لے آنا چاہیے تھا مگر وہ پھر بھی منکر رہیں گے۔ اس کا سبب معلوم کرنا چاہیے حق تعالیٰ محض آثار کا علاج نہیں کرتے بلکہ اصل مرض کا علاج کرتے ہیں مگر افسوس! ہم کو اس طب روحانی کا اہتمام نہیں، طب جسمانی کا تو اتنا اہتمام ہے کہ ذرا طبیعت میں تغیر ہوا اور طبیب کی تلاش کرنے لگے مگر طبیب روحانی سے اتنی بے پروائی کی کہ اس کی طرف التفات ہی نہیں، اس کی نسبت فرماتے ہیں:

چند خوانی حکمت یونانیاں ۔۔۔ حکمت ایمانیاں راہم بخواں
صحت ایں حس بجوئید از طبیب ۔۔۔ صحت آں حس بجوئید از حبیب

''یونانی حکمت کی کتابیں کب تک پڑھتے رہو گے'' کچھ دن حکمت ایمانی یعنی معرفت کی

کتب پڑھو، حس جسمانی کو درست کرنا چاہتے ہو تو طبیب سے رجوع کرو اور اگر حس روحانی کی ترقی منظور ہو تو مرشد کامل سے رجوع کرو۔"

پھر طب جسمانی میں کامل طبیب وہ ہوتا ہے جو اصل مرض کا علاج کرے اور وہ طبیب ناقص ہوتا ہے جو آثار کا علاج کرتا ہے کہ کسی نے کھانسی کی شکایت کی تو ملٹھی بتلادی، بخار کی شکایت کی تو گل گاؤزبان لکھ دیا وغیرہ وغیرہ۔ یہ نہیں دیکھتا کہ بخار کا سبب کیا ہے، کھانسی کی وجہ کیا ہے، اس کے سبب کا استیصال کرنا چاہیے۔

اسی قسم کے ایک حکیم جی ہمارے قصبہ کے قریب رہتے ہیں۔ وہ یہ غضب کرتے ہیں کہ طب کی دو تین کتابیں اردو کی دیکھ کر علاج کرنے لگے اور لطیفہ یہ کرتے ہیں کہ مریضوں سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ تشخیص مرض تو کسی اور حکیم سے کرالو علاج میں کردوں گا، کوئی اس سے پوچھے کہ جب تم تشخیص نہیں کرسکتے تو علاج کیونکر کرو گے کیونکہ تشخیص مرض کے بعد تشخیص مزاج کی بھی تو ضرورت ہے۔ کتابوں کے نسخے ہر مریض کے مزاج کے موافق نہیں ہوتے، گو کسی خاص حالت میں مرض کے موافق ہوں۔ تشخیص مرض کے بعد طبیب کامل بھی کتابوں ہی سے نسخے دیکھ کر یا یاد کر کے علاج کرے گا مگر اس کے ساتھ وہ مزاج مریض کی رعایت کر کے کتابی نسخہ میں کچھ تغیر وتبدل بھی ضرور کردے گا اور جس کو تشخیص بالکل نہیں آتی وہ اس کی رعایت کیونکر کرے گا مگر عوام اس شخص سے اس لیے علاج کراتے ہیں کہ تشخیص فعل آنی ہے جو ایک دفعہ نبض دکھلانے سے ہو جاتی ہے اور علاج فعل زمانی ہے اس کے لیے زیادہ مدت کی ضرورت ہے اور لائق طبیب کو بار بار بلانے میں فیس اور کرایہ کا خرچ بہت ہوتا ہے اس لیے وہ لائق طبیب کو ایک دفعہ بلا کر تشخیص اس سے کرالیتے ہیں اور علاج اس سستے عطائی سے کرالیتے ہیں۔

ایسے ہی ترجمہ دیکھ طبیب بننے والوں پر مجھے ایک قصہ یاد آیا۔ کان پور مطبع نظامی میں ایک شخص کا خط آیا جس میں املا بھی درست نہ تھا اس میں لکھا تھا کہ میں فتویٰ بھی دے لیتا ہوں، میرے پاس شرح دقیہ بروزن عطیہ کا اردو ترجمہ موجود ہے اس سے مسائل کا جواب دے لیتا ہوں۔ فتویٰ بھی لکھ لیتا ہوں اور وعظ بھی کہہ لیتا ہوں۔

میرے پاس وعظ کی بھی ایک کتاب ہے اب لوگ کہتے ہیں کہ آپ سے سب فیض تو جاری ہو گئے مگر طب کا فیض نہیں ہے اس کو بھی جاری کردیجئے تو اگر آپ کے مطبع میں "طب احسانی" اردو ہو تو میرے نام ارسال کردیجئے تاکہ یہ فیض بھی جاری کردوں۔ (میرے نزدیک یہاں فاء کی جگہ حاء ہونا چاہیے تھی)۔

ایسے ہی ترجمہ دیکھنے والوں کی ایک یہ حکایت ہے کہ ایک غیر مقلد صاحب جب امام بنتے تو ہل

ہل کر نماز پڑھاتے اور تنہا نماز میں ذرا حرکت نہ کرتے۔ لوگوں نے اس کا سبب پوچھا تو کہا' حدیث میں آیا ہے "من ام منکم فلیخفف"[1] جس کا ترجمہ یہ لکھا ہوا تھا کہ جو امام بنے وہ ہلکی نماز پڑھائے۔ ان حضرت نے ہلکی کو یوں پڑھا کہ ہا کو کسرہ دیا اور یاء کو مجہول پڑھا یعنی ہل کے نماز پڑھائے۔ اس لیے وہ امامت کے وقت خوب ہلتے تھے۔ خدا بچائے اس جہالت سے۔

ایسے ہی ایک دنیا پرست مولوی نے ایک شخص کو فتویٰ دے دیا تھا جو میں نے لکھا ہوا بھی دیکھا تھا کہ ساس سے نکاح کرنا جائز ہے اور دلیل یہ بیان کی ساس وہ ہے جو منکوحہ کی ماں ہو اور منکوحہ وہ ہے جس سے نکاح صحیح ہوا ہو اور اس شخص کی بیوی جاہل ہے جس کی زبان سے کفریات کا صدور غالب ہے اور نکاح کے وقت تجدید ایمان ہوئی نہیں۔ اس لیے وہ منکوحہ بنکاح صحیح نہیں تو اس کی ماں ساس بھی نہیں' کم بخت نے محض گمان و تخمین پر نکاح کو بھی فاسد کر دیا اور منکوحہ کی ماں کو بھی حلال کر دیا اور حرمت مصاہرت کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ ابو حنیفہؒ کی رائے ہے ہم اس کو نہیں مانتے۔

یہ واقعات تو میں نے استطراداً بیان کر دیئے۔ اصل گفتگو یہ تھی کہ عطائی طبیب آثار کا علاج کرتے ہیں اسباب کا علاج نہیں کرتا۔

ان کی ایسی مثال ہے جیسے ایک گاؤں میں ایک شخص تاڑ کے درخت پر اتفاق سے چڑھ گیا۔ جب اوپر پہنچ گیا تو زمین دیکھ کر اترتے ہوئے بہت ڈر لگا' شاید اس کو چڑھنا آتا ہوگا اور اترنا نہ آتا ہوگا۔ طریق باطن میں بھی بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ترقی تو کرتے ہیں مگر نزول نہیں کرتے جیسے مجذوبین۔ یہ لوگ کامل نہیں بلکہ ناقص ہیں' کامل وہ ہے جو عروج و نزول دونوں کا جامع ہو اب وہ لگا چلانے اور شور مچانے کہ مجھے کسی طرح اتارو۔ سب لوگ حیران ہو گئے کہ کس طرح اتاریں۔ آخر کار بوجھ بجھکڑ کو بلا کر لائے جو سب سے زیادہ گاؤں میں عاقل مشہور تھا۔ اس نے اول تو اوپر نیچے دیکھا اور سوچا' پھر کہا بس سمجھ میں آ گیا' ایک لمبا سا رسہ لاؤ اور اس کے پاس پھینکو اور اس سے کہو کہ اپنی کمر سے باندھ لے۔ چنانچہ یہ سب کچھ کیا گیا پھر کہا اس رسے کو زور سے جھٹکا دے کر کھینچو' لوگوں نے جو جھٹکا دیا تو اس کا بدن تو نیچے آ گیا مگر روح اوپر کو اڑ گئی' لوگوں نے بوجھ بجھکڑ سے کہا کہ یہ کیا ہوا۔ کہنے لگا اس کی قسمت! میں نے تو اسی تدبیر سے بہت آدمیوں کو کنویں سے نکالا ہے۔ یہی حال ان عطائی طبیبوں کا ہے کہ صرف ظاہری آثار کا علاج کرتے ہیں' اسباب کو نہیں دیکھتے' ایک ہی نسخہ کو ہر جگہ برتتے ہیں' اسباب مختلفہ کو نہیں دیکھتے جیسے اس احمق نے رسی کو ایک ہی

---

[1] (المعجم الكبير للطبراني ١٧: ٢٠٦' الكامل لابن عدي ٧: ٢٥٣٢)

تدبیر یاد کر کے کنویں میں بھی استعمال کیا اور درخت میں بھی۔

مجھے ایک عطائی نے آنت اترنے کی دوا دی تھی جو کان میں ڈالی جاتی تھی میں ان عطائیوں کا علاج کبھی نہیں کرتا مگر اس وقت یہ خیال ہوا کہ خارجی علاج ہے اس کا کیا حرج ہے۔

چوں قضا آید طبیب ابلہ شود

(جب موت آتی ہے تو طبیب کی عقل ٹھکانے نہیں رہتی)

میں نے اس دوا کا استعمال کیا تو اس سے تمام بدن میں برودت کا ایسا غلبہ ہوا کہ حرارت غریزیہ بھی بہت کم ہوگئی۔ آخر میں نے اسے چھوڑا اور طبیب سے رجوع کیا۔ کئی دن کے بعد مختلف ادویہ سے حرارت غریزیہ اپنے حال پر آئی۔

شیوخ کی پہچان

جس طرح طب جسمانی میں بعض عطائی ہیں ایسے ہی طریق باطن میں بعض شیوخ اناڑی اور عطائی ہوتے ہیں اس لیے میں شیوخ کی پہچان بتاتا ہوں جن میں ایک قبل رجوع ہے ایک بعد رجوع ہے۔ قبل رجوع تو یہ بات دیکھنی چاہیے کہ کاملان عصر کا اس سے کیا برتاؤ ہے وہ اس کے متعلق کیا گواہی دیتے ہیں۔ اگر وہ اس کے کمال کے معتقد ہوں تو اس کو کامل سمجھنا چاہیے۔

دوسری بات بعد رجوع کے قابل لحاظ یہ ہے کہ ابھی اس سے بیعت ہونے میں جلدی نہ کرو بلکہ اس سے اپنا حال عرض کر کے کام کرنا شروع کرو اور اگر وہ بدون بیعت کے کام نہ بتلائے تو وہ ناقص ہے اس کو چھوڑ و کسی اور سے رجوع کرو اور اول کام کرو پھر کام شروع کر کے اپنے حالات سے اس کو اطلاع دو اور یہ دیکھو کہ اس کے جوابات سے اطمینان و تسلی ہوتی ہے یا نہیں' اگر اطمینان ہوتا تو سمجھو کہ یہ شخص محقق ہے منزل شناس ہے اور اطمینان نہ ہوتا ہو تو سمجھو کہ ناقص ہے جو احوال سالکین کی حقیقت کو نہیں سمجھتا' اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

وعدہا باشد حقیقی دل پذیر وعدہا باشد مجازی تاسہ گیر

''سچے وعدے دل کو لگتے ہیں مجازی یعنی ناراست وعدے طبیعت میں تردد پیدا کرتے ہیں۔''

تاسہ گیر کے معنی ہیں اضطراب' جھوٹے وعدوں سے اضطراب ہوتا ہے اور سچی باتوں سے تسلی ہوتی ہے۔ حدیث میں بھی ہے: الصدق طمانیة والکذب ریبة

وعدہ اہل کرم گنج رواں وعدہ نااہل چوں رنج رواں

''اہل کرم کا وعدہ خزانہ رائج یعنی خالص ہے نااہل کا وعدہ جان کے مصیبت ہوجاتا ہے۔''

عارف شیرازی ایسے ہی اناڑیوں کی شکایت فرماتے ہیں اور یہ بھی ایک علامت ہے شیخ کے غیر محقق ہونے کی جو عارف کے کلام میں مذکور ہے۔

خستگاں را کہ طلب باشد وقوت نبود گر تو بیداد کنی شرط مروت نبود

"کمزوروں کو جب طلب ہو اور قوت نہ ہو تو ان کو قوت سے زیادہ کام لے کر تم ان پر ظلم کرو تو یہ شرط مروت کے خلاف ہے۔"

بعض شیوخ ہر شیخ کو بتلاتے ہیں کہ چھ مہینے ہمارے پاس رہو۔ اب ایک شخص صاحب اہل و عیال ہے اس کو بھی یہی بتلا دیا۔ وہ کہتا ہے کہ مجھ کو تو ہمت نہیں، شیخ صاحب فرماتے ہیں کہ پھر ہمارے پاس کیوں آئے۔ یہ جواب اس کے غیر محقق ہونے کی علامات ہے۔ اگر کوئی طبیب پچاس روپیہ کا نسخہ لکھے اور غریب آدمی افلاس کا عذر کرے اور طبیب یوں کہے کہ پھر ہمارے پاس کیوں آئے تو وہ طبیب نہیں ہے۔ طبیب کامل وہ ہے جو غریبوں کا علاج دھیلے اور پیسہ کی دوا سے کرے۔

ہمارے حضرت استاد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک رئیس کو جامن کی کونپلوں کا استعمال کرنا بتایا۔ ایک رئیس کا علاج دودھ میں اگاس بیل کو جوش دے کر پینا بتلا دیا اور ایک شخص کو سویاں ابال کر کھانا بتلا دیا۔ آپ کے نسخے ہمیشہ پیسہ دو پیسہ کے ہوتے تھے اور بعض دفعہ بالکل مفت کی جنگلی دوا بتلاتے تھے۔ اطباء دیوبند کہا کرتے تھے کہ یہ مولانا کی کرامت ہے طب نہیں کہ ایسی معمولی چیزوں سے نفع ہو جاتا ہے۔ مولانا اس کو سن کر ہنستے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ لوگ طب سے ہی واقف نہیں۔

تو محقق کی تلاش کرو اور جب محقق مل جائے تو اس کی اطاعت کرو اور اس کے سامنے اپنی تجویز و رائے کو فنا کردو۔ پہلے یہ حالت تھی کہ طالبین مشائخ کی ایسی اطاعت وانقیاد کرتے تھے کہ اگر کسی کو یہ کہا جاتا کہ تم کسی دوسرے سے تعلیم حاصل کرو تو وہ اس پر راضی ہو جاتے اور یہ سمجھتے تھے کہ ان کی اطاعت سے ہم کو نفع ہوگا اور خود ہم کسی سے رجوع کریں ہم کو انہی سے فیض ہوگا۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص نے بیعت کی درخواست کی، فرمایا تم مولانا محمد قاسم صاحب سے بیعت ہو جاؤ وہ زیادہ کامل ہیں۔ وہ مولانا محمد قاسم صاحب کی خدمت میں گیا، انہوں نے مولانا گنگوہی پر ٹالا اور فرمایا تم انہی سے بیعت ہو جاؤ، وہ زیادہ کامل ہیں۔ وہ پھر گنگوہ حاضر ہوا، حضرت نے پھر مولانا محمد قاسم پر ٹالا، وہ پھر ان کے پاس آیا، اسی طرح کئی بار غریب کو دوڑایا، آخر ایک دفعہ گنگوہ میں یا نانوتہ میں قران السعدین ہوا اور دونوں حضرات مسجد جارہے تھے، وہ شخص راستہ روک کر کھڑا ہو گیا اور کہا اب تم دونوں جمع ہو، میرے متعلق فیصلہ کر لو اور

کوئی نہ کوئی مجھے بیعت کرے جب تک اس کا فیصلہ نہ ہوگا میں راستہ نہ چھوڑوں گا' اس وقت دونوں میں سے کسی نے اس کو بیعت کرلیا مگر آج کل حالت یہ ہے کہ اگر کسی کو دوسرے سے تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیا جائے تو وہ اطاعت نہیں کرتا اور یوں سمجھتا ہے کہ مجھے ٹال دیا اور غلط مشورہ دیا' جب اطاعت وانقیاد کا یہ عالم ہو تو پھر نفع کیونکر ہو۔ یہ گفتگو درمیان میں استطرادًا آ گئی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ محقق وہ ہے جو سبب کا علاج کرے محض آثار کا علاج نہ کرے اور یہی محقق کی علامت ہے۔

حب دنیا ونسیان آخرت کا مرض

اور حق تعالیٰ کے کلام کی یہی شان ہے کہ اس میں مرض کی تشخیص بھی ہوتی ہے اسباب امراض بھی بیان کیے جاتے ہیں اور اسباب کا علاج کیا جاتا ہے اور یہاں کسی مریض کو یاس کو جواب نہیں دیا جاتا۔ افسوس! ایسا کامل مطب اور اس کی ایسی بے قدری کہ ہم اس کے لکھنے پڑھنے کا ذرا اہتمام نہیں کرتے۔ گو تمہید طویل ہوگئی ہے مگر اس سے آپ کو اس سبب مرض کا شدید وقابل اہتمام ہونا تو معلوم ہوگیا ہوگا۔

تو حق تعالیٰ اس مقام پر کفار کے انکار واعراض کا سبب بتلاتے ہیں کہ یہ باوجود قیام دلائل و اظہار معجزات کے ایمان نہیں لاتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ محض دنیا کو جانتے ہیں یعنی ان کو دنیا کی طرف خاص درجہ کی توجہ ہے جس کی تفصیل آگے بتلاؤں گا اور ان کو آخرت سے غفلت ہے۔ خلاصہ سبب کا دو باتیں ہیں ایک توجہ الی الدنیا دوسرے غفلت عن الآخرۃ۔ اب اپنے ذہنوں کو ٹٹول کر دیکھئے کہ اس کو کوئی شخص مرض سمجھتا ہے تامل سے معلوم ہوگا کہ کوئی بھی اس کو مرض نہیں سمجھتا اور اگر کوئی مرض سمجھتا ہے تو معمولی مرض سمجھتا ہے اور جس مرض کو معمولی سمجھا جائے وہ سخت خطرناک ہے۔ حالی کا شعر ہے' گو حالی کا کلام پڑھنے کو جی تو نہیں چاہتا مگر ان اشعار میں صحیح مضمون بیان کیا گیا ہے اس لیے پڑھتا ہوں۔

کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا ۔۔۔ مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا؟
کہا دکھ نہیں کوئی دنیا میں ایسا ۔۔۔ کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا
مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں ۔۔۔ کہے جو طبیب اس کو ہذیان سمجھیں

حقیقت میں اگر سخت سے سخت مرض کا علاج اہتمام سے کیا جائے تو وہ آسان ہو جاتا ہے کیونکہ حدیث میں ہے: مامن داء الا وانزل اللّٰہ لہ دواء[1]

---

[1] (اتحاف السادۃ المتقین ۹: ۱۵۱' المغنی عن حمل الأسفار للعراقی ۴: ۲۷۶)

''حق تعالیٰ نے ہر مرض کے لیے دوا نازل کی ہے۔'' اور یہ عام ہے امراض ظاہرہ کو بھی باطنہ کو بھی۔ البتہ اگر کسی مرض کو معمولی سمجھ کر ٹال دیا جائے اور اس کا علاج نہ کیا جائے یا اہتمام سے نہ کیا جائے تو وہی سخت خطرناک ہے کیونکہ وہ اندر اندر جڑ پکڑ لے گا۔ پھر اخیر میں اہتمام و توجہ کرنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ یہی حالت اس مرض کے ساتھ ہی ہماری ہو رہی ہے کہ ہم نے اس کو معمولی بات سمجھ لیا ہے حالانکہ یہ اتنا بڑا مرض ہے کہ کفر کی جڑ ہے اور کفر کا منشا و سبب ہے۔ کفار کے ایمان نہ لانے کا سبب بھی اس آیت کی دلالت سے توجہ الی الدنیا اور غفلت عن الآخرت ہے۔ جس کو ہم معمولی خیال سمجھتے ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ اصل فرع سے اشد ہوتی ہے۔ پس یہ اصل سہل ہے تو اس قاعدہ کے موافق کیا نعوذ باللہ کفر کو بھی معمولی اور سہل کہا جائے گا؟ ہرگز نہیں! تو ثابت ہوگیا کہ یہ مرض حب دنیا و نسیان آخرت کفر سے بھی اشد ہے اور گو خدا کا شکر ہے کہ ہم میں اس درجہ کی غفلت عن الآخرت تو نہیں جس درجہ کی کفار میں ہے اور وہی کفر سے اشد بھی ہے کیونکہ وہ تو آخرت کے قائل ہی نہیں۔ محض دنیا ہی کو جانتے ہیں اور ہم آخرت کے قائل ہیں اور ہمارا اعتقاد ہے کہ دنیا کے سوا ایک دوسرا عالم بھی ہے۔ البتہ حالت یہ ہے کہ اعمال میں اس کا استحضار نہیں نہ اس کے لیے سامان کی فکر ہے تو گو غفلت کا اعلیٰ درجہ ہمارے اندر نہ ہو مگر جس درجہ کی بھی ہے وہ معمولی بات نہیں بلکہ بہت سخت چیز ہے کیونکہ اس ادنیٰ درجہ کا بڑھ جانا کیا مشکل ہے۔

زکام، کھانسی اول معمولی درجہ کی ہوتی ہے پھر وہی رفتہ رفتہ دق اور سل کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ جب کہ اس کو معمولی سمجھ کر ٹال دیا جائے۔ اسی طرح افیون و تمباکو کو شروع میں قلیل مقدار سے کھایا جاتا ہے پھر وہ خود ترقی کا تقاضا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ جو شخص ایک رتی افیون کا کھانے والا تھا سال بھر کے بعد وہ کئی ماشے کھانے لگتا ہے کیونکہ نشہ کی چیز میں خاصیت ہے کہ وہ خود بخود بڑھتی ہے اور حب دنیا بھی ایک نشہ ہے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ سو روپیہ میں ایک بوتل کا نشہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حب دنیا روز بروز ترقی کرتی رہتی ہے۔ جس شخص کی تنخواہ ۲۰ روپے ہے وہ کہتا ہے کہ پچاس ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔ جب پچاس ہو گئے تو کہتا ہے کہ ستر ہو جائیں پھر ستر ہو گئے تو اب سو کی تمنا ہے۔ سو ہو گئے تو اس سے آگے کی تمنا ہے۔ بس وہ حال ہے کہ:

لاینتهی ارب وقلت والشعر للمتنبی ولله دره ما ابلغة حیث قال ؎

وربما احتسب الانسان غایتها وفاجأته بامر غیر محتسب

وماقضٰی احد منها لبانته ولاانتهی ارب الا الٰی ارب ۱۲ ظ

سولوگوں کو دنیا کا تو ایسا نشہ ہے مگر آخرت میں یہ حالت ہے کہ ہر شخص اس کے لیے قلیل درجہ پر

قانع ہے۔ اگر کسی کو ترقی آخرت کی نصیحت کی جائے تو کہتا ہے کہ پانچ وقت کی نماز تو پڑھتے ہیں اور کیا جان نکالو گے اور بعض تو آخرت کی طرف بھی اسی وقت تک متوجہ ہوتے ہیں جب تک دنیا سلامت رہے اور اگر دنیا کا نقصان کسی وجہ سے ہو گیا تو وہ آخرت کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔ گویا خدا کی اطاعت وعبادت محض اس خوشامد سے کرتے ہیں کہ وہ ان کی دنیا سنوارتے رہیں اور اگر دین پر عمل کرتے ہوئے اتفاقاً دنیا بگڑ جائے تو یہ خدا سے بھی بگڑ بیٹھتے ہیں۔

چنانچہ ایک دیہاتی نے روزہ رکھا تھا۔ اتفاق سے اسی دن اس کی بھینس مر گئی تو کم بخت نے لوٹا کو منہ لگا کر پانی پیا اور آسمان کی طرف منہ کر کے کہتا ہے اور رکھالے رو جا (روزہ)

اسی طرح ایک بڈھے کی اولاد بڑھاپے میں اسکی خدمت نہ کرتی تھی تو وہ گھر چھوڑ کر مسجد میں آ پڑا اور نماز روزہ کرنے لگا۔ اتفاق سے لڑکوں کو کھیتی میں نقصان پہنچا' کچھ مویشی مر گئے اور کھیت برباد ہو گیا تو وہ کہنے لگا کہ یہ ساری نحوست اس بڈھے کی نماز کی ہے (نعوذ باللہ) سب مل کر اسکے پاس آئے کہ ہم آج سے تیری خدمت کیا کرینگے تو گھر پر رہ اور نماز نہ پڑھا کر۔ اس نے کہا اچھا! مگر دیکھو! وعدہ خلافی نہ کرنا ورنہ میں پھر بوریا بندھنا لے کر نماز شروع کر دونگا۔ سب نے پکا وعدہ کیا اور بڈھے نے نماز چھوڑ دی اور خوب گھی' دودھ کھانے لگا' پھر جب کبھی لڑکے اسکی خدمت میں کمی کرتے وہ کہتا کہ ارے لائیو میرے اوجو کا کلھڑا (وضو کا لوٹا) لڑکے پھر ڈر جاتے اور خوشامد کرتے کہ تم نماز نہ پڑھو اب سے خدمت میں کمی نہ ہو گی تو اس بڈھے نے نماز کے ڈراوے میں ان سے خوب خدمت کروائی۔

مگر ایسے احمق تو مسلمانوں میں آج کل بہت کم ہیں اور جو ایسا ہو اس سے گفتگو ہی نہیں کیونکہ وہ حقیقت میں مسلمان ہی نہیں جو نماز روزہ کو منحوس سمجھتے ہیں جو مسلمان نماز روزہ کو برکت کی چیز بھی سمجھتے ہیں ان کی بھی یہ حالت ہے کہ ہر شخص جس درجہ میں ہے اسی پر قانع ہے اس سے آگے بڑھنے کی نہ فکر ہے نہ کوشش ہے۔ امام غزالی نے اس کے متعلق خوب مضمون لکھا ہے' فرماتے ہیں:

ارى الملوك بادنى الدين قدقنعوا ومامارهم رضوا بالعيش بالدون
فاستغن بالدين عن دنيا الملوك كما استغنى الملوك بدنياهم عن الدين

یعنی میں بادشاہوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ دین میں تو ادنیٰ درجہ پر قانع ہیں مگر عیش دنیوی میں ادنیٰ حالت میں قانع نہیں ہیں' آگے دین داروں کو نصیحت فرماتے ہیں کہ تم بھی بادشاہوں کی دنیا سے ویسے ہی مستغنی ہو جاؤ جیسے وہ دنیا کو لے کر دین سے بے پروا ہو گئے' تم دنیا میں ان کو نہیں گھٹا سکتے تو دین میں تو نیچا دکھا دو۔ یہ تو غفلت کے متعلق کلام تھا۔

اب توجہ الی الدنیا کو سنئے۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم کو بہ نسبت آخرت کے دنیا کی طرف توجہ زیادہ ہے گو کفار جیسا انہماک نہ ہوان کو تو ہر وقت اسی میں انہماک ہے۔ آخرت کا اعتقاد ہی نہیں رکھتے تو ہم کو گو ایسا انہماک نہ ہو مگر یہ ضرور ہے کہ انہماک کا ایک درجہ ہمارے اندر بھی ہے جس کا حاصل یہی ہے کہ آخرت سے زیادہ دنیا کی طلب ہے اور اس کے لیے آخرت سے زیادہ کوشش کی جاتی ہے اور میں بھی افیون کی مثال سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ ہلکا مرض بھی اشد ہو جاتا ہے بلکہ بعض اوقات اس وجہ سے کہ ہلکا سمجھ کر اس کی طرف التفات نہیں کیا جاتا' زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بخار ہلکا ہلکا زیادہ خطرناک ہے وہ تو رگوں میں پیوست ہو جاتا ہے اور پتہ نہیں لگتا۔ یاد رکھو! حب دنیا کفر کی اصل ہے اس کو معمولی مت سمجھو اور یہ بات کہ جڑ کو معمولی نہ سمجھا جائے میں اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ بزرگوں کے اقوال میری تائید کر رہے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

علت ابلیس انا خیر بدست ایں مرض درنفس ہر مخلوق ہست

''ابلیس کی بیماری اپنے کو بہتر سمجھنے کی تھی اور یہ مرض ہر مخلوق کے اندر موجود ہے۔''

اس میں تصریح ہے کہ ابلیس کے مردود ہونے کا اصلی سبب تکبر تھا اور یہ مرض ہر شخص کے اندر موجود ہے گو اس کا درجہ نہ ہو مگر جب شہر میں آگ لگتی ہے تو اس کی ابتدا ہمیشہ معمولی سی بات سے ہوتی ہے۔ بعض دفعہ ایک دیا سلائی سے گھر میں آگ لگ گئی' بعض دفعہ ایک چنگاری نے چھپر کو جلا دیا' پھر اس سے کڑیوں میں آگ لگ گئی' پھر ہوا نے دوسرے گھروں تک آگ پہنچا دی اور بستی کی بستی جل گئی۔

کسب دنیا و حب دنیا کا فرق

صاحبو! جب حق تعالیٰ کے کلام سے سبب کفر معلوم ہو گیا تو اس کو خفیف نہ سمجھو اور اس کے ادنیٰ درجہ سے بھی نکلنے کی پوری کوشش کرو اور میں کسب دنیا سے منع نہیں کرتا بلکہ حب دنیا سے منع کرتا ہوں کیونکہ یہی جڑ ہے تمام جرائم کی۔ ''حب الدنیا راس کل خطیئۃ''[1]

آج کل تو تعلیم یافتہ جماعت کسب دنیا و حب دنیا میں فرق نہیں کرتی جس کی وجہ سے وہ دو غلطیوں میں مبتلا ہیں۔ ایک تو علماء کے کلام میں دنیا کی مذمت دیکھ کر ان پر طعن کرنے لگے کہ یہ لوگ کسب دنیا سے منع کرتے ہیں حالانکہ نصوص شرعیہ میں اس کی اجازت صراحۃً موجود ہے۔ علماء اس کو کیسے منع کر سکتے ہیں۔ دوسرے جن نصوص میں کسب دنیا کی اجازت تھی ان کو ان ظالموں نے حب دنیا پر بھی محمول کر لیا

---

[1] (کنز العمال: ۶۱۱۴' مشکوٰۃ المصابیح: ۲۵۱۳' الدر المنثور للسیوطی ۶:۳۴۱' اتحاف السادۃ المتقین للزبیدی ۳:۱۳۱' ۸:۳۵۴۷' ۸۱:۲۹۵' ۴۹۴)

حالانکہ جس پیغمبر کا یہ ارشاد ہے: "کسب الحلال فریضة بعد فریضة"[1] انہی کا یہ ارشاد بھی ہے: "حب الدنیا رأس کل خطیئة"[2] اور یہ اشارہ بھی ہے:

تعس عبدالدینار تعس عبدالدرھم تعس عبدالخمیضة ان اعطی رضی وان منع سخط تعس وانتکس واذا شیک فلاانتقش۔[3]

اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بد دعا دی ہے کہ دینار و درہم کا بندہ ہلاک ہوجائے ذلیل ہوجائے اور اگر اس کے کانٹا لگے تو خدا کرے نکلنا نصیب نہ ہو۔ شاید کوئی ذہین یہاں یہ اشکال پیدا کرے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا بھی دعا ہو کر لگتی ہے پھر اس کا کیا ڈر؟ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حق تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ:

اللھم انما بشر فایما رجل اذیته اوشتمته اولعنته فاجعلها له صلٰوة وزکٰوة وقربة تقربه بها الیک۔[4]

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حکم اس بددعا کا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بشریت کے اقتضاء سے غلبہ غضب میں فرمادی ہو۔ تشریعی بددعا کا یہ حکم نہیں اور اس جگہ جو عبدالدینار والدرہم کو بددعا دی گئی ہے وہ بشریت کی راہ سے نہیں ہے بلکہ تشریعی بددعا ہے جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اب اس بددعا سے بہت ڈرنا چاہیے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور تشریعی بددعا بہت جلد قبول ہوتی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں "انی اری ربک یسارع فی ھواک" کہ میں دیکھتی ہوں کہ جو آپؐ چاہتے ہیں حق تعالیٰ ویسے ہی کر دیتے ہیں۔

اب میں حب دنیا کی حقیقت حق تعالیٰ ہی کے کلام سے بتلانا چاہتا ہوں کیونکہ اس میں بہت لوگ غلطی کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآءُ کُمْ وَاَبْنَآءُ کُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ اِقْتَرَفْتُمُوْھَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا وَمَسَاکِنُ تَرْضَوْنَھَا اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَجِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِہٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ۔ (التوبہ آیت نمبر ۲۴)

---

[1] (حلیة الاولیاء لأبی نعیم ۷: ۱۲۲، تذکرة الموضوعات للفتنی: ۱۳۴، کشف الخفاء للعجلونی ۲: ۱۲۲) [2] (انظر تخریج الحدیث الرقم: ۴۵)

[3] (سنن ابن ماجہ: ۴۱۳۵، ۴۱۳۶، السنن الکبریٰ للبیہقی ۹: ۱۵۹، ۱۰: ۲۴۵، مشکٰوة المصابیح: ۵۱۶۱، الصحیح للبخاری ۸: ۱۱۵، بالفاظ مختلفة)

[4] (الصحیح لمسلم: ۲۰۱، فتح الباری لابن حجر العسقلانی ۱۱: ۱۷۱، جمع الجوامع للسیوطی: ۹۷۵۶، بالفاظ مختلفة)

''یعنی آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیبیاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہوں تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم (سزائے ترک ہجرت) کا بھیج دیں۔''

دنیا کی محبت اور حرص کا درجہ

سبحان اللہ! حق تعالیٰ کیسے رحیم ہیں کہ دنیا کی محبت سے بھی منع نہیں فرماتے بلکہ احبیت سے منع فرماتے ہیں کہ دنیا کی محبت اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے زیادہ نہ ہو جس کی علامت یہ ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ میں کمی ہو جائے یعنی اطاعت احکام میں اختلال ہو جائے میرے نزدیک **وجهاد فی سبیله** تفسیر ہے ماقبل کی جس میں احبیت من اللہ و رسولہ کی حقیقت بتلائی گئی ہے جس سے یہ معلوم ہو گیا کہ احبیت بھی مطلقاً مورد ملامت نہیں اگر دنیا کی احبیت طبعی ہو تو مذموم نہیں بلکہ عقلی احبیت نہ ہونا چاہیے بلکہ یہ احبیت عقلیہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہونا چاہیے اور احبیت عقلیہ کا معیار یہ ہے کہ اطاعت احکام و جہاد فی سبیلہ میں کمی نہ ہو اگر یہ معیار محفوظ ہے تو پھر طبعی محبت اگر دنیا سے یا بیوی سے یا اولاد سے زیادہ بھی ہو تو کچھ ڈر نہیں۔

اگر ایک شخص اپنے بیٹے کے مرنے پر زیادہ روئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے واقعہ کو سن کر زیادہ نہ روئے تو مواخذہ نہ ہوگا۔ مواخذہ اس پر ہوگا کہ تزاحم دین و دنیا کے موقع پر دنیا کو دین پر ترجیح دے۔ اگر یہ نہ ہو بلکہ دنیا کی محبت و حرص کو دبا کر دین پر فدا کر دے۔ گو ترک دنیا سے حزن بھی ہو اور دل بھی دکھے تو اس پر مواخذہ تو کیا ہوتا اس سے تو ثواب بڑھے گا۔ کمال تقویٰ یہی ہے کہ دنیا کی حرص و محبت ہوتے ہوئے بھی اس کا مقابلہ کیا جائے۔ مولانا فرماتے ہیں:

شہوت دنیا مثال گلخن ست   کہ ازو حمام تقویٰ روشن ست

''دنیا کی طلب اور خواہش مثل انگھیٹی کے ہے کیونکہ اس سے تقویٰ کا حمام روشن ہے۔''

فرشتے اگر رشوت نہ لیں تو کیا کمال ہے ان کو مال کی حرص ہی نہیں، کمال اس سب جج کا ہے جس کے مدعی و مدعا علیہ دونوں نے الگ الگ سوا دو لاکھ روپے رشوت کے پیش کیے ا:زان سے ایک پیسہ نہ لیا اور غصے سے دونوں کو نکال دیا مگر بے علمی کے سبب ایک جہالت بھی کی کہ آپ نے دونوں پر غصہ ظاہر کر کے مقدمہ کو ایسا خراب کر دیا کہ دونوں پر ظلم ہو گیا، ظالم پر بھی، مظلوم پر بھی اور یہ بات ان سے اول کہہ دی تھی کہ اگر تم رشوت پیش نہ کرتے تو میں مقدمہ کو انصاف سے فیصل کرتا مگر اب

چونکہ دونوں نے رشوت سے مجھے تکلیف دی ہے میں ایسا فیصلہ کروں گا کہ دونوں کو یاد رہے گا۔

یہ تو ان کی جہالت تھی مگر سوا دو لاکھ روپیہ کا واپس کر دینا واقعی اس شخص کے حوصلہ کی بات تھی اگر وہ لے لیتا تو اس پر کیا جرم قائم ہوتا' کچھ بھی نہیں کیونکہ ایک فریق رشوت دیتا دوسرا نہ دیتا جب تو یہ احتمال تھا کہ شاید دوسرا مخبری کر دے اور جب دونوں رشوت دے رہے تھے تو یہ احتمال بھی نہ تھا اور کوئی مخبری کرتا بھی تو ثبوت کہاں سے لاتا کیونکہ رشوت کی رسید ہی نہیں ہوتی۔

اس پر مجھے مولانا غوث علی صاحب پانی پتی کا لطیفہ یاد آیا کہ ایک شخص نے اپنے بھائی کے واسطہ سے مولانا کے پاس دس روپیہ ہدیہ بھیجے اور بھائی سے کہہ دیا کہ رسید لیتے آنا۔ شاید بھائی پر اطمینان نہ ہوگا۔ اس نے مولوی صاحب کو دس روپیہ دے کر کہا کہ ان کی رسید لکھ دیجئے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ اپنے روپے واپس لے جاؤ کہیں رشوت کی بھی رسید ہوتی ہے اس نے پوچھا' حضرت! رشوت کیسی' یہ تو ہدیہ تھا' فرمایا کہ بلاغرض کسی کو کون دیتا ہے' تم لوگ ہم کو صرف اس خوشامد میں دیتے ہو کہ دنیوی حاجات میں اللہ تعالیٰ سے کچھ سفارش کر دیں تو یہ رشوت ہوئی یا ہدیہ ہوا' اس میں لطافت تو تھی مگر یہ بتلا دیا کہ ہدیہ وہ ہے جس میں سوائے تطییب قلب مہدی لہ کے اور کچھ مطلوب نہ ہو۔

میں کہہ رہا تھا کہ صرف حرص دنیا مطلوب نہیں بلکہ اس کے مقتضاء پر عمل کرنا مذموم ہے' غیر محقق شیخ اس میں غلطی کرے گا' اگر اس سے کوئی شخص حرص دنیا کی شکایت کرے گا تو وہ کوئی وظیفہ یا مراقبہ تجویز کر کے بتلا دے گا مگر محقق فوراً تسلی کر دے گا کہ حرص کا ہونا مضر نہیں بلکہ اس سے اجر بڑھتا ہے جب کہ عمل اس کے خلاف ہو بلکہ شرعاً وہ حرص حرص ہی نہیں جس کے مقتضاء پر عمل نہ ہو۔ حرص شرعی وہی ہے جس سے دنیا کو دین پر ترجیح ہونے لگے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی حقیقت کو خواب واضح فرمایا۔ جب آپ کے پاس خزائن کسریٰ فتح ہو کر آئے تو بڑا بھاری خزانہ تھا' میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ہزاروں برس سے یہ سلطنت قائم تھی اور ابتداء سے اس وقت تک ایک ہی سلسلہ خاندان میں چلی آ رہی تھی تو ایسی قدیم سلطنت کا خزانہ خود سمجھ لیجئے کہ کیا ہوگا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو دیکھ کر دعا کی اور عرض کیا اے اللہ! ہم یہ تو دعا نہیں کرتے کہ ہم کو مال کی محبت نہ ہو اور نہ یہ عرض کرتے ہیں کہ اس کے آنے کی ہم کو خوشی نہ ہو کیونکہ آپ کا ہی ارشاد ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ. (آل عمران آیت نمبر۱۴)

''خوشنما معلوم ہوتی ہے اکثر لوگوں کو محبت مرغوب چیزوں کی (مثلاً) عورتیں ہوئیں بیٹے

ہوئے لگے ہوئے ڈھیر ہوئے سونے اور چاندی کے نمبر (یعنی نشان) لگے ہوئے گھوڑے ہوئے (یا دوسرے) مویشی ہوئے اور زراعت ہوئی۔''

جب آپ نے اس کو ہمارے لیے مزین کر دیا ہے تو ہم کو اس سے محبت بھی ہوگی اور اس کے آنے سے خوشی بھی ہوگی بلکہ ہم یہ دعا کرتے ہیں کہ اس کی محبت کو اپنی رضا کا وسیلہ بنا دے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو بات فرمائی ہے واقعی یہ وہی کہہ سکتے ہیں۔ غیر محقق مشائخ بلکہ محققین بھی بہت سے یہ سمجھتے ہوں گے کہ جب مال مطلقاً مذموم ہے اور بعضے جاہل تو ڈینگیں مارا کرتے ہیں کہ ہم کو کیا پرواہ ہے سلطنت کی' کیا پرواہ ہے روپیہ پیسہ کی اور بعضے جنت سے بھی استغناء ظاہر کرتے ہیں مگر یہ سب باتیں اس وقت تک ہیں جب تک کھانے کو روٹی مل رہی ہے ورنہ حقیقت معلوم ہو جائے ان دعوؤں کی۔ بس کمال وہ ہے جس کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ظاہر فرمایا کہ مال کی احتیاج بھی ظاہر کی اس سے مسرت بھی ظاہر کی مگر اس کے ساتھ یہ دعا بھی کی کہ اے اللہ! اس کی محبت کو اپنی رضا کا ذریعہ بنا دیجئے۔

پس محبت مال مطلقاً مذموم نہیں بلکہ ایک درجہ اس کا مطلوب بھی ہے۔ مثلاً اتنی محبت جس سے مال کی حفاظت کا اہتمام ہو سکے مطلوب ہے کیونکہ مال کا ضائع کرنا حرام ہے اگر اتنی محبت بھی نہ ہوگی تو یہ مال کی بے قدری کرے گا اور اس کو ضائع و برباد کرے جس کی ممانعت اس حدیث میں آئی ہے: ''ان اللہ کرہ لکم قیل و قال و کثرۃ السوال واضاعۃ المال''[1] اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ محبت سے ہم کو انکار نہیں نہ یہ دعویٰ ہے کہ ہم کو اس کے آنے سے خوشی نہیں ہوئی۔ طبعاً محبت بھی ہے اور خوشی بھی ہے مگر عملاً وعقلاً دعا یہ ہے کہ اس کو اپنی مرضیات کا وسیلہ بنا دیجئے۔ اسی سے ''لایومن احدکم حتیٰ یکون اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما''[2] کا بھی حل ہو گیا کہ مراد احبیت عقلیہ ہے جس کی تفسیر اوپر جہاد فی سبیلہ میں گزر چکی ہے۔ خلاصہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حب عقلی سب سے زیادہ ہونا چاہیے جس کا معیار یہ ہے کہ احکام میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہو اور تعارض کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو دوسروں کے احکام پر ترجیح دی جائے۔ گو حب طبعی میں کمی ہو اور غور کرنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ طبعی محبت بھی ہر شخص مسلم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے ماں

---

[1] (مسند امام احمد بن حنبل ۴: ۲۴۹' جمع الجوامع للسیوطی: ۴۹۴۳' کنز العمال: ۴۴۰۲۸)

[2] (مسند احمد بن حنبل ۳: ۲۰۷' ۲۷۸' اتحاف السادۃ المتقین ۹: ۵۴۷' الترغیب والترھیب: ۴۳)

باپ واولاد وغیرہ سب سے ہی زیادہ ہے مگر اس کا ظہور خاص مواقع پر ہوتا ہے۔

چنانچہ مولانا مظفر حسین صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے ایک رئیس نے کہا کہ حضرت مجھے تو ایسا شبہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مجھے اپنے والد کی محبت ہے۔ مولانا نے اس وقت تو یہ جواب دیا کہ ہوگی' اس کے بعد عملاً اس شبہ کا یوں جواب دیا کہ باتوں باتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات اور کمالات وفضائل بیان کرنا شروع کیے جس سے اہل مجلس بہت محظوظ ہورہے تھے اور وہ رئیس صاحب بھی بہت مزے لے لے کر سن رہے تھے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہر مسلمان کو لذیذ معلوم ہوتا ہے اور جو ظالم کسی مسلمان کو یہ کہے کہ یہ ذکر رسولؐ سے منع کرتے ہیں اس سے بڑھ کر مفتری کوئی نہیں۔ ارے! ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی منع نہیں کرتا ہاں ضد رسولؐ سے منع کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اس طرح نہ ہو جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت ہو۔

جب مولانا نے دیکھا کہ رئیس صاحب بہت مزے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سن رہے ہیں تو درمیان میں دفعۃً فرمانے لگے کہ اچھا اس قصہ کو تو رہنے دیجئے اب میں کچھ آپ کے والد صاحب کے کمالات ومحاسن بیان کرتا ہوں کہ وہ بھی بڑے صاحب کمالات تھے۔ اس لفظ کے سنتے ہی رئیس کا رنگ بدل گیا اور کہا مولانا توبہ توبہ! میرے والد بھی کوئی چیز ہیں جن کا تذکرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کو قطع کرکے کیا جائے' نہیں' آپ پہلا ہی بیان جاری رکھئے۔ تو مولانا صاحب نے فرمایا کہ آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ میں والد صاحب کا تذکرہ کیوں ناگوار ہوا؟ آپ تو کہتے تھے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اپنے والد کی محبت معلوم ہوتی ہے۔ اب جو رئیس صاحب نے موازنہ کرکے غور کیا تو بے ساختہ کہنے لگے کہ مولانا! جزاکم اللہ تعالیٰ! آج آپ نے میرا شبہ حل کردیا۔ واقعی مجھے حضور ہی کے ساتھ محبت زیادہ ہے اور والد کے ساتھ اس محبت کے مقابلہ میں کچھ بھی محبت نہیں۔

بہرحال طبعی محبت بھی ہر مسلمان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے زیادہ ہے مگر تحقیق یہ ہے کہ طبعی محبت اگر کم ہو تو مضائقہ نہیں' عقلی محبت سب سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہونا چاہیے کہ بدون اس کے صرف محبت طبعیہ بھی کافی نہیں جیسا کہ بعض لوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے طبعی محبت تو زیادہ ہوتی ہے کہ آپ کی نعت میں قصیدے پڑھتے ہیں اور مولود کی مجلسیں قائم کرتے ہیں اور ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام وذکر سے مزا بھی آتا ہے مگر محبت عقلیہ سے

کورے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی مخالفت کرتے ہیں تو ان کی حالت اچھی نہیں ان کو اپنی اصلاح کرنا چاہیے۔

اور بعض لوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت عقلی تو ہوتی ہے کہ احکام کی مخالفت نہیں کرتے مگر محبت طبعی ان کو اپنے اندر کم معلوم ہوتی ہے اس لیے وہ پریشان ہوتے ہیں۔ سو میں ان کو اطمینان دلاتا ہوں کہ اول تو ان کو محبت طبعی بھی حاصل ہے ورنہ اس کے فقدان کا رنج ہی کیوں ہوتا! اور یہ فقدان کا گمان اس لیے ہوتا ہے کہ ابھی ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا دوسری محبتوں سے موازنہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ موازنہ کے وقت معلوم ہو جائے گا کہ واقعی طبعی محبت بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے زیادہ ہے جیسا کہ ان رئیس کے واقعہ میں ابھی میں نے بتلایا ہے۔ دوسرے یہ کہ طبعی محبت معلوم نہیں تو غیر مطلوب میں کمی ہونا کچھ مضر نہیں۔ ضرر تو یہ ہے کہ محبت مطلوبہ میں کمی ہو یعنی محبت عقلیہ میں اور تم بحمد اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ ہو پھر کیوں پریشان ہوتے ہو۔

اور یہاں سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہوگئی جو محض محبت طبعیہ کو کافی سمجھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ بریلی میں ایک دفعہ بعد نماز جمعہ میرا بیان ہوا جس میں "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ" (التوبہ آیت نمبر۱۱۹) "اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور (عمل میں) سچوں کے ساتھ رہو۔" کا بیان تھا اور تکمیل ایمان کی تاکید اور اہل کمال کی صحبت اختیار کرنے کی ترغیب تھی۔ مگر رات کو اسی جگہ اس کے خلاف بیان ہوا اور یہ کہا گیا کہ اے لوگو! تقویٰ کی ضرورت نہیں نہ نماز روزہ کی ضرورت ہے صرف محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت ہے پھر چاہے شراب پیو چاہے کچھ کرو تم ضرور جنت میں جاؤ گے اور یہ وہابڑے ہرگز ناجی نہیں۔

ان لوگوں نے میرے جلانے کو یہ بیان کیا تھا مگر احمقوں نے میرے جلانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی مخالفت کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح اطہر کو ایذاء دی۔ بھلا مجھے اس سے جلنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر جلیں گے تو وہی جہنم میں جلیں گے میں نے جو مضمون بیان کیا تھا اپنی طرف سے نہیں بیان کیا تھا بلکہ قرآن وحدیث سے بیان کیا تھا اس کی مخالفت کرنے سے میرا کیا نقصان ہوا۔ اگر نقصان ہوا تو انہی کو ہوا۔

پس یہ حالت البتہ افسوسناک ہے کہ محض محبت کا نام یاد کر لیا اور اطاعت کا وقت آیا تو احکام نبویہ کی صریح مخالفت کرنے لگے۔ غرض جو شخص احکام کا مطیع ہو اس کی محبت مقصودہ حاصل ہے۔ اب اگر بعض آثار میں کمی بھی ہو تو پریشان نہ ہونا چاہیے۔ بعض لوگوں کو اپنی نسبت محبت نہ ہونے کا

ایک اور واقعہ سے بھی وہم ہو جاتا ہے وہ یہ کہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف زیادہ کشش نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف کشش زیادہ ہوتی ہے اور بعض کو اس کے برعکس حالت سے خدا تعالیٰ کی محبت نہ ہونے کا وہم ہو جاتا ہے۔ سو یاد رکھو کہ یہ محض محبت طبعیہ کی کیفیات میں تفاوت ہے اور محبت عقلیہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کی دونوں شخصوں کو حاصل ہے یعنی جس کو اللہ تعالیٰ کی کشش زیادہ ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کم اور اس کو بھی جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کشش زیادہ ہے اور اللہ کی طرف کم اور یہ دھوکہ حضرت رابعہؒ کو بھی ہوا تھا انہوں نے بھی محبت طبعیہ و عقلیہ کے فرق کی طرف التفات نہیں کیا تھا۔

اس کا وقوع اس طرح ہوا کہ ایک دفعہ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تو خجلت کی وجہ سے آنکھیں نیچی کر لیں اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت نے میرے دل پر اتنا غلبہ کیا ہے کہ آپ کی محبت کی بھی جگہ نہیں چھوڑی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسلی فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ اے رابعہ خدا تعالیٰ سے محبت کرنا عین میرے ساتھ محبت کرنا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ سے محبت کرنے کا آپؐ نے حکم دیا ہے تو اس میں حکم رسولؐ ہی کی اطاعت ہے اور یہی محبت عقلیہ ہے۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ قرآن سے کفر کا سبب دو امر معلوم ہوتے ہیں۔ ایک غفلت عن الآخرت' دوسرے حب دنیا' پھر اس پر میں نے یہ کہا تھا کہ میں کسب دنیا سے منع نہیں کرتا بلکہ حب دنیا سے منع کرتا ہوں' پھر ترقی کر کے یہ کہا تھا کہ مطلقاً محبت دنیا سے بھی منع نہیں کرتا بلکہ احبیت دنیا سے منع کرتا ہوں پھر اور ترقی کر کے کہا تھا کہ احبیت دنیا سے مطلقاً منع نہیں کرتا بلکہ احبیت عقلیہ سے منع کرتا ہوں۔ اگرچہ طبعاً کسی کو دنیا سے زیادہ محبت ہو تو کچھ حرج نہیں مگر عقلاً ایسا نہ ہونا چاہیے۔ اس پر محبت طبعیہ و عقلیہ کی حقیقت بیان کرنے میں کلام طویل ہو گیا۔

بہرحال حب دنیا اور انہماک فی الدنیا سبب ہوا ہے اہل کفر کے کفر کا۔ یہود اسی واسطے ایمان نہ لا سکے کہ ان کو اندیشہ تھا کہ اب تو ہم پیر بنے ہوئے ہیں مسلمان ہو کر مرید ہو جائیں گے اور یہ ہدایا و نذرانے جواب ملتے ہیں بند ہو جائیں گے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مریدوں کو بعد میں اتنا کچھ ملا کہ ان پیروں کے باپ دادا کے خواب میں بھی نہ آیا ہوگا۔ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے کسریٰ و قیصر کے خزائن فتح کیے اور دنیا ان کے پیروں کی غلام باندی ہو گئی تو جس دنیا کی محبت نے ان کافروں کو ایمان سے روکا وہ بھی ایمان کی بدولت ان کو پہلے سے زیادہ مل جاتی اور

نہ بھی ملتی تو ان سے خدا تعالیٰ تو راضی ہو جاتے اور رضائے الٰہی وہ چیز ہے جس کے سامنے ساری دنیا کی بھی کوئی ہستی نہیں مگر اس کو تو وہ سمجھے جس کو آخرت کی فکر ہو۔ خیر کفار تو رضائے الٰہی کی اس لیے قدر نہ کر سکے کہ وہ آخرت سے غافل اور منکر تھے مگر ہم مسلمانوں کو کیا ہو گیا کہ باوجود اعتقاد آخرت کے پھر دنیا کو دین پر ترجیح دیتے ہیں اور رضائے الٰہی کی بے قدری کرتے ہیں۔

اس وقت اس بیان کو میں نے اس لیے اختیار کیا ہے کہ یہ بیان مستورات کی فرمائش سے ہو رہا ہے۔

عورتوں پر حب دنیا کا غلبہ

عورتوں پر حب دنیا کا بہت غلبہ ہے ان میں زیور اور کپڑے کی حرص بہت زیادہ ہے پھر حالت یہ ہے کہ جب چار عورتیں جمع ہو کر بیٹھیں گی تو صبح سے شام تک دنیا ہی کا چرچا رہے گا' دین کا ذکر ہی نہیں آتا' عورتیں خود غور کر کے دیکھ لیں گی کہ ان کی مجلسوں میں سے کتنی مجلسیں ایسی ہیں جن میں دین کا ذکر ہوتا ہو اور گو دنیا کا زیادہ تذکرہ کرنا بھی مباح ہے۔ جب کہ کوئی بات معصیت کی نہ کی جائے مگر اس مباح کی سرحد گناہ سے ملی ہوئی ہے جو شخص زیادہ مشغلہ دنیا کے تذکرہ کا رکھے گا وہ ضرور گناہ میں مبتلا ہو گا۔ حدیث میں آتا ہے:

الا ان لکل ملک حمی وان حمی اللّٰہ محارمہ ومن رتع حول الحمی یوشک ان یقع فیہ۔[1]

اور بزرگوں کا ارشاد ہے کہ مباحات بھی حول الحمی میں داخل ہیں۔ چنانچہ تجربہ بھی ہے اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کو زیادہ تر طاعات میں مشغول رہیں' مباحات میں بھی زیادہ انہماک نہ کرے اس لیے دنیا کا زیادہ تذکرہ کرنا کہ ساری مجلس میں اول سے آخر تک یہی ذکر ہو مقدمہ معصیت ضرور ہے اور اس کا منشاء وہی حب دنیا ہے جو آج کل عورتوں میں غالب ہے اسی لیے عورتیں بہت کم دیندار ہوتی ہیں اور جن مقامات کی عورتوں میں دینداری ہے وہ صرف اسی وجہ سے کہ ان میں حب دنیا کم ہے۔

ہمارے قرب میں پانی پت کی عورتیں بہت دیندار سنی جاتی ہیں ان میں بعض لڑکیاں قرآن کی حافظ ہیں اور بعضی سبعہ قرأت کی ماہر ہیں اور قرآن پڑھتی ہوئی تو قریب قریب سب ہی ہیں' نمازی بھی بہت زیادہ ہیں اور اس کے ساتھ دنیا کے اعتبار سے بھی خوشحال ہیں۔ ہر شخص کے یہاں تھوڑی بہت زمین ضرور ہے' کھانے پینے کی طرف سب بے فکر ہیں مگر یہ خوشحالی اس بات کی بدولت

---

[1] (مسند احمد بن حنبل ۴: ۲۷۱' السنن الکبریٰ للبیہقی ۵: ۲۶۴' ۳۳۴' مشکل الآثار للطحاوی ۱: ۳۲۳)

ہے کہ ان میں دنیا کی حرص زیادہ نہیں۔ وہاں کی مستورات جہاں تک سنا گیا ہے بہت سادگی سے رہتی ہیں یہاں تک کہ ان کی دلہنیں بھی گیروں کے کپڑے پہن لیتی ہیں اور قیمتی کپڑوں کی زیادہ حرص نہیں کرتیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ساری زمینداری زیور اور کپڑوں ہی میں نیلام ہو جاتی۔ چنانچہ جن قصبات کی عورتوں پر یہ مرض ہے وہاں افلاس آ چکا ہے، گھر اور زمین تک بنیے کے پاس رہن ہو چکا ہے۔ یہاں تو یہ حالت ہے کہ چاہے کھانے کو گھر میں کچھ بھی نہ ہو مگر برادری میں نکلنے کے لیے اطلس اور کمخواب کے کپڑے اور سونے کا زیور ضرور ہوتا کہ برادری میں عزت کی نظر سے دیکھی جائیں حالانکہ غریب آدمی قیمتی کپڑے پہن کر کچھ معزز نہیں ہو سکتا کیونکہ حقیقت حال سب کو معلوم ہے۔

کانپور میں ایک صاحب مجھ سے ملے جو لیسدار مغرق ٹوپی پہنے ہوئے تھے اور باقی لباس بھی نہایت شاندار تھا۔ میں سمجھا کہ شاید کوئی نواب یا بڑے درجہ کا رئیس ہوگا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میاں غالباً کانسٹیبل ہیں اور کل دس بارہ روپیہ تنخواہ ہے، مجھے خوب یاد ہے کہ تنخواہ معلوم ہوتے ہی وہ شخص میری نظروں سے گر گیا اور وہی لباس جس کی وجہ سے پہلے کچھ وقعت ہوئی تھی اس کی ذلت کا سبب بن گیا اور یہ ایسی بات ہے کہ جس کو اہل دنیا بھی محسوس کرتے ہیں۔

چنانچہ ایک موقع پر ایک غریب آدمی بڑی شان و شوکت کا لباس پہن کر کلکٹر کے پاس ملازمت کی تلاش کو گئے اور ایک رئیس کو سفارش کے لیے ساتھ لے گئے۔ کلکٹر کو تحقیق سے معلوم ہوا کہ لیاقت کچھ بھی نہیں، اس نے صاف کہا کہ بڑی نوکری کی لیاقت نہیں اور چھوٹی نوکری ان کی شان کے خلاف ہے اس لیے نہایت حقارت کے ساتھ جواب دے کر نکال دیا۔

افسوس! ان لوگوں کو اتنی بھی خبر نہیں کہ جس چیز کے لیے یہ اپنی زمین اور جائیداد کو برباد کرتے ہیں وہ اس کو کھو کر حاصل نہیں ہو سکتی۔ زمیندار خوشحالی آدمی چاہے کیسے ہی معمولی لباس میں ہو اس کی عزت ہوتی ہے اور زمین و جائیداد کھو کر چاہے کوئی کتنا ہی قیمتی لباس پہن لے اس کی عزت نہیں ہوتی۔ ہاں! اگر کوئی دوسرا عزت کا سبب پیدا ہو جائے تو اور بات ہے۔ مثلاً ملازمت بڑے عہدہ کی مل جائے یا اس کو کوئی کمال حاصل ہو جائے مگر مسلمانوں کو آج کل ملازمت کا ملنا تو شرائط ملازمت حاصل نہ کرنے سے دشوار ہو گیا اور کوئی کمال بھی حاصل نہیں کرتے۔ پھر محض لباس سے عزت کیونکر ہو سکتی ہے اور ملازمت کسی کو ملتی بھی ہے تو وہ اس میں بھی ذلت کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ نوکری تو میاں کی پچاس روپیہ کی اور شان بتاتے ہیں پانچ سو روپیہ کے ملازم کی سی اور اگر کہیں تنخواہ کی قلت کی قلعی کھل جائے تو اس پر دوسری قلعی چڑھا کر حقیقت کو چھپایا جاتا ہے۔

چنانچہ عورتوں کی ایک کمیٹی میں اپنے اپنے شوہروں کی تنخواہ کا ذکر ہو رہا تھا' کسی نے کہا کہ میرے میاں کی تنخواہ سو ہے کسی نے کہا دو سو ہے' ایک غریب عورت بھی وہاں موجود تھی جو زیور اور لباس میں کسی سے کم نہ تھی۔ اس سے جو پوچھا تیرے میاں کی تنخواہ کیا ہے؟ تو وہ یہ کہتے ہوئے شرمائی کہ بیس روپیہ ہے اور جھوٹ بولنے میں بھی رسوائی کا اندیشہ ہوا تو آپ کیا کہتی ہیں کہ تنخواہ تو بیس ہی روپیہ ہے مگر ماشاء اللہ اوپر کی آمدنی بہت ہے۔ ایک عورت نے کہا کم بخت توبہ کر' حرام کی آمدنی پر ماشاء اللہ کہتی ہے' کفر ہو جائے گا' ایمان جاتا رہے گا۔

تفکر کی ضرورت

میں سچ کہتا ہوں کہ جو لوگ دنیا کے طالب اور اس میں منہمک ہیں وہ اس کی صحیح حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔ حقیقت معلوم نہ ہونے سے ہی اس پر فریفتہ ہو رہے ہیں اگر اس کی حقیقت معلوم ہو جائے تو سخت نفرت ہو جائے اس کی ایسی مثال ہے جیسے پاخانہ پر چاندی کے ورق لگے ہوئے ہیں اور کوئی اس کو حلوہ سمجھ کر تاک میں بیٹھا ہو یا کسی چڑیل بڑھیا کو لال ریشمی لباس پہنا دیا گیا ہو اور نقاب سے منہ ڈھانپ دیا گیا ہو اور کوئی اس کو حسین خوبصورت سمجھ کر محبت کا دم بھرنے لگے۔ مگر جب برقع اٹھے گا اس وقت اس محبت کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔

بس قامت خوش کہ زیر چادر باشد　　چوں باز کنی مادر مادر باشد

"نقاب کی بناء پر خوش ہے کہ کوئی خوش شکل ہوگی مگر جب نقاب اٹھا تو معلوم ہوا کہ یہ تو نانی کی ہم عمر ہے۔"

کسی کا قطعہ ہے:

عارفے خواب رفت درفکرے　　دید دنیا بصورت بکرے
کرد ازوے سوال کاے دلبر　　بکر چونی بایں ہمہ شوہر
گفت یک حرف باتو گویم راست　　کہ مرا ہرکہ بود مردنخواست
وانکہ نامرد بود خواست مرا　　زاں بکارت ہمیں بجاست مرا

یعنی ایک عارف نے دنیا کو خواب میں دیکھا کہ بڑھیا ہے مگر ابھی تک باکرہ۔ انہوں نے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ تو نے اتنے خصم کئے اور اب تک کنواری ہی رہی' کہا جو مرد تھے انہوں نے مجھے منہ نہیں لگایا اور جو میرے عاشق تھے وہ نامرد تھے' ان کو میں نے منہ نہیں لگایا' اس لیے اب تک کنواری ہی ہوں۔ واقعی دنیا تو اس وقت بوڑھی ہوگی جوان کہاں سے رہی۔ ہزاروں برس کی عمر ہو چکی ہے مگر ہم لوگ اس پر جان دے رہے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ بڑی حسین نوجوان ہے۔

صاحبو! آپ تو دنیا کو برقع کے اوپر سے دیکھ کر اس کے عاشق ہو گئے ہو اور اہل اللہ نے برقعہ اٹھا کر اسے دیکھا ہے اس لیے وہ نفرت کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک تفسیر ہے اس آیت کی: "لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ" (البقرہ آیت نمبر ۲۱۹، ۲۲۰) کہ دنیا و آخرت کی حقیقت میں تفکر کرو۔ دونوں کو برقع کھول کر دیکھو تو تم کو دنیا سے نفرت اور آخرت کی طلب ہو جائے گی۔ دنیا ظاہر میں محاسن سے مزین ہے مگر اندر گوہ موت اور سانپ بچھو بھرے ہوئے ہیں اور آخرت ظاہر میں مکارہ و مصائب سے گھری ہوئی ہے مگر اندر سے نہایت حسین دلفریب محبوبہ ہے جس کی ایک نگاہ کے سامنے سلطنت ہفت اقلیم بھی کوئی چیز نہیں، ہم کو الزام دیا جاتا ہے کہ یہ لوگ دنیا سے واقف نہیں ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ واللہ! ہم تم سے زیادہ دنیا سے واقف ہیں کیونکہ ہم کو تو تفکر فی الدنیا کا امر ہے ہم تو اس میں خوب غور و تامل کرتے ہیں یہاں تک کہ اس کی حقیقت سے بھی واقف ہو گئے تم خاک واقف ہو کہ محض برقع کے اوپر سے زینت دیکھ کر عشق کا دم بھرنے لگے۔

پس ہم دنیا سے بے توجہی کی تعلیم نہیں دیتے بلکہ یوں کہتے ہیں کہ دنیا کی حالت پر ضرور توجہ کرو مگر کامل توجہ کرو جس سے حقیقت منکشف ہو۔ ناتمام توجہ نہ کرو کہ ظاہر ہی تک رہ جاؤ۔ چنانچہ اس آیت میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے جس کو میں نے بیان کے لیے اختیار کیا ہے حق تعالیٰ نے اس میں سبب کفر یہی بتلایا ہے۔ "يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" (الروم آیت نمبر ۷) کہ کفار کو دنیا کی صرف ظاہری حالت کا علم ہے اس لیے وہ ایمان سے رکے ہوئے ہیں یعنی اگر حقیقت دنیا کا علم ہو جاتا تو یہ حالت نہ ہوتی۔ تو یہاں بھی ظاہر دنیا کے علم کو مذموم کہا گیا ہے۔ حقیقت کے علم کو مذموم نہیں کہا گیا اور حقیقت دنیا کا علم اہل دنیا کو حاصل نہیں صرف اہل دین ہی کو حاصل ہے۔

اور یہ مضمون اس مضمون کی نظیر ہے جو میں نے لکھنؤ کے ایک وعظ میں بیان کیا تھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ علماء ترقی سے منع کرتے ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے اور ہم پر بہتان ہے ہم ترقی سے کیونکر منع کر سکتے ہیں جب کہ قرآن میں حق تعالیٰ نے ہم کو ترقی کا حکم فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: "فَاسْتَبِقُوْا الْخَيْرَاتِ" کہ "خیر میں باہم سبقت کرو اور یہی ترقی کا حاصل ہے۔" پس ترقی تو ہمارے نزدیک فرض ہے اور اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ علماء تم سے زیادہ ترقی کے حامی ہیں کیونکہ تم نے آج تک اس کو فرض شرعی نہ کہا تھا نہ اس کی فرضیت کو قرآن سے ثابت کیا بلکہ تم محض اقتصادی اور تمدنی مصالح کی بناء پر اس کے حامی ہو۔ پس ترقی کے ضروری ہونے میں تو کسی کو اختلاف نہ رہا صرف اختلاف اس بات میں ہے کہ ہم ترقی کے لیے اتنی قید بڑھاتے ہیں کہ خیر میں ترقی ہونا چاہیے

اور آپ یہ قید نہیں بڑھاتے مگر اس قید کے ضروری ہونے سے آپ کو بھی انکار نہیں ہوسکتا۔

اول تو یہ قید خود نص میں موجود ہے۔ یعنی "فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ" (البقرہ آیت نمبر ۱۴۸) "سو تم نیک کاموں میں تگاپو کرو"۔ دوسرے خیر کا مقابل شر ہے اور ترقی فی الشر کو کوئی عاقل مطلوب نہیں کہہ سکتا۔ اب اختلاف صرف اس میں رہا کہ جس ترقی کے آپ حامی ہیں وہ خیر ہے یا نہیں؟ آپ ترقی درہم کے حامی ہیں خواہ دین سلامت رہے یا نہ رہے اور ہم بدون سلامت دین کے ترقی درہم کو ترقی ورم سمجھتے ہیں۔

جس شخص کے بدن پر ورم ہو جائے ظاہر میں وہ بھی ترقی یافتہ ہے مگر حقیقت میں وہ تنزل کی طرف جا رہا ہے۔ یہ حال بدون دین کے ترقی ورم کا ہے۔ پس یوں نہ کہو کہ علماء ترقی سے مانع ہیں بلکہ یوں کہو کہ وہ خاص صورت کی ترقی کے مانع ہیں جو ترقی ورم کے مشابہ ہے ورنہ فی نفسہ مطلق ترقی کے تو وہ تم سے زیادہ حامی ہیں۔

اسی طرح میں یہ کہتا ہوں کہ ہم توجہ الی الدنیا سے منع نہیں کرتے بلکہ دنیا کی طرف ناتمام توجہ سے منع کرتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ دنیا کی حالت میں کامل توجہ کرو جس سے اس کی حقیقت واضح ہو جائے اور ہم توجہ الی الدنیا سے کیونکر منع کر سکتے ہیں جب کہ نص میں تفکر فی الدنیا کا امر ہے۔ چنانچہ اہل اللہ نے دنیا کی حالت میں کامل توجہ کی ہے اور اس کی حقیقت سمجھ کر اس کو بتلایا۔

چنانچہ ایک بزرگ کا ارشاد ہے: "حلالها حساب و حرامها عذاب" کہ دنیا کی حالت یہ ہے کہ اسکا حلال حصہ تو حساب سے خالی نہیں اور حرام پر عذاب ہوگا تو کوئی جز کلفت سے خالی نہ ہوا۔

اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے کہ دنیا کی تمام لذتیں ماکولات و مشروبات و ملبوسات و نساء میں منحصر ہیں اور ماکولات میں سب سے افضل شہد ہے اور وہ ایک مکھی کی قے ہے اور مشروبات میں سب سے افضل پانی ہے جس میں خنزیر تک بھی آدمی کا شریک ہے اور ملبوسات میں سب سے بہتر حریر ہے جو ایک جانور کا لعاب ہے اور نساء کی یہ کیفیت (یہ مضمون نساء کے متعلق مستورات کے حاضر ہونے کے سبب بیان نہ کیا تھا نظر ثانی میں بڑھا دیا گیا ۱۲ منہ) ہے کہ "ترهن لاحسن مواضعها ويعتمد منها انتن مواضعها" یہ باتیں ہیں جن پر غور کرنے سے دنیا کی حقیقت دوسروں پر بھی واضح ہوتی ہے۔

اور ایک بزرگ کا ارشاد امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ دنیا آخرت کے مقابلہ میں تو قابل نفرت ہے لیکن اس سے قطع نظر وہ خود اپنی حالت ذاتیہ پر نظر کر کے بھی قابل نفرت ہے کیونکہ

طالب دنیا کوئی راحت میں نہیں ہے۔

دنیادار پریشانی سے خالی نہیں

صاحبو! تم دنیاداروں کی ظاہری ٹیپ ٹاپ کو نہ دیکھو بلکہ ان کی اندرونی حالت کو ان کے پاس رہ کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ کوئی بھی پریشانی سے خالی نہیں اور طالب آخرت سب کے سب راحت میں ہیں چنانچہ ان کی یہ حالت ہے:

نہ باشتر برسوارم نہ چواشتر زیر بارم   نہ خداوند رعیت نہ غلام شہر یارم

''نہ میں اونٹ پر سوار ہوں نہ ہی اونٹ کی طرح بوجھ کے نیچے دبا ہوا ہوں۔''

دنیا والوں کو کہیں بچہ کا غم ہے کہیں بیوی کا کہیں تنگدستی کا کہیں مقدمہ بازی کا کہیں زمینداری کا کہیں شادی اور غمی کی رسموں کا اور اہل اللہ کو کچھ بھی غم نہیں' میں یہ نہیں کہتا کہ ان کو بیوی بچہ کا تنگدستی کا حادثہ پیش نہیں آتا' ان کو بھی یہ واقعات پیش آتے ہیں اور ان کے منہ سے بھی آہ نکلتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی وہ اندر سے خوش بھی ہوتے ہیں۔ شاید تم کہو کہ یہ دونوں باتیں کیونکر جمع ہوسکتی ہیں تو میں کہوں گا کہ ان دونوں باتوں کو تو ایک معمولی شفاخانہ میں جمع کر کے دکھلا دیتا ہے۔ کسی مریض کے دمل ہو اور ڈاکٹر کسی مصلحت سے بغیر کلوروفام سنگھائے اس کا آپریشن کرے تو وہ اس وقت روئے گا بھی' چلائے گا بھی' آہ بھی کرے گا مگر بعد میں ڈاکٹر کو پچاس روپیہ نذرانہ اور انعام کے بھی دے گا تو دیکھئے! اس شخص نے آہ بھی کی اور رویا چلایا بھی اور دل سے ان سب باتوں پر خوش بھی تھا جبھی تو ڈاکٹر کو فیس اور انعام دیا۔ اسی طرح اہل اللہ کی حالت ہے یہ زندہ مثال ہے تکلیف ظاہری اور محبت حق کے جمع ہوجانے کی۔ محقق دونوں کو جمع کر کے دکھلا دیتا ہے اور بیچارہ غیر محقق ایسے موقع پر گھبرا کر یوں کہنے لگتا ہے:

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ   بازمیگوئی کہ دامن ترمکن ہوشیار باش

''درمیان دریا میں تختہ باندھ کر دیا پھر کہتے ہیں خبردار دامن تر نہ ہو۔''

یہ شعر اصل میں ایک عربی شعر کا ترجمہ ہے۔

القاہ فی الیم متکوفا و قال لہ   ایاک ایاک ان تبتل بالمّا

علامہ شعرانی نے لکھا ہے کہ حضرت حق سبحانہ کی شان میں اس شعر کا پڑھنا حرام ہے کیونکہ حق تعالیٰ وسعت سے زیادہ کسی کو تکلیف نہیں دیتے جیسا اس شعر میں تکلیف مالا یطاق کا الزام دیا گیا ہے اور محقق جو تکلیف و رضا کو جمع کر لیتا ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ عقلاً خوش ہوتا ہے اور

طبعاً متالم ہوتا ہے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

ناخوش تو خوش بود بر جان من   دل فدائے یار دل رنجان من

''محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ طبیعت کو ناخوش ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں۔''

تکلیف کی بات سے طبعاً تکلیف ضرور ہوتی ہے مگر عقلاً اس وجہ سے کہ:

ہرچہ از دوست می رسد نیکوست

(دوست کی طرف سے جو پہنچے اسی میں خیر ہے)

شیریں ہو جاتی ہے پس یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے کہ طالبان دنیا پریشانی میں ہیں اور طالبان آخرت راحت میں ہیں۔

مطلوبیت دنیا کے درجات

صاحبو! تم بھی ان حضرات کی طرح باطن دنیا میں تامل کرو۔ اس آیت میں بھی ظاہر کی قید بڑھا کر باطن پر نظر کرنے کی طرف اشارہ ہے اور خلاصہ اس نظر باطن کا یہ ہے کہ دنیا میں اس کی مطلوبیت کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک مطلوبیت اس کے صفات کے اعتبار سے، دوسرے مطلوبیت اس کی غایت کے اعتبار سے تو صفت کے اعتبار سے تو دنیا کی یہ حالت ہے کہ وہ فانی ہے اور آخرت فانی ہے اور پائیدار کے مقابلہ میں ناپائیدار قابل رغبت نہیں ہوا کرتا اور غایت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس چیز کے لیے لوگ دنیا کو طلب کرتے ہیں وہ بھی دنیا سے حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ وہ بھی دین ہی سے حاصل ہوتی ہے۔

اب سمجھئے کہ دنیا کو کس چیز کے لیے طلب کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عیش آرام کے لیے طلب کیا جاتا ہے۔ اب غور کیجئے کہ عیش آرام کس چیز کا نام ہے۔ بعض لوگ عمدہ لباس، عمدہ مکان اور عمدہ غذا کو عیش آرام سمجھتے ہیں مگر یہ تو اسباب آرام ہیں اور عیش و آرام کی حقیقت کچھ اور ہے۔

دیکھئے اگر کسی کو پھانسی کا حکم ہو جائے اور یہ سب اسباب بھی اس کو میسر ہوں تو کیا اس کو ان اسباب سے کچھ خوشی ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں اور اگر کسی بے آئین سلطنت میں اس کو اجازت دی جائے کہ چاہے تم اپنا کوئی عوضی پھانسی کے لیے دے دو خواہ خود پھانسی پر لٹک جاؤ اور یہ شخص اعلان کر دے کہ جو شخص میری طرف سے پھانسی پر لٹکنا منظور کرے میں اس کو اپنی تمام جائیداد اور مال دیدوں گا تو بتلاؤ کیا کوئی غریب سے غریب بھی پھانسی کو گوارا کر لے گا؟ ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں کرے گا۔

پس معلوم ہوا کہ یہ اسباب حقیقت دنیا نہیں بلکہ صورت دنیا ہے اور حقیقت کچھ اور ہے یعنی

راحت قلب اور ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ راحت قلب طلب دین ہی سے حاصل ہوتی ہے طلب دنیا سے حاصل نہیں ہوتی۔ اہل اللہ میں جو حضرات محبوبانہ شان میں رکھے جاتے ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے شاہانہ لباس وغذا سے اور کثرت معتقدین سے نوازا ہے میں ان کا ذکر نہیں کرتا بلکہ جن دینداروں کی یہ حالت ہے کہ مدفوع علی الابواب ہیں جوتے بھی درست نہیں لباس بھی شکستہ ہے، میں ان کی نسبت دعویٰ سے کہتا ہوں کہ وہ بھی راحت قلب میں دنیا داروں سے بڑھے ہوئے ہیں ان کی یہ حالت ہے کہ "**رب اشعت اغبر مدفوع علی الابواب لو اقسم علی اللّٰہ لابرہ**" ان کو خدا پر ایسا ناز ہوتا ہے کہ اگر وہ کسی بات پر قسم کھا بیٹھیں کہ یہ اس طرح ہوگی تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا کر دیتے ہیں۔ اسی کو عارف شیرازیؒ فرماتے ہیں:

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں — کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

"میں گدائے میکدہ کہ مستی کے وقت دیکھوں کہ فلک پر ناز اور ستارہ پر حکم کرتا ہوں۔"

وہ اپنی ایسی حالت شکستگی میں خوش اور مگن ہیں۔ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ جب کوئی فقر و فاقہ کی شکایت کرتا تو فرماتے کہ تم اس دولت کی قدر کیا جانو، تم کو مفت میں یہ دولت مل گئی ہے اس کی قدر ابراہیم بن ادھم سے پوچھو جس نے سلطنت کو چھوڑ کر فقر و فاقہ خریدا ہے۔ وہ دنیا کی تکالیف کو تکلیف ہی نہیں سمجھتے اور یوں کہتے ہیں:

ناخوش تو خوش بود بر جان من — دل فدائے یار دل رنجان من

"محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ طبیعت کو ناخوش ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں۔"

عارف شیرازیؒ فرماتے ہیں:

خرم آں روز کزیں منزل ویران بروم — راحت جاں طلبم وز پے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے — تا در میکدہ شاداں و غزل خواں بروم

"وہ دن بہت اچھا ہوگا کہ اس ویرانہ مکان (دنیا) سے جاؤں، جان کو آرام مل جائے اور محبوب کے دیدار کیلئے چلا جاؤں میں نے نذر کی ہے کہ اگر یہ دن نصیب ہو تو خوش و خرم اور غزل پڑھتا ہوا جاؤں۔"

اب بتلائیے جو موت سے بھی ایسا خوش ہو وہ دوسری کسی کلفت سے کیا پریشان ہوگا۔ پھر یہ محض باتیں ہی نہیں بلکہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی موت کے وقت انکی حالت یہی ہوتی

ہے۔ایک بزرگ جونقشبندی ہیں جن پر سکون غالب ہوتا ہے چشتی بھی نہ تھے کہ مغلوب ہوں انہوں نے مرتے ہوئے یہ وصیت کی کہ ہمارے جنازہ کیساتھ ایک خوش آواز یہ قطعہ پڑھتا ہوا چلے:

مفلسا نیم آمدہ درکوئے تو　　　شیأ للہ از جمال روئے تو

دست بکشا جانب زنبیل ما　　　آفریں بردست و برباز روئے تو

''آپ کے دربار میں ہم مفلس ہوکر آئے ہیں اپنے جمال کے صدقہ میں کچھ عنایت کیجئے ہماری زنبیل کی طرف ہاتھ بڑھائے آپ کے دست وبازو پر آفرین ہے۔''

اگر کوئی چشتی ایسی وصیت کرتا تو غلبہ کی تاویل بھی ہوسکتی تھی کیونکہ سوختن افروختن ان کا حصہ ہے۔

اہل اللہ موت سے نہیں گھبراتے

مگر حق یہ ہے کہ اس بات میں اہل اللہ سب ہی کا یہی مذاق ہے کہ وہ موت سے نہیں گھبراتے۔ آخر کچھ تو بےفکری تھی جو ایسی وصیت سوجھی۔شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ مرنے کے بعد ان کو کسی کے شعر پڑھنے سے کیا مزہ آیا ہوگا تو واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو مرنے کے بعد بھی مزہ آتا ہے۔چنانچہ حضرت سلطان نظام الدینؒ کے جنازہ کے ساتھ ایک مرید فرط حزن میں یہ اشعار پڑھ رہا تھا۔

سروسیمینا بصحرامی روی　　　سخت بے مہری کہ بے مامی روی

اے تماشا گاہ عالم روئے تو　　　تو کجا بہر تماشا می روی

''اے محبوب آپ جنگل جارہے ہیں سخت بے مہری کہ بغیر ہمارے جارہے ہیں'اے محبوب آپ کا رخ انور جہاں کا تماشا گاہ ہے' آپ تماشا کے لیے کہاں جارہے ہیں۔''

شیخ کے انتقال پر مریدین کی جو حالت ہوتی ہے وہ ظاہر ہے۔اس شخص نے اسی حالت میں یہ اشعار پڑھے تھے۔دفعتہً حضرت سلطان جی کا ہاتھ کفن میں بلند ہوگیا۔جیسا کہ وجد کی حالت میں ہوا کرتا ہے۔لوگوں نے اس مرید کو روکا کہ اشعار پڑھنا بند کرو۔نہ معلوم کیا سے کیا ہوجائے گا'پھر کچھ دیر کے بعد ہاتھ کفن میں سیدھا ہوگیا۔یہ تو موت سے پہلے اور موت کے بعد متصل کی حالت تھی اور برزخ کی حالت کے بارے میں ایک بزرگ فرماتے ہیں:

گرنکیر آید و پرسد کہ بگورب تو کیست　　　گویم آں کس کہ ربودایں دل دیوانہ ماہ

''اگر منکر نکیر آئیں اور پوچھیں کہ تمہارا رب کون ہے تو میں کہوں گا جو ہمارا دل چھین کر لے جارہا ہے ہمارا رب ہے۔''

ان حضرات کو پھر غم کیوں ہو اور بعض تفاسیر پر موت کے قریب کی حالت خود نص میں مذکور ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَنْ لَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ وَلَكُمْ فِیْهَا مَاتَشْتَهِیْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِیْهَا مَاتَدَّعُوْنَ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ. (حٰم السجدہ: ۳۰،۳۱،۳۲)

''اور جن لوگوں نے (دل سے) اقرار کرلیا کہ اللہ ہمارا رب ہے پھر (اس پر) مستقیم رہے ان پر فرشتے اتریں گے کہ تم اندیشہ نہ کرو اور نہ رنج کرو اور تم (جنت) کے ملنے پر خوش رہو جس کا تم سے (پیغمبروں) کی معرفت وعدہ کیا جاتا تھا اور ہم تمہارے رفیق تھے دنیاوی زندگی میں اور آخرت میں بھی رہیں گے اور تمہارے لئے اس (جنت) میں جس چیز کو تمہارا جی چاہے گا موجود اور جو تمہارے لیے جو مانگو گے موجود ہے۔ یہ بطور مہمانی کے ہوگا غفور رحیم کی طرف سے۔''

کہ فرشتے ان کو بشارتیں سناتے ہیں اور مطمئن و بے فکر کردیتے ہیں اس کے بعد قیامت ہے سو ان کے حق میں وہ بھی فکر کی چیز نہیں۔ چنانچہ منصوص ہے: ''لَایَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ''۔ (الانبیاء آیت نمبر ۱۰۳) ''ان کو بڑی گھبراہٹ (یعنی نفخہ ثانیہ سے زندہ ہونے کی) غم میں نہ ڈالے گی اور (قبر سے نکلتے ہی) فرشتے ان کا استقبال کریں گے'' حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ سے میں نے اس معنی میں ایک شعر سنا ہے۔ فرماتے تھے:

عاشقاں رابا قیامت روز محشر کار نیست عاشقاں راجز تماشائے جمال یار نیست

''اللہ کے عاشقوں کو روز محشر کوئی کام نہ ہوگا' اللہ کے عاشقوں کو سوائے محبوب کے تماشا جمال کے کوئی شغل نہ ہوگا۔''

اب بتلایئے! جس کے نزدیک روز محشر جلوہ دیدار محبوب کا دن ہو اس کو قیامت سے کیا پریشانی ہوگی؟ کچھ بھی نہیں۔ مولانا رومی نے مثنوی میں لکھا ہے کہ اہل اللہ جب جہنم کے اوپر سے پار ہو کر جنت میں پہنچ جائیں گے تو باہم کہیں گے کہ ہم نے سنا تھا کہ پل صراط جہنم کے اوپر ہے مگر ہم کو تو راستہ میں جہنم نظر نہیں پڑا تو فرشتے کہیں گے کہ تم نے راستہ میں ایک باغ دیکھا تھا؟ کہیں گے ہاں' باغ تو دیکھا تھا فرشتے کہیں گے کہ وہی جہنم تھا' تمہارے اعمال کی برکت سے وہ باغ کی صورت میں تم کو نظر آیا' تو ان کے لیے تو جہنم بھی آتش خلیل کی طرح گلزار ہو جائے گا' پھر ان سے

زیادہ راحت میں کون ہوگا۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب مسلمان پل صراط پر سے گزریں گے تو جہنم مؤمن سے کہے گا:

جزیا مؤمن فان نورک اطفاء ناری.[۱]

اے مسلمان! جلدی سے آگے بڑھ جا' تیرے نور نے تو میری آگ ہی کو بجھا دیا۔ اس کی تفسیر میں بعض نے فرمایا ہے کہ جیسے مؤمن جہنم سے پناہ مانگتا ہے ایسے ہی جہنم بھی مؤمن سے پناہ مانگتا ہے تو جس سے جہنم بھی پناہ مانگے جو رأس العموم ہے اس کی خوشی کی کیا حد ہوگی اور واقعی جہنم کو مؤمن سے پناہ مانگنا چاہیے کیونکہ مؤمن میں اور جہنم میں کوئی مناسبت نہیں اور جہاں مناسبت نہ ہو وہاں تو طرفین اسے اعراض ہی ہوگا۔ اس مضمون کو ایک شاعر نے دوسرے رنگ سے بیان کیا ہے:

میں جو ہوں قابل دوزخ تو گناہوں کے سبب   لیک دوزخ نے کیا کیا جو مرے قابل ہے

یعنی جہنم نے کیا قصور کیا جو مجھے اس کے اندر بھیجا گیا' واقعی مسلمان بھی عجیب چیز ہے کہ دوزخ سے وہ بُعد چاہتا ہے اور دوزخ اس سے بُعد چاہتی ہے۔

دولت ایمان قابل قدر ہے

صاحبو! اس دولت ایمان کی قدر کرو۔ اس تفصیل سے معلوم ہوگیا کہ اہل اللہ سے بڑھ کر راحت قلب کسی کو حاصل نہیں اور یہی روح ہے دنیا کی۔ تو معلوم ہوا کہ طالبان دنیا کو دنیا سے کچھ بھی حصہ نہیں ملا۔ وہ تو محض ظاہری اسباب کو لئے بیٹھے ہیں اور روح دنیا ان ہی لوگوں کو حاصل ہے جن کو تم تارک دنیا کہتے ہو۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ روح دنیا طلب دنیا سے نہیں ملتی بلکہ ترک دنیا سے ملتی ہے پھر حیرت ہے کہ لوگ ایسی چیز کے عاشق ہیں جس کے ملنے کا طریقہ یہی ہے کہ اس سے نفرت کی جائے' محبت نہ کی جائے۔

یہ تو اس کا اثبات تھا کہ دنیا کی راحت اہل اللہ ہی کو میسر ہے باقی رہا کہ یہ کیا ہے راز ان کی اس راحت کا؟ سو وہ یہ ہے کہ اہل اللہ اپنے لئے کوئی حالت تجویز نہیں کرتے کیونکہ تجویز کرنا دعویٰ ہے ہستی کا کہ ہم بھی کچھ ہیں اور ہماری تجویز بھی کوئی چیز ہے اور ان کا مذاق فناء محض ہے وہ اپنے کو مٹا چکے یعنی اپنے ارادہ اور تجویز کو فنا کر چکے ہیں۔ جیسا فرماتے ہیں:

خود ثنا کردن زمن ترک ثناست   ایں دلیل ہستی و ہستی خطاست

''وہ تو اپنی طرف سے ثناء بھی نہیں کرتے کہ یہ بھی ہستی کی دلیل ہے کہ ہم حق تعالیٰ کی ثناء

[۱] (لم أجده فی "موسوعة أطراف الحديث النبوی الشريف")

کریں، ہم ہیں کیا چیز جو ان کی ثناء کر سکیں۔"

رہا یہ شبہ کہ پھر اہل اللہ کے کلام میں حق تعالیٰ کی ثناء کیوں ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں ثناء کی ہے۔ اس کا جواب اہل اللہ نہیں دے سکتے۔ صوفیاء نے اس کا جواب حدیث سے دیا ہے کہ عارف "بی یسمع وبی ینطق وبی یبصر"[1] کے درجہ میں ہوتا ہے اس لیے وہ ثناء اس کی طرف منسوب نہیں ہوتی بلکہ حق تعالیٰ ہی ثناء کرتے ہیں جیسے شجرۂ طور سے آواز آئی تھی۔ "اِنِّیٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ" تو کیا شجرۂ اپنے آپ کو رب العالمین کہہ رہا تھا؟ ہرگز نہیں بلکہ کوئی اس سے کہلوا رہا تھا اور کہنے والا دوسرا تھا۔

کاش! اگر اہل افتاء منصور کے انا الحق کو بھی شجرہ طور کے انا اللہ پر قیاس کرتے تو وہ بے چارے دار پر نہ کھینچتے۔ مگر علماء یہ سمجھے کہ شجرۂ طور غیر عاقل تھا اور منصور عاقل ہیں حالانکہ وہ محض ناقل تھے۔ جیسے عدالت کا اردلی مقدمہ والوں کے پکارنے میں محض ناقل ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑے رئیس کا نام لے کر پکارتا ہے کہ فلاں ولد فلاں حاضر ہے۔ اس وقت کوئی اس کی بات سے ناراض نہیں ہوتا کیونکہ جانتے ہیں کہ یہ خود نہیں کہہ رہا بلکہ نقل کر رہا ہے اور دوسرے وقت میں اس کو کیا مجال ہے جو رئیس کے سامنے آ بھی سکے اور بول بھی سکے اور نام لینا تو در کنار اور نام لے کر پکارنا تو بڑی بات ہے۔

ایسے ہی اہل اللہ ثناء الٰہی کے وقت ناقل ہوتے ہیں خود ثناء نہیں کرتے نہ اپنے کو اس قابل سمجھتے ہیں کہ فانی محض ہوتے ہیں۔ جب فانی ہیں تو پھر یہ حضرات تجویز کہاں کر سکتے ہیں اگر ان کا کوئی عزیز بیمار ہوتا ہے تو وہ دوا اور دعا سب کچھ کرتے ہیں مگر دل سے ہر پہلو پر راضی ہوتے ہیں۔ اگر مر گیا تو وہ اول ہی سے اس پر راضی تھے۔ گو طبعی رنج ہو اس کا مضائقہ نہیں مگر دل سے وہ اس پر راضی ہوتے ہیں اور تمام کلفتوں کی جڑ یہی تجویز اور توقع ہے اور جو شخص تجویز اور توقع کو فنا کر دے گا وہ ہر حال میں راحت ہی سے رہے گا بلکہ اگر کوئی دنیا دار شخص اہل اللہ سے ناتمام تشبہ بھی حاصل کر لے وہ بھی دوسروں سے راحت میں رہے گا۔

چنانچہ ایک جنٹلمین تھے وہ ملانے جنٹلمین تھے یعنی آزاد دنیا دار۔ ان کی حالت یہ تھی کہ ہیٹ بھی لگائے ہوئے ہیں اور لنگی بھی پہنے ہوئے ہیں لوگ بہت ہنستے کہ ہیٹ اور لنگی کا کیا جوڑ۔ تو وہ کہتے ہیں کہ لباس راحت کے لیے پہنا جاتا ہے اور پتلون میں راحت نہیں ہے بلکہ آدمی اس میں جکڑ بند ہو جاتا ہے اس لیے لنگی باندھ لی اور ہیٹ میں راحت ہے کہ اس سے دھوپ وغیرہ سے نگاہ کی حفاظت ہے

---

[1] (الصحیح للبخاری ۴: ۱۳۵، سنن الترمذی: ۳۱۶۱)

اس لیے میں راحت کی چیز اختیار کرتا ہوں خواہ جوڑ ہو یا نہ ہو۔ جب ان کے والد صاحب کے انتقال کا تار آیا تو باورچی نے کھانا نہیں پکایا کہ آج کیا کھائیں گے۔ وقت پر کھانا مانگا اس نے کہا میں نے تو آج اس خیال سے کہ والد صاحب کا صدمہ ہوگا کھانا نہیں پکایا۔ تو اس پر پانچ روپیہ جرمانہ کیا (یہ تو واہیات حرکت تھی) اور کہا سبحان اللہ! وہ تو اپنی موت سے مرے اور تم ہم کو زندگی میں بھوکا مارنا چاہتے ہو۔ (یہ بات عقل کی تھی اور حقیقی آزادی کی جس میں سرتا سر راحت ہے) تو حضرت اصل دنیا دار تو اہل دین ہی ہیں کہ دنیا کی روح یعنی راحت قلب تو ان ہی کے پاس ہے اور دنیا داروں کے پاس بجز ٹیپ ٹاپ کے راحت خاک بھی نہیں اور اگر کسی کو کچھ راحت ہے بھی تو وہ بھی اہل اللہ کے تشبہ کی برکت ہے یہ تو طریقہ تھا دنیا سے بے توجہی کا کہ دنیا کی حقیقت میں غور کیا جائے۔

توجہ آخرت کا طریقہ

اب آخرت کی طرف توجہ کا طریقہ سنئے۔ وہ بھی یہی ہے کہ آخرت کی حالت میں غور کرو کہ اس کی ایک حالت یہ ہے کہ وہاں رنج وغم کا نام نہیں۔ ظاہر ہے کہ جب طلب آخرت کا دنیا میں یہ نتیجہ ہے کہ طالب آخرت کو یہاں بھی راحت قلب حاصل ہو جاتی ہے تو خود آخرت میں پہنچ کر کیا حال ہوگا۔

دوسری حالت یہ ہے کہ آخرت پائیدار ہے اس کی نعمتیں ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں۔ تیسری حالت آخرت کی یہ ہے کہ جتنی اس کی طلب کی جائے اس سے زیادہ ملتی ہے بلکہ جتنی تم چاہ بھی نہیں سکتے اتنی ملتی ہے اور دنیا کی یہ حالت ہے کہ جتنی مانگتے ہیں اور چاہتے ہیں اتنی بھی نہیں ملتی۔

وما قضی احد منها لبانته　　لاینتهی ارب الی ارب

مشاہدہ ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ وہ جتنی دنیا چاہتا ہے اتنی نہیں ملتی اور آخرت کی یہ حالت ہے کہ اس کے طالب کے سب مطلوبات اس کو ملتے ہیں۔ چنانچہ وہ راحت کا طالب ہے، جنت کا طالب ہے، رضا حق کا طالب ہے، دوستوں کی ملاقات کا طالب ہے، یہ سب باتیں مع شے زائد اس کو ملیں گی اور بہت سی چیزیں تو اس کو دنیا ہی میں مل جاتی ہیں۔ مثلاً راحت قلب و رضائے حق، البتہ یہاں تغیر کا کھٹکا لگا رہتا ہے وہاں اس سے بھی اطمینان ہے اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

مَنْ کَانَ یُرِیْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِیْهَا مَانَشَآءُ لِمَنْ نُّرِیْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ یَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا. (بنی اسرائیل آیت نمبر ۱۸)

کہ جو شخص حیات عاجلہ یعنی دنیا کا طالب ہے اس کو ہم جتنا چاہتے ہیں اور جس کے لیے چاہتے ہیں یہاں ہی دے دیتے ہیں پھر اس کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے جس میں ذلت و رسوائی

کے ساتھ داخل ہوگا۔ یہ وہ شخص ہے جو پکا دنیا دار ہے جو محض دنیا ہی کا طالب ہے یعنی کافر جو آخرت کو جانتا ہی نہیں، دنیا ہی میں منہمک ہے تو اس کو بھی جتنی وہ چاہتا ہے اتنی نہیں ملتی اور نہ ہر ایک کو ملتی ہے۔اس کے بعد فرماتے ہیں:

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰی لَهَا سَعْیَهَا وَهُوَمُؤمِنٌ فَاُولٰئِکَ کَانَ سَعْیُهُمْ مَّشْکُوْرًا. (بنی اسرائیل آیت نمبر۱۹)

اور جو آخرت کو طلب کرے اور اس کے لیے کماینبغی کوشش کرے۔ یہاں **وسعی لها سعیها** جو بڑھایا گیا ہے یہ ارادالاخرۃ کی تفسیر ہے۔اور یہ اس واسطے بڑھایا گیا تا کہ ہوسناکوں کی ہوس کو قطع کردیا جائے کیونکہ بہت لوگ ارادہ آخرت کے بارے میں اسی کو کافی سمجھتے ہیں کہ زبان سے یوں کہہ لیا جائے کہ نیت کرتا ہوں میں طلب آخرت کی۔ اللہ اکبر! یعنی بہت لوگ محض تمنائے آخرت کو طلب آخرت سمجھتے ہیں اور اس کے اسباب کو اختیار نہیں کرتے۔(اور یہ حالت آخرت ہی کے ساتھ ہے دنیا کے ساتھ کسی کا یہ برتاؤ نہیں کہ محض تمنا کو کافی سمجھ لے۔اسی واسطے "مَنْ کَانَ یُرِیْدُ الْعَاجِلَةَ" کے بعد "وَسَعٰی لَهَا سَعْیَهَا" نہیں بڑھایا گیا کیونکہ وہاں تو ارادہ کے معنی بھی عام طور پر یہ ہیں کہ خوب سعی کی جائے۔پس یہ شبہ نہ رہا کہ ارادہ عاجلہ میں تو سعی کی قید نہیں اور یہاں سعی کی قید ہے۔تو آخرت کی فضیلت دنیا پر پوری طرح واضح نہ ہوئی۔اگر یہاں بھی محض ارادہ سے بحث ہوتی تو مقابلہ کامل ہوتا۔جواب کا حاصل یہ ہے کہ سَعٰی لَهَا سَعْیَهَا دونوں جگہ مراد ہے مگر وہاں اس کے بیان کی ضرورت نہ تھی کیونکہ وہاں ارادہ کے معنی میں لوگوں نے غلطی نہیں کی اور یہاں بیان کی ضرورت تھی کیونکہ یہاں معنی ارادہ میں غلطی کا وقوع ہو رہا ہے ۱۲ظ)

اور سَعٰی لَهَا سَعْیَهَا فرمایا سَعٰی لَهَا سَعْیَه نہیں فرمایا کہ آخرت کے لیے اپنی سی کوشش کرے کیونکہ اس میں کم ہمتوں کو موقع مل جاتا کہ ہر شخص ذرا سا کام کر کے کہہ دیتا کہ بس میری ہمت تو اتنی ہی ہے تو ان کم ہمتوں کے بہانے قطع کرنے کے لیے فرماتے ہیں کہ آخرت کے لیے آخرت کے مناسب کوشش کرے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ اپنی طاقت سے زیادہ کوشش کرے جیسا کہ ظاہر میں شان آخرت کی عظمت سے مفہوم ہوتا ہے بلکہ مطلب وہی ہے کہ اپنی سی کوشش کرے اور اپنی ہمت کے موافق سعی کرے۔

چنانچہ دوسری جگہ اس کی تفسیر "فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ" (تو جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ

سے ڈرتے رہو) (التغابن نمبر آیت ۱۶) سے کی گئی ہے۔ پس حاصل **سَعٰی لَهَا سَعْيَهَا وَسَعٰی لَهَا سَعْيُه** کا ایک ہی ہے لیکن **سَعٰی لَهَا سَعْيَهَا** کے بعد **سَعٰی لَهَا سَعْيُه** کا مفہوم جو ذہن میں آئے گا وہ یہ ہوگا کہ اپنی سی کوشش ختم کردے اور اس کے بغیر کم ہمتوں کو بہانہ کا موقع مل جاتا خوب سمجھ لو۔ چنانچہ اس حکمت کی وجہ سے حق تعالیٰ نے "**فَاتَّقُوْا اللّٰهَ مَااسْتَطَعْتُمْ**" (تو جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو) (التغابن نمبر آیت ۱۶) کو اول نازل نہیں فرمایا بلکہ اول "**اِتَّقُوْا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ**" (اللہ تعالیٰ سے ڈرا کرو جیسا ڈرنے کا حق ہے۔ (آل عمران آیت ۱۰۲) کا نزول ہوا جس سے صحابہ گھبرا گئے کہ حق تعالیٰ کی شان کے مناسب تقویٰ کس سے ہو سکتا ہے۔ تب تسلی کے لیے "**فَاتَّقُوْا اللّٰهَ مَااسْتَطَعْتُمْ**" (تو جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو) (التغابن نمبر آیت ۱۶) نازل ہوا اور یہ اس کے لیے ناسخ نہیں بلکہ مفسر ہے کہ "**اِتَّقُوْا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ**" (اللہ تعالیٰ سے ڈرا کرو جیسا ڈرنے کا حق ہے۔ (آل عمران آیت ۱۰۲) کا مطلب یہ ہے کہ اپنی استطاعت کے موافق تقویٰ اختیار کرو اور سلف کے کلام میں اگر اس کو کہیں ناسخ کہا گیا ہے تو اس سے بھی مراد تفسیر ہی ہے لیکن سلف کے کلام میں بیان تبدیل و بیان تفسیر سب کو نسخ سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ بہرحال مقصود تو تقویٰ بقدر استطاعت ہے لیکن اس کو "**اِتَّقُوْا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ**" (اللہ تعالیٰ سے ڈرا کرو جیسا ڈرنے کا حق ہے۔ (آل عمران آیت ۱۰۲) کے بعد اس کی تفسیر میں بیان فرمانے سے کم ہمتوں کے بہانے قطع ہو گئے اور اول ہی اس کا نزول ہو جاتا تو کم ہمتوں کو بہانہ ڈھونڈھنے کا موقع مل جاتا۔ ایسا ہی یہاں سمجھو کہ **سعی لها سعیہا** کی طرف لوٹتا ہے مگر **سعی لها سعیہ** نہ فرمانے میں وہ حکمت ہے جو ابھی بیان ہوئی۔ واللہ اعلم باسرار کلامہ۔

بہرحال ارشاد فرماتے ہیں کہ جو آخرت کا طالب ہو تو اس کی جزا یہ ہے کہ **فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا**۔ (بنی اسرائیل آیت نمبر ۱۹) ان کی سعی کی قدر کی جائے گی۔ بظاہر یہاں کچھ انعام کا ذکر نہیں مگر قرآن شاہی کلام ہے اس میں شاہانہ محاورات کے ساتھ گفتگو کی جاتی ہے اور شاہی محاورہ میں یہ لفظ بہت بڑا ہے۔ یہ ہزاروں تفاصیل سے بڑھا ہوا ہے جب بادشاہ کسی سے کہہ دے کہ ہم نے تمہاری خدمت کی قدر کی ہے تو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ بہت کچھ ملے گا اور امید سے زائد ملے گا اب سمجھ لو کہ جس کی سعی کی احکم الحاکمین قدر دانی فرمائیں اس کو تو کیا کچھ ملے گا۔

ایسے ہی قرآن میں جو بعض جگہ **لعلکم تتقون** وغیرہ آیا ہے یہ بھی شاہانہ محاورہ ہے۔ بادشاہوں کا قاعدہ ہے کہ وہ انہی لفظوں کے ساتھ وعدہ کیا کرتے ہیں کہ امیدوار باشید اور یہ لفظ ان کے کلام میں

دوسروں کی قسموں سے زیادہ مؤکد ہے۔ پس ایک بات تو آخرت کی یہ قابل رغبت ہے کہ اس کی طلب بیکار نہیں جاتی بلکہ ثمرہ ضرور مرتب ہوتا ہے بخلاف دنیا کے کہ وہاں اس کا وعدہ نہیں۔ پھر یہ کہ طالب آخرت کو طلب سے زیادہ ملتا ہے چنانچہ ایک عمل کا دس گناہ ثواب تو ہر شخص کے لیے مقرر ہے۔

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ اَمْثَالِهَا. (الانعام آیت نمبر ۱۶۰)

اور بعضوں کو سات سو گنا بھی ملے گا جیسا کہ اس آیت میں ہے:

كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ. (البقرہ آیت نمبر ۲۶۱)

"جیسے ایک دانہ کی حالت جس سے سات بالیں جمیں جس کے ہر بال کے اندر سو دانے ہوں۔"

پھر اسی پر بس نہیں بلکہ دوسری جگہ ارشاد ہے: "فَيُضَاعِفَهُ لَهُ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً" اب تو کچھ حد ہی نہ رہی کیونکہ دوسری آیت کا نزول اس وقت ہوا ہے جب پہلی آیت کا نزول پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی تھی: اللھم زدنی[۱] تو یقیناً اس میں پہلی آیت سے زیادہ ہی تضاعف ہے اور مفسرین نے اس کے ہر ضعف کو سات سو کہا ہے اور اگر یہ بھی نہ ہو تو کثرت کثیرہ میں تو شبہ ہی نہیں وہ تو منصوص ہے۔

اور حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ کے راستہ میں ایک چھوارہ کوئی دے تو حق تعالیٰ اس کو یہاں تک بڑھاتے ہیں کہ احد پہاڑ سے بڑا ہو جاتا ہے۔ اس سے اور بھی حد بڑھ جاتی ہے کیونکہ چھوارہ کے برابر احد پہاڑ کے اجزاء کرنے بیٹھو تو اجزاء کرنے ہی میں سو دو سو برس لگ جائیں گے، گویا اتنا بے حساب ملے گا۔ بعض جاہل لوگ تو اتنی جزا کو سن کر ہی گھبرا گئے۔ چنانچہ ایک جاہل آریہ نے لکھا ہے کہ جزاء کا قاعدہ مسلمانوں میں ہے وہ ٹھیک نہیں کیونکہ ہمارے اعمال تو محدود ہیں ان پر جزا غیر محدود کا مرتب ہونا ایسا ہے جیسا کہ پاؤ بھر کی غذا والے کو پچاس من کھلا دیا جائے وہ تو مر جائے گا۔ پس محدود کو جزائے غیر محدود کی طاقت کہاں!

اس جہالت کی بات کو جواب ظاہر ہے کہ پاؤ بھر کی غذا والا پچاس من کھلانے سے اس وقت مرے گا جب کہ اس کو ایک وقت میں ایک دم سے کھلا دیا جائے اور اگر جزائے غیر محدود کے ساتھ عمر بھی غیر محدود ہو اور عمر غیر محدود غذا کھلائی جائے تو بتلایئے اس میں کیا اشکال ہے۔ اس جاہل نے جزا کو تو غیر محدود رکھا اور عمر کو محدود لے لیا اور خواہ مخواہ اعتراض کر دیا۔ یہ نہ دیکھا کہ مسلمان عمر دار الجزاء کو بھی غیر محدود کہتے ہیں مگر چونکہ یہ آریہ خود نجات ابدیہ کے بھی قائل ہیں ان کے نزدیک

---

[۱] (کذا ذکر فی التفسیر المظھری من عدۃ کتب الحدیث)

جو آدمی نیک ہوتا ہے وہ عالم ارواح میں ایک محدود مدت تک رہ کر تناسخ کے طور پر عالم اجسام میں آ جائے گا اس لیے اس نے مدت جزاء کو حاصل کر لیا اور اشکال کر دیا مگر حقیقت میں تو یہ اشکال اس کے مذہب پر ہے اسلام کی تعلیم پر کوئی اشکال نہیں مگر تعصب سے عقل مسخ ہو جاتی ہے اس لیے جو جی میں آیا ہانک دیا تو آخرت میں جزا اتنی ملے گی جس کو سن سن کر ایسے جاہل تو گھبرا ہی گئے۔

غرض وہاں یہ حال ہے:

نیم جاں بستاند وصد جاں دہد　　آنچہ درو ہمت نیاید آں دہد
خودکہ یابد ایں چنیں بازار را　　کہ بیک گل می خری گلزار را

''فانی اور حقیر جان لیتے ہیں اور اس کے بدلہ میں باقی جان عطا کرتے ہیں جو خواب و خیال میں نہیں ہوتا وہ عطا کرتے ہیں ایسا بازار کہاں مل سکتا ہے کہ ایک پھول کے بدلہ میں چمن ہی خرید لے۔''

اور جب ان کی طرف سے ایسی جاں بخشی کا برتاؤ ہے تو ہم کو بھی حق تعالیٰ کے جان دادن کا یہ برتاؤ کرنا چاہیے۔

ہمچو اسماعیل پیشش سر بنہ　　شاد و خنداں پیش تیغش جاں بدہ

''حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرح اس کے سامنے اپنا سر جھکا دے، ہنستے کھیلتے اس کی تلوار کے سامنے جان دے دے۔

حدیث میں ہے کہ جنت میں سب سے اخیر میں جو شخص داخل ہوگا حق تعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ جا جنت میں جا، وہ جائے گا تو وہاں ہجوم اور مجمع دیکھے گا۔ حق تعالیٰ سے عرض کرے گا کہ یہاں تو جگہ بھی نہیں۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہم نے تجھ کو دنیا سے دس گناہ زیادہ رقبہ جنت میں دیا۔ وہ کہے گا ''اتستھزی بی وانت رب العالمین''[1] کیا آپ رب العالمین ہو کر مجھ سے ہنسی کرتے ہیں یہاں تو ذرا سی بھی جگہ نہیں اور آپ دنیا سے دس گنا بتلاتے ہیں۔ یہ شخص جاہل جنتی ہوگا، گنوار اسی واسطے ایسی بے باکانہ گفتگو کرے گا کیونکہ جنت میں جاہل بھی ہوں گے۔

حضرت عبداللہ بن المبارک نے نماز کے بعد بہت لوگوں کو مسجد سے نکلتے ہوئے دیکھا، خوش ہوئے اور فرمایا ''نعم حشر الجنة هم'' کہ الحمدللہ! یہ سب جنت کی بھرتی ہیں مگر کام کے آدمی ان میں دو تین ہی ہوں گے۔

---

[1] (الصحیح لمسلم کتاب الایمان: ۳۱۰، مشکوۃ المصابیح: ۵۵۸۲، مسند امام أحمد بن حنبل ۱: ۴۱۰)

جنت اور دوزخ کی وسعت

صاحبو! تم جنت کے طالب ہو تو جنت تو انشاء اللہ تم کو ملے ہی گی' جنت تمہارے ہی واسطے ہے' کفار کے واسطے تھوڑا ہی ہے اس سے تو بے فکر رہو' پس ذرا برے برے کام چھوڑ دو مگر جی یوں چاہتا ہے کہ جنت کی بھرتی نہ بنو بلکہ کام کے آدمی بنو تو جنت میں اتنی وسعت ہے کہ سب سے ادنیٰ مسلمان کو بھی دنیا سے دس گنا رقبہ جنت میں ملے گا۔

اس پر بعض نیچریوں نے اعتراض کے طور پر کہا ہے کہ ہم نے تو سارا جغرافیہ پڑھا ہے' ہم کو تو جنت کا کہیں پتہ نہیں لگا۔

اس کا جواب میں نے یہ دیا ہے کہ تم نے جغرافیہ ارضی پڑھا ہے جغرافیہ عالم نہیں پڑھا ہے وہ ہمارے پاس ہے اگر تم جغرافیہ عالم پڑھتے یعنی قرآن تو تم کو جنت کا پتہ چل جاتا اور جن لوگوں نے یہ جغرافیہ عالم پڑھا ہے ان کو جنت کا بھی علم ہے اور دوزخ کا بھی اور پل صراط کا بھی اور عرش و میزان کا بھی اور بعض کو تو ان میں دنیا ہی کے اندر سب کا انکشاف ہو گیا ہے۔

چنانچہ شیخ عبدالکریم جیلیؒ بڑے صاحب کشف ہیں انہوں نے تو جنت اور دوزخ کی پیمائش تک کر لی ہے کیونکہ دونوں باوجود وسعت کے ہیں تو محدود ہی اور محدود کی پیمائش ممکن ہے لیکن اگر حواس جسم سے پیمائش کی جاتی تو پھر بھی عرصہ دراز لگتا۔ جب قوی روحانیہ سے پیمائش کی گئی تو عرصہ دراز کی ضرورت نہیں ہوئی کیونکہ روح کی قوت بہت زیادہ ہے۔ نیز شیخ عبدالکریم جیلیؒ کو ایک دریا بھی منکشف ہوا ہے جس کے بارے میں وہ فرماتے ہیں کہ اس کی ایک ایک لہر آسمان و زمین سے دس گنا زیادہ ہے مگر فرشتے اس کی لہروں کو روکے ہوئے ہیں ورنہ آسمان و زمین سب غرق ہو جاتے۔

پھر بعض جاہلوں نے یہ شبہ کیا ہے کہ جنت جب اتنی بڑی ہے کہ "عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ" تو وہ سماتی کہاں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ تم کو اس شبہ کا حق نہیں کیونکہ تمہارے مقتدر اہل سائنس اس بات کے خود قائل ہیں کہ فضاء الجو غیر متناہی ہے پھر اس غیر متناہی میں اگر جنت بھی ہو تو کیا حرج ہے۔ ممکن ہے جس طرح مریخ میں تم آبادی کے قائل ہو اسی طرح کوئی کرہ جنت بھی ہو اور وہاں بھی آبادی ہو مگر بوجہ بعد کے وہ کرہ تم کو نظر نہ آتا ہو کیونکہ مریخ کی آبادی کا علم تم کو اس لیے ہوا ہے کہ تم اس کو زمین سے قریب مانتے ہو اور یہ جواب بطور الزام کے ہے ورنہ جنت کو ہم اس فضاء الجو سے باہر

ساتوں آسمانوں سے اوپر مانتے ہیں چنانچہ قرون سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ جنت آسمانوں سے آگے ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

لَاتُفَتَّحُ لَهُمْ (اے للکفار) اَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ (الاعراف آیت نمبر۴۰)

''جولوگ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اوران (کے ماننے) سے تکبر کرتے ہیں ان کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے اور وہ لوگ کبھی جنت میں نہ جاویں گے جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے کے اندر سے نہ چلا جاوے۔''

اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت سموات سبعہ سے اوپر اور عرش سے نیچے ہے اور عرش ان سب سے بڑا ہے اس سے بڑی کوئی مخلوق نہیں۔ شیخ عبدالکریم جیلیؒ کو جو دریا منکشف ہوا ہے جس کی ایک لہر آسمان وزمین سے بھی دس گنی ہے عرش سے وہ بھی اس کے نیچے لکھتے ہیں اور عرش گو سب سے بڑا ہے مگر وہ بھی محدود ہے اور حق تعالیٰ کی ذات حد سے منزہ ہے۔ وہ غیر محدود ہے۔

تو یہاں سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی ہے جو عرش کو حق تعالیٰ کا مکان سمجھتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ نعوذ باللہ حق تعالیٰ عرش پر ایسے مستقر ہیں جیسے ہم اپنے مکان میں ہیں۔ بھلا غیر محدود کو محدود کیونکر محیط ہوسکتا ہے اور مکان کے لیے مکین پر محیط ہونا لازم ہے۔

رہا یہ سوال کہ پھر ''اِسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ'' (الاعراف ۵۴) ''عرش پر قائم ہوا'' کے کیا معنی ہیں؟

اس کے جواب میں سہل طریق تو سلف کا ہے کہ اس میں سکوت کیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ اس کے معنی ہم کو معلوم نہیں جو بھی مراد ہے ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور اگر تاویل کی ٹھہرے تو وہ تاویل سہل ہے جو میں نے بارہا بیان کی ہے کہ ''اِسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ'' شاہی محاورہ ہے جیسا کہ فارسی میں تخت نشینی ہے اور تخت نشینی کنایہ ہے۔ تصرف وتدبیر مملکت اور تنفیذ امر ونواہی سے ورنہ حقیقت معنی تو بعض جگہ مفقود ہوتی ہے کہ بادشاہ فرش پر بیٹھ کر احکام جاری کرتا ہے اور آج کل تو کرسیوں کی نشست کی رسم عام ہونے سے معدوم ہی ہے مگر یہ محاورہ اب بھی موجود ہے تو جو معنی تخت نشینی کے آج کل ہیں یعنی متصرف فی الامور ہونا وہی ''اِسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ'' کا مفہوم ہے اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ بعض آیات میں ''اِسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ'' کے ساتھ ''يُدَبِّرُ الْاَمْرَ'' بھی وارد ہے۔

اور اگر کوئی وسعت جنت پر یہ شبہ کرے کہ اتنی بڑی جنت میں کیونکر رہیں گے جی نہ گھبرائے گا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہاں خدام اور اسباب تنعم بھی بہت سے ملیں گے جن سے تمام مکان

پُر ہوگا جن سے جی لگ جائے گا۔

بہرحال جنت کے ان حالات کو سوچو اس سے طلب آخرت وتوجہ الی الآخرت پیدا ہوگی کہ حق تعالیٰ ہماری ذرا سی طلب پر اتنی بڑی جنت دیں گے اور طلب دنیا پر کچھ بھی وعدہ نہیں۔ شاید یہاں اس کی طالب علم کو شبہ ہو کہ ایک آیت میں تو طلب دنیا پر بھی ترتب ثمرہ کا وعدہ ہے۔ فرماتے ہیں:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْلَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا. (الشوریٰ آیت نمبر۲۰)

''جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو ہم اس کو اس کی کھیتی میں ترقی دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو تو ہم اس کو کچھ دنیا (اگر چاہیں) دیدیں گے۔''

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہاں وعدہ ہے تو منھا کے ساتھ ہے جس میں من تبعیضیہ ہے تو کل کا وعدہ کہاں ہوا جزو قلیل کا وعدہ ہوا اس پر شاید یہ سوال ہو کہ ایک آیت میں آخرت کے متعلق بھی منھا آیا ہے۔

وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ. (آل عمران آیت نمبر۱۴۵)

''اور جو شخص دنیاوی نتیجہ چاہتا ہے تو ہم اس کو دنیا کا حصہ دے دیتے ہیں اور جو شخص اخروی نتیجہ چاہتا ہے تو ہم اس کو آخرت کا حصہ دیں گے اور ہم بہت جلد عوض دیں گے حق شناسوں کو۔''

جواب یہ ہے کہ وہاں قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ من ابتدائیہ ہے تبعیضیہ نہیں اور یہاں سے معلوم ہوا کہ قرآن وحدیث سمجھنے کے لیے نحو وصرف کی بھی ضرورت ہے۔

آج کل ہر جاہل مجتہد ہے

مگر آج کل بہت لوگ بدون صرف ونحو کے قرآن وحدیث کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ نئے مجتہدین تو بہت جلدی حدیث کا ترجمہ پڑھنے لگتے ہیں۔ بس دو چار رسالے اردو کے پڑھے اور مشکوٰۃ بخاری کا ترجمہ شروع کر دیا اور لگے ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور شافعیؒ پر اعتراض کرنے۔

ایک جاہل کہتا تھا کہ حدیث میں تو آیا ہے کہداج ''کہداج'' اور ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ماننے والے کہتے ہیں کہ سورہ پھاتحہ پڑھنا پھرج نہیں۔ واقعی یہ بھی عجیب زمانہ ہے جس میں ہر جاہل بھی مجتہد ہے مگر تعجب نہیں آج کل مسلمان تو مسلمان انگریز بھی اسلام میں اجتہاد کرنے لگے

ہیں۔ ایک انگریز رام پور میں مسلمانوں کے ایک مجمع میں کہہ رہا تھا کہ قرآن سے ثابت ہے کہ طاعون لگتا ہے' قرآن میں ہے کہ جہاں طاعون ہو وہاں سے نہ جاؤ۔ اسکے ساتھ ایک مقدمہ اس نے اپنی طرف سے لگالیا کہ جانے کی ممانعت کا سبب یہی ہے کہ طاعون لگتا ہے۔ اس لیے منع فرمایا کہ یہاں کا طاعون وہاں نہ پہنچ جائے۔ پس دعویٰ ثابت ہوگیا تو یہ انگریز بھی اسلام میں مجتہد ہونے کا مدعی تھا جبھی تو اپنی طرف سے ایک مقدمہ لگالیا۔

اور اس سے بڑھ کر یہ بھی ہندو بھی دین اسلام میں مجتہد ہونے لگے۔ چنانچہ پچھلے دنوں ایک ہندو کی نسبت اخباروں میں شائع ہوا تھا کہ وہ قید خانہ میں قرآن کا مطالعہ کررہا ہے اور مسلمانوں کے لیے قرآن سے راہ عمل تجویز کرے گا پھر اس نے قید خانہ سے نکل کر یہ فتویٰ بھی دیا کہ ہم کو قرآن میں گائے ذبح کرنے کا حکم نہیں ملا اس لیے مسلمان اس طریقہ کو چھوڑ دیں تو اگر ایک جاہل مسلمان آج کل مجتہد ہو جائے تو کیا تعجب ہے مگر ان جہالتوں سے اسلام کو ان شاء اللہ تعالیٰ کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا۔

اگر گیتی سراسر باد گیرد　　چراغ مقبلاں ہرگز نہ میرد

''اگر تمام دنیا ہوا بن جائے تب بھی اللہ والوں کا چراغ گل نہ ہوگا۔'' اور

چراغے راکہ ایزد برفروزد　　ہرآں کس تف زند ریشش بسوزد

''بس چراغ کو اللہ تعالیٰ روشن کریں جو شخص اس پر پھونک مارے اس کی ڈاڑھی جل جائے۔''

اگر یہ دین انسانوں کے اختیار میں ہوتا تو آج تک کبھی کا مٹ چکا ہوتا جبکہ ایسے ایسے جاہل اور کافر تک مجتہد بننے کے مدعی ہیں مگر اس کو تو خدا نے اپنے قبضہ میں رکھا ہے اور خود اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ. (الحجر آیت نمبر ۹)

''ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم اس کے محافظ اور نگہبان ہیں۔''

اور اسی واسطے مسلمان تبلیغ اسلام کی طرف سے بے فکر ہیں کہ بس اللہ تعالیٰ نے اس کا ٹھیکہ لے لیا ہے اس لیے یہ اللہ تعالیٰ پر اپیل ہے مگر اتنی بے فکری تو اچھی نہیں اس سے دین کا نقصان نہیں مگر خود ہمارا نقصان ہے کہ ہم خادمان دین کی فہرست سے نکل جائیں گے۔ پس نہ اتنی بے فکری چاہیے اور نہ اتنی فکر کی ضرورت ہے جتنی خیر خواہان قوم مثل ڈوم کے گاتے پھریں گے۔

تبلیغ کے آداب

میں نے دیوبند کے مدرسہ میں ایک وعظ کہا تھا جس کا نام آداب التبلیغ ہے جو گویا علماء کا

مصدقہ اور رجسٹری شدہ ہے اس میں میں نے تبلیغ کے آداب بیان کئے ہیں اس کا مطالعہ اس باب میں بہت نافع ہوگا۔ اس میں میں نے بتلایا ہے کہ تبلیغ کی فکر کا کون سا درجہ مطلوب ہے اور کونسا درجہ غیر مطلوب ہے۔ جس میں ایک مضمون یہ ہے کہ تبلیغ میں ثمرات کا انتظار نہ کرو۔ یعنی یہ تجویز نہ کرو کہ ہماری سعی سے شدھی بند ہی ہو جائے یا دس ہزار ہندو مسلمان ہو جائیں کیونکہ اس تجویز و انتظار کا نتیجہ یہ ہے کہ چند دن کے بعد جب اس ثمرہ کے ترتب میں دیر ہوگی تو ہمت پست ہو جائے گی۔ اس میں راز یہ ہے کہ مبالغہ فی العمل ہمیشہ تقلیل عمل کا سبب ہوتا ہے۔

صوفیاء نے اس کو خوب سمجھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تکثیر فی العمل سے منع کیا ہے وہاں حقیقت میں تکثیر عمل سے ممانعت نہیں بلکہ تقلیل عمل سے ممانعت ہے کیونکہ اس مبالغہ کا انجام تقلیل عمل ہی ہے اور بعض صوفیاء سے جو خود تکثیر عمل اور مجاہدات کثیرہ منقول ہیں تو اس کا راز یہ ہے کہ ان کے لیے عمل صالحہ طبیعت ثانیہ اور غذا بن گیا تھا جس کی تکثیر موجب ملال و تقلیل نہ تھی۔

اسی لیے جب کسی زاہد خشک نے ان پر اعتراض کیا کہ اتنا مجاہدہ کرنا اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا ہے جس سے "لَاتُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ" (البقرہ آیت نمبر ۱۹۵) "اور (اپنے آپ کو) اپنے ہاتھوں تباہی میں مت ڈالو۔" میں ممانعت ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ ہر ایک کی ہلاکت جدا ہے جس کے لیے تکثیر عمل موجب ہلاکت ہو وہ تقلیل عمل کو ترک کرے اور ہمارے لیے تقلیل موجب ہلاکت ہے اس لیے ہم کو تکثیر عبادت سے ممانعت نہیں۔

غرض ثمرہ کا انتظار کرنا مضر ہے اس سے عمل میں ہمت چند روز کے بعد شکستہ ہو جاتی ہے تو ایسی فکر تو مناسب نہیں کہ ہر وقت اسی فکر میں رہے اور ثمرات کی تدبیر میں لگا رہے تو اتنی فکر بھی نافع نہیں اور ایسی بے فکری بھی اچھی نہیں جیسی آج کل ہمارے اندر ہے۔ بس یوں کرو کہ اپنی طرف سے تبلیغ کا اہتمام کرو اور ثمرہ کی امید رکھو مگر اس کے انتظار میں نہ رہو بلکہ اس کا معاملہ خدا تعالیٰ کے سپرد کرو۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ آج کل مذہب اسلام میں ہر شخص اجتہاد کرنے کا دعویٰ رکھتا ہے اس زمانہ کی یہ بھی ایک خاصیت ہے کہ نااہل اپنی حد سے بڑھ کر اہل کی جگہ لینا چاہتے ہیں۔

آدمیاں گم شدند ملک خدا خر گرفت

"اصل آدمی ناپید ہو گئے اور ملک خدا پر گدھوں کی سلطنت قائم ہو گئی۔"

اور یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ قرآن و حدیث کی فہم کے لیے صرف و نحو وغیرہ کی سخت ضرورت ہے محض ترجمہ کافی نہیں۔ اسی بناء پر میں نے کہا تھا کہ ایک آیت میں قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے

کہ من تبعیضیہ ہے اور دوسری جگہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ من بیانیہ ہے اور یہ بات وہی سمجھ سکتا ہے جس نے صرف ونحو ومعانی کو پڑھا ہو۔ محض ترجمہ سے اس کا پتہ نہیں چل سکتا۔ بہرحال یہ دعویٰ ثابت ہے کہ دنیا تو جتنی چاہتے ہو اتنی بھی نہیں ملتی اور آخرت چاہنے سے زیادہ ملتی ہے۔

طلب آخرت کا طریقہ

ایک اور آیت قابل تحقیق ہے:

اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَاتَمَنّٰی فَلِلّٰہِ الْاٰخِرَۃُ وَالْاُوْلٰی.

''کیا انسان کو اس کی ہر تمنا مل جاتی ہے سو خدا ہی کے اختیار میں ہے آخرت اور دنیا کی بھی۔''

یعنی دنیا و آخرت خدا کی ملک ہیں تمہاری تمنا پر مدار نہیں اس میں سوال یہ ہے کہ جب دونوں خدا کی ملک ہیں تو یہ تو معلوم نہ ہوا کہ وہ کس کو دینا چاہتا ہے اور کس کو نہیں۔ سو اس کو دوسری آیات نے حل کر دیا ہے کہ دنیا کو تو وہ نہ سب کو دینا چاہتے ہیں اور نہ تمنا کے برابر دینا چاہتے ہیں اور آخرت ہر طالب آخرت کو جتنا وہ چاہے گا اس سے بھی زیادہ دیں گے۔ اب بہت ہی بعید از عقل ہے کہ انسان پھر بھی دنیا کا طالب ہو اور آخرت سے غافل ہو۔

رہا یہ کہ طلب آخرت کی حقیقت کیا ہے تو اجمالاً اس کو سب جانتے ہیں کہ فرائض کی پابندی اور محرمات سے اجتناب کا نام طلب آخرت ہے مگر میں اس وقت ایسی حقیقت بتلانا چاہتا ہوں جو اس آیت سے معلوم ہوتی ہے یعنی اس پر ''وَھُمْ عَنِ الْاٰخِرَۃِ ھُمْ غَافِلُوْنَ'' (الروم آیت نمبر ۷) ''اور یہ لوگ آخرت سے بے خبر ہیں۔''

بطریق مفہوم دال ہے کیونکہ یہاں غفلت پر مذمت ہے۔ پس غفلت کی ضد مطلوب ہوگی اور غفلت کی ضد ہے ذکر وفکر جس کا ترجمہ اردو میں دھیان اور دھن ہے۔ پس طلب آخرت کی حقیقت یہ ہوئی کہ آخرت کا دھیان اور دھن رہے اور یہ کوئی مشکل بات نہیں اس میں تو کچھ وظیفے وظائف کی بھی ضرورت نہیں۔ بس اتنی ضرورت ہے کہ دل سے آخرت کی یاد ہو اور اس کی دھن لگی رہے۔ اگر دھیان اور دھن لگی رہے گی تو اول تو تم راستہ سے ہٹو گے نہیں اور اگر ہٹو گے بھی تو جلد ہی متنبہ ہو کر راستہ پر لگ جاؤ گے اور اس کے حصول کا سہل طریقہ یہ ہے کہ صحبت اہل اللہ اختیار کرو گا ہے گا ہے ان سے ملتے رہو، ان کے پاس بیٹھو، ان سے باتیں سنو، ان سے تعلق رکھو اور اگر یہ میسر نہ ہو تو تذکرہ اولیاء اللہ اس کے قائم مقام ہے۔ اسی کو عارف فرماتے ہیں:

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل ست صراحئی مے ناب وسفینہ غزل ست

سفینۂ غزل سے مراد اہل اللہ کے حالات وملفوظات کی کتابیں ہی۔ اگر شیخ کامل میسر ہو تب تو اس سے بہتر کوئی چیز نہیں اور اگر یہ میسر نہ ہو تو غیر کامل کی صحبت ومخالفت ومجالست ہی ترک کردو یا کم کردو کیونکہ غیر کامل کی صحبت سخت مضر ہے۔ اگر اس کے پاس بیٹھ کر محرمات کی طرف بھی گفتگو منجر نہ ہو تو مباحات ہی میں زیادت ہوگی اور مباحات میں حد سے زیادت مضر ہے۔ حدیث میں ہے:

ایاکم و کثرۃ الضحک فانھا تمیت القلب۔[1]

ہنسنا جائز ہے مگر اس کی کثرت دل کو مردہ کر دیتی ہے۔ حضرت فریدؒ فرماتے ہیں:

گرچہ گفتار ش بود درعدن ۔۔۔ دل زیر گفتن بمیر د در بدن

''دل میں فضول کلام سے کدورت پیدا ہوتی ہے اگر چہ وہ کلام نہایت ہی عمدہ ہو۔''

اور اگر باتیں بھی زیادہ نہ ہوں تو کم از کم دل تو اس کی طرف جب تک بیٹھے رہو گے بلاضرورت متوجہ رہے گا تو یہی کس قدر مضر ہے کہ قلب کو غیر اللہ کی طرف بلاضرورت مشغول کیا گیا۔ اس ضرر کا احساس ان لوگوں کو ہوسکتا ہے جن کو خدا کی طرف دل لگانے کا کچھ مزا حاصل ہے۔ اسی راز کی وجہ سے ہمارے اکابر نے توجہ متعارف کو پسند نہیں فرمایا کیونکہ اس میں شرط یہ ہے کہ مخاطب کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو کہ اس وقت خدا تعالیٰ کا تصور بھی اس کے تصور سے زیادہ نہ ہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے حضرات کو کسی وقت بھی کسی چیز کی طرف زیادہ توجہ نہیں ہوتی ممکن ہے کسی وقت کسی چیز کی طرف ان کو بھی زیادہ توجہ ہوتی ہو مگر ایک تو اتفاقاً بلاقصد ایسا ہو جائے اور ایک یہ کہ قصداً ایسی توجہ کر بیٹھے کہ خدا کا تصور بھی اگر آئے تو اس کو مغلوب کیا جائے۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہمارے حضرات کو قصداً ایسا کرنا پسند نہیں اور بلاقصد کسی شے کی طرف توجہ ہو جائے وہ اور بات ہے۔ اپنی طرف سے وہ ہمیشہ یہی قصد رکھتے ہیں کہ توجہ الی اللہ سب سے زیادہ ہو اور کوئی شے اس سے مانع نہ ہو۔ باقی جو لوگ توجہ متعارف کا طریقہ اختیار کئے ہوئے ہیں میں ان پر اعتراض نہیں کرتا ان کی نیت بخیر ہوگی تو ان کو بھی کچھ ثواب مل جائے گا۔ وہ نیت یہ ہوگی کہ توجہ للہ بجائے توجہ الی اللہ کے ہے مگر عاشق کو کب گوارا ہے کہ قصداً غیر کی طرف متوجہ ہو۔

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ ایک شاعر نے ایک محفل میں یہ شعر پڑھا:

اس کے کوچہ سے جب اٹھ اہل وفا جاتے ہیں ۔۔۔ تا نظر کام کرے رو بہ قفا جاتے ہیں

وہاں ایک اور شاعر بھی تھا اس نے فوراً اس کا رد کیا اور کہا:

---

[1] (جمع الجوامع للسیوطی: ۹۳۵۸، کشف الخفاء للعجلونی ۱: ۳۲۳)

اس کے کوچہ سے کب اٹھ اہل وفا جاتے ہیں　　وہ ہوسناک ہیں جو روبہ قفا جاتے ہیں

یہ شخص عاشق تھا کیونکہ اس مضمون کو عاشق ہی رد کر سکتا تھا ورنہ ظاہر میں پہلے شعر کا مضمون بھی اچھا تھا مگر مذاق عشق کے خلاف تھا۔ حضرت! عاشق کا مذاق تو یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک دم بھی محبوب سے غافل ہونے کو گوارا نہیں کر سکتا۔ اپنی طرف سے ہر دم وہ ادھر ہی متوجہ رہتا ہے۔ خواہ محبوب متوجہ ہو یا نہ ہو۔

کیا خوب کہا ہے:

ملنے کا اور نہ ملنے کا مختار آپ ہے　　پر تم کو چاہیے کہ تگ و دو لگی رہے

مولانا فرماتے ہیں:

اندریں راہ می تراش و می خراش　　تادم آخر دمے فارغ مباش

''اس راہ سلوک میں ادھیڑ بن میں لگے رہو یعنی خوب کوشش کرو آخر دم تک بے کار نہ رہو۔''

یہ می تراش و می خراش دھیان اور دھن ہی کا ترجمہ ہے کہ ہر وقت ادھر لو لگی ہے۔ کیوں:

تادم آخر دمے آخر بود　　کہ عنایت باتو صاحب سر بود

''آخری وقت تو کوئی گھڑی ایسی ضرور ہوگی جس میں عنایت ربانی تمہاری ہمراز اور رفیق بن جائے گی۔'' اور

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی　　شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

''پلک جھپکنے کی دیر تک بادشاہ حقیقی سے غافل نہ ہو شاید کہ تمہاری طرف بارگاہ خداوندی کی طرف سے تم پر نظر کرم ہو اور تمہیں اس کا علم نہ ہو۔''

بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اگر کوئی بدانتظام ہو جس سے نباہ کر کام نہ ہوتا ہو کبھی تو توجہ الی اللہ زیادہ ہوتی ہے کبھی کچھ بھی نہیں ہوتا۔ معمولات بھی پابندی سے ادا نہیں ہوتے تو وہ بھی گھبرائے نہیں کیونکہ حضرت استاد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص نے اس بدنظمی اور عدم دوام کی شکایت کی تھی تو حضرت نے فرمایا کہ ہر شخص کا دوام جدا ہے۔

دوام کی ایک یہ بھی صورت ہے کہ کبھی ہو کبھی نہ ہو یعنی ایسی حالت پر دوام ہو جائے کہ ذکر و فکر کو بالکل نہ چھوڑے بلکہ مہینہ میں بیس دن کام کر لیا دس دن چھوڑ دیا' یا دس دن کام کر لیا بیس دن چھوڑ دیا۔ اگر یوں کرتا رہا تو اس کا دوام یہی ہے یہ بھی محروم نہ رہے گا (اور یہ حدیث کے دوام کی تقسیم نہیں ہے بلکہ ضعیف کی تقویت ہے کہ اس غیر مطلوب دوام سے وہ دوام مطلوب پیدا ہو جائے گا تو بحکم مقدمۃ الشیء فی حکم الشیء ''کسی چیز کے مقدمہ کا حکم چیز کے حکم میں ہے'' اس کو مجازاً دوام فرما دیا ۱۲ منہ)۔

ایک دفعہ میرے ایک دوست کا منظوم خط میرے پاس آیا جس میں اول سے آخر تک اسی بدنظمی کی شکایت تھی۔ جی چاہا کہ میں بھی شعر میں جواب دوں اور شعر بھی اسی بحر کا ہو۔ اسی وقت مثنوی کا ایک شعر یاد آیا جس میں سارے خط کا جواب تھا تو میں خوش ہوا اور میں نے لکھا:

دوست دارد دوست ایں شفتگی ۔۔۔ کوشش بیہودہ بہ از خفتگی

''محبوب حقیقی اس طلب کو پسند فرماتے ہیں اگرچہ بے ثمر ہو مگر تعطل سے بہتر ہے۔''

یعنی ترک کلی سے کوشش بیہودہ ہی اچھی۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے:

بس ہے اپنا ایک بھی نالہ اگر پہنچے وہاں ۔۔۔ گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالہ و فریاد ہم

بلکہ میں اور ترقی کرتا ہوں کہ بدنظمی اور عدم دوام ذکر تو کیا اگر گناہ بھی ہو جائے تو جب بھی یہ نہ سمجھو کہ مردود ہو گئے بلکہ پھر بھی اللہ تعالیٰ ہی کو لپٹو اور یہ سمجھو کہ گناہ کا علاج بھی وہی کر سکتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایک بار وحی آئی کہ اے موسیٰ! میرا محبوب بندہ وہ ہے جو مجھ سے ایسا تعلق رکھے جیسا بچہ ماں سے رکھتا ہے' پوچھا! الٰہی یہ تعلق کیسا ہوتا ہے؟ فرمایا کہ ماں بچہ کو مارتی ہے اور بچہ اسی کو لپٹتا ہے۔ پس گناہ کر کے بھی ان کو نہ چھوڑو بلکہ انہی سے لپٹو۔ اب بتلایئے اس سے بھی زیادہ کوئی آسان طریقہ کامیابی کا ہوگا؟ اس میں تو کوئی بھی دشواری نہیں کچھ حرج نہیں۔ اس کو اختیار کیجئے' اس سے طاعات پر استقامت اور محرمات سے اجتناب سہل ہو جائے گا کیونکہ اس سے آپ کو حق تعالیٰ کی محبت پیدا ہوگی اور طلب و محبت تو وہ چیز ہے کہ ایک طوائف کا طالب اس پر جان و مال فدا کر دیتا ہے' اور ایک امرد کا طالب اس کے لیے ریاست کو تباہ کر دیتا ہے۔ پھر کیا خدا کا طالب اس کے لیے جان و مال سے دریغ کرے گا۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ وہ آپ کا جان و مال تباہ بھی نہیں کرنا چاہتے بلکہ سب کو صحیح سلامت رکھ کر اس میں برکت و ترقی کا وعدہ فرماتے ہیں۔

وَاللّٰہُ یَدْعُوْٓا اِلٰی دَارِ السَّلَامِ. (یونس آیت نمبر ۲۵) (اور اللہ تعالیٰ دار البقاء کی طرف تم کو بلاتا ہے)

اور مشاہدہ ہے وہ اپنے طالب کو دونوں جگہ دار السلام ہی میں دیکھتے ہیں۔ پس اگر اور بھی کچھ نہ ہو سکے تو کم از کم یہ آسان کام تو اختیار کر لیا جائے کہ آخرت کا دھیان اور دھن رکھا جائے مگر افسوس! عوام تو کیا علماء میں بھی اس کی کمی ہے۔ علماء میں نماز روزہ تو ہے مگر دھیان اور دھن اور اللہ تعالیٰ سے تعلق ان سے لو لگانا' لگنا لپٹنا' محبت میں گھلنا یہ نہیں ہے اور بدون اس کے کام نہیں چلتا کیونکہ بدون اس کے نماز روزہ پر استقامت خطرے میں رہتی ہے۔ ہر وقت مجاہدہ اور نفس سے منازعت رہتی ہے اور ظاہر ہے کہ منازعت کے ساتھ اول تو کام ہی خود دشوار ہوتا ہے پھر اس پر دشوار کی امید نہیں اور تعلق مع اللہ کے ساتھ منازعت نفس ختم ہو جاتی ہے اور دوام عمل کی امید غالب

قریب بہ یقین ہو جاتی ہے۔ اسی کو ایک عارف فرماتے ہیں:

صنما رہ قلندر سزوار بمن نمائی ۔۔۔ کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

''مجھ کو تو طریق عشق میں چلایئے نیز زہد خشک بہت دور دراز کا راستہ ہے۔''

رسم پارسائی سے مراد زہد خشک ہے اور رہ قلندر سے مراد طریق عشق ہے۔ فرماتے ہیں کہ طریق زہد خشک بہت دور دراز کا راستہ ہے مجھے تو طریق عشق میں چلایئے۔

آگے اس کے بعید اور اس کے قریب ہونے کا سبب بتلاتے ہیں:

قمار خانہ رفتم ہمہ پاک باز دیدم ۔۔۔ چو بصومعہ رسیدم ہمہ یافتم ریائی

''میں جب شراب خانہ میں گیا تو سب کو پاکباز یعنی شراب خانہ کے اصول کا پابند پایا اور جب عبادت خانہ پہنچا تو سب میں ریاء یعنی اصول کا غیر پابند پایا۔''

یعنی اہل عشق میں امراض قلب تکبر و ریاء وغیرہ نہیں ہوتا کیونکہ عشق سب کو جلا پھونک کر راکھ کر دیتا ہے اور زاہدان خشک میں تکبر و عجب و ریاء وغیرہ بہت ہوتا ہے۔ آگے فرماتے ہیں:

بطواف کعبہ رفتم بحرم رہم نداوند ۔۔۔ کہ برون در چہ کردی کہ درون خانہ آئی

بر بزمیں چوں سجدہ کردم زززمیں ندا بر آمد ۔۔۔ کہ مرا خراب کردی تو بسجدہ ریائی

''میں خانہ کعبہ کے طواف کیلئے گیا تو حرم نے مجھ کو راستہ نہ دیا اور کہا کہ تو نے حرم کے باہر کیا کیا جو خانہ کعبہ میں داخل ہونا چاہتا ہے' جب زمین پر میں نے سجدہ کیا تو زمین سے یہ ندا آئی کہ تو نے ریاء کا سجدہ کر کے مجھے بھی خراب کیا۔''

پس طریق عشق کی ضرورت ہے کہ خدا کے ساتھ دھن اور دھیان لگا رہے اور یہ بات کتابوں سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کا طریقہ وہ ہے جو ایک دنیا دار جج کہتا ہے۔

نہ کتابوں سے نہ وعظوں سے نہ زر سے پیدا ۔۔۔ دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اسی کیلئے صحبت عشاق کی ضرورت ہے۔ اب میں ختم کرتا ہوں چونکہ یہ مضمون ضروری تھا اور مستورات کے مناسب تھا کیونکہ سہل مضمون ہے جس میں کچھ زیادہ کام نہیں کرنا پڑتا۔ اس لیے میں نے اسکو تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔ گو دیر زیادہ ہوگئی ہے جس سے بعض لوگوں کو دھوپ کی تکلیف ہوئی اور مستورات محبوسات کو گھٹن کی اور کھانا پکانے میں دیر کی تکلیف ہوئی مگر تکلیف ہی سے راحت ہوتی ہے کچھ مضائقہ نہیں اور جس وقت مضمون کی آمد ہوتی ہے اس وقت مضمون کو روک نہیں سکتا۔ اس لیے میں مجبور تھا۔

اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

تجارت آخرت

ترقی نہایت خوبصورت لفظ ہے لیکن اس وقت اس کا ماحصل محض طول امل و حرص ہے جس کی شریعت مطہرہ نے جڑ کاٹ دی ہے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے یہاں امل اور طول حرص کا نشان بھی نہیں تھا۔ ان کے پیش نظر صرف ترقی دین تھا اور اسی کے تحت ان حضرات کو دنیا کی بھی وہ ترقی حاصل ہوئی کہ آج لوگوں کو خواب میں بھی نصیب نہیں ہوسکتی۔

طاعات بدنیہ و مالیہ کے متعلق یہ وعظ ۲۷ ربیع الاول ۱۳۳۰ھ کو جامع مسجد سہارن پور میں تقریباً دو ہزار کے مجمع میں ہوا جس پر ۲ گھنٹے ۲۲ منٹ لگے۔ اسے مولوی سعید احمد صاحب نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ. اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

فَقَدْقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ. (التوبہ آیت نمبر ۱۱۱)

ترجمہ: ’’بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی۔‘‘

مسلمانوں کی ایک کوتاہی

یہ ایک بڑی آیت کا ٹکڑا ہے اس میں خداوند تعالیٰ نے مجملاً ان تمام وظائف ضروریہ کا جو بندہ کے ذمہ ضروری ہیں بہت مختصر لفظوں میں ذکر فرمایا ہے۔ اس آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہم لوگوں میں من جملہ بہت سی کوتاہیوں کے ایک کوتاہی وہ بھی ہے جس کی اصلاح کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔ اس سے تو انکار نہیں ہوسکتا کہ ہم میں بہت سی کوتاہیاں ہیں۔ بہت سی باتوں میں اہل اسلام مرکز اسلام سے ہٹے ہوئے اور اپنی مخترعہ من سمجھوتیوں میں پھنسے ہوئے ہیں اور اہل اسلام کی تخصیص قید احترازی نہیں۔ یعنی یہ مطلب نہیں ہے کہ کوتاہیاں صرف اہل اسلام میں ہیں دوسری قوموں میں نہیں۔ جیسا کہ بعض اہل مذاق جدید کا یہ خیال ہے اسی لیے وہ جس وقت اہل اسلام کی مذمت بیان کرتے ہیں تو دوسری قوموں کی مدح کرتے ہیں کہ فلاں قوم میں فلانی صفت نہایت اچھی ہے مگر مسلمانوں میں نہیں اور اس میں بھی بعض تو وہ مدائح ہیں کہ وہ فی نفسہ مدح کے قابل ہیں۔ نیز ان کے ذکر کرنے سے مسلمانوں کو غیرت دلانا مقصود ہوتی ہے کہ جن لوگوں سے دین کا تعلق بھی نہیں ان میں

تو یہ مدائح موجود ہیں اور جن لوگوں میں بوجہ دین کے ہونا چاہیے وہ بالکل معریٰ ہیں' اس کا تو مضائقہ نہیں۔ قابل افسوس تو یہ امر ہے کہ یا تو غیر قوموں کی وہ صفات بیان کی جاتی ہیں کہ جو واقع میں قابل مدح ہی نہیں یا اگر قابل مدح ہیں تو ان سے مقصود صرف مسلمانوں پر طعن اور ان کا دل توڑنا اور عیب کھولنا ہوتا ہے۔ یہ امر مسلمانوں کے لیے سخت محل شکایت ہے اور اگر واقعات کا مشاہدہ کیا جائے تو اس کا ہرگز انکار نہیں کیا جاسکتا کہ واقعی اکثر اہل اسلام کا یہ شیوہ ہوسکتا ہے۔ ہر عاقل آدمی کو قرائن سے ان کے لب ولہجہ سے' اس نفرت سے جو کہ ایسے لوگوں کو مسلمانوں سے ہے ان سب کے مجموعہ سے اس کا اخذ کر لینا بعید نہیں کہ ان لوگوں کا مقصود محض اہانت ہوتی ہے مسلمانوں کی۔

پھر لطف یہ کہ جن مدائح کی مسلمانوں سے نفی کی جاتی ہے وہ واقع میں مدائح بھی نہیں یعنی شریعت مطہرہ کے نزدیک مطلوب نہیں ہیں اگر چہ دنیا میں کسی درجہ میں مطلوب ہوں لیکن مسلمان من حیث المسلمان کے منہ سے ان مدائح کا نکلنا بالکل ایسا ہے جیسے کوئی شخص ہاتھی کی یہ تعریف کرنے لگے کہ وہ اس قدر قوی ہوتا ہے کہ اگر اس کو وزن کیا جائے تو پچاس من کا اترے کہ یہ صفت اگر چہ واقعی صفت ہے لیکن اس کو تہذیب نفس اور قابل مدح ہونے میں کچھ دخل نہیں۔

پس اسی قسم کے وہ مدائح ہیں کہ جن کو آج کل مدائح سمجھا جاتا ہے کہ اگر چہ ان میں کسی درجہ میں منفعت ضرور ہے جیسے ہاتھی کے اس قدر وزنی ہونے میں کیونکہ حکیم مطلق نے ہاتھی کو اتنا بڑا جثہ بلا وجہ نہیں عطا فرمایا لیکن حکیم مطلق نے اس کمال کو قابل مداح نہیں ٹھہرایا۔ چنانچہ انہی مخترعہ مدائح میں ایک مدح ترقی کرنا بھی ہے کہ اس کو بہت بڑی مدح سمجھا جاتا ہے۔ علی ہذا خودداری وغیرہ' سو غور کر کے دیکھ لیجئے کہ شریعت نے ان کو مدح کے قابل سمجھا ہے یا نہیں۔

تاریخ اور حدیث کا فرق

ترقی نہایت خوبصورت لفظ ہے لیکن اس وقت اس کا ماحصل محض طول امل وحرص ہے جس کی شریعت مطہرہ نے جڑ کاٹ دی ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جو کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے نمونہ تھے۔ انہوں نے اس کو اپنے خیال میں کبھی جگہ نہیں دی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس کی تعلیم نہیں فرمائی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت جس کا ایک ایک واقعہ احادیث میں مدون بمعنی جمع ہے اس کو دیکھا جائے۔ ابتداء سے انتہا تک آپ کو یہ تعلیم نہ ملے گی۔ رہے تاریخی واقعات سو ان کا یہ حکم ہے کہ اگر وہ حدیث سے مطابق ہوں تو قابل

اخذ ہیں ورنہ ہیچ محض کیونکہ مؤرخین میں یہ بڑا مرض ہے کہ وہ واقعات میں اپنی رائے کو دخل دیتے ہیں پھر اس رائے کو بصورت واقعہ بیان کرتے ہیں۔

زمانہ حال کے بعض خود رو مصنفین پر افسوس ہے کہ وہ محدثین پر اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے واقعات میں اپنی رائے کو شامل کیا ہے لیکن جو شخص محدثین کے حالات سے واقف ہے وہ خوب جانتا ہے کہ محدثین رحمتہ اللہ علیہ نے کس تدین سے کام لیا ہے۔ البتہ یہ اعتراض مطابق واقع کے مؤرخین پر ضرور ہو سکتا ہے۔

صاحبو! محدثین کا تدین اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ اگر ایک حدیث سے ایک بات کو ثابت کرتے ہیں تو اس کے بعد ہی دوسرا باب اس معارض صوری بیان کرتے ہیں اور اس میں بھی حدیث پیش کر دیتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ ان حضرات کو مقصود محض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کا جمع کرنا ہے نہ کہ اپنی رائے کو ثابت کرنا یا اس پر زور دینا کیونکہ جب ایک حدیث کے ساتھ دوسری حدیث جو اس پہلی سے صورۃ معارض ہے موجود ہے اور ظاہر ہے کہ اس محدث کی رائے کسی ایک جانب ہوگی تو بصورت ایراد معارض کوئی خاص رائے کیونکر مقصود ثابت ہو سکتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کو اپنی اغراض کی تائید مقصود نہیں ہے بلکہ ان کا مقصود تمام احادیث کا لوگوں کے سامنے پیش کر دینا ہے کہ دیکھیں اور خوب سمجھ لیں۔

ہاں تاریخ میں اس قسم کے واقعات پائے جاتے ہیں کہ ایک مؤرخ نے اپنے خیال کے مؤید واقعات کو لیا اور دوسرے نے اپنے خیال کے مؤیدات کو۔ پس جب حدیث و تاریخ میں یہ تفاوت ہے تو حدیث قابل وثوق ہوئی اور اس کے مقابل تاریخ قابل وثوق نہ ہوئی تو جو واقعات تاریخ میں حدیث کے خلاف ہوں گے اور حدیث ان کو باطل کرتی ہوگی وہ محض ہیچ ہیں ہرگز قابل قبول نہیں۔

ترقی دین صحابہؓ کا مطمع نظر تھا

غرض حدیث کو دیکھئے تو اس سے معلوم ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز زندگی کیا تھا اور وہی طرز بعینہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تھا تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے یہاں طول حرص اور طول امل کا نشان بھی نہیں تھا۔ ان کی ترقی ترقی دین تھی، اگرچہ اس کے تابع ہو کر ان حضرات کی دنیا کی بھی وہ ترقی حاصل ہوئی کہ آج لوگوں کو خواب میں بھی نصیب نہیں لیکن مطمع نظر صرف ترقی دین تھا۔ چنانچہ ان حضرات کی اسی شان کو خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ. (الحج آیت نمبر ۴۱)

''کہ اگر ہم ان کو زمین پر قبضہ دیدیں تو یہ لوگ اس وقت بھی نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں' اچھی باتوں کی ترغیب دیں اور بری باتوں سے روکیں۔''

یہ ہے ان کے خیالات کا نقشہ جس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہوسکتا۔ اب ان کو یاد رکھئے اور پھر ان کے ساتھ اپنے خیالات کو دیکھئے اور انطباق کیجئے۔

واللہ! ایسا دشوار انطباق ہے جیسے خط مستقیم پر خط منحنی کو منطبق کرنے لگیں کہ جب تک اس میں استقامت اور انحنا باقی رہے گا کبھی انطباق ممکن ہی نہیں تو ہمارے خیالات خط منحنی کی طرح ہیں اوران حضرات کے خیالات کی مثال خط مستقیم ہے۔

بحمداللہ! یہ مثال ایک خاص اعتبار سے بھی بہت ہی اچھی خیال میں آئی کیونکہ خط منحنی کے انطباق علی المستقیم کی شان یہ ہوتی ہے کہ اس کے بعض اجزاء تو خط مستقیم پر سے گزرے ہوئے ہوتے ہیں اور بعض اجزاء اس سے ہٹے ہوئے۔ یہی حالت ان خیالات مخترعہ کی ہے کہ ان میں اگر ایک قدم شریعت پر ہے تو دوسرا اس سے بالکل الگ جس کا کسی تاویل سے بھی جادہ شریعت پر انطباق نہیں ہوسکتا۔ پس ایسے حالات وخیالات کس طرح قابل مدح ہوسکتے ہیں۔ غرض جن مدائح کی آج کل لوگ علی العموم مسلمانوں سے نفی کرتے ہیں وہ مدائح واقع میں اس مسلک میں داخل ہونے کی قابلیت ہی نہیں رکھتے۔

ہمدردانِ قوم کی نمائشی ہمدردیاں

اگر بعض باتیں واقع میں قابل مدح ہوں بھی جیسے ہمدردی وایثار وغیرہ تب بھی ان کے نفی کرنے سے مقصود محض مسلمانوں کی تذلیل ہوتی ہے۔ دل سوزی یا ہمدردی ہرگز مقصود نہیں ہوتی کیونکہ اگر ہمدردی ہوتی تو دوسری باتوں میں بھی تو ان کے ساتھ ہمدردی ہوتی۔ حالانکہ اس وقت انہی طاعنین میں بہت سے ایسے لوگ دیکھتا ہوں کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ اختلاط کو بھی گوارا نہیں کرتے۔ مسلمانوں کا سلام لینا بھی ان کو پسند نہیں۔ اور جب یہ حالت ہے تو کسی طرح بھی نہیں کہا جاسکتا کہ ان کو مسلمانوں سے ہمدردی ہے اور اگر تھوڑی دیر کے لیے اس کو مان بھی لیا جائے تب بھی اس خاص سبب سے جو مذکور ہوا ہرگز ممکن نہیں کہ ان کی ذات سے عام مسلمانوں کو کسی قسم کی بہبودی یا نفع پہنچ سکے۔

بدیہی بات ہے کہ طبیب اس وقت مریض کو نفع پہنچا سکتا ہے کہ جب مریض کے پاس آئے' نبض دیکھے' قارورہ دیکھے' تسلی دلجوئی کرے اور اگر ایسا نہ کرے بلکہ دور ہی سے محض صورت دیکھ کر الٹا سیدھا نسخہ تجویز کردے تو کوئی عقلمند باور نہ کرے گا کہ یہ طبیب اس مریض کو اس کے مرض سے نجات دلانے کا سبب بن سکتا ہے اور وہ مریض اس کے علاج سے درست ہوسکتا ہے۔

دیکھ لیجئے! طاعون کے زمانہ میں جو طبیب مریضوں سے دور رہتے ہیں ان کی ذات سے کسی مریض کو کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ کسی ایک کو بھی نہیں۔ ہاں اس طبیب سے ضرور فائدہ پہنچتا ہے جو مریض کے مرض کا اپنا مرض سمجھ کر اس کے ساتھ بالکل گھل مل جائے۔

مجھ سے ایک طبیب نے بیان کیا کہ ایک زمانہ میں جب ان کے قصبہ میں طاعون پھیلا تو ۶۳ مریض ان کے زیر علاج رہے جن میں سے ۵۳ تندرست ہوگئے اور دس مریض انتقال کر گئے۔ کہتے تھے کہ ان ۶۳ مریضوں میں ایک مریض ایسا بھی تھا کہ جب اس کی نبض کو میں نے دیکھا ہے تو شدت حرارت کی وجہ سے میری انگلی پر چھالا پڑ گیا لیکن پھر بھی اسکی تدابیر میں مصروف رہے۔ غرض جو طبیب مریض سے نفرت کرے گا وہ مریض کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

آج دیکھ لیجئے کہ ان مدعیان طبابت اخلاق کا کیا برتاؤ قوم کے ساتھ ہے بلکہ میں کہتا ہوں کہ اپنے ساتھ بھی ان کو ہمدردی نہیں اور اپنے امراض کے علاج پر بھی توجہ نہیں اور یہی سبب ہے قوم سے ہمدردی نہ کرنے کا۔ کیونکہ طبعاً اپنا خیر خواہ انسان زیادہ ہوتا ہے بلکہ دوسروں کی خیر خواہی جو کرتا ہے اس میں اپنی خیر خواہی مضمر بمعنی پوشیدہ ہوتی ہے۔ پس جو شخص اپنا ہمدردانہ ہوگا وہ دوسروں کا کیسے ہمدرد ہوگا۔ یہ لوگ اول اپنی تو اصلاح کریں پھر دوسروں کی اصلاح حقیقی کی فکر کریں۔

آج یہ حالت ہے کہ اظہار ہمدردی اسلام میں بڑے بڑے جلسے ہوتے ہیں۔ انجمنیں قائم ہوتی ہیں مگر نہ نماز کی فکر ہے نہ روزے کا خیال ہے۔ مال کی اتنی افراط ہے کہ دس آدمیوں کو بھی ساتھ لے جا سکیں لیکن محبت اسلام کا یہ عالم ہے کہ خود بھی حج کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ وضع کو دیکھئے تو سر سے پاؤں تک اسلام کے بالکل خلاف۔ گفتگو کو دیکھئے تو وہ مذہب کے بالکل جدا' تو جب ان کو اپنے امراض کے ازالہ کی فکر نہیں تو پھر دوسروں کے امراض کے ساتھ ان کو کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔

بات یہ ہے کہ ہر زمانہ کی ایک رسم ہوتی ہے کہ اہل زمانہ اسی پر چلنے لگتے ہیں۔ آج کل یہ رسم ہے کہ ہر مشہور یا غیر مشہور تحصیل شہرت یا تکمیل شہرت کی کوشش کرتا ہے اور اس کے ذرائع بہم پہنچاتا ہے۔ من جملہ ان ذرائع کے ایک یہ بھی ہے کہ انجمنیں قائم کی جائیں اور جلسے کیے جائیں' کوئی ان انجمنوں کا گورنر ہو جائے' کوئی سیکرٹری کوئی کچھ کوئی کچھ اور اس سے عام وخاص میں ان کو ایک امتیاز ہو جائے۔

پھر رسم بھی اگر شریعت پر منطبق ہوتی تو بھی نفع سے خالی نہ ہوتی کیونکہ وہ اس انطباق کی برکت سے ایک دن مبدل بہ حقیقت ہو سکتی تھی اور جب ظاہری انطباق علی الشریعۃ بھی نہ ہو تو سراسر مضر اور رسم قاتل ہے اور یہی وجہ ہے کہ حکماء اُمت نے عوام الناس سے صرف اسی قدر کو کافی سمجھا

ہے کہ وہ اپنی صورت ظاہری شریعت کے موافق بنالیں اور صورت عبادت کے پابند ہو جائیں کیونکہ وہ حضرات جانتے ہیں کہ یہ صورت ہی ان شاء اللہ ایک دن مبدل بحقیقت ہو جائے گی۔

چنانچہ ہمارے حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر عبادت میں ریاء بھی ہو تو اس کو کیے جاؤ کیونکہ ریاء ہمیشہ ریاء نہیں رہتا۔ چند روز میں عادت ہو جاتی ہے پھر عادت سے عبادت ہو جاتی ہے پھر وہ ذریعہ قرب بن جاتی ہے اس کو مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

از صفت وازنام چہ زاید خیال
واں خیالت ہست دلال وصال

یعنی اسم سے خیال پیدا ہوتا ہے پھر وہ خیال ہی رہبر ہو جاتا ہے وصال کی طرف۔ مگر یہ اسی وقت ہے جب کہ صورت شریعت پر منطبق ہو ورنہ اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر اصلاح کی کوئی سبیل نہیں اس لیے میں کہتا ہوں کہ اگر رسم ہوتی اور منطبق ہوتی تو اس کے مبدل بحقیقت ہو جانے کی امید تھی۔ مگر انطباق ہوتا کیونکہ اس لیے کہ انطباق کے لیے ضرورت اس کی ہے کہ شریعت کی وقعت دل میں ہو اور یہاں وہی ندارد ہے۔

علماء پر اعتراض کی حقیقت

آج کل عقلاء شریعت مطہرہ کو مولویوں کے خیالات کا مجموعہ سمجھتے ہیں اور ان پر اعتراض کرتے ہیں لیکن ہم کو غنیمت سمجھنا چاہیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو ان لوگوں نے اعتراض سے بچالیا اگرچہ واقع میں اثر اس قول کا آپ ہی پر ہوگا لیکن تاہم مورد عتاب تو صرف مولویوں کو بنایا۔ ہم اس کے بھی شکر گزار ہیں مگر ان معترضین کو یہ ضرور سمجھ لینا چاہیے کہ درحقیقت ان کے اعتراضات کا اثر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی پر پڑتا ہے کیونکہ "ضرب الغلام اهانة المولی" اگر کوئی شخص کسی کے غلام کو مارے اگرچہ اس نے بظاہر آقا کو کچھ نہیں کہا مگر واقع میں یہ آقا کی بھی اہانت ہوگی کیونکہ آقا اور غلام میں اس قدر تغائر نہیں ہے جس قدر یہ شخص سمجھ رہا ہے بلکہ اس میں ایسا تغائر ہے جیسا کہ احول کے مرئیات میں ہوتا ہے۔

مشہور ہے کہ کسی استاد نے اپنے شاگرد کو کہا کہ فلاں طاق میں ایک بوتل رکھی ہے وہ اٹھا کر لے آؤ۔ شاگرد چونکہ احول تھا وہاں جو پہنچا تو ایک بوتل کی دو نظر آئیں۔ استاد سے کہنے لگا کہ یہاں دو بوتلیں رکھی ہیں ان میں سے کون سی لاؤں؟ استاد نے کہا کہ دو نہیں بلکہ ایک ہی ہے کہنے لگا کہ میں خود مشاہدہ کر رہا ہوں' آپ میرے اس مشاہدہ کی تکذیب کرتے ہیں۔ اس پر استاد نے غضب ناک ہو کر کہا کہ ایک بوتل توڑ دو اور دوسری میرے پاس لے آؤ۔ شاگرد نے ایک بوتل کو توڑا تو وہ دونوں ٹوٹ گئیں' کہنے لگا اب تو یہاں ایک بھی نہیں رہی۔

مولانا نے اس قصہ کو کلام مجید کی اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے: "لَانُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ" تو ایک کی تکذیب کرنے سے سب رسولوں کی تکذیب ہوتی ہے اور اس سے خدا تعالیٰ کی تکذیب ہو جاتی ہے۔ پس نائب کی تکذیب منیب کی تکذیب ہو جاتی ہے۔ پس علماء کی تکذیب سے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب ہوگی اور اس سے خدا تعالیٰ کی تکذیب ہوگی مگر لوگ اس پر بالکل نظر نہیں کرتے بلکہ بے دھڑک اس پر اعتراض کر دیتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ آج کل کے جلسے اور انجمنیں بالکل رسم بلا معنی ہیں اور صورت بھی ٹھیک نہیں اور لوگوں نے ان کو محض رسم سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ نفع پہنچانا ہرگز مقصود نہیں ہے جیسا کہ میں نے بیان کیا کہ یہ جب اپنا ہی دین برباد کر رہے ہیں تو دوسروں کو دینی نفع پہنچانے کا کب قصد کر سکتے ہیں۔

ایثار کی حقیقت

اور اگر کہئے کہ یہ ایثار ہے کہ اپنے دین سے دوسروں کے دین کو مقدم کر رکھا ہے اس لیے باوجود اپنے دین کے قائم نہ کرنے کے دوسروں کے دین کی درستی کرتے ہیں تو سمجھو کہ ایثار کی اجازت دنیوی منافع میں ہے دینی منافع میں نہیں۔ یعنی اگر ہمارا دنیاوی نفع فوت ہو کر دوسرے کا نفع ہو جائے تو اس کو ایثار کہیں گے اور اگر کوئی ہمارا دین تباہ ہو کر دوسروں کو نفع پہنچے تو یہ ایثار نہیں کہلائے گا ورنہ اگر دین کو تباہ کر کے بھی ایثار ہوتا تو باغی سب سے زیادہ صاحب ایثار ہونے چاہئیں اور ان کو سب سے زیادہ خیر خواہ سرکار کہنا چاہیے کیونکہ ان میں اتنی بڑی ہمدردی و ایثار ہے کہ انہوں نے اپنی جان بھی دے دی اور تمام منافع جو اطاعت سے ان کو پہنچے وہ دوسری رعایا کے لیے چھوڑ دیئے۔

صاحبو! یہ وہی ایثار ہے جو فرعون میں تھا۔ دین چھوڑ کر دنیا پر قناعت کی۔ اس کی ایک حکایت ہے کہ مصر کی زراعت کا مدار رود نیل کے جوش پر تھا' ایک سال اس کو جوش نہیں ہوا' لوگ فرعون کے پاس آئے اور کہا کہ تو مدعی الوہیت ہے' ہم لوگ قحط میں مرے جاتے ہیں' یہ تیری الوہیت کب کام آئے گی' اس نے کہا کہ کل رود نیل کو جوش ہوگا' رات کو دعا کی کہ اے اللہ! اگرچہ میں اس قابل تو نہیں ہوں کہ میری کوئی معروض قبول ہو لیکن میری ہمت تو دیکھئے کہ میں نے آپ کو چھوڑا' جنت کو چھوڑا' ابدالآباد کے عذاب کو گوارا کیا' ان سب کے بدلے صرف ایک التجا کرتا ہوں کہ میری ایک دعا کو قبول فرما لیجئے کہ جب میں رود نیل کو حکم دوں تو اس کو جوش ہو جائے۔ چنانچہ اس کی یہ دعا قبول ہوگئی اور ایسا ہی ہوا۔

اور اس کی دعا کی قبولیت سے کوئی اپنے دل میں شبہ نہ کرے کہ اس کافر ملعون کی دعا کیونکر قبول ہوگئی۔

بات یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ سب کی سنتے ہیں حتیٰ کہ شیطان جو کہ سب سے زیادہ ملعون ہے اس کی درخواست بھی قبول ہوگئی اور پھر درخواست بھی خاص عتاب کے وقت کہ علی العموم اس وقت کی درخواست پوری نہیں ہوتی اور درخواست بھی ایسی عجیب جو کسی نے آج تک نہ کی تھی اور نہ وہ ظاہر منظوری کے قابل تھی کہ:

اَنْظِرْنِیْ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ. (ص آیت نمبر ۷۹)

''کہنے لگا تو پھر مجھ کو مہلت دیجئے قیامت کے دن تک۔''

گویا خداوند تعالیٰ کی طرف سے تو یہ عتاب تھا کہ "وَاِنَّ عَلَیْکَ لَعْنَتِیْ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ" (ص:۷۸) ''اور بے شک تجھ پر میری لعنت ہوگی قیامت کے دن تک'' اور شیطان کی طرف سے یہ درخواست رب اَنْظِرْنِیْ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ. (ص آیت نمبر ۷۹) ''کہنے لگا تو پھر مجھ کو مہلت دیجئے قیامت کے دن تک۔'' تو جب اس کی ایسی عجیب درخواست ایسے عجیب وقت میں قبول ہوگئی تو فرعون کی درخواست قبول ہونے میں کیا استبعاد ہوسکتا ہے۔

شیطان کے اس واقعہ سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں اول تو اس کی بے حیائی کہ جوتیاں سر پر پڑ رہی ہیں اور اس کو درخواست کرنے کی سوجھ رہی ہے۔ دوسرا اس کا وثوق کہ باوجود اس حالت کے بھی اس کو پورا یقین تھا کہ ضرور درخواست قبول ہوگی۔ تیسرے خدا تعالیٰ کا فضل وکرم کہ درخواست کے ساتھ ہی "اِنَّکَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ" ارشاد ہوا اور جب دشمن کے ساتھ یہ برتاؤ ہے تو دوستوں کو کب محروم کیا جاسکتا ہے۔

دوستاں را کجا کنی محروم　　تو کہ با دشمناں نظر داری

''دوستوں کو کب محروم کرو گے جبکہ دشمنوں پر آپ کی نظر عنایت ہے۔''

یہ قصہ مسلمانوں کے لیے بڑی خوشی کا ہے کہ جب اس بارگاہ میں دشمن کی دعا قبول ہوئی تو ہماری دعا کیوں قبول نہ ہوگی مگر یہ ضرور ہے کہ شیطان کے برابر اڑیل ہوجائیں۔ غرض جیسے فرعون کی ہمت تھی ویسی ہی آج کل کے ایثار والوں کی بھی ہمت ہے اور اگر فرعون کی وہ ہمت ہمت کہنے کے قابل نہیں تو ہمارا یہ ایثار بھی ایثار نہیں ہے۔

پس معلوم ہوا کہ جو اپنا خیر خواہ نہیں دوسروں کا بھی خیر خواہ نہیں ہے تو جو کچھ کر رہے ہیں محض رسم کے لیے کر رہے ہیں۔ یہ ہیں وہ صفات جن کو مدائح قرار دیا جاتا ہے ان کا مسلمانوں سے نفی کرنا اور دوسری قوموں میں مدائح کے شمار میں ثابت کرنا کہاں تک قابل قدر ہوسکتا ہے۔ ہم لوگوں کی زبانوں پر وہ الفاظ ہیں جو کہ جسد بلا روح ہیں کہ رات دن ان کو دہرایا جاتا ہے جس سے معلوم

ہوا کہ ان کی برابر کوئی دلسوز ہی نہیں لیکن جیسے حدیث میں آیا ہے کہ "**لایجاوز حناجرھم**" قلب پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا اور جب متکلم کے قلب پر اثر نہیں تو سامعین کے قلب پر کیا خاص اثر ہوسکتا ہے۔ غرض مسلمانوں کی کوتاہیوں کا بیان جو اس انداز تحقیر پر ہو وہ بے شک مذموم ہے اس سے تو احتراز واجب ہے لیکن اگر برائے شفقت ہو تو ضروری ہے اور اسی شفقت کی راہ سے خاص مسلمانوں کی شکایت ان کوتاہیوں کے متعلق بھی مضائقہ نہیں پس میرا تخصیص کے ساتھ یہ کہنا کہ مسلمانوں میں کوتاہیاں ہیں تخصیص کی نظر سے ہے کہ ہمارا خطاب اس وقت خاص مسلمانوں سے ہے اور اس موقع پر انہیں کی اصلاح مہتم بالشان ہے۔ اس مضمون کو اس قدر تفصیل سے بیان کرنے کا قصد نہ تھا۔ اتفاقاً اس میں تفصیل ہوگئی جو ان شاء اللہ تعالیٰ مفید ہوگی۔

دین کے تجزیہ کی صورتیں

اب اس کوتاہی کو جو یہاں مقصود بالذکر ہے عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ من جملہ ان موجودہ کوتاہیوں کے ایک کوتاہی یہ بھی ہے کہ ہم لوگوں نے دین کے اجزاء کو متفرق کر دیا۔ یعنی دین میں انتخاب کر لیا ہے جیسے کوئی چیز تقسیم ہوا کرتی ہے مثلاً انعام کی گھڑی، رومال وغیرہ میں سے ایک نے گھڑی لے لی، دوسرے نے مال، تیسرے نے کچھ اور چوتھے نے کچھ اور۔ اسی طرح یہ عمل ہمارے بھائیوں نے اس وقت مذہب میں کیا ہے کہ ایک نے دین کے ایک جزو کو لے لیا اور دوسرے نے دوسرے جزو کو۔ اسی کو قرآن میں فرمایا گیا ہے: "**جَعَلُوا الْقُرْآنَ عِضِيْنَ**" (الحجر آیت نمبر ۹۱) "جنہوں نے حصے کر رکھے تھے یعنی آسمانی کتاب کے مختلف اجزاء قرار دیئے تھے۔" اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے "**اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ**" (البقرہ آیت نمبر ۸۵) "(پس یوں کہو کہ کتاب (توریت) کے بعض (احکام) پر تم ایمان رکھتے ہو اور بعض پر ایمان نہیں رکھتے۔"

اس تفریق کی بہت سی صورتیں ہیں۔ ایک من جملہ ان کے یہ ہے کہ کچھ حصہ پر ایمان لایا جائے اور کچھ پر انکار کیا جائے، مسلمان اس سے تو بری ہیں۔ ایک یہ ہے کہ بعض کو چھوڑ دیا جائے، اس کی بہت صورتیں ہیں۔ ایک کو اس وقت بیان کیا جاتا ہے کہ بعض نے تو صرف اعمال بدنیہ کو دین سمجھا اور اعمال مالیہ کو دین سے خارج سمجھا اور یہ وہ لوگ ہیں جو کہ دیندار کہلاتے ہیں کہ انہوں نے دین کا مدار زیادہ تر اعمال بدنیہ کو سمجھا اور بعض نے تو فقط مالیہ کو اختیار کر کے دوسرے اجزاء کو خیر باد کہہ دیا۔ چنانچہ اس وقت دونوں قسم کے لوگ موجود ہیں۔ بعض رؤسا کہ ان کو مشقت اٹھانا دشوار ہے انہوں نے تجویز کر لیا کہ چار روپے کسی رفاہ عام کے کام میں دے دو۔ بس کافی ہے

اور دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ نفع متعدی نفع لازمی سے زیادہ انفع ہے۔

صاحبو! یہ بالکل وہی بات ہے کہ "کلمت حق ارید به الباطل" کیا اعمال مالیہ پر کار بندرہ کر اعمال بدنیہ کی ضرورت نہ رہے گی۔ ان کو وجوب ساقط ہو جائے گا۔ ذرا قرآن کو دیکھئے جہاں اٰتُوا الزَّكوٰةَ ہے وہیں اَقِيْمُوا الصَّلوٰةَ بھی موجود ہے۔ قرآن میں تامل کرنے کے بعد کسی کو ذرا بھی گنجائش اس کی نہیں مل سکتی ہے۔

رہا یہ شبہ کہ اگر قرآن میں کسی کو یہ گنجائش نہیں ملتی تو یہ ۷۲ فرقے کیونکر پیدا ہو گئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سب گنجائش قبل غور ہے جب تک غور نہ کیا جائے اس وقت تک قرآن کی حالت مردخی کی سی ہے کہ معتزلہ اس سے اپنے توہمات کو ثابت کر رہے ہیں اور قدریہ اپنے توہمات کو مجسمہ اپنے دعوے پر دلیل پیش کرتے ہیں اور معطلہ اپنے دعوے پر لیکن غور کرنے کے بعد سوائے مذہب حق کے کسی ایک کے مذہب کی بھی گنجائش کلام مجید میں ہرگز نہیں رہتی۔

آیہ یتدبرون القرآن کے معنی

ارشاد ہے: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا. (النساء آیت نمبر ۸۲)

"تو کیا پھر قرآن میں غور نہیں کرتے اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بکثرت تفاوت پاتے۔"

معلوم ہوا کہ یہ بات تدبر کے بعد نظر آتی ہے کہ اس میں اختلاف نہیں تو جو کچھ اختلاف ہے وہ بوجہ غور نہ کرنے کے ہے اور تدبر بھی اس شخص کا معتبر ہوگا جس کے پاس سامان تدبر بھی ہو۔ ہر کس و ناکس کا تدبر معتبر نہیں۔ آج کل کے عقلاء کا تدبر ایسا ہی ہوگا جیسا کہ ایک شخص نے گلستان کے اس شعر میں تدبر کیا تھا:

دوست آں باشد گیرد دست دوست — در پریشاں حالی و در ماندگی

کہ ایک مرتبہ ان کے ایک دوست پٹنے لگے اور خود بھی کچھ ہاتھ چلا رہے تھے۔ انہوں نے وہاں جا کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی پہلے سے بھی زیادہ پٹائی ہوئی کسی نے اس حرکت کی وجہ پوچھی تو کہا کہ میں نے شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول پر عمل کیا:

دوست آں باشد گیرد دست دوست — در پریشاں حالی و در ماندگی

"دوست وہ ہے جو اپنے دوست کا پریشانی و عاجزی میں ہاتھ بٹائے۔"

تو جیسا اس نے گلستان کو سمجھا ویسا ہی ہمارے بھائی قرآن میں تدبر کرنے والے موجود ہیں۔خدا تعالیٰ ان کو سلامت رکھے مگر باطنی سلامتی کے سائے کے ساتھ۔

ایک صاحب پنجاب میں مجھ سے ملے۔ کہنے لگے کہ تحقیقات جدیدہ سے یہ ثابت ہوگیا کہ تخم میں ایک نر اور مادہ ہوتا ہے۔میں کہتا ہوں خیر یہی ہو لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ قرآن میں بھی یہ مسئلہ موجود ہو مگر وہ کہنے لگے کہ میں نے سوچا کہ قرآن میں بھی کہیں اس کا ذکر ہے یا نہیں۔کئی مہینے تک سوچتا رہا لیکن کہیں نہ ملا۔سبحان اللہ! صاحبو! قرآن میں اس مسئلہ کو ڈھونڈنا ایسا ہے جیسے کوئی طب اکبر میں جوتے بنانے کی ترکیب ڈھونڈنے لگے۔کیوں صاحبو! اگر کوئی ایسا کرنے لگے تو عقلاء وقت اس کی نسبت کیا فتویٰ دیں گے' وہی فتویٰ اس کی نسبت بھی دینا چاہیے۔غرض کہنے لگے کہ مدت کے بعد ایک روز اتفاق سے میری بیوی قرآن پڑھ رہی تھی جب اس نے یہ آیت پڑھی:

سُبْحَانَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ. (یٰسٓ آیت نمبر ۳۶)

''وہ پاک ذات ہے جس نے تمام مقابل قسموں کو پیدا کیا' نباتات زمین کی قبیل سے بھی۔''

تو میں بہت خوش ہوا کہ قرآن میں یہ مسئلہ صریح موجود ہے۔

تو وہ بزرگ ازواج کے معنی خاص میاں بیوی اور نر مادہ سمجھے۔حالانکہ ازواج کے لغوی معنی جوڑ کے ہیں خواہ کسی چیز کا جوڑ ہو حتیٰ کہ ''ذوجی الخف والنعل'' بھی کہتے ہیں۔زوج کے معنی وہی ہیں جس کو فارسی میں جفت اور اردو میں جوڑا کہتے ہیں۔میاں بیوی کو بھی اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ بھی باہم جوڑا ہوتے ہیں' یہ نہیں کہ ہر جگہ میاں بیوی ہی کے معنی ہوں اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میری جفت پاپوش اٹھالاؤ یا یہ کہے کہ میرے جوتے کا جوڑا اٹھالاؤ تو کیا اس کے یہ معنی ہوں گے کہ میرے جوتے کی میاں بیوی اٹھالاؤ۔پس معنی آیت کے تو یہ ہیں کہ ہم نے نباتات کے جوڑے پیدا کیے کہ اگر ایک انار کھٹا ہے تو دوسرا میٹھا علی ہذا لیکن ان مجتہد صاحب نے ازواج کا ترجمہ زن وشوہر کیا اور قرآن میں اپنے نزدیک اس مسئلہ کو بھی داخل کر دیا تو اگر ایسے لوگ قرآن میں تدبر کریں گے تو قرآن کی جوگت ہوگی ظاہر ہے اور اس قسم کے تدبر کرنے والے اس سے پہلے بھی لوگوں میں ہوتے آئے ہیں۔

میرے ایک استاد بیان کرتے تھے کہ ان کے پاس ایک درزی بیٹھا ہوا تھا۔اس نے اول یہ پڑھا:

اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ.

''میں ایمان لایا اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر

اور اچھی بری تقدیر پر اور مرنے کے بعد اٹھائے جانے پر۔“

پھر ایک سرد آہ کھینچی اور کہنے لگا کہ مولوی صاحب! بادلوں کی بھی موت ہے یہ گت بعد الموت کی بنائی کہ عین کی جگہ الف پڑھ کر اس کی یوں تحلیل کی کہ بعد الموت۔

بہت لوگوں نے قرآن کی تفسیریں لکھنی شروع کردیں لیکن وہ تفاسیر اسی قسم کی ہیں۔ وجہ یہ کہ ان کے پاس سامان تدبر یعنی علم وتقویٰ نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ تدبر بھی ضروری ہے جس کو اس آیت میں فرمایا: اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ. اور پھر تدبر کے لیے سامان تدبر بھی ضروری ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔ پس اس آیت سے یہ ثابت ہوگئی کہ قرآن میں غور کرنے کے بعد اختلاف کی گنجائش نہیں رہتی اور جہاں بالکل صریح دلالت ہو وہاں تو تدبر کی بھی ضرورت نہیں۔

عبادات بدنیہ ومالیہ میں تفریق

چنانچہ عبادات بدنیہ ومالیہ کی تفریق کی غلطی پر ”وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ“(البقرہ آیت نمبر ۱۱۰)”اور نمازیں پابندی سے پڑھے جاؤ اور زکوٰۃ دیئے جاؤ۔“ صاف دال ہے کہ جہاں اٰتُوا الزَّکٰوۃَ کا حکم وہاں اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ بھی ہے یہ تو دنیادار امراء کا بیان تھا۔

دوسرے وہ لوگ ہیں جن پر دین داری کا بہت ہی غلبہ ہے۔ انہوں نے اپنے مذاق کے موافق ایک اور مسلک اختیار کیا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ دینداری جو کچھ ہے وہ جان سے کام لینے میں ہے۔ ان لوگوں نے طاعات مالیہ کو چھوڑ دیا۔ چنانچہ میں اپنے ہی کو کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص میری سوانح عمری لکھنے لگے تو اس کا آسانی سے پتہ بھی نہ لگے گا کہ فلاں جگہ دس روپے دیئے۔ اسی طرح ہم میں اکثر کی یہ حالت ہے۔ غرض اس تفصیل سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ ہم لوگوں نے دین کے اجزاء کو تقسیم کر رکھا ہے کہ ایک جزو کو ایک نے اختیار کرلیا اور دوسرے کو دوسروں نے۔ یہ ایک کھلی کوتاہی ہے۔ پھر اس کے تحت میں اور بہت سی جزئیات داخل ہیں۔

یعنی پھر خود عبادات بدنیہ میں بھی ایک تفریق کی ہے۔ مثلاً کسی نے وظیفہ کو لے لیا، کسی نے صرف قرآن کو لے لیا۔ ایک شخص کہتے تھے کہ میں اپنے مرشد کی تعلیم پر اس شدت سے پابند ہوں کہ نماز چاہے قضا ہوجائے لیکن مرشد کی تعلیم کبھی قضا نہیں ہوئی۔ اسی طرح اموال میں بھی تفریق کی ہے۔ چنانچہ بعض لوگ جب مرنے لگتے ہیں تو چونکہ کوئی اولاد نہیں ہوتی اس لیے وہ مسجد بنانا تجویز کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بعض جگہ نمازیوں کی تعداد سے مسجدوں کی تعداد زیادہ ہے۔ قصبہ آنولہ کی نسبت سنا ہے کہ وہاں بے حد مسجدیں ہیں اور غضب یہ ہے کہ باوجود اس کثرت کے

اب بھی اگر کسی کو اس طرف توجہ ہوگئی تو اپنی مسجد الگ ہی بنانے کی سوجھے گی اور مزا یہ کی نئی مسجد شروع کر کے پرانی کا سامان لینے پر نگاہ دوڑتی ہے کیونکہ چندہ تو اس قدر ہو نہیں سکتا۔ کام آ دھا رہ جاتا ہے اور اس وقت مولویوں سے اجازت لینے کی فکر کرتے ہیں کہ حضرت پرانی مسجد بالکل ویران ہے آباد ہونے کی امید نہیں کیا اس کا ملبہ نئی مسجد میں خرچ کر لیں۔

میں نے اپنے قصبہ میں دیکھا ہے کہ لوگوں نے ایک پرانی مسجد کو چھوڑ کر دس پندرہ قدم کے فاصلہ پر ایک نئی مسجد بنائی۔ اب چند روز سے لوگ اس پرانی کی درستی پر بھی متوجہ ہوئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ یا ایک پھر ویران ہوگی یا دونوں کی جماعتیں ٹوٹیں گی۔

کان پور میں ایک شخص نے مسجد بنائی۔ دوسری برادری کے بھائی نے اس کے مقابلہ پر ایک دوسری مسجد تیار کی۔ جب دونوں بن کر تیار ہوئیں تو نمازیوں کی فکر ہوئی۔ آخر یہ تجویز کیا گیا کہ نماز کے بعد شیرینی تقسیم کی جایا کرے تاکہ نمازی بڑھیں۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ اس قسم کے لوگ مسجد بنانا زیادہ ثواب سمجھتے ہیں کہ مسجد کے کام میں روپیہ صرف ہونے میں زیادہ ثواب ہے۔

اکثر ایسا ہوا کہ ایک شخص تیل لایا اور اس سے پوچھا گیا کہ اس کو طالب علموں میں صرف کر دیا جائے یا مسجد میں تو وہ مسجد ہی تجویز کرتا ہے بلکہ اکثر عوام الناس کا یہ خیال ہے کہ مسجد میں تیل جلنے سے قبر میں روشنی ہوتی ہے اسی بناء پر اگر کوئی مر جائے اور اس کا ثواب پہنچانا ہو تو کھانا مسجد ہی میں بھیجتے ہیں۔ دوسری جگہ دینے کو ویسا ثواب نہیں سمجھتے۔

اور اس میں ایک اور قید تراشی ہے کہ وہ کھانا بھی رات کے وقت بھیجا جائے۔ شاید یہ سمجھتے ہوں کہ دن کو تو آفتاب نکلا ہے اس کی کم و بیش روشنی تو ضرور ہی قبر میں پہنچتی ہوگی برخلاف رات کے کہ اس میں بالکل تاریکی ہوتی ہے اس لیے اس وقت اس طعام اور چراغ کے ذریعے سے روشنی پہنچے گی اور دن کی بھیجنا رات کے وقت نافع ہونے کی توقع پر شاید اس لیے پسند نہیں کرتے ہوں گے کہ خدا جانے وہاں کا انتظام کافی ہوگا یا نہیں تو ایسے وقت پہنچاؤ کہ فوراً ہی پہنچے۔ ایسا نہ ہو کہ کارکنان قضا و قدر کہیں رکھ کر بھول جائیں اور وہ مردہ ساری رات تاریکی میں رہے۔

اسی کے قریب قریب گڑ دینے کی رسم ہے یعنی یہ سمجھتے ہیں کہ سکرات موت کی تلخی اس سے دور ہوگی۔ صاحبو! گڑ تو وہاں پہنچتا نہیں اور یہ کہیں ثابت نہیں کہ میٹھی چیز کا ثواب بھی میٹھا ہوتا ہے۔

غرض اس قسم کی بہت سی خرافات لوگوں میں ہیں اور ان سب کے لیے مسجد ہی کو تجویز کیا ہے کیونکہ ان کے اعتقاد میں مسجد میں بھیجنے سے زیادہ ثواب ہوتا ہے اور مسجد میں بھی زیادہ تر ثواب

خاص منبر پر رکھنے سے سمجھا جاتا ہے مگر وہ بھی اس وقت تک کہ جب اس پر نیاز بھی دی جائے ورنہ ان کے خیال میں اتنا مال ضائع ہی گیا۔

کانپور میں ایک مرتبہ چند عورتیں کچھ مٹھائی لے کر عشاء کے بعد جامع مسجد میں آئیں۔ وہاں ہی مدرسہ کے طلبہ رہتے تھے۔ میں اس وقت مکان پر جا چکا تھا۔ صرف طلباء مسجد میں موجود تھے۔ طالب علموں کا فرقہ آزاد ہوتا ہی ہے وہ ان سے مٹھائی لے کر نیاز دیئے بغیر ہی سب کھا گئے' اس پر ان عورتوں نے بے حد شور و غل کیا' ان کی آواز سن کر ان کے گھر کے مرد بھی جمع ہو گئے۔ یہ ہنگامہ دیکھ کر ایک طالب علم میرے پاس دوڑا گیا اور کہا کہ مسجد میں اس قسم کا ہنگامہ برپا ہے اور یہ اس کی وجہ ہے۔

میں نے مسجد میں آکر دیکھا کہ بہت سے لوگ جمع ہیں۔ آخر میں نے اس وقت باقتضائے مصلحت طالب علموں کو برا بھلا کہا۔ ایک آدھ کو مارا بھی اور مٹھائی کی قیمت پوچھ کر طالب علموں سے سب قیمت دلوائی اور عورتوں کو سمجھا دیا کہ یہاں نہ لایا کرو۔ قیمت دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ صرف اڑھائی آنے کی قیمت تھی حالانکہ یہ مقدار کوئی ایسی مقدار نہ تھی جس سے اس قدر ہنگامہ کی نوبت آئی۔ نیز وہ انہی طالب علموں کے لیے لائی گئی تھی لیکن محض اس وجہ سے کہ نیاز نہ ہوئی ان عورتوں کے خیال میں ثواب نہ پہنچا تھا اور یہاں تک نوبت پہنچی۔ حالانکہ میں بقسم کہتا ہوں کہ اگر دس دفعہ بھی نیاز دیدی جائے لیکن کسی کو کھلایا یا دیا نہ جائے تو کچھ بھی ثواب نہیں پہنچتا اور ایک دفعہ بھی نیاز نہ دی جائے اور کسی مستحق کو دے دیا جائے تو ثواب پہنچ جاتا ہے۔

ایک ظریف درویش نے بیان کیا کہ ایک مقام پر فاتحہ تھی' ہم کو بھی بلایا گیا' کھانا چنا گیا تو فاتحہ شروع ہوئی۔ فاتحہ خواں نے حضرت آدم علیہ السلام سے نام گنوانے شروع کئے' بہت دیر ہو گئی تو میں نے کہا کہ صاحب! ساری دنیا کے نام تو شمار کئے جاتے ہیں مگر ہمارا نام بھی تو لے لو کیونکہ جب تک ہم نہ کھائیں گے ان میں سے ایک کو بھی ثواب نہ پہنچے گا۔ اس پر وہ لوگ خفا تو بہت ہوئے کہ یہ وہابی ہے لیکن فاتحہ کا سلسلہ جلدی ختم ہو گیا۔ غرض عام طور پر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ بدون نیاز کے ثواب نہیں ہوتا۔ نیز اس میں قوانین بھی ایجاد کئے گئے ہیں۔

چنانچہ مجھ سے ایک شاہ صاحب نے ارشاد فرمایا کہ گیارہویں اٹھارہ تاریخ تک جائز ہے اس کے بعد جائز نہیں۔ گویا یہ نماز کا وقت ہے کہ فلاں گھنٹے تک رہے گا اس کے بعد نہ رہے گا۔ صاحبو! یہ عقائد روکنے کے قابل ہیں یا نہیں' اگر کوئی کہے کہ ہمارا یہ عقیدہ نہیں ہے تو سمجھو کہ لوگ تم کو دیکھ کر یہ عقائد پیدا کر لیں گے۔

شریعت سے دوری

صاحبو! عوام الناس اس قدر حد سے نکل گئے ہیں کہ شریعت سے بہت دور جا پڑے۔ غضب ہے کہ بعض مقامات پر خدائی رات منائی جاتی ہے اور صبح کو اللہ تعالیٰ کی سلامتی کے گیت گاتے ہوئے مسجد میں آتے ہیں اور آ کر جھک کر سلام کرتے ہیں۔ غرض مسجدوں کی بابت یوں سمجھتے ہیں کہ گویا نعوذ باللہ خدا تعالیٰ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ سو بعض نے اموال کا مصرف مسجد ہی کو قرار دیا ہے۔ بعض لوگوں نے انجمنوں یا مدارس کو لیا، خواہ وہ مدارس دینی ہوں یا دنیوی لیکن ان میں جنہوں نے مدارس دنیوی کو لیا وہ تو کبھی اکھڑ کر بھی مسجد کی طرف نہیں گرتے۔ پس انہوں نے مدرسہ سنبھال کر مسجد کو چھوڑ دیا۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ قوم سے جس طرح ہو چندہ جمع کیا جائے خواہ وہ شریعت کے موافق ہو یا شریعت کے مخالف ہو۔ یعنی یہ لوگ دباؤ ڈال کر چندہ وصول کرتے ہیں جو کہ شریعت سے بالکل ہی حرام ہے اور غضب یہ کرتے ہیں کہ اگر کوئی غریب آدمی چار آنے دے دے تو ان کی نمائشی قدر اس طرح کی جاتی ہے کہ اس کو نیلام کیا جاتا ہے اور ظاہر یہ کیا جاتا ہے کہ اس کی قدر کی گئی کہ یہ غریب کا عطیہ ہے حالانکہ مقصود محض اس بہانہ سے بڑی رقم وصول کرنا ہے۔ صاحبو! ان لوگوں سے غریبوں کی کیا قدر ہوگی۔ غریبوں کی قدر وہ کرے گا جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرے۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ بیمار ہو گئے تو صاحبزادے نے شکریہ میں بہت لوگوں کی دعوت کی۔ مولانا نے اپنے ایک خاص خادم سے فرمایا کہ جب غریب لوگ کھانا کھا چکیں تو ان کے سامنے کا بچا ہوا کھانا جو کہ سقوں کو دیا جاتا ہے وہ سب میرے پاس لے آنا کہ وہ تبرک کھاؤں گا اور خیال نہ کرنا کہ ان کا بدن صاف نہیں، انکے کپڑے صاف نہیں اور اس کو تبرک اس لیے قرار دیا کہ اول تو وہ لوگ مومن ہیں۔ دوسرے ان کی یہ شان ہے کہ حدیث قدسی میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے: "انا عندالمنكسرة قلوبهم"[1] اسی لیے حدیث میں آیا ہے: "یا عائشة قربی المساکین"[2] چنانچہ وہ کھانا حضرت کے پاس لایا گیا اور حضرت نے اس کو نہایت رغبت سے کھایا تو کیا کسی نے اس قسم کی قدر غریبوں کی کر کے دکھائی ہے؟

مگر اس قدر دانی کی بھی نئی نئی فریب آمیز صورتیں ایجاد ہو رہی ہیں۔ حتیٰ کہ اس کی ایک

---

[1] (الاسرار المرفوعة لعلی القاری ۱۱۷، ۱۱۸، ۳۷۲، کشف الخفاء للعجلونی ۱: ۲۳۴، ۴۴۹)

[2] (لم أجد الحديث فی الموسوعة)

چونی کو سینکڑوں روپیہ سے فروخت کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس میں علاوہ تلبیس کے ربوا بھی لازم آتا ہے کیونکہ اس صورت میں تفاضل ہو جاتا ہے اور تفاضل ایک جنس میں ربوا ہے اگر ربوا کا کوئی علاج بھی کرلیں تو تلبیس کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔

ایک مقام پر ایسا ہوا کہ ایک چونی فروخت ہونے لگی۔ ایک غریب آدمی نے جو سبق پڑھا ہوا تھا اس پر ایک ہزار روپیہ لگا دیا اور بیچنے والوں نے اسی کے نام پر نیلام ختم کر دیا۔ جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ چونی میرے نام پر ختم ہو گئی ہے تو رونے لگا۔ لوگوں نے رونے کی وجہ پوچھی۔ کہنے لگا کہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے میں نے تو صرف اس لیے ایک ہزار کہہ دیا تھا کہ لوگ سن کر اس سے آگے بڑھیں گے، انجمن والوں کا فائدہ ہو جائے گا۔ آخر ایک صاحب اٹھے اور فرمایا کہ قوم میں کوئی ایسا نہیں جو اس عالی ہمت غریب کا قرضہ اپنے ذمہ لے لے۔ غرض اس غریب کے واسطے پھر چندہ کیا گیا اور اس طرح پر ایک ہزار کی تعداد پوری کی گئی۔

جائے غور ہے کہ یہ کارروائی صدق سے کس درجہ بعید ہے اور صاحبو! یہ صدق ہی وہ چیز ہے جو کہ آج مسلمانوں سے بالکل مفقود ہے کہ اب ان کی ہر بات میں ایک پہلو ہوتا ہے۔ ہاں مخلصین میں اب بھی بحمد اللہ یہ صدق باقی ہے۔ غرض یہ حالت چندہ کی ہوتی ہے اور اس مذاق والوں کی یہ حالت ہے کہ گویا یہ کام کرلیا تو دین پر پورا عمل کرلیا۔ نہ ان کی پھر نماز کی ضرورت ہے نہ روزہ کی اور اگر نماز پڑھتے بھی ہیں تو گھروں میں۔ گویا مسجد میں آنے کی ان کو بالکل معافی ہے۔

امراء کے لچر حیلے

ایک رئیس صاحب کہنے لگے کہ مسجد میں کس طرح جائیں، وہاں نہ چٹائی ٹھیک ہے نہ وہاں فرش پنکھے کا انتظام ہے جگہ جگہ کائی جم رہی ہے گھر پر ہر طرح کی آسائش ہے۔ میں نے کہا ذرا سنبھل کر شکایت کرو، یہ تم کس کی شکایت کرتے ہو۔ غریبوں کی یا خدا تعالیٰ کی سو غریبوں کی شکایت تو اس لیے نہیں ہو سکتی کہ ان کے پاس اتنی وسعت ہی نہیں کہ وہ سب سامان کر سکیں۔ خدا تعالیٰ کی شکایت اس لیے نہیں ہو سکتی کہ یہ خدا تعالیٰ کا اول تو کام ہی نہیں تمہارا کام ہے۔ دوسرے خدا تعالیٰ کیا فرشتوں سے یہ کام لیں۔ یہ بھی خدا کا کرنا ہے کہ تم کو حکم دیا خدمت مساجد کا اور اس کے لیے وسعت مالی دی۔ پس یہ معلوم ہوا کہ تمہاری ہی کوتاہی ہے اس لیے تم اپنی ہی شکایت کر رہے ہو۔ اگر تم مسجد میں جاتے تو تم کو اس کی حس ہوتی اور خیال پیدا ہوتا اور لطف یہ کہ بعضے لوگ مسجد کی مدد تو کیا کرتے، الٹا مسجد کی چیزیں اپنی ملک کے طور پر سمجھتے ہیں اور منگا منگا کر اپنے اپنے کاموں میں لاتے ہیں اور

اگر کوئی رو کے تو اس غریب پر خفگی ہوتی ہے کہ مسجد کیا تمہاری ملک ہے؟ نہیں صاحب! مسجد تمہاری ملک ہے کہ اس کی چیزیں تم خوب استعمال کرو کبھی مسجد میں کچھ دینے کی بھی توفیق ہوئی؟

ایسے لوگوں کی حالت بعینہ اس قصائی کی سی ہے کہ اس کا ایک رشتہ دار قصائی مر گیا۔ اس کی بیوی یہ کہہ کر روتی تھی کہ ہائے! تیری چھریاں کون لے گا؟ تیرے مویشی کون لے گا؟ وہ شخص ہر بات کے جواب میں بول رہا تھا کہ میں لوں گا' اس پر وہ عورت نوحہ میں بولی کہ تیرا قرضہ کون دے گا' تو وہ صاحب کہنے لگے بولو بھائی کس کی باری ہے؟

تو یہی حالت ہماری مساجد کے ساتھ ہے کہ خدمت کا بار تو دوسروں پر اور چیزیں برتنے والے یہ۔ حتیٰ کہ بعض لوگ تو تختے بھی لے جاتے ہیں اور یہ تو دینداروں میں بھی مرض ہے کہ مسجد کا گرم پانی منگا لیتے ہیں۔

غرض میں نے ان سے کہا کہ مسجد کی یہ حالت تو تمہاری ہی بدولت ہے۔ کہنے لگے کہ مولوی تو مسجد میں فرشی پنکھا لگانے سے منع کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں اجازت دیتا ہوں تم لگا لو۔ کہنے لگے کہ لوگ شور وغل کریں گے اور مجھ پر اعتراض کریں گے۔ میں نے کہا ان شاء اللہ تعالیٰ چار دن میں جب نماز کی برکت سے قلب پر عبدیت کا اثر ہوگا تم خود ہی اس مخدومیت کو چھوڑ دو گے۔ کسی مولوی کو منع کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔

حاصل یہ کہ اسی قسم کے لوگ دین صرف اسی کو ہی کہتے ہیں کہ کچھ روپیہ خیرات کر دیا جائے اور بعضے ان سب سے نرالے وہ لوگ ہیں کہ وہ نہ اعمال بدنیہ کریں نہ مالیہ۔ اگر ان کے پاس کچھ سرمایہ ہوا تو اس کو بینک میں جمع کر دیا' ان لوگوں کو منع کیا جاتا ہے تو منع کرنے والوں کو یہ لوگ تاریک خیال کرتے ہیں۔

ایک شخص نے اسی قسم کے ایک صاحب سے کہا کہ ہم نے سنا ہے تم سود لیتے ہو تو وہ جواب میں فرماتے ہیں کہ تم میری ذاتیات پر حملہ کرتے ہو' سبحان اللہ! امر بالمعروف ذات پر حملہ ہونا ہو گیا۔ آخر جب انہوں نے سمجھایا تو کہنے لگے کہ بھائی! یہ وقت جائز ناجائز کی تحقیق کا نہیں ہے اس وقت تو جس طرح ہو سکے روپیہ کمانا چاہیے۔

یہ مذکورہ بالا تو ان لوگوں کی حالت تھی جو دنیا کے مدارس قائم کرتے ہیں اور جو دین کے مدارس کے حامی ہیں انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جب ہم نے وعظ یا خطاب خاص سے دوسروں کو ترغیب دی تو ہم کو خود روپیہ دینے کی کیا ضرورت ہے۔ "الدال علی الخیر کفاعله"[1] کا ہی ثواب بہت ہے۔ الحاصل ہر ایک فرقہ نے اپنے خیال کے موافق دین کا ایک خلاصہ نکال رکھا ہے۔ تو صاحبو! یہ کتنی بڑی کوتاہی ہے۔

---

[1] (المعجم الکبیر للطبرانی ۶: ۲۳۰، ۱۷: ۲۲۷، ۲۲۸، مجمع الزوائد للهیثمی ۱: ۱۶۶، ۳: ۱۳۷، تفسیر القرطبی ۶: ۴۶، کنز العمال: ۱۶۰۵۲)

کوتاہی متعلق انفاق

مگر میں اس وقت ان مذکورہ اقسام میں سے بضرورت مقام اس کوتاہی کو بالخصوص بیان کرتا ہوں جو کہ غالب ہے۔ وہ یہ کہ مال کے خرچ کرنے کو مشکل سمجھتے ہیں۔ جہاں معلوم ہوا کہ اب چار پیسے خرچ کرنے پڑیں گے انہوں نے فوراً اپنی جان بچا کر اس موقع سے بھاگنے کی کوشش کی۔ ممکن ہے کہ اس خاص کوتاہی کے بیان کرنے سے کسی کو یہ شبہ ہو کہ محض چندہ مانگنے کے واسطے یہ وعظ کہا جاتا ہے۔ اگر تم تحریک چندہ کو پسند نہیں کرتے تو میں اس کے جواب میں کہتا ہوں کہ بیشک اس وقت ترغیب چندہ ہی کے لیے وعظ کہنا زیادہ مقصود ہے اور میں مطلق ترغیب کو ناپسند نہیں کرتا۔ ترغیب تو خدا تعالیٰ کے کلام مجید میں جگہ جگہ موجود ہے البتہ اس کو ایک خاص حد تک کلام مجید میں رکھا گیا ہے۔ یعنی اعمال کی دو قسمیں ہیں ایک بذل نفس ایک بذل مال۔ تو جو نسبت اس کو کلام مجید میں ہے اگر وہی نسبت کسی شخص کے وعظ میں بھی ہو تو اس کا کیا مضائقہ ہے اور اس نسبت کے محفوظ رہنے کا یہ طریقہ ہے کہ یا تو ایک ہی وعظ میں دونوں مضمونوں کو بیان کر دیا جائے اور یا کسی ایک وعظ میں بذل نفس کے متعلق بیان کر دیا جائے۔ چنانچہ اس وعظ سے زیادہ مقصود ترغیب ہے انفاق فی سبیل اللہ کے اور اگرچہ اکثر واعظین کی یہ عادت ہے کہ جب چندہ کی ترغیب دیتے ہیں تو شروع سے ترغیب کا مضمون بیان نہیں کرتے بلکہ اس کو موجب وحشت عامہ سمجھ کر یوں کرتے ہیں کہ بیان شروع دوسرے مضمون سے کرتے ہیں اور اس کو کسی جگہ جوڑ لگا کر اسی وعظ میں شامل کر دیتے ہیں اور میں اس طرز کا مخالف تو نہیں ہوں کیونکہ اس میں بھی مصلحت ہے مگر اس میں اتنا ضرور ہے کہ ایسے شخص کے ہر وعظ میں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ شاید اب چندہ کا ذکر چھیڑا جائے۔ اس لیے میں نے شروع ہی سے اس مضمون کو لیا اور پھر کہے دیتا ہوں کہ اس وقت محض چندہ کا بیان ہوگا جس کا جی چاہے سنے اور جس کا جی چاہے چلا جائے جو سنے گا اپنے نفع کے لیے سنے گا' ہمارا اس میں کوئی نفع نہیں اور نفع کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس وقت سننے والوں کو کوئی گٹھڑی انعام میں مل جائے گی مگر قرآن میں صاف ارشاد ہے:

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ. (البقرہ آیت نمبر ۲۷۲)

''اور (اے مسلمانو!) جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اپنے فائدے کی غرض سے کرتے ہو اور تم اور کسی غرض سے خرچ نہیں کرتے' بجز رضا جوئی ذات پاک حق تعالیٰ کے اور نیز جو کچھ مال خرچ کر رہے ہو یہ سب (یعنی اس کا ثواب) پورا پورا تم کو مل جاوے گا اور تمہارے لیے اس میں ذرا کمی نہ کی جاوے گی۔''

ان آیتوں میں غور کیجئے کہ کیا ارشاد ہوتا ہے۔ پس یہ شبہ کہ ہم نے تمہاری ہی زبان سے متعدد مرتبہ چندہ مانگنے کی ممانعت سنی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ مطلقاً ممانعت ہی سمجھ جانا یہ ناتمام مضمون سننے سے ناشی ہوا ہے۔ آیات بالا میں معلوم ہوگیا ہے کہ یہ مضمون بھی دین کا ایک جزو ہے۔ البتہ چندہ مانگنے کی متعدد صورتیں ہیں ان میں سے جو صورت شریعت پر منطبق نہ ہوگی وہ بیشک مذموم ہوگی باقی مذموم نہ ہوگی اور یہ قاعدہ کچھ چندہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ نماز روزہ میں بھی یہی قاعدہ ہے۔ مثلاً جو نماز شریعت پر منطبق ہوگی وہ محمود ہوگی ورنہ مذموم۔ مثلاً اگر کوئی شخص بے وضو نماز پڑھنے لگے یا قبلہ کی طرف پشت کر کے نماز پڑھنے لگے تو وہ نماز مذموم اور ناجائز ہوگی۔ اسی طرح یہ قاعدہ طاعات مالیہ میں بھی ہے کہ چندہ دینے کے جواز کے لیے کچھ شرائط ہیں اگر وہ پائی جائیں گی تو جائز ہوگا ورنہ ناجائز۔ پھر وہ کچھ چندہ ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہدیہ وغیرہ میں بھی وہی شرائط ہیں۔

اس وقت اکثر کمی یہ ہے کہ ان شرائط کا لحاظ نہیں کرتے اور یہ کمی زیادہ تر لینے والوں میں ہے دینے والے تو چونکہ حتی الامکان دیتے ہی کم ہیں اس لیے وہ اکثر ان خرابیوں سے بچے ہوئے ہیں۔ البتہ لینے والے بہت زیادہ مبتلا ہیں اور یہ کوتاہی دو جگہ ظاہر ہوتی ہے۔

قبولیت ہدیہ کی شرائط

کیونکہ معاملہ دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک تو وہ جو کہ بالعوض ہو دوسرے وہ جو کہ بلاعوض ہو۔ پہلی قسم میں بھی اگرچہ خرابیاں آج کل بہت ہیں مگر پھر بھی ایک حد تک اس میں جواز کی صورتیں بھی بکثرت معمول بہا ہیں لیکن بلاعوض میں تو بہت ہی بے احتیاطی کی جاتی ہے اور بلاعوض کی صورت دو ہیں ہدیہ یا چندہ۔ ان دونوں میں سراسر بے احتیاطیاں ہو رہی ہیں۔

چنانچہ ہدیہ میں ایک تو یہ بے احتیاطی کر رکھی ہے کہ کبھی کسی کا ہدیہ واپس ہی نہیں کیا جاتا جو شخص بھی ہدیہ پیش کرے اس کو فوراً قبول کر لیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص واپس کر دیتا ہو تو اس کو برا کہتے ہیں اور اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ صاحبو! رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال میں غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ہر ایک ہدیہ لینا بھی ناپسندیدہ ہے۔ ارشاد ہے:

مااتاک من غیر اشراف نفس فخذوہ و مالا فلاتتبعہ نفسک۔[1]

کہ جو بلا انتظار نفس آئے اس کو لے لو اور جو نہ آئے اس کی فکر میں نہ پڑو۔ اسی حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدیہ قبول کرنے کے متعلق ایک قید بتلائی ہے اس کو ادب سے تعبیر کیا

---

[1] (المسند للامام أحمد بن حنبل ۶:۴۵۲، مجمع الزوائد للهيثمي ۳:۱۰۱، بلفظ مختلف)

جائے یا شرط واجب ہے۔ میں اس وقت اس سے خالی الذہن ہوں جو کچھ بھی ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلا دیا کہ اشراف نفس سے بچنا چاہیے۔ میں نے اس سے ایک امر مستنبط کیا ہے۔ اگر استنباط غلط ہو تو اس کی اصلاح کر دی جائے۔ سو میں نے اس سے یہ قاعدہ سمجھا ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس آمد و رفت رکھو تو ہمیشہ ہدیہ لے جانے کے پابند نہ بنو بلکہ کبھی ہدیہ لے کر چلے جاؤ کیونکہ تجربہ بتلا رہا ہے کہ پابندی کی صورت میں جب اس شخص کی صورت نظر پڑے گی تو طبعاً ذہن میں یہ وسوسہ پیدا ہوگا کہ خدا جانے کچھ لایا ہے یا نہیں۔ یہی اشراف ہے تو اس کا علاج یا تو یہ ہے کہ نفس ایسا ہو جائے کہ اس میں اشراف ہی نہ ہو یا یہ کہ پابندی سے منع کر دیا جائے۔ چنانچہ میں نے اپنے لیے یہی تجویز کیا ہے بلکہ نہ لانا اکثر ہو تو زیادہ بہتر ہے۔

دوسری حدیث میں ہے: "**تهادوا تحابوا**"[1] تو ہدیہ دینے کی مصلحت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ازدیاد محبت کو قرار دیا ہے اور ازدیاد محبت اس وقت ہوتا ہے کہ ہدیہ لے کر جی خوش ہو اور جی اس وقت خوش ہوتا ہے کہ جب اشراف نفس نہ ہو ورنہ مسرت نہیں ہوتی بلکہ انتظار کی جو کلفت تھی وہ رفع ہوگئی تو اس حدیث سے یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ ہدیہ میں اشراف کی نوبت نہ آنی چاہیے۔ دوسرے اسی حدیث سے یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ بیعت کے وقت ہدیہ نہ لینا چاہیے کیونکہ اس کی بھی وہی حالت ہوتی ہے۔

جیسا کہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بھائی آج کل کے پیروں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اگر کوئی دیہاتی ان کے سامنے سر کھجانے لگے تو پیر صاحب کو خیال ہوگا کہ شاید یہ پگڑی میں سے روپیہ نکال کر دے گا واقعی بالکل سچ ہے۔

پیران باطل کی تمثیل

حرص و طمع نے ہماری وہ حالت بنا دی ہے کہ جیسے ایک مرید نے اپنے مرشد سے ایک خواب بیان کیا کہ میں نے خواب میں یہ دیکھا کہ میری انگلیاں نجاست سے بھر رہی ہیں اور آپ کی انگلیوں پر شہد لگا ہے۔ پیر صاحب سن کر کہنے لگے کہ اس کی تعبیر تو ظاہر ہے تو دنیا کا کتا ہے اور ہم اللہ والے ہیں۔ مرید نے کہا کہ حضور ابھی تو خواب پورا نہیں ہوا میں نے اسی میں یہ دیکھا ہے کہ آپ کی انگلیاں میں چاٹ رہا ہوں اور میری انگلیاں آپ چاٹ رہے ہیں۔ اس پر پیر صاحب بہت خفا ہوئے۔

غرض یہ خواب صحیح ہو یا غلط لیکن اس خواب سے مرید نے جس حالت کا فوٹو کھینچا ہے وہ بالکل مطابق واقع ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ مرید تو پیر سے دین حاصل کرنے کے لیے تعلق رکھتا

---

[1] (السنن الكبرىٰ للبيهقي ٦: ١٦٩، مجمع الزوائد للهيثمي ٤: ١٤٦، موطا امام مالك: ٩٠٨)

ہے اور پیر مرید سے دنیا مردار سمیٹنے کی فکر میں ہے۔

اسی قسم کے ایک پیر کے کوئی مرید تھے۔ ان سے کسی نے پوچھا کہ میاں تم کو پیر سے کچھ فائدہ بھی ہوا یا نہیں۔ مرید نے کہا کہ میاں صاحب جب سقاوہ ہی میں کچھ نہ ہوتو لوٹے میں کہاں سے آئے۔

اس موقع پر ایک حکایت یاد آئی۔ بلگرام میں ایک بزرگ تھے' ان کے پاس ایک شخص پڑھنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ حسب معمول ایک دن وہ پڑھنے کے لیے آئے تو دیکھا کہ استاد صاحب کے چہرہ پر ضعف کے آثار نمودار ہیں' دیکھ کر سمجھ گئے کہ آج شیخ کے ہاں کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ یہ دیکھ کر پڑھنے سے عذر کر دیا اور گھر واپس گئے اور وہاں سے کھانا پکوا کر لائے۔ جب کھانا پیش کیا تو شیخ نے کہا کہ کھانا تو عین حاجت کے وقت آیا ہے لیکن اس کے لینے سے ایک عذر شرعی مانع ہے' وہ یہ کہ جب تم واپس گئے تو مجھے اسی وقت یاد آیا کہ تم میرے لیے کھانا لینے کو جاتے ہو' تو یہ کھانا اشراف نفس کے بعد آیا ہے اور اس کا لینا حدیث کے خلاف ہے۔

وہ مرید بھی کیسے مؤدب تھے کہ اصرار نہیں کیا اور سینی لے کر فوراً اٹھ کر چل دیئے اور تھوڑی دور پہنچ کر پھر لوٹے اور آ کر عرض کیا کہ حضرت اب تو اشراف نفس نہیں رہا ہوگا کیونکہ میرے واپس لے جانے کے بعد آپ کو یقین ہو گیا ہوگا کہ اب وہ کھانا گیا۔ لہٰذا اب تو اس کو قبول فرما لیجئے۔ چنانچہ آپ نے قبول فرما لیا۔

سبحان اللہ! جب دل میں محبت ہوتی ہے خدمت کا طریقہ خود بخود سمجھ میں آ جاتا ہے۔ بقول شخصے

شوق در ہر دل کہ باشد رہبرے در کار نیست

''جس دل میں شوق موج زن ہو اس کو رہبر کی ضرورت نہیں ہے۔''

برخلاف آج کل کے اگر کوئی شیخ انکار کر دے تو مرید پھر بھی اس کو پریشان کرتا ہے۔

ہدایا کے آداب

اور ایک ادب ہدایا کا یہ ہے کہ دنیاوی حاجت کی آمیزش اس میں نہ ہو۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ آ کر ہدیہ دیتے ہیں پھر تعویذ لکھ دینے کی فرمائش کرتے ہیں۔ ایسے ہدیہ کو فوراً واپس کر دینا چاہیے۔

حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے آپ کو ایک اونٹ دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے عوض میں کئی اونٹ اس کو دیئے مگر وہ شخص راضی نہ ہوا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت رنج ہوا اور فرمایا کہ فلاں فلاں خاندان کے سوا کسی سے ہدیہ نہ لوں گا۔

وجہ اس کی یہی تھی کہ اس شخص نے دنیوی غرض سے ہدیہ دیا تھا اور اسی حدیث سے یہ بات بھی سمجھ

میں آئی کہ اکثر لوگوں سے اول ملاقات میں ہدیہ نہ لینا چاہیے کیونکہ اول ملاقات میں یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ ہدیہ دینے والے کی کیا نیت ہے۔ اسی لیے میں نے اپنا معمول مقرر کرلیا ہے کہ جو نیا شخص آتا ہے اس سے میں ہدیہ نہیں لیتا' البتہ اگر قرائن قویہ سے خلوص ثابت ہوجائے تو مضائقہ نہیں۔ رسم پرست لوگوں نے اس ہدیہ لے جانے کی وجہ یہ نکالی ہے کہ اگر پیر کے پاس خالی ہاتھ جاوے گا تو وہاں سے خالی ہاتھ آئے گا۔ چنانچہ اس کی نسبت مثل بھی مشہور ہے کہ خالی جائے خالی آئے اس لیے ضروری ہے کہ جاتے ہی پیر جی کی مٹھی گرم کردو اور اس مٹھی گرم کرنے کے محاورہ کی ایک اصل ہے وہ یہ کہ پیر زادوں نے اپنا راز چھپانے کے لیے لوگوں کو یہ تعلیم دی کہ مصافحہ میں ہدیہ دیا کریں تا کہ لوگوں کو پتہ نہ چلے۔

صاحبو! اول تو مصافحہ ایک مستقل عبادت ہے اس میں دنیا کے انضمام کے کیا معنی۔ دوسرے اس کی کیا خبر ہے کہ کوئی دوسرا شخص مصافحہ نہ کرے گا تو اگر کسی دوسرے نے بھی مصافحہ کرلیا تو اس کو معلوم ہوگا کہ پیر صاحب کو ہدیہ دیا گیا ہے' پھر اخفا کہاں رہا اور اگر دوسروں کو مصافحہ سے روکا جائے پھر تو خواہی نخواہی دال میں کالے کا شبہ ہوگا کیونکہ بعضی احتیاط سبب بے احتیاطی کا بن جاتی ہے۔

چنانچہ مشہور ہے کہ ایک شخص کا نکاح ہونے والا تھا اس نے کسی دوسرے سے ایک دوشالہ مستعار لے لیا۔ جب بارات گئی تو لوگ دولہا کو دیکھنے کے لیے آئے۔ ایک شخص نے پوچھا کہ دولہا کون ہے؟ تو صاحب دولہا کی طرف اشارہ کرکے فرماتے ہیں کہ دولہا تو یہ ہیں لیکن دوشالہ میرا ہے۔ دولہا نے کہا کہ یار تم بھی عجیب آدمی ہو' اسے ظاہر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کہنے لگے کہ اب ایسا نہ کروں گا۔ تھوڑی دیر میں اور کسی نے آکر پوچھا تو آپ فرماتے ہیں کہ دولہا تو یہ ہیں مگر دوشالہ میرا نہیں۔ اس پر دولہا اور بھی جھلایا کہ بندہ خدا تم کو اسکے ذکر ہی کی کیا ضرورت پڑی تھی۔ کہنے لگا کہ اب ان شاء اللہ تعالیٰ ایسا نہ ہوگا۔ کچھ دیر میں ایک صاحب نے آکر پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ دولہا تو یہ ہیں مگر دوشالہ کا کچھ ذکر نہیں۔ آخر دولہا نے غصہ میں آکر دوشالہ اس کے اوپر پھینک دیا۔

تو جیسے اس شخص کا یہ کہنا کہ دوشالہ میرا نہیں یا دوشالہ کا ذکر ہی نہیں بظاہر احتیاط تھی مگر باعتبار اثر کے پوری بے احتیاطی تھی۔ اسی طرح دوسرے سے مصافحہ نہ کرنا بھی اظہار ہوگا۔ ہدیہ کا جب اظہار ہوگیا تو پھر اخفاء کہاں رہا۔ نیز جب دوسروں کے بھی مصافحہ کا احتمال ہے تو مرید صاحب کو یہ ڈر بھی تو ہونا چاہیے کہ اگر کوئی شخص پیر کے ہاتھ سے لے کر بھاگ جائے تو کیا کرلیں گے کیونکہ جب اخفا کرکے دیا گیا ہے تو ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں کہ ہمارے ہاتھ میں کچھ تھا اور اگر کہئے کہ ہم دوسرے کے مصافحہ کرنے سے پہلے جیب میں رکھ لیں گے تو میں کہوں گا کہ مصافحہ میں لینے کی مصلحت تو فوت ہوگئی کیونکہ جب جیب

میں رکھا گیا تو بھانڈا تو پھوٹ گیا اور اگر میری یہ رائے غلط ہے تو اس کی غلطی ظاہر کر دی جائے۔

غرض بعض لوگ یہ تعلیم کرتے ہیں کہ جب پیر کے پاس جاؤ تو کچھ لے کر ضرور جاؤ ورنہ جو خالی جائے وہ خالی آئے۔ یہ کلمہ تو ٹھیک ہے مگر اس کا مطلب لوگوں نے غلط سمجھا۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ جو خلوص سے خالی جاوے گا وہ خالی آوے گا۔ اگرچہ پیر کو روپیہ بھی کیوں نہ دیا ہو۔ غرض خلوص نہ ہونے سے تو فیض سے بھی خالی رہا اور روپیہ دے کر اس سے بھی خالی ہو گیا۔

اور ایک بات بھی ہدیہ کے متعلق کہنی ضروری ہے کہ بعض اوقات جو چیز ہدیہ میں دی جاتی ہے وہ مقدار میں اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ اس کا لینا گراں معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص نے دس روپیہ لا کر پیش کیے تو بعض دفعہ کسی وجہ سے ان کے لینے سے طبیعت پر گرانی ہوتی ہے اس کے متعلق میں مدت سے سوچا کرتا تھا کہ اگر ہم واپس کرنا چاہیں تو کسی شرعی قاعدہ کے تحت میں اس واپسی کو داخل کریں۔ مگر الحمد للہ یہ بھی حدیث سے سمجھ میں آ گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: "لایرد الطیب فانہ خفیف المحمل[1]" اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رد کرنے کی علت طیب کے خفیف المحمل ہونے کو قرار دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ علت نہ پائی جائے بلکہ اس کے خلاف طبیعت پر گرانی اور بار گزرے تو ایسی چیز کا واپس کر دینا جائز ہو گا۔ میں نے اس کا ایک تخمینی معیار قائم کر لیا ہے۔ وہ یہ کہ کسی شخص سے اس کی ایک دن کی آمدنی سے زیادہ نہ لیا جائے۔ گویا اگر کسی شخص کی تنخواہ ۳۰ روپیہ ماہوار ہے تو اس سے مہینہ بھر میں صرف ایک روپیہ ہدیہ میں لینا مضائقہ نہیں۔

اور اگر کوئی کہے کہ جب ایک شخص جوش طبیعت سے اس سے زیادہ دینا چاہتا ہے تو انکار کی کیا ضرورت۔ تو سمجھو کہ جس جوش میں مصالح کی رعایت نہ ہو وہ جوش نہیں بلکہ جنون ہے۔ جس کی اصلاح کرنا واجب ہے اور اسی موقع پر ایک اور امر کو بھی جو کہ ہدیہ صدقہ وغیرہ سب میں مشترک ہے سمجھ لینا چاہیے۔ وہ یہ کہ ہدیہ، صدقہ، چندہ، قرض غرض جو طریقہ وادوستد کا ہو، حرام مال میں نہ ہونا چاہیے۔ اگر کوئی حرام میں دینا چاہے تو صاف انکار کر دے۔ یہ تو ضروری امور ہدیہ کے متعلق تھے۔

چندہ کی تحصیل کی شرائط

دوسرا امر جس میں بے احتیاطی کی جاتی ہے وہ چندہ ہے اس میں ایک تو یہ ضروری ہے کہ وسعت سے زیادہ نہ لے۔ چنانچہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے وسعت سے زیادہ نہیں لیا سوائے ان

---

[1] (لم أجد الحدیث فی الموسوعة) [2] (المسند للامام أحمد بن حنبل ۵: ۷۲)

لوگوں کے جن پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا اطمینان تھا کہ ان کی قوت توکل کی کامل ہے۔ جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا کل سرمایہ قبول فرمالیا ہے۔ ایک شرط یہ ہے کہ چندہ دینے والے کی طبیعت پر گرانی نہ ہو یعنی ان طرق سے بچے جن میں دینے والے کی طبیعت پر بار پڑنے کا احتمال ہو کیونکہ حدیث میں ہے: "الایحل مال امرء لابطیب نفسه"[1]

ایک شرط یہ ہے کہ اپنی مذلت نہ ہو کیونکہ بعض طریقے ایسے بھی چندہ لینے کے ہیں کہ ان میں دینے والے پر بار تو نہیں ہوتا مگر لینے والا نظروں سے گر جاتا ہے۔ حدیث شریف میں جو سوال کی ممانعت آئی ہے وہ اسی بناء پر ہے اور اسی وجہ سے جہاں نہ گرانی ہو نہ مذلت وہاں حاجت کے وقت طلب کرنا درست ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ اگر مانگو تو صلحا سے مانگو۔ ہم لوگ جو مدعی اصلاح ہیں اس حدیث کو سن کر بہت متفکر ہوں گے کہ خدا خیر کرے۔ اب سائلین کا ہجوم ہوگا اور فرمایا کہ یا بادشاہ سے مانگو۔

خلاصہ یہ ہے کہ یا تو اہل اللہ سے مانگو یا بہت بڑے امیر سے۔ اس کا راز یہ ہے کہ سوال کی حرمت کی وجہ دو ہیں۔ ایک ذلت دوسرے مخاطب کی گرانی طبع کا احتمال۔ لیکن یہ علی سبیل منع الخلو ہیں۔ علی سبیل منع الجمع نہیں اور جب علت مرتفع ہوگی معلول بھی مرتفع ہوگا۔ تو جب بادشاہ سے مانگا تو نہ ذلت ہوئی نہ گرانی۔ گرانی تو اس لیے نہ ہوگی کہ جس کے پاس کروڑوں موجود ہیں وہ اگر دس پانچ دے دے تو اس کے خزانہ میں کیا کمی آتی ہے اور ذلت اس لیے نہیں کہ بادشاہ خود اتنا بڑا رتبہ رکھتا ہے کہ یہ اس کی نظر میں چڑھا ہی کب تھا کہ آج نظروں سے گر گیا اور بزرگوں سے مانگنے کی اجازت بھی اسی لیے ہے کہ ان سے مانگنے میں مذلت تو اس لیے نہیں ہوسکتی کہ وہ سب سے کم اپنے کو سمجھتے ہیں۔ دوسرے ترحم ان میں بہت ہوتا ہے' ہر ایک پر ان کو ترحم ہوتا ہے' وہ کسی کو کیوں ذلیل سمجھنے لگے اور گرانی اس لیے نہیں ہوگی کہ وہ ہر چیز سے بالکل آزاد ہیں اگر ان کو نہ کرنا ہوگی وہ آزادی سے جواب دے دیں گے کسی سے وہ کیوں دبیں گے۔ اس لیے گرانی ان کے پاس بھی نہیں آتی ان کی سادگی و آزادی کی وہ حالت ہے کہ:

دل فریبان بناتی ہمہ زیور بستند　　　دلبر ماست کہ باحسن خداداد آمد

"خودرو پودے زیور سے آراستہ ہیں کہ ہمارے محبوب میں خداداد حسن ہے۔"

زیر بارند درختاں کہ ثمر ہادارند　　　اے خوشا سرو کہ از بند غم آزاد آمد

"پھل دار درخت زیر بار ہیں سرو بہت اچھا ہے کہ ہر غم سے آزاد ہے۔"

اور ان کی یہ حالت ہے کہ:

---

[1] (المسند للامام أحمد بن حنبل ۵: ۷۲)

گردو صد زنجیر آری بگسلم　　　غیر زلف آں نگارے دلبرم

''اگر دو سو زنجیریں ہوں تو توڑ دوں سوائے اپنے محبوب کی زلف کے بندش کے، یعنی سوائے اپنے محبوب کا کسی اور کا گفتار ہونا برداشت نہیں''

یعنی بجز احکام خداوندی کی قید کے اور کوئی قید بھی ان کو مقید نہیں کر سکتی۔ بڑی قید ننگ وناموس کی ہوتی ہے اس کو وہ مٹا ہی چکے جس کا طریقہ وہ ہے جو اس شعر میں مذکور ہے:

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما　　　اے طبیب جملہ علت ہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموس ما　　　اے تو افلاطون و جالینوس ما

''اے عشق تو ایسا ہے کہ تیری بدولت خیالات درست ہو جاتے ہیں اور تجھ سے سب امراض کا علاج ہو جاتا ہے۔ اے عشق تو ہمارے لئے نخوت وناموس کی دوا ہے تو ہمارے لیے افلاطون اور جالینوس ہے۔'' دیگر

ہر کرا جامہ زعشقے چاک شد　　　اوزحرص و عیب کلی پاک شد

''جس کو محبوب حقیقی کا عشق ہو جائے وہ حرص تمام نقائص اور اخلاق ذمیمہ سے بالکل پاک ہو جاتا ہے۔'' اس سے ان کی یہ حالت ہے:

ساقیا برخیزد دردہ جام را　　　خاک برسر کن غم ایام را

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں　　　مانمی خواہیم ننگ و نام را

غرض وہ بالکل آزاد ہیں۔ ان پر کسی قسم کا دباؤ نہیں پڑ سکتا۔ یہ ہے کہ جس کے سبب ان دونوں کو مستثنیٰ کر دیا گیا لیکن جب یہ علت معلوم ہوگی اور یہ اجازت اسی بناء پر ہے تو اگر ان دونوں میں بھی کہیں اس کا احتمال ہو تو ان سے بھی مانگنا جائز نہ ہوگا اور یہی وجہ تھی میری ممانعت کی چندہ سے ورنہ مطلق ممانعت ہرگز مقصود نہ تھی اور یہ سمجھ لیجئے کہ دین تو ہر وقت باعزت ہے لیکن ظاہر نظر میں اس کی عزت علماء کی عزت سے سمجھی جاتی ہے۔ اگر یہ لوگ نظروں سے گر گئے تو سمجھئے کہ دین نظروں سے گر گیا اور اس وقت جو دین نظروں سے گر گیا ہے یہ ہماری ہی بدولت اور محض ہماری صورت احتیاج بنانے کی وجہ سے ہے۔ اگر لوگ ہماری اس حالت کو دیکھ کر خود دین کی تعلیم کو موجب ذلت سمجھنے لگے اور ہم کو بھی اس احتیاج نے یہ نوبت پہنچائی۔ بقول شخصے

آنکہ شیراں راکند روبہ مزاج　　　احتیاج است احتیاج است احتیاج

''جو شیروں کو لومڑی مزاج بنا دیتی ہے وہ احتیاج ہی تو ہے۔''

مگر بعض ایسے صاحب ہمت بھی ہیں کہ وہ باوجود احتیاج کے بھی ذلت گوارا نہیں کرتے۔ ایک شہزادہ ایرانی کسی حادثہ سے آوارہ ہوکر لکھنؤ آیا وہاں ایک رئیس مسافرانہ وارد تھے۔ شہزادہ نے ان کی دعوت کی، دوسرے کسی موقع پر وہ حالت سفر میں پریشان ہوکر اتفاقاً ان رئیس کے گھر پہنچے۔ ایک مریل ٹٹو پر خستہ وزار سوار تھے۔ رئیس صاحب نے اس کی صورت دیکھ کر براہ تاسف کہا:

آنکہ شیراں راکند روبہ مزاج　　احتیاج است احتیاج است احتیاج

''جو شیروں کو لومڑی مزاج بنا دیتی ہے وہ احتیاج ہی تو ہے۔''

شہزادہ بگڑ گیا اور فی البدیہہ یہ جواب دیا کہ

شیر نر کے می شود روبہ مزاج　　مے زند بر کفش خود صد احتیاج

''شیر نر کب لومڑی مزاج ہوتا ہے وہ سو احتیاجوں کو جوتی پر مارتا ہے۔''

اور کہا کہ تم ہم کو غربت کی وجہ سے ذلیل سمجھتے ہو اور یہ کہہ کر چل دیا۔

تو جو لوگ مقتدا کہلائیں ان کے بڑی ضرورت اس کی ہے کہ وہ نظروں سے نہ گریں اور یہ امر حاصل ہوتا ہے استغناء سے۔ البتہ جب کبھی چندہ کی ضرورت ہو تو تحریک عام کا مضائقہ نہیں کیونکہ اس میں کوئی ذلت نہیں ہے۔ رہی تحریک خاص، اس میں اگر یہ یقین ہو کہ نہ میں ذلیل ہوں گا اور نہ مخاطب پر گرانی ہوگی تب تو جائز ہے اور اگر ان میں سے ایک کا بھی احتمال ہو تو ناجائز اور میں ہمیشہ ممانعت کیا کرتا ہوں وہ اسی تحریک خاص کی بعض صورتوں میں۔ یہ تو تحقیق ہے اس کی جو میں سمجھتا ہوں۔

رہا عمل، تو عمل کرنے میں اپنی اپنی رائے ہے۔ میں نے اپنے لیے یہ تجویز کرلیا ہے کہ تحریک عام میں تو کبھی رکا نہ جائے اور تحریک خاص کو مع دونوں قسموں کے ترک کردیا جائے۔ اس لیے میں تحریک عام کررہا ہوں، اس میں بحمد اللہ کوئی مضائقہ نہیں اور نہ یہ سوال ہے بلکہ دعوت الی الدین ہے۔

چندہ مشروعہ کی ترغیب

اس کے متعلق اس آیت میں کافی فیصلہ موجود ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتے ہیں:

اِنْ یَّسْاَلْکُمُوْھَا فَیُحْفِکُمْ تَبْخَلُوْا وَیُخْرِجْ اَضْغَانَکُمْ. (سورہ محمد آیت نمبر ۳۷)

''اگر تم سے تمہارے مال طلب کرے پھر انتہا درجہ تک تم سے طلب کرتا رہے تو تم بخل کرنے لگو اللہ تعالیٰ تمہاری ناگواری ظاہر کردے۔''

یہ تو سوال کرنے کے متعلق ارشاد ہے کہ اگر خدا تعالیٰ تم سے مانگے اور مبالغہ سے مانگے تو تم بخل کرنے لگو اور وہ تمہارے کینے کو ظاہر کردے۔ آگے فرماتے ہیں:

هَاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ یَّبْخَلُ وَمَنْ یَّبْخَلْ فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاللّٰهُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ثُمَّ لَایَكُوْنُوْا اَمْثَالَكُمْ. (سورہ محمد آیت نمبر ۳۸)

''ہاں تم لوگ ایسے ہو کہ تم کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے بلایا جاتا ہے سو بعضے تم میں سے وہ ہیں جو بخل کرتے ہیں اور جو شخص بخل کرتا ہے تو وہ خود اپنے سے بخل کرتا ہے اور اللہ تو کسی کا محتاج نہیں اور تم سب محتاج ہو اور اگر تم روگردانی کرو گے تو خدائے تعالیٰ تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کردے گا پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔''

دیکھئے! سوال کی تو نفی کرتے ہیں اور دعوت الی الانفاق کا اثبات فرماتے ہیں اور سوال کرنے پر بخل کرنے میں زیادہ مذمت نہیں فرماتے بلکہ ایک گونہ اس میں معذور رکھتے ہیں۔ چنانچہ ''فَیُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا'' میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے اور دعوت الی الانفاق میں بخل کرنے کی مذمت فرماتے ہیں کہ ''مَنْ یَّبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ'' کہ خدا تعالیٰ کو کوئی پرواہ نہیں ہے کیونکہ ''وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ثُمَّ لَایَكُوْنُوْآ اَمْثَالَكُمْ.'' کہ اگر روگردانی کرو گے تو خدا تعالیٰ تمہاری بجائے دوسری کسی قوم کو پیدا کردے گا جو کہ تمہاری طرح بخیل اور جان چرانے والے نہ ہوں گے اور تم سے ہر طرح افضل ہوں گے۔ دیکھئے ترغیب پر بخل کرنے سے کس قدر دھمکایا ہے کہ تمہارے تان گاڑی نہیں چلتی۔ دوسرے بھی ہزاروں خدمت گزار موجود ہیں۔

منت منہ کہ خدمت سلطان ہمی ہمی کنی   منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

''احسان مت جتاؤ کہ ہم بادشاہوں کی خدمت کرتے ہیں بلکہ احسان مانو کہ تم جیسے نااہلوں کو خدمت کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔''

خدا تعالیٰ ہی کا ہم پر احسان ہے ہم سے یہ کام لے لیا۔ تو اسی آیت میں خدا تعالیٰ نے فیصلہ کردیا کہ سوال اور چیز ہے اور وہ یہ ہے کہ جس میں احفاء ہو اور احفاء دو قسم کا ہے۔ ایک صوری دوسرا معنوی۔ جیسے وجاہت سے وصول کرنا کہ یہ بھی احفاء کی ایک فرد ہے۔ غرض جس میں ایلام قلب ہو وہ احفاء ہے اور اس پر تبخلوا کا ترتب کچھ بعید نہیں اور ایک ہی ترغیب اس میں بخل کرنا مذموم ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو صورتیں غیر مشروع ہیں وہ تو سوال میں داخل ہیں اور جو مشروع ہیں وہ ترغیب میں داخل ہیں۔

حب دین کی تمثیل

غرض میں آپ لوگوں کو ترغیب دیتا ہوں اور مجھے اس ترغیب کے متعلق بہت سے مضامین

محرکہ یاد نہیں ہیں، ہاں صرف یہ یاد ہے کہ:

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ. (البقرہ آیت نمبر ۲۶۱)

''جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کیے ہوئے مالوں کی حالت ایسی ہے جیسے ایک دانہ کی حالت جس سے (فرض کرو) سات بالیں اُگیں (اور) ہر بال کے اندر سو دانے ہوں اور یہ افزونی خدا تعالیٰ جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے ہیں جاننے والے ہیں۔''

اور اس مقام پر خدا تعالیٰ نے بہت دور تک انفاق فی سبیل اللہ کا حکم فرمایا ہے۔ یعنی یہ ربع سیپارہ اس انفاق کی فضیلت میں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ بہت بڑی ضروری چیز ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ ہماری حالت یہ ہے:

گر جاں طلبی مضائقہ نیست وزر طلبی سخن دریں است

''اگر جان مانگو تو مضائقہ نہیں اور اگر مال مانگو تو اس میں کلام ہے۔''

ہم لوگوں کو دین سے جو کچھ محبت ہے اس کا خلاصہ وہی ہے جو کہ مولانا نے مثنوی میں لکھا ہے کہ ایک شخص سفر میں چلا جا رہا تھا، راستہ میں دیکھا کہ ایک کتا پڑا ہوا سسک رہا ہے اور ایک آدمی اس کے پاس بیٹھا رو رہا ہے۔ مسافر نے اس شخص سے رونے کا سبب پوچھا، اس نے کہا کہ یہ کتا میرا بہت بڑا رفیق تھا، آج یہ مر رہا ہے، میں اس کے غم سے روتا ہوں۔ پوچھا کہ اس کو کیا بیماری ہے، کہا کہ صرف فاقہ، یہ واقعہ سن کر مسافر کو اس کی اور کتے کی حالت پر رحم آیا۔ قریب ہی ایک بورا بھرا ہوا تھا، مسافر نے پوچھا کہ میاں! اس میں کیا چیز ہے؟ اس شخص نے کہا کہ اس میں روٹیاں بھری رکھی ہیں۔ مسافر نے کہا، ظالم! کتے کے مرنے پر بیٹھا رو رہا ہے اور یہ نہیں ہوتا کہ اس بوری میں سے ایک روٹی نکال کر اس کو دیدے، کہنے لگا کہ جناب مجھے اس قدر محبت نہیں ہے کہ اس کے لیے روٹیاں بھی خرچ کرنے لگوں، روٹیوں کے دام لگے ہیں اور آنسو مفت کے ہیں۔

اسی طرح ایک شخص کی حکایت ہے کہ اس کا لڑکا بیمار ہوا، کسی نے ختم قرآن کی رائے دی اور کسی نے خیرات کا مشورہ دیا۔ تو اس نے قرآن تو پڑھوایا لیکن خیرات کا ایک پیسہ نہیں دیا۔ اسی طرح ہم لوگ محبت میں اس کے مدعی تو ہیں مگر پیسہ خرچ کرنے میں سب ختم ہو جاتی ہے۔

اور میں جو اس وقت ترغیب دے رہا ہوں اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تم ضرور ہی دو کیونکہ دین کا کام تو ان شاء اللہ تعالیٰ تمہارے نہ دینے کی صورت میں بھی ضرور ہی چلے گا۔ میں صرف اس لیے ترغیب دے رہا ہوں کہ یہ بھی ایک شریعت کا مسئلہ ہے جس کا پہچاننا ضروری ہے لیکن اس ترغیب کے ساتھ ہی محل صرف کا بتلانا بھی ضروری ہے۔

مگر اس کے بتلانے سے قبل میں یہ ظاہر کیے دیتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کہا ہے کسی کے کہنے سے نہیں کہا نہ آگے کسی کا کہا ہوا کہوں گا۔ ہاں! اس کی مجھے خبر نہیں کہ کسی نے تصرف باطنی سے میرے دل میں ڈالا ہو مگر میں یقین کے ساتھ اس کی بھی نفی کرتا ہوں کیونکہ بحمد اللہ ہمارے بزرگ ایسے نہیں ہیں کہ وہ اس قسم کے تصرفات سے کام لیں بالخصوص ایسے موقع پر کہ جہاں ان حضرات کو خلاف مرضی ہونے کا احتمال ہو۔ ہاں خدا تعالیٰ نے دل میں ڈالا اور میں نے بیان کیا۔

تو انفاق مالی مصارف کا فیصلہ یہ ہے کہ مفید انجمنیں، مدرسے، مسجدیں وغیرہ ہیں سب ضروری مگر جس وقت جو مصرف زیادہ ضروری ہو وہ زیادہ قابل توجہ ہے۔ میرے خیال میں اس مقام پر اس وقت میں مدرسہ مظاہر العلوم کے متعلق دار الطلبہ میں بڑی ضرورت ہے کماً بھی کیفاً بھی بلکہ مناسب ہو کہ لوگ اس کو دیکھ بھی لیں، لوگوں کے دیکھنے میں ان شاء اللہ تعالیٰ برکت ہوگی۔

دار الطلبہ کے فضائل

اس دار الطلبہ کے باب میں حدیث میں ہے: "او بیتاً لابن السبیل بناه"[1] یعنی اگرچہ وہ ابن السبیل فاسق ہو پھر بھی اس کے لیے گھر بنانے میں ثواب ہوگا چہ جائیکہ وہ طلبہ علم ہوں جو کہ اضیاف ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور پھر یہ بھی نہیں کہ یونہی سکونت رکھیں بلکہ قال اللہ اور قال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کا شغل رکھیں کہ اس کے برابر کوئی شغل ہی نہیں۔ حدیث میں ہے:

الدنیا ملعون ومافیها ملعون الا ذکر اللّٰه وما والاه اوعالم او متعلم.[2]

تو علم دین ذکر اللہ بھی ہے اور اس میں عالم و متعلم بھی جمع ہیں اور دوسرے متعلقین ماوالاہ بھی۔ غرض ذکر اللہ بھی اور ماوالاہ اور عالم و متعلم تو لعنت سے مستثنیٰ ہوئے۔ باقی سب موجب بعد عن الرحمتہ ہیں۔ اس سے بعض مخلصین کو اسباب دنیا کی نسبت سخت تشویش ہونا ممکن تھی۔ حضور صلی

---

[1] (سنن الترمذی: ۱۳۷۶، تفسیر ابن کثیر ۶:۵۵۱، التفسیر للبغوی ۱:۲۲۰، الترغیب والترهیب للمنذری ۱:۹۹، ۱۱۰، ۱۱۸) [2] (سنن ابن ماجة: ۴۱۱۲، کتاب التمهید، لابن عبد البر ۱۷:۳۱۴، کنز العمال: ۶۰۸۳، ۶۰۸۴، ۶۰۸۷)

اللہ علیہ وسلم نے اس کی کیسی تدبیر فرمائی۔ گویا ایک پاکیزہ کیمیا سکھلائی کہ اس دنیائے ملعون کو اگر ماوالاہ میں داخل کردیں تو پھر وہ سبب قرب ہوجائے گی تو اس سے زیادہ کیا کیمیا ہوگی کہ واسطہ لعنت کو قرب بنادیا اور وہ بھی ایک ذرا سی آنچ میں۔ مولانا اسی مضمون کو فرماتے ہیں:

عین آں تخلیل راحکمت کند　　عین آں زہر آب راشربت کند
آں گمان انگیز راسازویقیں　　مہرہا رویا نداز اسباب کیں

''عین اس خیال کو حکمت کہتے ہیں اور عین اس زہر کے پانی کو شربت بنادیتے ہیں اس گمان انگیز کو یقین کردیتے ہیں اور اسباب کینہ سے محبتیں پیدا کردیتے ہیں۔''

صدقہ جاریہ کے فضائل

لوگ مغرور نہ ہوں کہ ہم تو ان کاموں میں دیتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت بھی مدرسہ میں دیا ہے۔ لہٰذا ہم پہلے ہی داخل ہیں، سو جتنا دیا ہے وہ تو اس ترغیب سے نہیں دیا۔ اس پر دینا تو جب ہی سمجھا جائے کہ جنہوں نے مدرسہ میں کچھ دیا ہے وہ اسی قدر دارالطلبہ میں اور دیں اور جنہوں نے اب تک کچھ نہیں دیا وہ بھی حسب ہمت دیں اور جو نہیں لائے وہ وعدہ کرلیں مگر اس کا خیال رہے کہ نری زبان ہی نہ ہو بلکہ پورا بھی کریں۔ کوئی صاحب قلیل کثیر کا خیال نہ کریں۔ یہ صدقہ جاریہ ہے، جتنا ہوسکے اس کی کثرت کو غنیمت سمجھیں اور صدقہ جاریہ وہ چیز ہے کہ جب انسان مرجاتا ہے اور ذرہ ذرہ نیکی کو ترستا ہے اور سوچتا ہے کہ کاش اس وقت کوئی ایسی سبیل ہو کہ کوئی شخص ایک مرتبہ سبحان اللہ ہی کہہ کر بخش دے کہ بڑے بڑے اولیاء اللہ بھی احتیاط ظاہر کرتے ہیں۔

اے کہ برمامی روی دامن کشاں　　ازسر اخلاص الحمدے بخواں

''اے وہ شخص جو ہم سے دامن جھاڑ کر گزر گیا، ذرا ایک مرتبہ اخلاص سے ایک مرتبہ سورۃ الفاتحہ پڑھ کر اس کا ثواب ہمیں بخشتا جاتا''

کہ اگر اور کچھ نہیں تو ایک دفعہ الحمدللہ ہی پڑھتے جاؤ۔ آج جس الحمد کو ہم ہزار بار خود پڑھ سکتے ہیں بعد مرگ اس کو ایک مرتبہ دوسرے کی زبان سے پڑھنے کے لیے ترسیں گے تو یہ صدقہ جاریہ اس وقت کام آئے گا۔ نیز جس وقت قیامت کے روز اعمال پیش کیے جائیں گے اور دیکھے گا کہ میرے پاس کافی نیکیاں نہیں، اس وقت جب ورق اُلٹا جائے گا تو دیکھے گا کہ کسی جگہ بخاری شریف کا ثواب لکھا ہوا ہے کسی جگہ مسلم شریف کا ثواب لکھا ہوا ہے کہیں قرآن شریف پڑھنے کا ثواب لکھا ہے۔ علیٰ ہذا۔

صاحبو! اگر آج سے ہزار سال کے بعد قیامت آئے تو اس وقت تک اس مکان میں یا اس

مکان میں تعلیم پانے والوں کے سلسلہ میں جتنی مرتبہ بخاری کا ختم ہوگا اور جتنی مرتبہ مسلم شریف پڑھائی جائے گی برابر اس کی روح کو ثواب ملتا رہے گا اور قیامت کے روز اس کی غایت پریشانی کے وقت ان شاء اللہ تعالیٰ کہا جائے گا کہ تم نے جو دارالطلبہ میں مثلاً مدد کی تھی آج یہ پوٹ کی پوٹ ثواب کی اس کی بدولت تم کو مل رہی ہے۔ اس وقت خوش ہوگا اور زبان حال سے کہے گا:

جمادے چند دادم جاں خریدم　　　بحمد اللہ زہے ارزاں خریدم

''چند سکے دیئے اور جان خریدی اور بفضل اللہ بہت سستا سودا خریدا''

اور اس وقت معلوم ہوگا کہ ایک روپیہ یا دو روپے دینے سے کیا نفع عظیم حاصل ہوا۔

صاحبو! خدا تعالیٰ کا شکر کرنا چاہیے کہ اتنی بڑی دولت مفت میں ہاتھ آتی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض وہمی خیال مزاجوں کو شبہ ہو کہ جب اس مکان میں یہ کام یا خود یہ مکان نہ رہے گا تو کیسے ثواب ملے گا۔ تو اول تو اس کا گمان کرنا ہی برا ہے۔ یاد رکھو کہ نیک کام کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا کرتا۔

اگر گیتی سراسر باد گیرد　　　چراغ مقبلاں ہرگز نمیرد

''اگر دنیا سراسر ہوا بن جائے تب بھی مقبولین کا چراغ ہرگز نہیں بجھ سکتا۔''

غرض اس میں کبھی انقطاع نہیں ہوتا اور بالفرض ہو بھی تو یہ[1] قاعدہ مقررہ ہے کہ

''انما الاعمال بالنیات''

تو نیت تو دینے والوں کی ہمیشہ ہی کے لیے اس کی اعانت کرنے کی ہے اور اگر اسی پر مدار ہے کہ جتنے دن کام ہوا اتنے ہی دن کا ثواب ملے تو جنت دائمی کا استحقاق بھی نہ رہے گا کیونکہ جب سو برس تک نیکیاں نہیں کیں تو سو برس سے زیادہ جنت میں کیوں رہیں۔ حالانکہ جنت میں ابدالآباد رہنا ثابت ہے۔ تو اس نیت کی بدولت ہے کہ ہر مسلمان کی یہ نیت کہ اگر قیامت تک زندہ رہیں گے تو اس دین پر رہیں گے اسی لیے جزائے موبد ملتی ہے۔ اسی طرح یہاں بھی نیت تائید کی ہے۔ پس یہ وسوسہ غلط ٹھہرا۔ تو خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں خدا تعالیٰ نے اس تقسیم اور تجزیہ کا غلط ہونا ثابت فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے تمہارے نفسوں اور جانوں کو خرید لیا ہے تو دونوں کو جمع فرمانے سے یہ بتلا دیا کہ نہ صرف بذل مال کرنے والے معذور ہوں اور نہ صرف بذل جان کرنے والے بلکہ جب دونوں کا بذل ہوگا تو جنت کا استحقاق ہوگا۔

---

[1] (الصحیح للبخاری ۱:۲، ۸:۵،۱۷۵:۹،۲۹ سنن ابی داؤد: ۲۲۰۱، سنن الترمذی: ۱۶۴۷، سنن النسائی کتاب الطھارۃ ب ۵۹، کتاب الایمان والندب ۱۹، سنن ابن ماجہ: ۴۲۲۷)

توصاحبو! جنت ایسی سستی نہیں ہے۔ خوب سمجھ لو کہ:

الا ان سلعة اللّٰه غالية الا ان سلعة اللّٰه هی الجنة۔[۱]

اب میں طالب علموں کے کام کی بات بتلاتا ہوں کہ اس مقام پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ بذل نفس تو خاص خاص کاموں میں ہوتا ہے یعنی قتال جس کا آگے ذکر بھی ہے: "یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ" تو بذل نفس عام کیسے ہوا؟ تو سمجھو کہ خدا تعالیٰ نے خود آگے چل کر فرما دیا ہے: "اَلتَّائِبُوْنَ الْحَامِدُوْنَ الْعَابِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرَّاکِعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ" الخ (التوبہ آیت نمبر۱۱۲) "وہ ایسے ہیں جو (گناہوں سے) توبہ کرنے والے ہیں (اور اللہ کی) عبادت کرنے والے ہیں (اور) حمد کرنے والے رزوہ رکھنے والے رجوع کرنے والے (اور) سجدہ کرنے والے۔" یہ آیت اس شبہ کو زائل کر کے بتلا رہی ہے کہ یہ سب کام بذل نفس ہی میں داخل ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ دلیل ہے کہ آگے ارشاد ہوتا ہے وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ یہ المؤمنین اسی عن المؤمنین سابق کا اعادہ ہے۔ پس اس اعمال کے بعد یہ حکم دینا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان مؤمنین مذکورین کو بشارت دے دیجئے صریح طور سے دال ہے کہ جس اشتراء نفس و اموال کا اوپر ذکر تھا وہ یہ اعمال ہیں۔ پس یہ سب بذل نفس ہو گیا۔ اس تقریر سے یہ معلوم ہو گیا کہ تمام شریعت مطہرہ بذل نفس اور بذل مال کی تفصیل ہے۔ یہ تھا میرا مقصود اس وقت کے بیان سے۔

اب میں ختم کرتا ہوں اور یہ درخواست کرتا ہوں کہ پانچ روپے میری طرف سے بھی مدرسہ میں قبول ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ برکت دے۔ آمین! یارب العالمین!!

---

[۱] (تفسیر البغوی ۷: ۹، تفسیر ابن کثیر ۷: ۴۸۱، اتحاف السادة المتقین للزبیدی ۱۰: ۲۵۳)

تذکیر الآخرہ

قرآن مجید کو سائنس کی کتاب سمجھ لینا، اس میں سائنس وفلسفہ کے مسائل ڈھونڈنا اور کواکب وغیرہ کی تحقیقات کرنا بالکل ایسا ہے جیسے طب اکبر میں جوتے سینے کی ترکیب دیکھنا۔

قرآن مجید میں تو روحانی تربیت اور اصلاح کے نسخے ملیں گے۔ سائنس و فلسفہ سے اسے کیا تعلق!

خطبہ ماثورہ

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ.اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

فَقَدْقَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی کَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَۃَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَۃَ.

(القیٰمۃ آیت نمبر ۲۰، ۲۱)

ترجمہ: ’’(اے منکرو) ہرگز ایسا نہیں بلکہ تم دنیا سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ بیٹھتے ہو۔‘‘

تمہید: میں اس وقت جس مضمون کو بیان کرنا چاہتا ہوں وہ ایک نہایت ضروری مضمون ہے اور مولوی شبیر احمد صاحب کی تقریر ’’دارالاخرۃ‘‘ کا گویا تتمہ ہے۔ مولوی صاحب نے اپنی تقریر میں اعتقاد آخرت کا بیان کیا ہے۔ میں آخرت کے متعلق عمل کا بیان کرنا چاہتا ہوں جو آیت میں نے اوپر بیان کی ہے اس میں خداوند تعالیٰ زجر و توبیخ کے ساتھ فرماتا ہے کہ تم لوگ اس کو پسند کرتے ہو جو عاجلہ ہے اور آخرت کو چھوڑے دیتے ہو حاصل اس کا یہ ہے کہ جو لوگ دنیا کو لئے ہوئے ہیں اور دنیا میں مبتلا ہیں اور آخرت کو چھوڑے بیٹھے ہیں ان کے لیے اس آیت میں تنبیہ ہے۔ پہلا مضمون (مولوی شبیر احمد صاحب کا مضمون) علمی تھی اور یہ گویا عملی ہے اور چونکہ مقصود علم سے عمل ہی ہے اس لیے یہ میرا مضمون گویا اس مضمون کا متمم ہے اور ہر چند کہ بعض علوم ایسے ہیں جو قطع نظر عمل سے خود من حیث العلم بھی مقصود ہیں اور اسی لئے حکماء نے بھی اپنے فنون کے مثلاً طب ہی کے دو جزو قرار دیئے ہیں علمی اور عملی اور تمام دنیا اس تقسیم کو مانتی ہے اور یہ دونوں ہی مطلوب ہیں لیکن تاہم وہ علوم مقصود بھی نظر غائر میں کسی نہ کسی عمل سے من وجہ ضرور تعلق رکھتے ہیں مثلاً خدا کے ایک ہونے کا اعتقاد ایک مقصود ہے مگر عمل میں بھی اس کا ایسا خاص اثر ہے کہ جس درجہ کا یہ اعتقاد ہوتا ہے اسی درجہ تک اس عمل کا ثواب بڑھ جاتا ہے۔

عارف اور عامی کی عبادت کا فرق

عارف وصحابہ کی عبادت اور ہماری عبادت کا فرق مراتب کا یہی راز ہے۔ عارف وصحابہ کی عبادت خواہ مالی ہو یا بدنی اس کے مقابلہ میں کسی کی عبادت نہیں ہوسکتی۔ صحابہ کی عبادت میں کیا بات زیادہ ہے؟ وہی علم وخلوص عارف کی دو رکعتیں ہماری دولا کھ رکعتوں سے بہتر و افضل ہیں اس لیے کہ علم واذعان اور خلوص اس میں اس قدر پایا جاتا ہے جو ہماری عبادت میں کبھی پیدا نہیں ہوسکتا۔ حضرت مرشدی نے فرمایا تھا کہ عارف کی دو رکعت غیر عارف لاکھ رکعت سے بہتر و افضل ہیں۔ حضرت نے یہ غلط نہیں کہا اور نہ اس میں مبالغہ ہے۔

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو میرا صحابی آدھا مد غلہ خیرات کرے وہ احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرنے سے زیادہ ثواب رکھتا ہے۔ اگر اس حدیث کی بناء پر آدھ سیر غلہ کے مقابلے میں آدھ سیر سونا لیا جائے اور اس کی نسبت سے احد پہاڑ کو دیکھیں تو نسبت معلوم ہوگی کہ کیا ہے اور اگر یہ نسبت اس طرح لی جائے کہ بجائے آدھ سیر غلہ کے اس کی قیمت لے کر پھر سونے کی قیمت سے موازنہ کیا جائے تو اور زیادہ نسبت حاصل ہوگی اور یہ ثواب کی زیادتی صرف علم معرفت کی زیادتی سے ہے اور اس سے اچھی طرح صحابہ کی عبادت اور ہماری عبادت کی نسبت معلوم ہوسکتی ہے۔

بعض لوگ شاید یہ کہیں کہ مولوی بھی عجیب آدمی ہیں کہیں اس حدیث کی علت محبت وخلوص کو بتلاتے ہیں اور کبھی علم ومعرفت کو اور ایک ہی حدیث سے متعدد مواقع پر متعدد کام لیتے ہیں۔ سو واضح ہو کہ خلوص ومحبت کا جذبہ بھی علم ومعرفت ہی سے حاصل ہوتا ہے جو صحابہ میں پایا جاتا تھا۔ پس ایک ہی چیز ہے خواہ اس کو خلوص سے تعبیر کرو خواہ علم ومعرفت سے۔ خوب کہا ہے:

عباراتنا شتی و حسنک واحد ۔۔۔ و کل الی ذاک الجمال یشیر

"ہماری عبارتیں مختلف ہیں لیکن مفہوم ایک ہے وہ سب تیرے جمال کو ظاہر کرتی ہے۔"

اسی علم ومعرفت سے ان حضرات کو وہ ادراک عطا ہوا تھا کہ حضرت عبداللہ بن سلام نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اول بار دیکھا تو باوجودیکہ اس وقت تک وہ خلوص جو بعد صحبت میسر ہوا نہ تھا مگر طلب حق کا جس قدر خلوص تھا اسی کا یہ اثر تھا کہ دیکھتے ہی بے ساختہ بول اٹھے۔ "ھذا لیس لوجہ کذاب"

نور حق ظاہر بود اندر ولی ۔۔۔ نیک بیں باشی اگر اہل ولی
مرد حقانی کی پیشانی کا نور ۔۔۔ کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

سِيمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ

"تو جب وہ کامل خالص ہوگیا ہوگا تو کیا حال ہوا ہوگا۔"

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند　　صاف گر باشد ندانم چوں کند

''ایک گھونٹ مٹی کا ملا ہوا جب مجنوں کر دیتا ہے تو اگر صاف ہو تو نہ معلوم کیا اثر کرے۔''

صحابہؓ کے علم کی حقیقت

غرض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو علم خالص تھا۔ اسی وجہ سے ہماری سعادت کاملہ یہی ہے کہ صحابہ کا اتباع کریں' ایک نظیر سے اس واقعہ کی کہ ہم صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے نقش قدم پر کیوں چلیں اور ان کی زندگی ہماری رہنما کیوں ہے۔ تحقیق نہایت دلنشیں مثال سے ہو سکتی ہے۔

دنیا جانتی ہے کہ ریل کس طرح چلتی ہے' ریل کے چلنے میں متحرک اولاً انجن ہے۔ ہر گاڑی میں انجن نہیں ہوتا بلکہ اگر ہر گاڑی میں انجن ہوتا تو شاید ریل چلتی بھی نہیں بلکہ ساری گاڑیوں کے لیے ایک ہی انجن ہوتا ہے جو سب کے لیے کافی ہوتا ہے۔ ترکیب یہ حرکت کی اولیہ ایک چیز میں ہوتی ہے اور دوسری چیزوں کو مرتبط کر دیا جاتا ہے جیسا کہ ریل گاڑی میں ہوتا ہے کہ انجن صرف متحرک اولاً ہوتا ہے اور ساری گاڑی انجن سے مرتبط ہوتی ہے۔ اکیلا انجن جو متحرک اولاً ہے ساری گاڑیوں کو کالکا سے کلکتہ لے جاتا ہے۔

جب ایک انجن متحرک اولاً بہت سی گاڑیوں کو ہزار ہا کوس لے جاتا ہے تو کون سے تعجب کی بات ہے اگر ایک شخص صحابہؓ سے تعلق رکھنے والا خدا تک پہنچ سکے جو شخص خدا تک پہنچنا چاہے وہ صحابہؓ کے انجنوں سے مرتبط ہو جائے۔

بود مورے ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد　　دست برپائے کبوتر زد ونا گاہ رسید

ایک چیونٹی تھی غریب و مفلوک الحال۔ اس نے حج کے جانے کا ارادہ کیا لیکن کوئی سامان اس کے پاس موجود نہ تھا۔ اسی فکر میں حیران و پریشان تھی۔ حجاج سے ترکیب پوچھی' حاجیوں نے بتلایا کہ جہاز میں اتنے دنوں سفر کرنا پڑتا ہے اور اونٹوں پر اتنے دنوں سفر ہوتا ہے۔ تب کہیں یہ ہزار ہا میل کا سفر ختم ہوتا ہے لیکن اس میں بڑی دقتیں ہیں' ہزاروں میل کا سفر' سینکڑوں روپیہ کا خرچ' چور ڈاکو کا خوف' جان کا خطرہ' غرض بڑی بڑی تکلیفیں ہیں جن کو اٹھا لینے کے بعد کہیں حج نصیب ہوتا ہے۔ بیچاری یہ سن کر سخت پریشان و ہراساں ہوئی۔ اسی ذوق وشوق اور غمگین حالت میں تھی کہ ناگہاں ایک رہبر نظر آیا جو مصداق تھا اس شعر کا

اے لقائے تو جواب ہر سوال　　مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

''آپ کی زیارت ہی ہر سوال کا جواب ہے آپ سے بلا شک وشبہ مشکل حل ہوتی ہے۔''

اوراس نے پوچھا کہ کہو کیسی حالت ہے' بیچاری رنج و غم میں بیٹھی ہوئی تھی۔ایک دردمند کو پاکر کچھ تسکین حاصل ہوئی اور کہا کہ میری حالت کیا ہے' حج کو جانا چاہتی ہوں' دل میں شوق محبت بھرا ہوا ہے لیکن پہنچنے کے وسائل نہیں۔اس وجہ سے غمگین و پریشان ہوں' اگر کوئی تدبیر آپ بتلا سکیں تو للہ بتلایئے۔اس شخص نے کہا کہ اچھا میں ایک طریقہ بتلاؤں اگر نخوت و تکبر نہ کرو کیونکہ نخوت و تکبر سے مقصد حاصل نہیں ہوتا اور آدمی ہمیشہ ناکام رہتا ہے۔اس نے کہا بہت بہتر' میں ہر طرح راضی ہوں' اتنے میں ایک کبوتر آ گیا اور جنگل میں دانہ چگنے لگا' وہ شخص جانتا تھا کہ یہ کبوتر حرم جانے والا ہے' اس سے کہا اگر تم جانا چاہتے ہو تو اس کبوتر کے پاؤں پکڑلو اور نخوت و غرور نہ کرو' حرم میں پہنچ جاؤ گی۔

بود مورے ہوسے داشت کہ درکعبہ رسد — دست برپائے کبوتر زدو ناگاہ رسید

''ایک چیونٹی کی خواہش تھی کہ کعبہ پہنچے تو اس نے یہ کیا کہ کبوتر کے پیر سے اپنے ہاتھ باندھ دیئے اور اچانک پہنچ گئی''۔

اتباع سے عار کی وجہ

غرض اس سے یہ ہے کہ وابستگی و ارتباط میں نخوت و غرور اور تکبر نہ کرو' وابستگی و ارتباط میں استنکاف کا ہونا ناکامیابی کی دلیل ہے۔اگر وابستگی کے ساتھ استنکاف کرو گے تو ہرگز کامیاب نہ ہو گے اور رہ جاؤ گے۔مسلمانوں میں اس کی سخت ضرورت ہے کہ وہ مقتداؤں سے ارتباط اور تعلق پیدا کریں کیونکہ مسلمانوں میں اتباع سے عار پایا جاتا ہے۔اور وجہ استنکاف کی یہ ہے کہ وہ اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں۔اپنے کو دولت منداور صاحب عزت خیال کرتے ہیں اور عارف باللہ اکثر غریب و خستہ حال ہوتے ہیں اس لیے یہ خیال کر کے کہ یہ لوگ چھوٹی حیثیت کے ہیں' غریب و مفلوک الحال ہیں۔میلے کچیلے اور بدحیثیت ہیں اور ہم بڑے دولت مند صاحب عزت' ہمارا اور ان کا کیا جوڑ' ہم کو ان سے کیا تعلق اور ربط پیدا کریں۔افسوس! اسی چھوٹے بڑے کے خیال نے شیطان کو راندہ درگاہ بنایا۔یہاں شیطان نے یہی تو کہا تھا کہ میں ایک چھوٹی حیثیت کے وجود کو جو مجھ سے ارذل اور کمتر ہے کیوں سجدہ کروں۔یہی نخوت و تکبر اس کی تباہی کا موجب بنا اور اسی نے اس کو کھویا اور یہی ہم کو خراب کر رہا ہے۔آج یہ مرض مسلمانوں میں کثرت سے ہے اور ہر شخص اس میں مبتلا پایا جاتا ہے۔

میں اعتراضاً نہیں کہتا بلکہ شفقت کے لحاظ سے کہتا ہوں' مسلمانو! اس خیال کو چھوڑ دو' ہماری ناکامیابی کی یہی وجہ ہے اور ہماری تباہی کو یہی موجب ہے۔اس صورت پرستی نے ہم کو برباد کر دیا ہے۔اہل حقیقت صورت کی نسبت فرماتے ہیں:

گر بصورت آدمی انسان بدے　　احمدؐ وابوجہل ہم یکساں بدے
اینکہ می بینی خلاف آدم اند　　نیستند آدم غلاف آدم اند

''اگر آدمی کی صورت کی وجہ سے انسان ہوتا تو احمد صلی اللہ علیہ وسلم یکساں ہوتے یہ کہ خلاف آدم کے جو تجھ کو نظر آتا ہے یہ آدمی نہیں آدمی کے غلاف میں ہے۔''

لباس کو چھوٹے بڑے ہونے کا سبب نہ بناؤ' لباس کو دیکھ کر چھوٹے بڑے ہونے کا احتمال نہ کرو۔ مولوی صاحب دس روپیہ کے نوکر ہیں' میلے کچیلے اور ٹوٹے پھوٹے حال میں ہیں' اس کی طرف نہ دیکھو' لباس کے اچھے برے ہونے سے آدمی کا اچھا برا ہونا معلوم نہیں ہوتا۔ اگر شریعت مجبور نہ کرتی تو اہل اللہ اور عارف باللہ پائجامہ بھی نہ پہنتے ان لوگوں کو جسم کی آرائش اور زینت سے کیا کام۔

نباشد اہل باطن درپے آرائش ظاہر　　بنقاش احتیاج نیست دیوار گلستان را

''اہل باطن کو ظاہری آرائش کی ضرورت نہیں' نقاش کو باغ کی دیوار کی ضرورت نہیں۔''

ذوق شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

عریاں ہی دفن کرنا تھا زیرزمیں مجھے　　اک دوستوں نے اور لگادی کفن کی شاخ

اس موقع پر ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک بادشاہ ذی حشمت وشوکت تھے لیکن ان کے بھائی لنگی باندھے ہوئے پھرا کرتے تھے۔ بادشاہ کو شرم آتی تھی کہ میں اتنا بڑا بادشاہ اور میرا بھائی صرف لنگی باندھے ہوئے پھرا کرتا ہے۔ ان کو بلا کر بادشاہ نے کہا کہ بھائی مجھے شرم آتی ہے تم پائجامہ تو پہن لو۔ انہوں نے کہا کہ ایک شرط سے کہ جب کرتا بھی ہو' کہا کرتے بہت' کہا کرتے کے ساتھ ٹوپی بھی ہو۔ بادشاہ نے کہا ٹوپی بھی بہت' کہا کہ جوتا بھی ہونا چاہیے۔ بادشاہ نے کہا کہ جوتے بھی بہت' کہا کہ جب یہ سب چیزیں ہوں تو ایک سواری بھی ہونا چاہیے۔ بادشاہ نے کہا کہ سواری بھی ہے۔ انہوں نے کہا کہ سواری گھوڑے کی اور اس کے لیے ایک اصطبل اور سائیس بھی ہونا چاہیے۔ بادشاہ نے کہا یہ چیزیں بھی موجود ہیں' پھر کہا ایک مکان رہنے کے واسطے' بادشاہ نے کہا بڑے بڑے عالیشان مکان آپ کے واسطے موجود ہیں' کہا کہ پھر ایک سلطنت بھی ہونی چاہیے' بادشاہ نے کہا سلطنت بھی حاضر ہے' شوق سے تخت پر بیٹھئے اور حکمرانی کیجئے۔ یہ سب پوچھ کر بادشاہ سے کہنے لگے کہ میں پائجامہ ہی کیوں پہنوں' جس میں اتنے جھگڑے ہوں اور ایسا بکھیڑا ہو۔

غرض جو لوگ عارف باللہ ہوتے ہیں انہیں ایسے تکلفات سے غرض نہیں ہوتی سادہ زندگی رکھتے ہیں اور عبادت میں مصروف رہتے ہیں اور انکے قلب میں اس سامان کی وقعت ہوتی ہے۔

ایک بادشاہ نے ایک بزرگ سے دریافت کیا کہ اگر آپ کسی موقع پر راستہ بھول جائیں اور وہاں پیاس معلوم ہو اور تشنگی بے چین کر رہی ہو اور ایک شخص پانی لے کر آئے اور کہے کہ میں یہ کٹورا پانی کا آدھی سلطنت کو فروخت کرتا ہوں تو آپ اسے خرید لیں گے؟ بادشاہ نے کہا بلاشک' میں آدھی سلطنت میں اس ایک کٹورہ پانی کو خرید لوں گا۔ بزرگ نے کہا اگر اسی طرح کبھی آپ کا پیشاب بند ہو جائے اور کوئی شخص یہ کہے کہ میں نصف سلطنت کے معاوضہ میں پیشاب کا بند کھولتا ہوں تو آپ اس پر راضی ہو جائیں گے؟ کہا بیشک! بزرگ نے فرمایا کہ آپ کی سلطنت کی کیا قیمت ہوئی! ایک کٹورہ بھر پانی اور پیشاب؟ ایسی قیمت کی چیز پر نخوت وغرور کرنا اور دوسروں کو حقیر وذلیل خیال کرنا کہاں تک درست کہا جاسکتا ہے۔

یہاں سے حالت معلوم ہوئی ہوگی آج کل کی ترقی کی۔ میں ترقی سے منع نہیں کرتا بلکہ ترقی کو پسند کرتا ہوں لیکن اسی طرح جس طرح کہ ایک نیک اور مسلمان کو ترقی کرنی چاہیے' ایسا نہیں کہ ترقی میں دین ہی کو بھول جائیں اور خدا کا خیال بھی نہ آئے جو لوگ خدا کو جان لیتے ہیں وہ دنیا سے زیادہ محبت تو کیا' بالکل محبت نہیں رکھتے۔

آں کس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند فرزند و عزیز و خانماں راچہ کند

"جس نے مجھے پہچان لیا وہ جان کو کیا کرے گا' اولاد' رشتہ داروں اور خاندان کو کیا کرے گا۔"

دنیا عارف کی نظر میں

دنیا کا وجود ان کی نظر میں کاہ سے زیادہ نہیں' چھوٹے چھوٹے بچے مٹی کے گھروندے کھلونے بناتے ہیں۔ عقلاء ان پر ہنستے ہوئے گزرتے ہیں اور بچوں کو بلا کر دکھاتے ہیں کہ ان دیوان خانوں میں آؤ اور ان کو دیکھو۔ اسی طرح عرفان اور اہل اللہ آپ کے بلند قصروں اور محلوں کو دیکھ کر آپ کو دار آخرت کی ترغیب دیتے ہیں اور جب آپ کو ملتفت نہیں پاتے تو وہ آپ پر ہنستے ہیں اور آپ کی حالت پر یہ کہتے ہوئے افسوس کرتے ہیں:

دلا تا کے دریں کاخ مجازی کنی مانند طفلاں خاک بازی

توئی آں دست پرور مرغ گستاخ کہ بودت آشیاں بیرون ازیں کاخ

چرازاں آشیاں بیگانہ گشتی چودو ناں چغد ایں ویرانہ گشتی

"اے دل اس مجازی مکان (دنیا) میں کب تک لڑکوں کی طرح خاک سے کھیلتا رہے گا تو ہی ہاتھ کا پلا ہوا وہ مرغ گستاخ ہے تیرا آشیاں اسی مکان سے باہر تھا اس آشیانہ سے تو کیوں

بیگانہ ہو گیا، کمینوں کی طرح تو اس ویرانہ کا اُلو بنا ہوا ہے۔"

پس اس سامان کو قبلہ و کعبہ مت بناؤ اور ان علماء کو جو خستہ حالت میں ہوں، میلے کچیلے ہوں، حقارت کی نظروں سے نہ دیکھو۔ وہی لوگ خاصان خدا اور کچھ لے جانے والے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ دنیا چھوڑ دو اور تمام تعلقات کو ترک کر دو۔ بلکہ غرض یہ ہے کہ دنیا میں اس قدر منہمک نہ رہو کہ خدا کو بھی بھول جاؤ بلکہ دنیا کو نظر حقارت سے دیکھو اور خاصان خدا کی عزت کرو۔ اہل اللہ سلطنتوں اور حکومتوں کی پرواہ نہیں کرتے اور ان کو وبال جان خیال کرتے ہیں۔

قصہ مشہور ہے کہ حضرت غوث پاک کی خدمت مبارک میں سلطان سنجر نے خط لکھا جس میں تحریر کیا کہ ایک حصہ ملک کا آپ کے خدام کے لیے آپ کو دیتا ہوں۔ آپ نے جواب میں لکھ کر بھیجا کہ:

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد　　دردل اگر بود ہوس ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبراز ملک نیم شب　　من ملک نیم روز بیک جونمی خرم

"اگر میرے دل میں ملک سنجر کی ہوس ہو تو میرا مقدر چتر سنجر کی طرح سیاہ ہو جائے کیونکہ مجھے دولت نیم شبی کی حقیقت معلوم ہو چکی ہے اس لیے میں سلطنت سنجر ایک جو کے بدلے بھی نہیں لوں گا۔"

ایک عارف کا قول ہے

بفراغ دل زمانے نظرے بما ہروئے　　بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے وہوئے

"ایک ساعت ایک لمحہ محبوب کو اطمینان سے دیکھنا دن بھر کی دار و گیر شاہی سے بہتر ہے۔"

جس شکستگی کو حقارت سمجھتے ہو اس کی نسبت حدیث قدسی ہے: **"انا عند المنکسرہ قلوبھم"**[1] (میں شکستہ دل لوگوں کے ساتھ ہوں) یہی شکستگی شرط وصول ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ　　جز شکستہ می نگیر د فضل شاہ

"فہم و خاطر کو تیز کرنا راہ سلوک نہیں بلکہ شکستگی پیدا کرنا ہے، اللہ کا فضل سوائے شکستگان اور کسی پر نہیں ہوتا۔"

ایک عارف کا قول ہے:

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود　　ہر کجا مشکل جواب آنجا رود
ہر کجا دردے شفا آنجا رود　　ہر کجا رنجے دوا آنجا رود

"جہاں پستی ہوتی ہے وہاں پانی جاتا ہے جہاں اشکال ہوتا ہے وہیں جواب دیا جاتا ہے جہاں مرض ہوتا ہے وہیں دوا استعمال کی جاتی ہے جہاں رنج ہوتا ہے وہیں شفا پہنچتی ہے۔"

---

[1] (أنظر تخریج الحدیث الرقم: ۵۷)

خدا تک پہنچنے کا صحیح راستہ

ہم لوگوں کو طلب نہیں ہے۔ اگر طلب ہوتی تو اتباع میں تذلل بھی گوارا ہوتا۔ اگر کوئی شخص کسی پر عاشق ہو جائے اور معشوقہ عاشق سے کہے کہ تمام کپڑے اتار کر لنگوٹ بند ہو جاؤ تب وصل ہوگا۔ واللہ ایسا ہی کرے گا۔ اس کو لنگوٹ بند ہونے میں کچھ بھی تامل نہ ہوگا اور تمام شرم و حیا بالائے طاق رکھ دی جائے لیکن خدا کے لیے ایسا نہیں۔

عشق مولیٰ کے کم لیلیٰ بود   گوئے گشتن بہرا و اولے بود

''محبوب حقیقی کا عشق لیلیٰ سے کیا کم ہو اس کی گلی میں ہونا اولیٰ اور بہتر ہے۔''

ایک زندہ نظیر اسے اس کو دیکھئے۔ کیمیا گروں کی حالت سب کو معلوم ہے کہ کپڑا ان کے بدن پر نہیں ہوتا۔ میلے کچیلے اور غلیظ رہتے ہیں لیکن عام لوگوں کے علاوہ والیان ملک اور بادشاہ تک ان کے پیچھے ایک سڑا ہوا حقہ لئے پھرا کرتے ہیں اگرچہ حقیقت میں وہ کیمیا گر نہ ہو۔ اللہ اکبر! ایسی کیمیا کے لیے اپنے عیش و عشرت اپنی ذاتی عزت و وجاہت کو تباہ کر دیا لیکن جن کو سچ مچ کی کیمیا آتی ہے جو لوہے کو سونا بناتے ہیں ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔ اگر ان کے پیچھے پھرو تو تعجب نہیں کیونکہ کیمیا گر حقیقت میں وہی ہیں۔

حاصل یہ کہ اگر تم بھی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ارتباط حاصل کرو گے ان کا واسطہ ڈھونڈو گے تو یقیناً کامیاب ہو گے کیونکہ خدا تک پہنچنے کا صحیح راستہ بتلانے والے یہی ہیں جس طرح کہ چیونٹی کبوتر کے پاؤں میں لگ کر کعبہ مقدس میں پہنچ گئی تو ہم بھی اسی طرح صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے پاؤں میں لگ کر کس طرح اللہ تک نہ پہنچیں گے، پہنچیں گے اور ضرور پہنچیں گے اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے واسطہ پیدا کرنا حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے واسطہ حاصل کرنا ہے تو کامیابی یقینی ہے۔

غرض معرفت و علم ہی نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو یہ درجہ دیا ہے۔ علم و معرفت بہت بڑا درجہ رکھتا ہے اگر علم و معرفت کوئی چیز نہیں ہے تو دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے لیکن اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ اس کا تعلق بھی عمل سے ہے۔ بدون عمل وہ چنداں نافع نہیں مگر دیکھا جاتا ہے کہ طلبہ میں علم کا ناز پیدا ہو گیا ہے اور وہ خیال کرنے لگے ہیں کہ یہ علم ہمارے لیے کافی ذخیرہ ہے اور ہم بحیثیت علم ایک بڑی حیثیت رکھتے ہیں۔ عقائد تو ان کے درست ہوتے ہیں لیکن اعمال ان کے ٹھیک نہیں ہوتے۔ غلطی یہ پڑی ہوئی ہے کہ وہ علوم و عقائد ہی کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور عمل کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ میں ان کو بتلاتا ہوں کہ تم عقائد کے گھمنڈ میں عمل درست نہیں کرتے اور جو کچھ ہے عمل ہی ہے اگرچہ علم و معرفت کے بعد ہی سہی۔

سب کچھ عمل پر موقوف ہے

قنوج میں ایک صاحب عامل بالحدیث سے ملاقات ہوئی۔ مجھ سے کہنے لگے کہ اجی حضرت! ہم صرف نماز ہی کے چند مسئلوں میں حدیث پر عمل کرتے ہیں۔ باقی معاملات میں حدیث کا نام بھی نہیں لیتے۔ مثلاً میں عطر بیچتا ہوں اور اس میں تیل بھی ملاتا ہوں۔ غرض عملاً ہم بہت کمزور ہیں۔ اسی طرح ہم حنفی ہیں ہمارے عقائد درست ہیں لیکن اعمال کی شکایت ہم میں بھی ہے حالانکہ وہ چیز ہے کہ جس پر سب چیز موقوف ہے۔ ہر چند کہ بعض علوم و معارف ایسے ہیں جن کا عمل سے چنداں تعلق نہیں ہے بلکہ خود وہ علوم ہی مقصود ہوتے ہیں لیکن قرآن شریف اور احادیث کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی غایت بھی عمل سے خالی نہیں۔

تقدیر کی تعلیم کا اثر

مثلاً خداوند تعالیٰ کلام پاک میں فرماتا ہے کہ:

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرٌ. لِّکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَافَاتَکُمْ وَلَاتَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰکُمْ. (الحدید آیت نمبر ۲۲،۲۳)

”کوئی مصیبت نہ دنیا میں آتی ہے نہ خاص تمہاری جانوں میں مگر وہ ایک کتاب میں (یعنی لوح محفوظ میں) لکھی ہے قبل اس کے کہ ہم ان جانوں کو پیدا کریں' یہ اللہ کے نزدیک آسان کام ہے۔ (یہ بات) بتلا اس واسطے دی ہے تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہے تم اس پر رنج (اتنا) نہ کرو اور تاکہ جو چیز تم کو عطا فرمائی ہے اس پر اتراؤ نہیں۔“

اس آیت میں مسئلہ تقدیر کی تعلیم کی ہے یعنی جو کچھ مصیبت آفاقی یا انفسی پہنچتی ہے وہ ہم نے پہلے سے لکھ رکھی ہے۔ یہ ایک تعلیم ہے لیکن اس علم میں بھی ایک عملی غایت موجود ہے۔ چنانچہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے تقدیر کی تعلیم کیوں دی اس لیے کہ جو چیز تمہارے ہاتھ سے فوت ہو جائے اس پر مغموم مت ہو اور جو چیز مل جائے اس پر شاداں نہ ہو (مراد فرح کبر ہے) اس تعلیم میں یہ بھی ایک بڑی خوبی ہے کہ خداوند تعالیٰ نے بالکل طبیعت کے موافق بتلایا ہے کیونکہ غم و رنج طبعی ہوتا ہے۔ اس تعلیم سے غم کے موقع پر طبعاً تسلی و تسکین حاصل ہو سکتی ہے اور حوادث میں وہ سکون کا باعث ہو جاتی ہے تمام عقلاء جمع ہو کر بھی ایسی تدبیر نہیں بتلا سکتے۔ غرض مسئلہ تقدیر کی ایک غایت تسلی و تسکین

اور صبر و سکون بھی ہے۔ چنانچہ "لکیلا تاسوا" میں اس کی تصریح ہے اور یہ ایک غایت ہے جسکا فائدہ اظہر من الشمس ہے۔ ایک مفروضہ واقعہ سے یہ بات آپ کی سمجھ میں آ جائے گی۔

خیال کیجئے کہ دو شخص ایک ہی جگہ کے ہوں۔ دونوں کی ہر طرح سے یکساں حالت ہو لیکن فرق صرف یہ ہے کہ ایک ان میں تقدیر کا قائل ہو اور دوسرا تقدیر کا قائل نہ ہو اور دونوں کے دو لڑکے یکساں ہوں دونوں نے یکساں تعلیم پائی ہو اور دونوں کے والدین نے یکساں تعلیم دی ہو، دونوں کے والدین کی امیدیں ان سے وابستہ ہوں۔ اتفاق سے دونوں لڑکے بیمار ہوں، یکساں دونوں کا مرض ہو اور معالج دونوں کا بھی ایک ہو۔ ڈاکٹر کی غلطی سے علاج ناکافی ہو اور دونوں مر جائیں۔ دونوں کے والدین کو سخت رنج ہوگا لیکن دونوں کا فرق اس موقع پر تقدیر کے مسئلہ سے ہوگا جو شخص تقدیر کا قائل ہے اس کی زبان سے تو اس موقع پر بے ساختہ کلمہ جاری ہوگا۔ "لَنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا" یعنی جو کچھ مصیبت آتی ہے وہ خدا ہی کی طرف سے آتی ہے۔ "فعل الحکیم لایخلو من الحکمۃ" خدا کا کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

حضرت خضر علیہ السلام نے جو ایک لڑکے کو مار ڈالا تھا اس میں بہتری ہی تھی۔ خداوند تعالیٰ بلا کسی حکمت کے کوئی کام نہیں کرتا۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ میرے والد کے انتقال پر ایک بدوی نے مجھ سے کہا:

اصبر بکن صابرین انما　　صبر الرعیۃ بعد صبر الرأس

"آپ صبر کیجئے، آپ بڑے ہیں اور ہم چھوٹے ہیں آپ کی وجہ سے ہم بھی صبر کریں گے۔"

خیر من العباس اجرک بعدہ واللہ خیر منک للعباس.

آپ کے والد کے مرنے سے کسی کا نقصان نہیں ہوا بلکہ آپ کو اور ان دونوں کو فوائد پہنچے۔ آپ کو ثواب ملے گا جو عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بہتر ہے اور عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اللہ تعالیٰ مل گئے جو تم سے خیر ہے۔

جب کسی کا نقصان نہیں ہوا تو غم کیسا؟ یہ مقولہ ہے ایک بدوی کا جو تقدیر کا قائل ہے دیکھو اس سے کیسی تسلی ہو سکتی ہے۔

دوسرا شخص جو تقدیر کا قائل نہیں ہے کہتا ہے کہ لڑکے کو ڈاکٹر کی بے تدبیری نے مار ڈالا۔ اگر ڈاکٹر تدبیر سے علاج کرتا تو لڑکا کبھی نہ مرتا۔ میں ڈاکٹر پر دعویٰ کروں گا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب پر دعویٰ دائر کر دیا گیا اور بیچارے ڈاکٹر صاحب کو جیل خانہ ہو گیا لیکن وہ حسرت اب بھی موجود ہے

کہ اگر علاج میں بے تدبیری نہ ہوتی تو لڑکا نہ مرتا۔ اس سے معلوم ہوگا کہ تقدیر کا قائل ہونا کیا کام دیتا ہے، کہ غم کی عمر دو تین ہفتے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ چنانچہ قائل تقدیر کا سکون غم کے ازالہ کا سبب بن گیا اور منکر تقدیر کا غم ہمیشہ باقی رہا۔

اسی طرح ہر علم اور ہر اعتقاد میں ایک غایت عمل کی ضرور ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ خداوند تعالیٰ آخر شب میں آسمان اول پر نزول فرماتے ہیں۔ اس پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ حرکت خداوند تعالیٰ کے لیے خلاف ہے لیکن اعتراض کی نوبت کیوں آتی ہے۔ غایت عمل پر نظر نہ ہونے سے۔ اگر غایت عمل پر نظر ہوتی۔ یہ اعتراض ہی پیدا نہ ہوتا بلکہ یہ سنتے ہی عزم ہوتا کہ اس وقت توجہ الی اللہ میں زیادہ اہتمام چاہیے کہ وقت قرب وقبول کا ہے۔ اس کا پتا مثال سے ملے گا۔

کوئی حاکم دورہ پر ہو اور کسی جگہ سے قریب آجائے اور لوگ آکر کہیں کہ فلاں حاکم یہاں سے ۶ میل کے قریب آگئے ہیں اور عنقریب آنا چاہتے ہیں۔ اگر اس جگہ کے ملازم کہنے لگیں کہ کل اتنے دور تھے آج اس قدر مسافت طے کر کے کیوں کر آئے تو اس سے معلوم ہوگا کہ وہ لوگ کام نہیں کرتے۔ اگر وہ لوگ کام کرتے ہوتے تو قریب ہونے کی توجیہ نہ ڈھونڈتے بلکہ کام کی درستی کے اہتمام میں لگ جاتے۔

اسی طرح حدیث میں خداوند تعالیٰ کے قرب کو اس لیے بتلایا جاتا ہے کہ قرب کے جان لینے سے تنبیہ ہوگی اور لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں گے اور بزبان حال کہیں گے:

امروزہ شاہاں مہماں شدہ است مارا — جبرئیل با ملائک درباں شدہ است مارا

مجھے حضرت مولانا مولوی محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت یاد آئی۔ حدیث پڑھی گئی تھی کہ جو شخص تازہ وضو سے دو رکعت نماز پڑھے اور ان رکعتوں میں حدیث النفس نہ کرے تو اس کے گزشتہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ ایک طالب علم نے کہا کہ حضرت ایسا ہو سکتا ہے کہ نماز میں خیال نہ آئے۔ مولانا نے فرمایا کہ کبھی کر کے بھی دکھایا و یسے ہی شبہ کرتے ہو۔

غرض محض الفاظ کی توجیہ کی تحقیق بیماری کی علامت ہے۔ عمل کو مقصود سمجھنا چاہیے اور اسی وجہ سے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ایسا امر کبھی نہیں پوچھا اور نہ کبھی اعتراض کیا۔

سائنس وفلسفہ کی تحقیقات

ایک بزرگ سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے معراج میں کیا کیا باتیں ہوئی تھیں۔ بزرگ نے کیا جواب دیا ہے:

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد زباغباں — بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد

''اب کس کا دماغ ہے کہ باغباں سے پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا' پھول نے کیا سنا اور صبا نے کیا کیا''

کسی اور نے کہا ہے:

تو نہ دیدی گہے سلیماں را چہ شناسی زبان مرغان را

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں کیں جا ہمیشہ باد بدست است دام را

''تو نے کبھی حضرت سلیمان علیہ السلام کو نہیں دیکھا تو پرندوں کی بولی کیسے پہچانے گا جس طرح عنقا کو کوئی شکار نہیں کر سکتا جال پھیلانا اور کوشش کرنا لا حاصل ہے اسی طرح ان کی ذات کا ادراک نہیں کر سکتا اس لیے فکر اور سوچ بے کار ہے۔''

وجہ یہ کہ تمہاری عقلوں کا جس قدر احاطہ ہے اللہ تعالیٰ کا احاطہ اس سے بہت زیادہ ہے۔"اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ" (بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہیں) محیط محاط کو کیا سمجھ سکتا ہے پانی کے کیڑوں میں سے ایک کیڑا سر نکال کر دیکھے کہ بڑے سے بڑے سامان ہیں۔ خدا کی حکمتوں سے جہاں معمور ہے لیکن وہ سب کے اسرار کو کیا سمجھ سکتا ہے۔ اسی طرح محققین کی وصیت ہے:

حدیث مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو کہ کس نہ کشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

''مطرب و مے یعنی عشق و محبت کی باتیں کرو زمانہ کے بھید اور اسرار کی ٹوہ میں مت لگو کیونکہ یہ عقدہ حکمت سے نہ کسی نے حل کیا اور نہ کوئی حل کر سکے گا۔''

اور اس مرض سے بڑھ کر علوم غیر شرعیہ کی تحقیق ہے۔ نصوص شرعیہ سے جیسا آج کل جب کوئی مسئلہ سائنس کا سنا اور اس کو قرآن مجید میں داخل کرنے کی کوشش کی۔ بھلا قرآن مجید میں سائنس وفلسفہ کے مسائل ڈھونڈنا' کواکب وغیرہ کی تحقیقات کرنا لغویات نہیں تو کیا ہے۔ قرآن مجید میں اس کے متعلق اگر کچھ آیا ہے تو وہ توحید پر استدلال کرنے کے لیے آیا ہے تو اس غرض و تفصیل کی حاجت نہیں بہت اجمال بھی کافی ہے۔ حتیٰ کہ بدوی نے استدلال کیا ہے۔

البعرة تدل على البعير والا ثر يدل على المسير فالسماء ذات الابراج والارض ذات الفجاج كيف لايدلان على اللطيف الخبير.

یعنی مینگنی اونٹ کا پتہ دیتی ہے۔ یہ تمام چیزیں جو کائنات میں نظر آتی ہیں خدا کے وجود پر کیسے دلیل نہ ہوں گی۔ قرآن مجید میں سائنس وفلسفہ کی تحقیقات دیکھنے کی مثال بعینہ ایسی ہے جیسی کہ کوئی جوتی سینے کی ترکیب طب اکبر میں ڈھونڈے۔ قرآن مجید طب اکبر ہے جوتی سینے کی کتاب نہیں ہے' قرآن مجید میں روحانی ترتیب اور اصلاح کے نسخے ملیں گے۔

سائنس وفلسفہ کی لغویات سے اسے کیا تعلق۔ اگر بقدر ضرورت کسی سائنس کے مسئلہ سے توحید وغیرہ پر استدلال کیا گیا ہے تو اس میں کلام نہیں لیکن قرآن مجید کو سائنس کی کتاب سمجھ لینا سخت غلطی ہے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا خدا کی ذات وصفات پر بحث نہ کرنا امور کائنات کے متعلق کچھ دریافت نہ کرنا اس امر کو بتلاتا ہے کہ یہ سب باتیں زائد از ضرورت ہیں۔ ایک سچے مسلمان کو ایسی باتوں سے کیا واسطہ! پس علوم وہی مقصود ہیں جن کی کوئی غایت عملی بھی ہو جیسا مسئلہ تقدیر و حدیث نزول الرب میں معلوم ہوا۔

اسی طرح توحید کی غایت میں خداوند تعالیٰ کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے: "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ" (الاخلاص نمبر ۱، ۲) "آپ (ان لوگوں سے) کہہ دیجئے کہ وہ یعنی اللہ (اپنے کمال ذات وصفات میں) ایک ہے۔ اللہ ایسا بے نیاز ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں اور اس کے سب محتاج ہیں۔" اس سورت میں خدا کی ذات وصفات بیان کی گئی ہے اس سے فائدہ یہ ہے کہ جس وقت خدا کو ایسا سمجھو گے غیر خدا پر طمعاً وخوفاً نظر نہ ہوگی جس طرح حاکم کا مقرب رعایا سے نہیں ڈرتا اسی طرح توحید پرست غیر خدا سے نہیں ڈرے گا۔

اکبر شاہ سے جنگل میں ایک گنوار کی دوستی ہوگئی۔ اکبر نے گنوار کو گھر بلایا کہ اگر تمہیں کچھ ضرورت پیش ہو تو ہمارے پاس آنا۔ گنوار کو ایک مرتبہ کچھ ضرورت پیش آئی اور وہ اکبر شاہ کے پاس آیا۔ دیکھا کہ اکبر شاہ نماز پڑھ رہے ہیں، نماز پڑھ کر دعا کی، گنوار نے دیکھا کہ جب یہ خود خدا سے مانگتے ہیں تو کیا میں نہیں مانگ سکتا۔ اکبر شاہ سے کہا کہ تمہارے احسان کی ضرورت نہیں ہم خود اس سے مانگ لیں گے جو تم کو لاکھوں دیتا ہے وہ کیا مجھے نہ دے گا۔ توحید کا یہ اثر ہوتا ہے کہ:

موحد چہ برپائے ریزی زرش ۔۔۔ چہ فولاد ہندی نہی برسرش
امید و ہراسش نباشد زکس ۔۔۔ ہمیں است بنیاد توحید بس

"موحد اور عارف کے قدموں کے نیچے خواہ سونا بکھیر دے یا اس کے سر پر تلوار رکھیں امید و خوف اس کو سوائے خدا کے کسی سے نہیں ہوتا، توحید کی بنیاد بس اسی پر ہے۔"

اگر غور کیا جائے گا تو تمام مسائل اعتقادیہ میں علاوہ غایت نجات کے اور بھی بہت سی غایات عملی نکلیں گی۔ پس جب علم کا عمل سے یہ تعلق ہے تو ضرور ہے کہ مسئلہ اثبات آخرت کے ساتھ جس کا بیان مولوی شبیر احمد صاحب نے کیا ہے اس کے اہتمام عمل کا مضمون بھی بیان کیا جائے۔

صحبت علماء کی ضرورت

اس لیے میں نے اس آیت کو اختیار کیا ہے۔ یہ عمل کو بھی ضروری بتلارہی ہے۔ پس اس آیت

(آیت مذکورۃ العنوان) میں حق تعالیٰ نے شکایت کی ہے محبت دنیا کی اور آخرت کے چھوڑ دینے کی اور حُبِ دنیا سے مراد یہ ہے کہ دنیا کو دین پر ترجیح دی جائے اور آخرت کا خیال مطلقاً نہ رہے تو بعض محبین دنیا اس کو مطلق کسب دنیا پر محمول کر کے اس تعلیم پر مضحکہ کرتے ہیں اور تعلیم کنندوں کی یہ مثال دیتے ہیں۔

ایک بادشاہ کے ہاں علماء کا دخل تھا۔ بادشاہ ان کی مرضی پر چلتے تھے۔ مولوی صاحبان نے کہا کہ بادشاہ سلامت! یہ تمام افواج وغیرہ جو فضول جھگڑا لگا رکھا ہے اس سے کیا فائدہ بیکار مصارف ہیں۔ مناسب ہے کہ تمام فوج موقوف کر دی جائے' بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور تمام فوج کو موقوف کر دیا۔ غنیم کو معلوم ہوا کہ فلاں بادشاہ نے فوج کو برخاست کر دیا ہے' فوراً لشکر کشی کی اور سرحد کے قریب آ پہنچا۔ بادشاہ نے مولوی صاحب سے کہا کہ دشمن حملہ کرنے آ پہنچا ہے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ ہم جا کر فیصلہ کئے دیتے ہیں۔ چنانچہ گئے اور جا کر اس کو سمجھایا کہ یہ کام بہت برا ہے' کسی کا ملک چھین لینا بڑے گناہ کا موجب ہے' ایسا نہ چاہیے' غنیم کہیں ایسی نصیحتوں سے باز رہ سکتا تھا' ناکام واپس آئے اور بادشاہ سے کہا کہ صاحب وہ تو مانتا نہیں' آپ ہی جانے دیجئے' آپ کا ملک گیا اور اس کا ایمان گیا۔

اسی طرح مولویوں کے کہنے پر چلے تو سارا گھر بار چھوڑ بیٹھے۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ اس الزام کی وجہ صرف یہ ہے کہ علماء کی صحبت میں نہیں رہتے ان کے پاس رہنے کے لیے کچھ مدت تو چاہیے' زیادہ نہیں تو چالیس دن ہی سہی۔ افسوس ہے اپنے جسمانی معالجہ کے لیے ملازمت سے بوضع تنخواہ رخصت لیتے ہیں' گھر کا انتظام کرتے ہیں' روپیہ خرچ کرتے ہیں' جسمانی مرض کے لیے بیکار رہنا اور نقصان گوارا کرنا منظور ہے۔ معالج ڈاکٹر کو سولہ روپیہ فیس کے دینے منظور لیکن روحانی مرض کے واسطے کچھ بھی نہیں کرتے۔ عربی رسول سرجن (مولوی کے پاس روحانی امراض کے معالج) کے لیے بہت قلیل مدت چالیس دن اگر رہیں تو تمام اعتراضات وسوالات کے جواب ہو جائیں۔ سب کام طلب اور ضرورت سے ہوتے ہیں چونکہ جسمانی امراض سے صحت مطلوب ہوتی ہے اس کے لیے ہر قسم کے نقصان اور تکلیف گوارا کرتے ہیں اور روحانی مرض سے خود ہی شفا پانا مقصود نہیں ہوتا۔ کاش! وہ اس کے ازالہ کی بھی ایسی ہی تدبیریں کرتے' کیا کسی محقق کے پاس چالیس دن رہ لینا بھی کوئی بڑا مشکل کام ہے۔ ان شاء اللہ اس کی صحبت ہی تمام تر شبہات کے رفع کے لیے کافی ہوگی۔ زیادہ قیل وقال کی حاجت نہ ہوگی۔

اے لقائے تو جواب ہر سوال　　　مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

''آپ کی زیارت ہی ہر سوال کا جواب ہے آپ سے بلا شک وشبہ مشکل حل ہوتی ہے۔''

اس کی دلیل یہی ہے کہ آزما کر دیکھ لو۔ بقول مولانا

آفتاب آمد دلیل آفتاب　　گر دلیلت باید ازوے رومتاب

''سورج کا نکلنا سورج کے وجود کی دلیل ہے اگر تم کو دلیل کی خواہش ہے تو اس سے منہ پھیرو۔''

اور چالیس دن کی تخصیص جو میں نے عرض کی ماخذ اس کا ایک حدیث ہے جس کا یہ مضمون ہے کہ جو شخص چالیس روز اللہ تعالیٰ کے لیے اخلاص اختیار کرے اللہ تعالیٰ اس کے قلب سے حکمت کے چشمے جاری کرتے ہیں لیکن یہ شرط ہے کہ مولویوں کے پاس رہنا کسی دنیوی غرض سے نہ ہو ورنہ ہرگز فائدہ نہ ہوگا۔

جیسا ایک گنوار کا واقعہ ہے کہ ایک گنوار سے کسی مولوی نے کہا کہ اگر تو چالیس دن نماز پڑھ لے تو تجھ کو میں ایک بھینس دوں، گنوار نے کہا بہت اچھا، جب چالیس دن گزر گئے تو گنوار آیا اور کہا، مولوی صاحب! میں نے چالیس دن نماز پڑھ لی، بھینس دلوایئے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ میں نے تو بھینس دینے کو صرف اس واسطے کہا تھا کہ تجھ کو نماز کی عادت ہو جائے۔ گنوار نے کہا تو جاؤ ہم نے بھی بے وضو ہی ٹرخائی تھی۔

اگر مولوی صاحب کی خدمت میں رہیں تو روٹی کھانے کی غرض سے نہیں بلکہ روٹی اپنے اپنے گھر سے کھائیں تاکہ کچھ قدر بھی ہو۔ ایک مفید عام رسالہ میں نے حضرت کے حکم سے چھپوایا تھا اور میں چاہتا تھا کہ مفت دوں لیکن حضرت نے حکم دیا کہ مفت نہیں بقیمت دینا کیونکہ مفت کی قدر نہیں ہوتی۔ غرض اخلاص وعقیدت اور فراغت کے ساتھ کام کرنا چاہیے تاکہ کچھ مفید نتیجہ نکل سکے۔

کیرانہ (ضلع مظفرنگر) میں ایک شخص کو ایک تحصیلدار صاحب نے پیش کیا اور کہا کہ ان کو بڑے شبہے ہیں۔ اگر آپ کچھ فرمائیں تو ان کی تسکین ہو جائے۔ میں نے کہا کہ یہ میرے ساتھ چلیں اور چند روز وہاں رہیں شبہات خود بخود دور ہو جائیں گے۔ عارف شیرازی اسی چالیس دن کے لیے فرماتے ہیں:

شنیدم رہروے درسرزمینے　　ہمیں گفت ایں معمار باقرینے

''کوئی سالک اپنے ہم نشین سے ایک معمہ کہہ رہا تھا''

پس چالیس دن تو شیشہ قلب میں محبت الٰہی کی شراب کو بساؤ۔ تمہارے قلب کا اطمینان ہو جائے گا۔ اگر بڑوں کے پاس رہنے کی ہمت نہ ہو تو خدا کے لیے تم چالیس روز میرے ہی پاس رہ کر اس سستے نسخہ سے فائدہ اٹھا کر دیکھ لو۔ غرض صحبت ہی سے یہ شبہ جاتا رہے گا کہ مولوی لوگ کسب دنیا سے منع کرتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ وہ حب دنیا سے روکتے ہیں جس کی مذمت اس آیت میں ہے اور آیت سے حدیث حب الدنیا رأس کل خطیئة[1] کی بھی تصریح ہوگئی۔

---

[1] (أنظر تخريج الحديث الرقم: ۴۵)

کسب دنیا اور حب دنیا

غرض ایک تو ہے کہ کسب دنیا اور ایک ہے حب دنیا تو کسب دنیا تو جائز ہے اور حب دنیا ناجائز۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک تو پائخانہ میں بضرورت طبیعت بیٹھ جانا اور ایک پائخانہ کو پیارا سمجھ کر اس میں جی لگا کر بیٹھنا۔ اول صورت جائز دوسری ناجائز۔ اسی طرح دنیا کو کمانا تو جائز لیکن دنیا کو محبوب و مرغوب سمجھنا حرام۔ قرآن شریف میں ان ہی الفاظ سے تصریح کی گئی ہے:

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ. (القیمۃ آیت نمبر ۲۰، ۲۱)

''یعنی عاجلہ کو محبوب سمجھتے ہو اور آخرت کو چھوڑے بیٹھے ہو۔'' اور اس خصوص میں ایک شبہ کا احتمال ہے وہ یہ کہ بعضے آدمی یہ سن کر کہ یہ آیت کفار کے متعلق ہے۔ کہنے لگتے ہیں کہ کفار کے متعلق آیات سے ہم کو کیا تعلق ہے۔ اسی طرح اگر وہ کسی ترجمہ قرآن میں دیکھ لیتے ہیں کہ یہ آیت مکی نہیں تو وہ خیال کر لیتے ہیں کہ غیر مکی آیت سے ہم کو کیا تعلق۔ اسی لیے اس موقع پر اس کے متعلق بھی کچھ بیان کر دینا ضروری ہے۔

خداوند تعالیٰ کو کسی کی ذات سے محبت وعداوت نہیں ہے بلکہ اس کی بناء اعمال خاصہ ہیں اور گو بعض احکام کا مورد اگرچہ خاص ہوتا ہے لیکن الفاظ کے عموم سے حکم ہوتا ہے اس لیے کفار کی شان میں جو بعض آیات اتری ہیں وہ اگرچہ باعتبار مورد کے خاص ہیں لیکن ان کے حکم عام ہے۔ پس جس عمل پر کفار کی شکایت ہے اگر وہ عمل ہم میں بھی ہے تو ہم کو بھی سبق حاصل کرنا چاہیے۔

دوسرے اگر پھر بھی خاص ہی مانا جائے تب اور بھی زیادہ افسوس ہے ہم پر کہ ہم مسلمان ہیں اور یہ کافروں کی خصلتیں ہم میں پائی جائیں۔ پس ایسی حالت میں یہ شبہ کفار کے متعلق آیات سے ہمیں کیا واسطہ' کسی طرح گنجائش نہیں رکھتا بلکہ کفار کی شان میں جو آیات ہوں ان کا اثر ہم پر زیادہ ہونا چاہیے۔ غرض کفار پر جو طعن وملامت اور شکایت ہے وہ ان کی ذات کی وجہ سے ہے یا فعل کی وجہ سے۔ یہ امر سب جانتے ہیں کہ ان کی شکایت ذات کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ فعل کی وجہ سے۔ اگر تم مسلمان ہو تو ان آیات کو دیکھ کر جو کفار کی شان میں ان کے فعل کی وجہ سے ہیں عبرت حاصل کرو اور دیکھو کہ جو خصائل کفار کے تھے وہ آج ہم میں پائے جاتے ہیں۔ افسوس! کس قدر بری بات ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی شریف کو چمار کہہ دیا جائے اس کو بہت برا معلوم ہوگا لیکن اگر چمار کو چمار کہہ دیا جائے تو اس کو خیال بھی نہ ہوگا۔ اسی طرح کفار کو کافر کہہ کر خطاب کرنے سے جتنا انہیں خیال ہوسکتا ہے اس سے زیادہ ہمیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ

من ترک الصلوٰۃ متعمداً فقد کفر[1]

میں یہ بھی بات سمجھنا چاہیے کہ تاویل بہ نسبت عدم تاویل کے اس خاص اعتبار سے زیادہ موجب ہے تغلیظ کو اور اس سے زجرو توبیخ اور بڑھ گئی ہے اور اشد ادکم نہیں ہوا۔

ایک اور شبہ ہوسکتا ہے اور یہ کہ ترک آخرت پر جو ملامت ہے مراد اس سے ترک اعتقاد ہی ہے یعنی انکار اور ہم خدا کے فضل سے آخرت کے قائل ہیں۔ پس خود لفظ ہی عام نہیں اور اس لیے اس کا مصداق ہم نہیں ہو سکتے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ اول تو یہ قید بلا دلیل ہے دوسرے اگر تسلیم بھی کیا جائے تو دوسری بعض آیات عموم میں محکم ہیں۔ تیسرے ظاہر لفظ سے تو شبہ اطلاق کا ہے اور جس دل میں درد ہوتا ہے وہ تو تھوڑے سے لفظی التباس سے بھی بے چین ہو جاتا ہے۔ خفیف سے خفیف التباس بھی ان کی جان پر بنا دیتا ہے۔

عشق است و ہزار بدگمانی

(عشق و محبت میں ہزاروں بدگمانیاں ہیں)

لیکن اس کے لیے طلب کی ضرورت ہوتی۔ معترض خالی الذہن طلب سے دور ہیں۔

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ مشہور ہے کہ ایک کنجڑا ان کے سامنے سے گزرا اور آواز لگائی "الخیار العشرۃ بدانق" یعنی دس ککڑیاں ایک دانگ ہیں۔ یہ آواز سنتے ہی آپ کا ذہن "اخیار" کے دوسرے معنی کی طرف منتقل ہوا یعنی خیر کی جمع۔ آپ ایک چیخ مار کر بیہوش ہو گئے اور فرمانے لگے جب دس نیکیوں کی قیمت ایک دانگ ہے تو ہم بروں کی کیا قیمت ہے۔ واقع میں کسی چیز کی فکر میں یہی حال ہوتا ہے۔ خوب کہا ہے:

بسکہ در جان فگار و چشم بیدار توئی ہر کہ پیدا می شود از دور پندارم توئی

"میری جان فگار اور چشم بیدار میں تو ہی بسا ہوا ہے جو کچھ دور سے ظاہر ہوتا ہے مجھ ہی کو گمان کرتا ہے۔"

ایک اور واقعہ حدیث میں آیا ہے کہ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ جمعہ کے دن خطبہ پڑھ رہے تھے اور بعض لوگ پریشان پھر رہے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بٹھلانے کے لیے ارشاد فرمایا اجلسوا اس وقت ایک صحابی دروازہ پر تھے جس وقت آپ کی زبان مبارک سے اجلسوا کا لفظ ان کے کان میں پہنچا اسی وقت دروازہ پر بیٹھ گئے۔ ہر چند یہ حکم

[1] (اتحاف السادۃ المتقین للزبیدی ۳: ۱۰، کنز العمال لعلی المتقی الھندی: ۱۸۸۷۲، ۵۰۰۸)

ان کے لیے نہ تھا لیکن شدت اطاعت غالب آ گئی اور گوارا نہ ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک حکم فرمائیں خواہ کسی کو سہی اور اس کی تعمیل نہ کی جائے۔

مسلمانو! تم میں ذوق اور محبت نہیں، طلب صادق تم میں نہیں پائی جاتی۔ اگر محبت وطلب ہوتی تو ہرگز ایسے شبہات واعتراضات پیش نہ آتے۔ حق یہی ہے کہ اس آیت (مذکورۃ العنوان) میں خداوند تعالیٰ کا مقصود مطلقاً حب عاجلہ اور ترک آخرت پر شکایت کرنا ہے اور اس کے مختلف مراتب ہیں جس درجہ کی حب دنیا ہوگی اسی درجہ ترک آخرت ہوگی اور ویسی ہی ملامت ہوگی۔ اگر حب دنیا و ترک آخرت مرتبہ اعتقاد میں ہے یعنی آخرت کا انکار ہے تو ابدالآباد تک جہنم میں رہے گا کیونکہ کفر ہے اور اگر آخرت کا اعتقاد تو ہے لیکن عمل نہیں تو فسق ہے اور عذاب محدود کا استحقاق۔ غرض جس طرح عقیدہ ضروری ہے اسی طرح عمل بھی۔ اور یہ عقیدہ مرجیہ کا ہے کہ عقیدہ درست ہونا چاہیے عمل کی ضرورت نہیں ہے اور ایمان اپنے درجہ پر ہیں ہم چونکہ اہل سنت وجماعت ہیں اس لیے دونوں کو ضروری سمجھتے ہیں۔

صغیرہ گناہ پر جرأت کا اثر

ہر چند کہ دوسرا مرتبہ اور اس کی شکایت اول کے درجہ پر نہیں جیسا کہ اوپر بیان ہوا لیکن یہ مرتبہ بھی چھوٹا نہیں خاطر جمع نہ ہو جائے بلکہ اگر یہ صغیرہ بھی ہوتا تب بھی بے فکری کی چیز نہ ہوتا۔ خیال کیجئے کہ چھوٹی سی چنگاری کیا گل کھلاتی ہے۔ صغیرہ گناہ پر بھی جرأت کرنا بڑا زیاں ہے۔ اگر صغیرہ کوئی بڑی بات نہیں ہے تو جو صاحب یہاں سے جائیں وہ اپنے گھر جا کر چھت میں ذرا سی چنگاری آگ کی رکھ دیکھیں کہ وہ تھوڑی دیر میں کیا اثر دکھاتی ہے۔ اسی طرح چھوٹا سا گناہ بھی تمام نیکیوں کو برباد کر دیتا ہے جس طرح کہ چھوٹی سی چنگاری سارے گھر کو جلا کر خاکستر بنا دیتی ہے اور دوسرا درجہ ترک آخرت کا۔ اگرچہ معصیت ہے کفر نہیں اور معصیت کا درجہ کفر سے کم نہیں لیکن اس پر عمل کرنا بھی تو سخت ظلم ہے اور کفر کے مقابلہ میں کم ہونے سے اس کا فی نفسہ صغیرہ ہونا لازم نہیں آتا۔

مولانا کی ایک مثال مجھے یاد آئی، فرماتے ہیں:

آسماں نسبت بعرش آمد فرود   لیک بس عالیست پیش خاک تود

''آسمان عرش کے مقابلہ میں بے شک نیچا ہے لیکن مٹی کے ٹیلہ سے تو کہیں اونچا ہے''

یعنی آسمان گو عرش سے چھوٹا ہے مگر زمین سے تو بڑا ہے۔ اگر کوئی شے درجہ چھوٹی ہو تو یہ لازم نہیں کہ وہ فی نفسہ چھوٹی ہو اور بعضے مدعی تو ہیں اعتقاداً ماننے کے مگر واقع میں وہ من حیث المذہب

نہیں مانتے بلکہ قومیت کی حفاظت کے لیے مانتے ہیں۔ مذہب چونکہ ایک ایسی چیز ہے جو تمام افراد کو متحد بنا دیتا ہے اس لیے اس کو اختیار کر لیا ہے۔ اگر ان کی یہ غرض کسی اور مذہب سے حاصل ہوتی تو وہ ہرگز مسلمان نہ ہوتے۔

مذہب اور ترقی

ایک اخبار میں یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوا کہ اب چونکہ ترقی کا زمانہ ہے اس لیے وحشیانہ خیالات کو چھوڑ دینا چاہیے اور سب کو ایک ایسے نکتہ خیال پر قائم ہو کر ایک مذہب اختیار کر لینا چاہیے اور اس کی صورت یہ ہے کہ توحید کو اختیار کر کے اس کو اصل مذہب قرار دیں اور اعتقاد و رسالت کی ضرورت کو بھی چھوڑ دیں۔ افسوس! مسلمان اور یہ رائے۔

از مذہب من گبر و مسلماں گلہ دارد

(میرے مذہب سے گبر و مسلمان شکوہ رکھتے ہیں)

ایک ایسے ہی شخص کے جواب میں میں نے کہا کہ خدا کی توحید کو تو تسلیم کرتے ہو اور توحید یہی ہے کہ اس کی ذات وصفات میں کامل اور متوحد خیال کیا جائے اور من جملہ خیالات کے صدق بھی ہو۔ جھوٹ بولنا بڑا نقص ہے۔ پس اعتقاد کذب منافی توحید ہوگا اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے: **مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ!** پس جو شخص رسالت کا منکر ہوگا وہ توحید ہی کا منکر ہوگا۔ پس ثابت ہوا کہ توحید کا قائل ہونا لازم ہے کہ رسالت کا بھی قائل ہو مگر ایسے قوم پرست رسالت ہی کا خاتمہ کیے دیتے ہیں اور ایسے لوگ اگرچہ بعض اوقات اسلام کی خدمت بھی کرتے ہیں لیکن خدمت ہمارے نزدیک اس لیے قابل قدر نہیں کہ ان کا مقصود خود خدمت مذہب نہیں ہے بلکہ محض ترقی قوم مقصود ہے اور اگر اسلام کو سچا سمجھ کر اس کی خدمت کی جاتی تو ان کے آثار سے اس کی جھلک معلوم ہوتی لیکن واقعات اس کے خلاف ہیں۔

چنانچہ عقائد اسلام پر جرح کی جاتی ہے اہل دین کو حقیر سمجھا جاتا ہے۔ مسائل اسلام میں شبہات پیدا کیے جاتے ہیں۔ اگر حق سمجھ کر دین و مذہب کی خدمت کی جاتی تو ان باتوں کی کہاں نوبت آتی۔ ان کی غرض تو صرف قومیت کا بڑھانا اور قومیت کو نشو ونما بخشنا ہے جس طرح دوسری قومیں ترقی اور نشو ونما حاصل کر رہی ہیں ترقی کی دوڑ میں سب سے آخر میں مسلمان جاگے۔ لیکن ایسے جاگے کہ سوتے ہی رہتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ غرض ترک آخرت کے مراتب مختلف ہیں اور اس کے اعتبار سے آج کل چند قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔

پرانی وضع کے لوگ جو عام قسم کی برائیوں میں مبتلا پائے جاتے ہیں اگرچہ آسائشی زندگی نے انہیں ایسا بنادیا ہے کہ ان کی عملی زندگی بہت خراب ہے لیکن وہ بایں ہمہ جب علماء و صلحاء کو دیکھتے ہیں تو دل سے تعظیم بجالاتے ہیں اور جھک جاتے ہیں اور یہ سمجھ کر کہ یہ لوگ اللہ والے ہیں ان کا ادب کرنا چاہیے' ادب کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ محض درویشوں صورتوں تک سے ڈرتے ہیں' خدمت کرتے ہیں اگرچہ وہ رہزن ہی کیوں نہ ہوں اور واقع میں یہ دنیادار لوگ ان درویشوں سے ہزار درجے بہتر ہیں۔

میرے ایک عزیز بیان کرتے تھے کہ فلاں جگہ کے امراء تمام جنتی ہیں اور فقراء دوزخی کیونکہ امراء تو فقراء سے دین کے لیے تعلق رکھتے ہیں اور فقراء امراء سے دنیا کا تعلق رکھتے ہیں۔

ایک حکایت کسی پیر و مرشد کی مشہور ہے کہ مرید نے پیر سے خواب بیان کیا' دیکھتا ہوں کہ میری انگلیاں پائخانہ میں بھری ہوئی ہیں اور آپ کی انگلیاں شہد میں۔ پیر جی نے کہا ہاں ٹھیک تو ہے اس میں شک ہی کیا ہے' ہم ایسے ہی ہیں اور تو ایسا ہی ہے۔ مرید نے کہا ابھی خواب پورا نہیں ہوا' یہ بھی دیکھا کہ میں تمہاری انگلیاں چاٹ رہا ہوں اور تم میری انگلیاں چاٹ رہے ہو۔ پیر صاحب بہت خفا ہوئے۔ اس حکایت کی وہی حاصل ہے کہ مرید تو پیر سے دین حاصل کرنا چاہتا ہے کہ وہ مشابہ شہد کے ہے اور پیر مرید کے دنیا حاصل کرنا چاہتا ہے کہ مشابہ پائخانہ کے ہے۔

دوسرے وہ لوگ ہیں جن کے دل میں اسلام کی وقعت و عظمت ہی نہیں۔ پہلی قسم کے لوگوں کا علاج موت کو یاد کرنا ہے۔ علم و اعتقاد تو تھا ہی عمل کی کمی تھی اس وجہ سے موت کی یاد ان کے لیے عبرت بخش ہوگی۔ چنانچہ فرمایا گیا:

اکثروا ذکر ھاذم اللذات [1]

موت کو اکثر یاد کیا کرو' موت کے خیال اور مراقبہ سے بہت جلد اصلاح ہو جائے گی۔ علاوہ ازیں فرمایا گیا ہے کہ اگر بیس مرتبہ موت کو روزانہ یاد کیا کرے تو شہادت کا مرتبہ حاصل ہو لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف موت کا نام لے لیا کرو بلکہ غرض یہ ہے کہ موت کو اس طرح یاد کرو کہ گناہوں سے بچانے کا سبب بن جائے۔

دوسروں کا علاج یہ ہے کہ وہ کسی محقق کی خدمت میں رہیں' خدا کے لیے مسلمانو رحم کرو' تم نہایت خطرناک حالت میں ہو' تمہاری اصلاح کی سخت ضرورت ہے۔ اب معلوم کرنا چاہیے کہ جس طرح اہل دنیا کی یہ قسمیں ہیں اسی طرح اہل دین باعتبار ترک آخرت کے دو قسم پر ہیں' اہل ظاہر و اہل باطن۔

---

[1] (أنظر تخريج الحديث الرقم: ۳۰)

دین داروں کی کوتاہی

ظاہری دینداروں میں یہ کمی ہے کہ بعض اعمال آخرت کے جن کے ترک کو وضع کے خلاف نہیں سمجھتے انہوں نے چھوڑ رکھے ہیں اور مضمرات آخرت میں مبتلا ہیں۔ مثلاً غیبت کرنا جو بلائے عام ہونے کے سبب مخل تقویٰ ہی نہیں سمجھا جاتا جیسا بی بی تمیزہ کا وضو تھا کہ فسق و فجور سے بھی نہ ٹوٹتا تھا۔ اس کا علاج یہ ہے کہ:

قال را بگذار ومرد حال شو   پیش مرد کاملے پامال شو

''قال کو چھوڑ دو اور حال پیدا کرو' حال پیدا کرنے کے لیے کسی کامل کی جوتیاں سیدھی کرو۔''

اور بدون اس کے اکثر حالت یہ رہتی ہے:

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند   چوں بخلوت می رسند آں کار دیگری کنند

مشکلے دارم زدانشمند مجلس بازپرس   توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتری کنند

''ریاکار واعظ جو محراب و منبر پر جلوہ فرما ہوتے ہیں' جب خلوت میں ہوتے ہیں تو دوسرے کام کرتے ہیں' مجھے مشکل ہے کہ محفل کے عقل مندوں سے پوچھوں توبہ کی نصیحت کرنے والے خود کم توبہ کرتے ہیں''

یہ تو خرابی واعظوں میں ہے۔ ایک خرابی تارکین وعظ میں اس سے بڑھ کر ہے وہ یہ کہ بعضے لوگ اس لیے خود وعظ نہیں کہتے کہ خود عامل نہیں۔ اس میں دو گناہ ہیں' ایک تو خود عامل نہ ہونا اور عمل کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ دوسرے اور لوگوں کو بھی تبلیغ نہ کرنا۔ بعض اہل علم دولت مندوں کے پاس پڑے رہتے ہیں اور لالچی و طماع ہو جاتے ہیں۔ یہ بری بات ہے جو لوگ اچھے ہوتے ہیں وہ دولت مندوں سے ہمیشہ متنفر رہتے ہیں۔

بئس الفقیر علی باب الامیر ونعم الامیر علی باب الفقیر.

اسی لیے وہ حق نہیں کہہ سکتے کیونکہ طمع ان کا مانع ہوتی ہے۔

طمع بگل وہرچہ خواہی بگو

(پھول کی طمع دل میں ہو تو پھر جو چاہے کہہ لے)

شاہ سلیم کا واقعہ ہے کہ شاہ جہان ان کے پاس آئے تو انہوں نے پاؤں بھی نہ سمیٹے جو کسی نے پوچھا تو فرمایا کہ جب سے ہاتھ سمیٹا پاؤں پھیلا دیا۔

مولانا شہید رحمتہ اللہ علیہ ایک مرتبہ لکھنؤ تشریف لے گئے۔ لکھنؤ کے ایک شہزادہ حاضر ہوئے اور زمینی سلام کیا' آپ نے انگوٹھا دکھا دیا' اس نے اشرفی نذر دی۔ آپ نے منہ چڑا دیا' مولانا نے ایسا قصداً کیا تھا' کیوں؟ اس لیے کہ اہل دنیا تنگ نہ کریں اور غیر مہذب سمجھ کر وہ پاس

نہ آئیں تاکہ دنیاداروں کے جھگڑوں سے نجات ہو یہ سب بے طمعی کے سبب تھا۔

پس حب مال کا علاج ایسے اولیاء اللہ کی صحبت میں رہنا ہے' اولیاء اللہ کی صحبت میں رہنے سے مال و دولت سے محبت دور ہو جاتی ہے اور غنائے باطنی حاصل ہوتا ہے۔ یہ کمی تھی اہل ظاہر میں' اس سے اہل باطن خوش ہو رہے ہوں گے کہ ہم میں کوئی کمی نہیں اور نہ کوئی خرابی ہے لیکن ان کو واضح رہنا چاہیے کہ لطیف غذا جب بگڑتی ہے تو سب سے ہی زیادہ گندی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح صوفیوں کا بگڑنا ہے ان میں جو بگڑتے ہیں ان میں بدخلقی بدمزاجی وغیرہ ایسی بری باتیں پائی جاتی ہیں حالانکہ درویشوں میں ان امور کا پایا جانا نہایت ہی مستنکر ہے۔

حضرت قبلہ و کعبہ کی تعلیم بتلاتا ہوں۔ حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ بعض درویش امراء کی تحقیر کرتے ہیں یہ ہمیں پسند نہیں۔ جب امیر تمہارے دروازہ پر آ گیا تو حسب قول **نعم الامیر علی باب الفقیر** وہ **نعم الامیر** میں داخل ہو گیا اس لیے اس میں اخلاق برتنا چاہیے۔ حضرت حاجی رحمتہ اللہ علیہ سب سے ملتے اور سب کی تعظیم کرتے تھے۔

"انزلوا الناس منازلھم"[1] ہمارے لیے حکم ہے یعنی لوگوں کو ان کے مرتبوں کے موافق بٹھاؤ۔ میرا خیال ہے کہ خدا جس کو بڑا بنائے جیسے امراء اس کو تم بھی بڑا سمجھو۔ البتہ خوشامد و طمع سے دور ہو اور خوش اخلاقی برتو۔ مگر افسوس ہے کہ جو خوش اخلاق بنے ہیں وہ امراء سے خود ملتے نہیں' امراء کے گھروں پر جاتے نہیں تو ایسوں سے بھلا ان کی اصلاح کیوں کر ہو۔ پس نہ تو خود ان کے گھر جائیں اور نہ ان کو اپنے آنے سے روکیں بلکہ اگر وہ آئیں تو ان سے ملنے میں عذر نہ کریں کیونکہ ان کی اصلاح بھی تمہارا فرض ہے۔ اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ بعض امراء اور دنیادار علماء کی جو شکایت کیا کرتے ہیں کہ وہ خود ہماری اصلاح کے لیے ہمارے پاس کیوں نہیں آتے۔ یہ شکایت بیجا ہے انہیں غور کرنا چاہیے کہ پیاسا کنویں کے پاس آتا ہے' کنواں پیاسوں کے پاس نہیں آیا کرتا۔ علماء کو تمہاری ضرورت نہیں' تم کو علماء کی ضرورت ہے' تم ان کے پاس جاؤ' کیا کبھی سول سرجن بھی بغیر بلائے اور فیس لیے تمہارے گھر آیا ہے۔ اس خیال سے اگر میری رائے میں مولوی بھی اپنی فیس مقرر کر دیں تو اچھا ہے لیکن ابھی مولوی جلدی نہ کریں' کہیں میری رائے ظاہر ہوتے ہی فیس لگا دیں بلکہ ابھی کچھ انتظار کریں' ابھی اس کا موسم نہیں آیا ہے۔ یہ عیب مذکور بدمزاجی کا تو دنیادار درویشوں میں ہے۔

صوفیوں کی کوتاہی

دوسرا عیب جو سچے صوفیوں میں **تحبون العاجلہ** کا ہے وہ دقیق ہے۔ وہ یہ کہ ذرا سا کام

---

[1] (سنن ابی داؤد: ۴۸۴۲' کنز العمال: ۵۷۱۷' اتحاف السادۃ المتقین ۶: ۲۶۵)

کر لینے کے بعد اس امر کے منتظر رہتے ہیں کہ کوئی کیفیت پیدا ہو اور جب کوئی کیفیت پیدا نہیں ہوتی تو پیر صاحب سے شکایت کرتے ہیں کہ ہم نے درود پڑھا' سب کچھ کیا لیکن ابھی تک کوئی کیفیت پیدا نہیں ہوئی۔ یہ بھی حب عاجلہ میں داخل ہے کیونکہ کیفیت ثمرہ عاجلہ ہے جو موعود بھی نہیں۔ اصل موعود مقصود ثمرہ آخرت کا ہے کہ وہ نجات اور رضا ہے۔ پس یہ بھی بڑی کمی ہے جس پر نظر ہی نہیں ہے' اس کا علاج نقل کرتا ہوں۔

حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے اگر کوئی آ کر یہ کہتا کہ حضرت اللہ کے نام سے کچھ فائدہ نہیں ہوا' آپ جواب میں فرماتے کہ یہ فائدہ کیا کم ہے کہ اللہ کا نام لیتے ہو۔

گفت آں اللہ تو لبیک ماست　　　دیں نیاز و سوز دردل پیک ماست

''تیرا اللہ ہی کہنا ہمارا جواب ہے اور تیرا یہ سوز و نیاز اور درد ہمارا قاصد ہے۔''

نیز حضرت نے فرمایا کہ تم کسی امیر کے گھر جاؤ جو تمہارا آنا پسند نہ کرے تو وہ کان پکڑ کر نکال دے گا۔ پس جب مسجد میں جاتے ہو اور وہاں سے نہیں نکالے جاتے تو سمجھو کہ حاضری مقبول ہے۔ چنانچہ غیر مقبولین کو حاضری کی توفیق بھی نہیں ہوتی۔

ایک واقعہ ہے کہ کسی امیر کے غلام نے نماز کے وقت مالک سے اجازت چاہی' مالک نے کہا اچھا' غلام مسجد میں چلے گئے اور مالک دروازہ پر بیٹھے رہے۔ غلام کو بہت دیر ہوگئی اور مالک نے مجبور ہو کر پکار کر دریافت کیا کہ اتنی دیر سے کیا کر رہے ہو؟ غلام نے کہا کہ باہر آنے نہیں دیتا' مالک نے کہا کون باہر آنے نہیں دیتا؟ اس نے جواب دیا کہ وہ جو تم کو اندر نہیں آنے دیتا۔

ذکر و شغل کی ضرورت

ایک شخص نے ایک محقق سے کہا کہ اتنے دن ہوئے ذکر و شغل کا کچھ نتیجہ نہیں نکلا' جواب میں فرمایا کہ اگر نفع نہ بھی ہو تو کچھ پرواہ نہیں۔ اس کی مثال اس طرح ہے کہ مالک کسی غلام سے کوئی کام لے اور وہ مالک سے کہے کہ کیا ملے گا' کیا غلام کا یہ جواب گستاخی نہ ہوگا؟ اسی طرح خدا کے غلام ہیں' ہمیں کیا حق ہے کہ ہم اس سے کچھ معاوضہ مانگیں۔

بوستان میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص عبادت کرتا تھا' آواز آئی کہ قبول نہیں ہوتی مگر وہ عبادت میں مشغول رہا۔ ایک مرید نے پیر سے کہا کہ ایسی عبادت سے کیا فائدہ جو مقبول نہیں ہوتی۔ پیر نے کہا' اے برخوردار

نیز حضرت نے فرمایا کہ تم کسی امیر کے گھر جاؤ جو تمہارا آنا پسند نہ کرے تو وہ

توانی ازاں دل بہ پرداختن　　　　که دانی که بے اوتواں ساختن

''اس شخص سے دل خالی کر سکتے ہو جس کے متعلق معلوم ہو کہ بغیر اس کے گزر کر سکتے ہو۔''

اگر دوسرا دروازہ ہوتا تو میں وہاں چلا جاتا' دروازہ یہی ایک ہے اس سے علیحدہ ہو کر کہاں ٹھکانا ہے اس پر فوراً آواز آئی:

قبول است اگرچہ ہنر نیست است　　　　که جز ماپناہ دیگر نیست است

''قبول ہے اگرچہ کمال کی کوئی بات اس میں نہیں سوائے اس بات کے تو نے یہ کہہ دیا کہ ہمارے پاس پناہ کی کوئی دوسری جگہ نہیں''

بیعت کی حقیقت

کانپور میں ایک بزرگ تھے شاہ غلام رسول نما۔ وہ اپنی توجہ سے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرا دیتے تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی ایسے لوگ گزرے ہیں۔ وہ لکھنؤ اپنے مرشد کے پاس گئے' بیعت ہونے کے لیے مرشد نے استخارہ کے لیے فرمایا' شاہ صاحب وہاں سے تھوڑی دور ہٹ کر جا بیٹھے' پھر حاضر ہو گئے۔ مرشد نے کہا کہ یہ کیسا استخارہ تھا؟ کہا کہ میں نے بیعت ہونے کے لیے نفس سے کہا کہ بیعت بک جانے کو کہتے ہیں تو آزادی کو چھوڑ کر غلام بنتا ہے کیوں بے وقوف ہوا ہے۔ نفس نے جواب دیا کہ جانے کے بعد خدا تو ملے گا' میں نے کہا کہ کیا تیرا اجارہ ہے اگر نہ ملا' نفس نے کہا کہ اگر نہ ملے گا تو بلا سے مگر اسے خبر تو ہوگی کہ ہم کو کسی نے طلب کیا تھا مگر ہم نہ ملے۔

ہمینم بس کہ داند ماہر ویم　　　　که من نیز ازخریداران اویم

''یہی کافی ہے کہ میرا محبوب جان لے کہ میں اس کے خریداروں میں سے ہوں۔''

مولوی صاحب نے فرمایا' جزاک اللہ! ایسا استخارہ کسی نے نہیں کیا۔

ہر کام میں مقصود کام ہی ہونا چاہیے' خواہ ثمرہ ملے یا نہ ملے' ہر حالت میں راضی رہنا چاہیے۔

اگر ایسا نہ کیا گیا تو تحبون العاجلہ میں من وجہ داخل ہو گے۔

مسلمانو! آخرت کے لیے عمل کرو ورنہ اس شکایت میں داخل ہو جاؤ گے۔

ترجیح الآخرہ

شریعت نے تمتع دنیا سے منع نہیں فرمایا بلکہ ترجیح دنیا علی الآخرۃ سے منع کیا ہے۔ پس دنیا کو بقدر ضرورت طلب کرنا خواہ تجارت سے ہو یا ملازمت سے یہ حرام نہیں۔ ہاں ! دین کو برباد کر کے دنیا کمانا حرام ہے۔

آخرت کی فضیلت پر یہ وعظ باغ عبدالباقی خاں واقع الہ آباد میں شب دوشنبہ بعد عشاء ۱۰ شعبان ۱۳۴۰ھ کو قریباً ۹۰۰ کے مجمع میں کھڑے ہو کر فرمایا جو اڑھائی گھنٹے میں ختم ہوا اور مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی عثمانی نے اسے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰۤی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ. اَمَّابَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ.

بَلۡ تُؤۡثِرُوۡنَ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ وَّاَبۡقٰی. اِنَّ ھٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الۡاُوۡلٰی صُحُفِ اِبۡرٰھِیۡمَ وَمُوۡسٰی. (سورۃ الاعلیٰ آیت نمبر ۱۶،۱۷،۱۸،۱۹)

ترجمہ: ’’مگر اے منکرو تم آخرت کا سامان نہیں کرتے بلکہ تم دنیوی زندگی کو مقدم رکھتے ہو حالانکہ آخرت (دنیا سے) بدرجہا بہتر اور پائیدار ہے اور یہ مضمون صرف قرآن ہی کا دعویٰ نہیں بلکہ) یہ مضمون اگلے صحیفوں میں بھی ہے یعنی ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں (پس زیادہ تر موکدہوا)۔‘‘

حق تعالیٰ کا شکوہ

ان آیتوں میں سے مجھے اول آیت کا بیان کرنا مقصود ہے اور اخیر کی دو آیتیں اسی پہلی آیت کی تاکید میں ہیں اس لیے میں نے بھی تاکیداً ان کو پڑھ دیا ہے ورنہ مقصود پہلی آیت ہے کیونکہ وہی اصل ہے اور یہ دونوں اس کی تابع ہیں۔ پس بیان میں بھی ان کے ساتھ متبوع و تابع کا سا برتاؤ کیا جائے گا۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے ہماری ایک حالت کا بیان فرمایا ہے۔ پھر اس پر شکایت فرمائی ہے اور جس طرح اس حالت کے درجات مختلف ہیں کہ اس کا ایک درجہ کفار کے ساتھ مخصوص ہے اور ایک درجہ اہل ایمان و اہل کفر دونوں میں مشترک ہے اسی طرح شکایت کے بھی درجات مختلف ہیں۔ بڑے درجہ میں بھی شکایت ہے اور چھوٹے درجہ میں کم لیکن چھوٹا درجہ اہل ایمان اور کفار میں مشترک ہے اس لیے اس درجہ میں شکایت مشترک ہے۔

اب سنئے وہ حالت کیا ہے اور اس پر شکایت کیا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ’’بَلۡ تُؤۡثِرُوۡنَ

اَلْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا" اس میں لفظ بل اعراض کے لیے ہے یعنی پہلی بات سے اعراض کر کے اس کے مقابل دوسری بات کا ذکر ہے۔ اس سے پہلے ارشاد ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی وَذَکَرَاسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی[1]

اس میں فلاح کا طریقہ بتلایا ہے کہ بامراد ہو وہ شخص جو (قرآن سن کر خبیث عقائد و اخلاق اور ناشائستہ اعمال سے) پاک ہو گیا اور اپنے رب کا نام لیتا اور نماز پڑھتا رہا۔ اس کے بعد لفظ بل اعراض کے لیے لایا گیا ہے یعنی مگر اے منکرو! تم قرآن سن کر اسے نہیں مانتے اور آخرت کا سامان نہیں کرتے بلکہ تم دنیوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو۔ حاصل یہ ہوا کہ فلاح کے مقابل ہماری یہ حالت ہے گو اس میں مقابلہ کی تصریح نہیں مگر لفظ بل مقابلہ کو بتلاتا ہے کیونکہ وہ موضوع ہے اعراض کے لیے جس کی حقیقت ہے پہلے کی نفی اور دوسرے کا اثبات اور اثبات و نفی میں تقابل ظاہر ہے۔ پس اس سے صاف معلوم ہوا کہ دنیوی زندگی کو آخرت پر مقدم کرنا فلاح کے خلاف ہے اور اس سے فلاح مبدل بہ خسران ہو جاتا ہے۔ پس ہماری وہ حالت یہ ہے کہ ہم اپنی فلاح کا اہتمام نہیں اور اس پر خدا تعالیٰ کی شکایت یہ ہے کہ تم دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو۔

پس یہ مضمون نہایت قابل اہتمام ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے اس جگہ جو شکایت بیان فرمائی ہے وہ معمولی شکایت نہیں بلکہ اس کا نتیجہ فلاح سے محرومی اور خسران میں مبتلا ہونا ہے اول تو خود حق تعالیٰ کا شکایت فرمانا ہی ہمارے اہتمام کے لیے کافی محرک ہونا چاہیے اور ہم کو ڈرنا چاہیے کہ شاید حق تعالیٰ ہماری ہی شکایت فرما رہے ہوں۔ اور یہ کیا تھوڑی بات ہے کہ احکم الحاکمین کو کسی سے شکایت ہو۔ ایک ادنیٰ حاکم کسی کی شکایت کرتا ہے تو اس کا کیا حال ہوتا ہے۔ پھر مسلمان کو خدا کی شکایت سنکر ضرور بیدار ہو جانا چاہیے۔ خصوصاً جب کہ وہ شکایت ایسی بات کے متعلق ہے جس کا نتیجہ ہمارے ہی حق میں مضرت رساں ہے۔ خدا تعالیٰ کا اس سے کوئی ضرر نہیں۔

اور ہر چند کہ مخاطب اس آیت کے بظاہر کفار ہیں مگر اس سے ہم کو بے فکری اور جسارت نہیں ہو سکتی کیونکہ دنیا کو آخرت پر مقدم کرنے کے درجات مختلف ہیں۔ کفار میں اس کا بڑا درجہ ہے اس لیے ان سے شکایت بھی بڑی ہے اور ہمارے اندر اس کا چھوٹا درجہ ہے تو ہم سے شکایت گو کم درجہ میں ہے مگر ہے ضرور کیونکہ جب منشاء موجود ہے تو شکایت ضرور ہو گی۔ پس یہ سمجھ کر ہم کو جسارت نہ کرنا چاہیے کہ اس کے مخاطب کفار ہیں اور ہمارے اندر اس درجہ کی غفلت نہیں جس درجہ کی کفار

---

[1] (سورۃ الاعلیٰ آیت نمبر ۱۴، ۱۵)

میں ہے کیونکہ جب ہمارے اندر بھی کسی درجہ کی غفلت موجود ہے تو اس سے بے فکری نہیں ہوسکتی۔

مضر شے کے درجات

دنیوی معاملات میں غور کرلیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس مضر شے میں مختلف درجات ہوں ان میں یہ کبھی نہیں دیکھا جاتا کہ درجہ اعظم کو چھوڑ کر عظیم کو اختیار کیا جاتا ہو۔ عشاق کا مذاق تو سب سے الگ ہے ان کو تو خدا تعالیٰ کی ادنیٰ ناگواری بھی پہاڑ معلوم ہوتی ہے مگر شکم پروروں کو ادنیٰ درجہ میں شاید کچھ گنجائش معلوم ہوتی ہو لیکن اعظم اور عظیم میں تو یہ لوگ بھی ایسا نہیں کرتے کہ اعظم کو چھوڑ کر عظیم کو گوارا کرلیں اور ادنیٰ درجہ میں بھی گنجائش ان کو نظر آتی ہے۔ وہ دین ہی میں نظر آتی ہے ورنہ دنیا میں تو وہ ادنیٰ درجہ کی مضرت سے بھی ویسے ہی احتیاط کرتے ہیں جیسی بڑے درجہ کی مضرت سے احتیاط کی جاتی ہے۔ مثلاً یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ کوئی شخص اپنے چھپر میں بڑا انگارا پڑنے سے تو احتیاط کرتا ہو اور چھوٹی چنگاری سے احتیاط نہ کرتا ہو بلکہ دونوں سے یکساں احتیاط کی جاتی ہے۔

اسی طرح مٹی کے تیل میں دیا سلائی چھوڑ کر کوئی مطمئن نہیں ہوتا حالانکہ دیا سلائی اس میں گر کر بعض دفعہ خود ہی گل ہوجاتی ہے مگر پھر بھی احتیاط کی جاتی ہے کیونکہ جتنے لوگ جلے ہیں وہ تنور یا انجن ہی کی آگ میں جل کر نہیں مرے بلکہ اکثر ایک دیا سلائی ہی نے کام تمام کردیا ہے۔ اسی لیے عقلاء ایک چنگاری سے ویسا ہی عذر کرتے ہیں جیسا تنور یا انجن سے کرتے ہیں بلکہ چنگاری سے بچنے کی زیادہ تاکید کرتے ہیں کیونکہ نادان آدمی اس کو خفیف سمجھ کر اس سے احتراز کم کرتے ہیں۔ اسی لیے آپ نے کسی عاقل کو انجن یا تنور کی آگ سے احتیاط کی تعلیم کرتے ہوئے نہ دیکھا ہوگا کیونکہ اس تعلیم کی ضرورت نہیں اس سے تو ہر شخص خود ہی بچتا ہے۔ ہاں ڈبیہ اور چنگاری سے احتیاط کی تاکید کرتے ہوئے اپنے بڑوں کو بہت دیکھا ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ مضرت کا ادنیٰ درجہ زیادہ قابل اہتمام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجنبی لوگوں سے خلوت کو منع کرنے میں زیادہ سخت الفاظ نہیں فرمائے اور نامحرم اقارب سے خلوت کے بارے میں ارشاد ہے: ''الحموا الموت''[1] یعنی کسی نے سوال کیا تھا کہ یا رسول اللہ! عورت اگر اپنے دیور کے ساتھ تنہائی میں بیٹھے تو کیسا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ وہ تو موت ہے۔ اس فرق کی وجہ یہی ہے کہ اس کو لوگ خفیف سمجھتے ہیں اور خفیف سمجھ کر اس سے احتیاط نہیں کرتے

[1] (الصحیح للبخاری ۷: ۴۸، الصحیح لمسلم کتاب السلام: ۲۰، سنن الترمذی: ۱۱۷۱، مشکوٰۃ المصابیح: ۳۱۰۲، تفسیر ابن کثیر ۶: ۵۲)

اور تربیت کا اصول یہ ہے کہ لوگ جس مضرت کو خفیف سمجھیں، مربی و حکیم اس سے زیادہ ڈرایا کرتا ہے۔

اب نفس کا یہ عذر غلط ہو گیا کہ اس کے مخاطب تو کفار ہیں کیونکہ معلوم ہو گیا کہ تقدیم دنیا علی الآخرت کے مختلف درجے ہیں۔ کفار میں بڑا درجہ ہے ان کو اس سے منع کیا گیا اور تمہارے اندر چھوٹا درجہ ہے تم کو اس سے منع کیا جاتا ہے۔ شکایت کی علت اور منشاء میں عذر کرنا چاہیے جب وہ موجود ہو تو شکایت بھی ضرور ہوگی۔ پھر جس درجہ کی آپ کم سمجھتے ہیں وہ مضرت اعظم کے سامنے صغیرہ ہے مگر فی نفسہ صغیرہ نہیں۔

آسماں نسبت بعرش آمد فرود لیک بس عالی ست پیش خاک تود

"یعنی آسمان عرش کے سامنے چھوٹا ہے لیکن فی نفسہ چھوٹا نہیں، زمین سے تو ہزاروں درجے بڑا ہے۔"

غفلت کا درجہ

اسی طرح گو ہمارے اندر جو درجہ غفلت کا ہے وہ اس غفلت سے کم ہے جو کفار میں ہے مگر فی نفسہ یہ خود بھی عظیم ہے جس نے ہمارے دین کو ناقص اور مردہ بنا رکھا ہے۔ لہٰذا اس کے مخاطب ظاہر میں گو کفار ہی ہیں مگر اشتراک علت کی وجہ سے جہاں جہاں یہ علت موجود ہوگی سب ہی مخاطب ہوں گے۔ اگر مسلمانوں کا اس کا مخاطب نہ مانا جائے تب تو یہ بات اور بھی زیادہ قابل لحاظ ہے کیونکہ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ مسلمانوں سے اس امر کا صدور نہیں ہو سکتا۔ ان کا اسلام ہی اس سے روکنے کے لیے کافی ہے۔ مستقل خطاب کی ضرورت نہیں اور صدور نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اس کا صادر ہونا مسلمان سے عقلاً ممتنع ہے بلکہ ممتنع عادی مراد ہے کہ مسلمان سے اس کا صدور عادۃً ممتنع ہے اور شرائع میں اس نکتہ کا بہت لحاظ کیا گیا ہے کہ جو امور مخاطب سے عادۃً ممتنع الصدور ہوں ان سے صراحتہً منع نہیں کیا گیا کہ اس سے تو یہ خود ہی بچیں گے۔

مثلاً زنا اور چوری سے منع کیا گیا، شراب پینے پر وعیدیں بیان کی گئیں لیکن شرب بول (پیشاب پینے) واکل غائط (پاخانہ کھانے) سے صراحتہً منع نہیں کیا گیا کیونکہ عادۃً مسلمان بلکہ صحیح الحواس سے یہ فعل ممتنع ہے اس سے بچنے کے لیے اس کا اسلام و صحت حواس خود زاجر ہے۔ خطاب مستقل کی کیا ضرورت ہے اور "اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ." (العنکبوت ۴۵) "بے شک نماز (اپنی وضع کے اعتبار سے) بے خیالی اور ناشائستہ کاموں سے روک ٹوک کرتی رہتی ہے۔" میں نہی کے معنی یہی زاجر ہوتا ہے۔

نماز سے فواحش کا سدباب

بعض لوگوں کو اس پر اشکال ہوتا ہے کہ نماز فحشاء والمنکر سے کیونکر روکتی ہے، ہم تو نمازیوں

کو فحش حرکات کرتے ہوئے ملاحظہ کرتے ہیں، ان صاحبوں کے نزدیک نماز کے منع کرنے کا یہ مطلب ہونا چاہیے کہ نماز حسا فحش کام سے روکتی ہے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ نماز کی ہیئت ایسی ہے کہ اپنے اقتضاء سے فحشاء و منکر سے زاجر ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ قانون ڈکیتی سے منع کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب کون سمجھتا ہے کہ قانون ڈکیتی کا صدور نہیں ہونے دیتا بلکہ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ قانون میں اس کی ممانعت ہے اور سخت سزا بتلائی گئی ہے۔ اب اگر کوئی قانون پر عمل نہ کرے تو اس سے یہ کلام غلط نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح مسلمانوں کو اس آیت کا مخاطب نہ ماننے سے اس بات کو ماننا پڑے گا کہ مسلمان سے اس کا صدور ہی نہیں ہوسکتا اس لیے نہی مستقل کی حاجت نہیں تو اس طریق سے تو اس فعل کی قبح میں اور زیادہ شدت ہوگئی کیونکہ اب مطلب یہ ہوا کہ دنیا کو آخرت پر ترجیح دینا کافروں ہی کا کام ہے۔ مسلمان کو اس کا اسلام ہی اس سے روکتا ہے اس لیے اس کو مخاطب نہیں بنایا گیا تو اس سے صاف یہ لازم آیا کہ جو مسلمان ایسا کرتا ہے وہ کافروں کا کام کرتا ہے اور یہی مطلب ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا:

من ترک الصّلوٰۃ متعمداً فقد کفر۔[1]

یعنی جس نے نماز کو عمداً ترک کیا وہ کافر ہوگیا یعنی اس نے کافروں کا کام کیا کیونکہ عادۃً مسلمان سے نماز کا ترک صادر نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ اس زمانہ میں واقعہ یہی تھا۔ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم فرماتے ہیں:

کان فرق مابیننا و بین المنافقین ترک الصّلوٰۃ

کہ ہمارے اور منافقوں کے درمیان میں نماز کا ترک کرنا ہی عابہ الامتیاز تھا۔

تو یہ **فقد کفر** ایسا ہے جیسے ہم اپنے بیٹے کو کہیں کہ تو پورا چمار ہے۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ تو چماروں کے کام کرتا ہے۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ تو واقع میں چمار ہے اسی طرح حدیث کا مطلب سمجھ لیا جائے۔ غرض مسلمانوں کو اگر اس آیت کا مخاطب نہ مانا جائے تو عتاب اور زیادہ شدید ہوگا۔ اب یہ بہانہ نہیں ہوسکتا کہ ہم اس آیت کے مخاطب نہیں ہیں یا تو کفار کے حق میں ہے۔ صاحبو! پھر تو اور زیادہ افسوس ہے کہ جو شکایت حق تعالیٰ کو کفار سے تھی آپ اسی میں مبتلا ہو رہے ہیں۔

دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کا نتیجہ

اب سمجھئے کہ وہ حالت ہماری کیا ہے جس کی حق تعالیٰ شکایت فرما رہے ہیں۔ وہ حالت یہ

---

[1] (أنظر تخريج الحديث الرقم: ۷۰)

ہے کہ ہم دنیا کو آخرت پر مقدم کر رہے ہیں اور یہ مرض ایسا ہے کہ ہم اس کو مرض ہی نہیں سمجھتے۔ اس میں عام ابتلا ہو رہا ہے، گناہوں کی فہرست میں چوری، زنا، شراب خواری کو سب گنیں گے، سود لینے اور رشوت لینے کو بھی گناہ سمجھیں گے لیکن کہیں یہ بھی کسی ذہن میں آتا ہے کہ دنیا کو آخرت پر ترجیح دینا بھی گناہ ہے۔ اس طرف کسی کو بھی التفات نہیں، اس کو گناہ تو کیا سمجھتے بلکہ بعض اوقات یوں کہتے ہیں کہ صاحب ہم تو دنیا دار آدمی ہیں، ہم سے دنیا کو نہیں چھوڑا جاتا، یہ کام تو انہی لوگوں کا ہے جو بیوی اور بچے نہ رکھتے ہوں، دنیا سے بالکل بے غرض ہوں۔

پس ترجیح دنیا علی الآخرت کے بعض افراد کو تو یہ لوگ گناہ ہی نہیں سمجھتے اور جس درجہ کو معصیت سمجھتے ہیں اس میں اپنے کو عاصی نہیں سمجھتے کیونکہ جب انہوں نے اپنے کو معذور سمجھ لیا تو معصیت کہاں رہی۔ ان لوگوں نے کسی سے سن لیا ہے کہ معذوری اور مجبوری کی حالت میں گناہ گناہ نہیں رہتا جیسے کسی نے ایک شخص کو دھمکی دے کہ شراب پیو ورنہ مار ڈالوں گا اور وہ دھمکی دینے والا ایسا کر بھی سکتا ہے تو اس صورت میں شریعت اس شخص کو حفاظت نفس کے لیے اجازت دیتی ہے کہ شراب پی لے۔ اس حالت میں شراب پینے سے تم کو گناہ نہ ہوگا۔ یہ مسئلہ سن کر لوگ ہر جگہ اس کو جاری کرنے لگے اور بات بات میں اپنے کو معذور سمجھ کر گناہ پر دلیر ہو گئے۔

میں کہتا ہوں کہ اس قانون شرعی کی یہ تفسیر آپ نے خود ہی تو کی ہے مگر آپ کو اس کا کیا استحقاق ہے، آپ کو شریعت ہی کے اکراہ کے حدود بھی پوچھنا چاہیے۔ اکراہ کے باب میں فقہاء نے اس کے حدود بیان فرمائے ہیں جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ شریعت میں اکراہ کا وہ کون سا درجہ ہے جس سے انسان معذور ہو سکتا ہے اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ جو تفسیر اکراہ کی آپ نے خود کی ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دیہاتی سرحدی نے قانون ریلوے کی تفسیر کی تھی کہ وہ ریل سے ایک من بھر کا کشمش کا بورا لے کر بغل میں دبائے نکلا۔ جب پلیٹ فارم کے دروازہ پر پہنچا تو ٹکٹ بابو نے اس کو ٹوکا کہ ٹکٹ لاؤ، اس نے ٹکٹ دکھا دیا، بابو نے کہا کہ اس سامان کی بلٹی بھی دکھاؤ، اس نے پھر وہی ٹکٹ دکھا دیا۔ بابو نے کہا یہ تو تمہارا ٹکٹ ہے، سامان کا ٹکٹ دکھاؤ۔ سرحدی نے کہا کہ یہی ہمارا ٹکٹ ہے اور یہی سامان کا ٹکٹ ہے۔ بابو نے کہا، نہیں! یہ سامان پندرہ سیر سے زیادہ ہے، اس کے لیے جدا ٹکٹ کی ضرورت ہے تو سرحدی صاحب کیا فرماتے ہیں: کہ نہیں! ریلوے نے پندرہ سیر کا قانون اس لیے مقرر کیا ہے کہ ہندوستانی آدمی اس سے زیادہ نہیں اٹھا سکتا اور حقیقت میں اس قانون کا مطلب یہ ہے کہ جتنا اسباب مسافر خود اٹھا سکے وہ معاف ہے اور جو اس

سے زیادہ ہو جس کے لیے مزدور کی ضرورت ہو اس پر محصول لگایا جائے گا۔ چونکہ ہندوستانی آدمی پندرہ سیر سے زیادہ خود نہیں اٹھا سکتا اس لیے پندرہ سیر کی تعین کر دی گئی اور ہم لوگ من بھر سے زیادہ خود اٹھا سکتے ہیں اس لیے ہمارا یہی پندرہ سیر ہے اس پر محصول نہیں ہو سکتا۔

تو کیا ریلوے کمپنی اس سرحدی کی اس تفسیر کو قبول کر سکتی ہے، ہرگز نہیں! وہ اس کے جواب میں یہ کہے گی کہ تم کو قانون کی تفسیر کرنے کا کوئی حق نہیں' قانون کا مطلب تم کو ہم سے پوچھنا چاہیے۔

اسی طرح قانون شرعی کی تفسیر کرنے کا آپ کو کوئی حق نہیں اور نہ آپ اس تفسیر کی بنا پر معذور ہو سکتے ہیں۔ غرض لوگوں نے اپنے دل میں یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم دنیا کو آخرت پر مقدم کرنے میں مجبور ہیں' اس لیے اس کو معصیت ہی نہیں سمجھتے اور اگر معصیت سمجھتے بھی ہیں تو نہایت ہی کم درجہ کی اور گناہ کبیرہ کو صغیرہ سمجھنا یہ خود معصیت ہے۔

جیسے کوئی شخص ڈکیتی کو ودیعت میں خیانت کرنے پر قیاس کرنے لگے اور یہ سمجھے کہ خیانت مذکورہ میں بھی دوسرے شخص کے مال کا ضائع کرنا ہے اور ڈکیتی میں بھی اس لیے یہ دونوں ایک درجہ کے جرم ہیں۔ تو حاکم وقت اس شخص پر دخل اندازی قانون کا جرم قائم کرے گا اور یہ کہے گا کہ جب قانون میں ڈکیتی اور خیانت کی سزائیں مختلف ہیں کہ ڈکیتی میں عبور دریائے شور یا چودہ برس کی قید سخت ہے اور خیانت میں یہ نہیں تو تم کو دونوں کے برابر کر دینے کا کیا استحقاق ہے؟ تم قانون میں دخل بے جا کرتے ہو۔

اسی طرح شریعت میں جب ہر گناہ کی سزا الگ ہے تو سب کو برابر سمجھنے کا کسی کو حق نہیں اور اگر کوئی صغیرہ سمجھے گا اس پر دوسرا جرم تحریف شریعت کا قائم ہو گا۔ اس لیے فقہاء نے تصریح کی ہے کہ معصیت کو خفیف سمجھنا معصیت بلکہ یہ قرب کفر ہے۔

آخرت سے بے فکری کا نتیجہ

حق تعالیٰ اسی کو شکایت فرماتے ہیں کہ تم ترجیح دنیا علی الآخرۃ کے مرض میں مبتلا ہو۔ فرماتے ہیں:

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (ای علی الآخرۃ ۱۲) وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى. (سورۃ الاعلیٰ ۱۶'۱۷)

ترجمہ: بلکہ تم دنیوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت دنیا سے بہتر اور زیادہ پائیدار ہے۔ یعنی تم اس کی کوشش کرتے ہو کہ دنیا میں عیش و عشرت اچھی طرح ہو آخرت چاہے کیسی ہی برباد ہو جائے اس جگہ آخرت کے متعلق ایک لفظ تو خیر کا فرمایا ہے جو کہ اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ آخرت دنیا سے بدرجہا بہتر ہے اور بہت بہتر ہے۔ دوسرا لفظ ابقی فرمایا کہ

وہ بھی اسم تفضیل ہے کہ آخرت بہ نسبت دنیا کے پائیدار بھی ہے مگر پھر بھی تم دنیا کو اس پر ترجیح دیتے ہو اور آخرت سے بے فکر ہو۔

حالانکہ ایک امر یہ بھی مشاہدہ ہے کہ آخرت میں بے فکری کے ساتھ دنیا اور گندی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ میں آگے بتلاؤں گا کہ آخرت فی نفسہ بھی قابل اہتمام تو ہے ہی مگر اس لیے بھی قابل اہتمام ہے کہ دنیا کی حلاوت اسی وقت نصیب ہوتی ہے جب کہ آخرت کی فکر ہو اور جو لوگ آخرت سے بے فکر ہیں بخدا ان کو دنیا کا بھی لطف حاصل نہیں ہوتا۔ (یہ مضمون بالکل اخیر میں بہت ہی مختصر مذکور ہوا۔ غالباً ارادہ مفصل بیان کرنے کا تھا مگر یاد نہیں رہا۔ جامع)

اب سمجھنا چاہیے کہ حق تعالیٰ کی اس شکایت کے ہم مصداق ہیں یا نہیں تو کفار کا مصداق شکایت ہونا تو ظاہر ہے مگر افسوس یہ ہے کہ مسلمان بھی آج کل اس شکایت کا مصداق بنے ہوئے ہیں ہر شخص اس مرض میں مبتلا ہے کہ اس کو بہ نسبت آخرت کے دنیا کا زیادہ اہتمام ہے' یہ تو میں نہیں کہتا کہ مسلمانوں کو آخرت کا اعتقاد نہیں یا وہ اعتقاداً آخرت کو دنیا سے کم سمجھتا ہو' ہاں' کفار کا یہ اعتقاد ہو سکتا ہے کیونکہ بعض کفار تو سرے سے آخرت ہی کے منکر ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ مرنے کے بعد آدمی مٹی میں مل جاتا ہے نہ اس کو کسی جگہ عذاب ہوگا نہ ثواب۔ اور بعض کفار کو آخرت کا اعتقاد اگر ہے بھی تو وہ ایسا اعتقاد ہے جیسے کوئی کہے کہ میں نے بادشاہ کو دیکھا تھا' اس کے ایک دم تھی اور ایک سونڈ تھی۔ اس تفسیر سے ہر شخص سمجھ لے گا کہ اس نے بادشاہ کو ہرگز نہیں دیکھا' نہ معلوم کس الا بلا کو دیکھ لیا ہے۔ اسی طرح جو کفار آخرت کے معتقد ہیں وہ اس کے متعلق ایسے خرافات بیان کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آخرت کے معتقد نہیں کسی دوسری چیز کے معتقد ہیں۔ اس لیے ان کا اعتقاد عدم اعتقاد کے حکم میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ساری کوشش دنیا ہی میں صرف ہو جاتی ہے' آخرت کا ان کو ذرا فکر نہیں۔

تو مسلمانوں کی یہ حالت تو نہیں ہے وہ آخرت کے معتقد بھی ہیں اور آخرت کا علم بھی ان کو صحیح طور پر حاصل ہے اور اس کو دنیا سے افضل بھی سمجھتے ہیں مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ ان کا عمل اس اعتقاد کے موافق نہیں' وہ صرف اعتقاد آخرت ہی کو مقصود سمجھے ہوئے ہیں اس سے عمل میں کام نہیں لیتے۔ ہر چند کہ اعتقاد کی خود بھی ضرورت ہے اور وہ فی نفسہ بھی مقصود ہے مگر اعتقاد کی ایک غایت عمل بھی ہے یعنی شریعت نے جو اعتقادیات کی تعلیم دی ہے اس سے دو مقصود ہیں ایک یہ کہ فی نفسہ ان امور کا اعتقاد رکھا جائے' دوسرے یہ کہ ان سے عمل میں کام لیا جائے کیونکہ یہ بات تجربہ

اور مشاہدہ سے ثابت ہے کہ اعتقاد کو عمل میں بہت دخل ہے۔ ایک عارف فرماتے ہیں:

موحد چہ برپائے ریزی زرش　　چہ فولاد ہندی نہی برسرش
امید و ہراسش نباشد زکس　　ہمیں است بنیاد توحید وبس

''موحد اور عارف کے قدموں کے نیچے خواہ سونا بکھیر دے یا اس کے سر پر تلوار رکھیں، امید و خوف اس کو سوائے خدا کے کسی سے نہیں ہوتا، توحید کی بنیاد بس اسی پر ہے۔''

توحید کامل کا اثر

دیکھئے! اس میں توحید کو اعمال میں مؤثر بتلایا گیا ہے کہ جب توحید کامل ہو جاتی ہے تو اس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ خدا کے سوا کسی سے رجاء و خوف نہیں رہتا۔ ایک آیت میں بھی اس مضمون کی طرف اشارہ ہے اور حدیث کے مل جانے سے تو تصریح ہو گئی۔ آیت یہ ہے:

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلاً صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا. (الکہف ۱۱۰)

ترجمہ: یعنی جس شخص کو خدا تعالیٰ سے ملنے (اور ان کے پاس جانے کا) اعتقاد ہو اس کو نیک عمل کرنے چاہئیں اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔'' حدیث میں اس جملہ لاشرک کی تفسیر میں لا یرائی وارد ہوا ہے۔ یعنی عبادت میں شریک نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ریا نہ کرے اور یہ تفسیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گویا حق تعالیٰ کی تفسیر ہے:

گفتہ او گفتہ اللہ بود　　گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

''آپ کا فرمان اللہ کا فرمان ہے اگرچہ یہ اللہ کے بندہ (سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان مبارک سے نکلا ہے۔''

اب اس آیت میں دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ اعتقاد لقاء رب کو عمل صالح میں بہت دخل ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے ''فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ پر فَلْيَعْمَلْ عَمَلاً صَالِحًا'' کو مرتب فرمایا ہے اور شرط و جزا میں علاقہ سببیت کا ہوا کرتا ہے۔ دوسرے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اعتقاد و لقاء رب کو زوال ریاء میں بھی دخل ہے کیونکہ ''وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ'' کو بھی ''فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ'' پر مرتب کیا گیا ہے۔ پس اعتقاد کو نفس عمل میں بھی دخل ہوا اور کمال عمل میں بھی اور آیت میں ریاء کو جو شرک سے تعبیر کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حقیقت ریاء کی یہ ہے

کہ عبادت کو کسی کے دکھلانے کے واسطے کیا جائے اور ظاہر ہے کہ جس کو دکھلانا مقصود ہوتا ہے وہ بھی فی الجملہ عبادت میں مقصود ہے تو اس شخص نے عبادت میں خدا کے ساتھ دوسرے کو بھی شریک کر لیا اور یہ شرک فی القصد ہے اس لیے ریاء کو حق تعالیٰ نے شرک فرمایا:

اس سے معلوم ہوا کہ توحید صرف **لا معبود الا اللّٰہ** کا نام نہیں یعنی توحید صرف اس کا نام نہیں کہ خدا کے سوا کسی کو معبود نہ سمجھے بلکہ **لا مقصود الا اللّٰہ** بھی کمال توحید ہے یعنی خدا تعالیٰ کے سوا کسی کو مقصود بھی نہ سمجھے اور جب خدا کے سوا کسی کو مقصود نے سمجھے گا تو اب اس کو کسی پر نظر نہ رہے گی نہ کسی سے خوف و طمع ہوگی۔ اسی کو عارف نے بیان فرمایا ہے:

موحد چہ برپائے ریزی زرش — چہ فولاد ہندی نہی برسرش
امید و ہراسش نباشد زکس — ہمیں است بنیاد توحید وبس

''موحد اور عارف کے قدموں کے نیچے خواہ سونا بکھیر دے یا اس کے سر پر تلوار رکھیں، امید و خوف اس کو سوائے خدا کے کسی سے نہیں ہوتا، توحید کی بنیاد بس اسی پر ہے۔''

اور یہاں سے معلوم ہوا کہ جو شخص ریاء کار ہوگا اسی کو مخلوق سے امید و ہراس بھی ہوگا اور جو ریاء سے پاک ہوگا اس کو کسی سے امید و ہراس بھی نہ ہوگا کیونکہ اسے غیر حق پر نظر ہی نہ ہوگی۔ غرض اس آیت و حدیث کے ملنے سے یہ معلوم ہوا کہ اعتقاد کو عمل اور درستی عمل میں بڑا دخل ہے۔

مجھ کو پہلے یہ مسئلہ ایک آیت سے معلوم ہوا تھا، پھر تو ہر جگہ یہی سمجھ میں آنے لگا وہ آیت ہے:

لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَافَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتَاكُمْ۔ (الحدید آیت نمبر ۲۳)

''تاکہ جو چیز تم سے جاتی ہے اس کا رنج نہ کرو اور جو چیز تمکو عطا کی ہے اس پر اتراؤ نہیں۔''

اس سے پہلے حق تعالیٰ نے فرمایا: مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ. لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَافَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتَاكُمْ. (الحدید آیت نمبر ۲۲، ۲۳)

''یعنی مصیبت نہ دنیا میں آتی ہے اور نہ خاص تمہاری جانوں میں مگر وہ ایک کتاب (لوح محفوظ) میں (پہلے سے) لکھی ہوئی ہے۔ (یہ بات) بتلا اس واسطے دی ہے کہ تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہے تم اس پر رنج (اتنا) نہ کرو اور تاکہ جو چیز تم کو عطا فرمائی ہے اس پر اتراؤ نہیں۔''

تقدیر کی حقیقت

اس میں حق تعالیٰ نے تقدیر کا مسئلہ بیان فرمایا ہے کہ جو کچھ تم کو پیش آتا ہے سب سے پہلے

مقدر ہو چکا ہے۔ آگے ارشاد ہے: "اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ"

"بے شک یہ خدا تعالیٰ پر آسان ہے۔" (کیونکہ اسکو علم غیب حاصل ہے تو پہلے سے آئندہ ہونے والے واقعات کا لکھ دینا اسے کچھ مشکل نہی۔ آگے فرماتے ہیں: لِّکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَافَاتَکُمْ اس میں لام کے ہے جس کے متعلق کی ضرورت جو یہاں مذکور نہیں بلکہ مقدر ہے۔ یعنی واخبرناکم بذلک لِکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَافَاتَکُمْ اور ہم نے تم کو یہ بات بتلا اس واسطے دی تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہے (عافیت یا اولاد و مال و جاہ) تم اس پر رنج نہ کرو اور جو چیز خدا نے تم کو دی ہے اس پر اتراؤ نہیں کیونکہ مصیبت کے وقت جب اس مضمون کا استحضار ہوگا کہ یہ پہلے ہی سے مقدر تھی۔ تقدیر میں اسی طرح تھا اس سے رنج میں کمی ہو جائے گی اور نعمت کے متعلق جب یہ سمجھ لیا جائے گا کہ خدا تعالیٰ نے اپنی رحمت و فضل سے پہلے ہی اس کو میرے واسطے مقدر کر دیا تھا اس سے ناز و عجب پیدا نہ ہوگا کیونکہ اتراوے تو وہ جس کا استحقاق ذاتی ہو یا اپنے آپ اس نے نعمت کو حاصل کیا ہو اور جب دوسرے کے حکم و مشیت سے ایک چیز ملی ہے اس پر اترانے کا کیا استحقاق ہے تو اس آیت میں حق تعالیٰ نے مسئلہ تقدیر کے بیان کرنے کی حکمت یہ بتلائی ہے تاکہ اس اعتقاد کی بدولت مصیبت میں صبر کی توفیق ہو اور راحت میں عجب و دلال نہ پیدا ہو۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ امور اعتقادیہ کو وجود اعمال و اصلاح اعمال میں بڑا دخل ہے۔

شریعت میں اعتقاد کا درجہ

اور شریعت کا مقصود یہ ہے کہ اعتقادیات سے عمل میں بھی کام لینا چاہیے چنانچہ اسی مقصود کو سمجھ کر محدثین نے یہ کہا ہے کہ اعمال ایمان کا جزو ہیں اور اعمال کے کم و بیش ہونے سے ایمان میں بھی زیادت و نقص ہوتا ہے۔ (اور معتزلہ و خوارج نے تو یہاں تک ترقی کی کہ ایمان بدون عمل کے کوئی چیز نہیں) مگر محققین کے نزدیک گو اعمال ایمان کا جزو نہیں ہیں مگر مکمل ایمان ضرور ہیں۔ پس ہر چند کہ ایمان عقائد ہی کا نام ہے مگر ایمان کے کمال وضعت کا مدار اعمال پر ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ مقاصد میں ہمیشہ درجہ کمال مطلوب ہوا کرتا ہے۔ درجہ ضعف پر کوئی اکتفا نہیں کیا کرتا۔ چنانچہ مقصد دنیویہ میں ہر شخص درجہ کمال ہی کا طالب ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ محض عقائد کی تصحیح کافی نہیں بلکہ تصحیح اعمال بھی ضروری ہے ورنہ بدون تصحیح عمل کے عقیدہ بھی کامل نہ ہوگا۔ دنیا کے کاموں میں مشاہدہ اس کا کر لیا جائے۔

دیکھئے! اگر آپ کسی شخص سے یہ کہیں کہ زید تیرا باپ ہے اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ اس کا مطلب محض یہ نہیں ہوتا کہ دل میں اس کے باپ ہونے کا اعتقاد کر لیا جائے بلکہ مراد یہ ہوتی ہے۔

تم کو اس کے ساتھ ادب و تعظیم کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ چنانچہ اگر مخاطب اپنے باپ کے ساتھ ادب و تعظیم کا برتاؤ نہ کرے تو آپ اس کو ملامت کریں گے کہ کم بخت میں نے تم کو بتلا دیا تھا کہ زید تیرا باپ ہے پھر بھی تو نے اس کی تعظیم کا حق ادا نہ کیا۔

معلوم ہوا کہ امور اعتقادیہ سے محض اعتقاد مطلوب نہیں ہوتا بلکہ اس کے مقتضا پر عمل کرنا بھی مطلوب ہوتا ہے اور اگر عمل اس کے موافق نہ ہو تو اس اعتقاد کو کالعدم سمجھا جاتا ہے۔

ان مقدمات کے بعد میں کہتا ہوں کہ مسلمانوں کو اگرچہ آخرت کا اعتقاد ہے اور اس کو دنیا سے افضل بھی سمجھتے ہیں مگر ان کا عمل اس اعتقاد کے موافق نہیں ہے۔ پس بقائدہ مذکورہ یہ کہنا صحیح ہے کہ ان کو آخرت کا اعتقاد کامل طور پر نہیں کیونکہ جس اعتقاد کے موافق عمل نہ ہو وہ اعتقاد ناقص ہے۔ اب تو آپ کو معلوم ہوا کہ یہ مضمون کس قدر ضروری ہے اور ہمارا اعتقاد و عمل موافق نہ ہونا ہماری حالت سے ظاہر ہے۔ چنانچہ ہماری حالت یہ ہے کہ اعمال میں جس وقت دنیا و آخرت کا تعارض ہوتا ہے وہاں دنیا ہی کو آخرت پر ترجیح دی جاتی ہے۔ مثلاً نماز کے وقت آپ کی دکان پر کوئی خریدار آ گیا تو اس وقت عموماً نماز میں تاخیر کر دی جاتی ہے اور دنیا کے نفع کو مقدم کیا جاتا ہے۔ یہ دنیا کی ترجیح ہے آخرت پر۔

توبہ کے بھروسہ پر گناہ کی ممانعت

اسی طرح اگر کوئی حسین عورت پر نظر پڑی۔ اس وقت ایسے لوگ بہت کم ہیں جو آخرت کے خیال سے نگاہ نیچی کر لیں۔ اکثر لذت نفس کے لیے اس کو گھور گھور کر دیکھتے ہیں۔ یہ بھی اسی گناہ کی فرد ہے کہ آخرت سے دنیا کو مقدم کیا گیا۔ پھر کوئی تو یہ سمجھ لیتا ہے کہ ہم مجبور ہیں۔ ہم سے یہ نہیں ہوسکتا کہ آخرت کو دنیا پر مقدم کریں۔ یہ کام تو بزرگوں کا ہے تو یہ لوگ تو گناہ کر کے اپنے کو گنہگار بھی نہیں سمجھتے اور بعض لوگ گناہ کو گناہ سمجھتے ہیں مگر دل کو یہ سمجھا لیتے ہیں کہ بعد میں توبہ کر لیں گے۔ اس غلطی میں بہت کم لوگ مبتلا ہیں مگر یاد رکھو یہ سراسر دھوکہ ہے نفس کا۔

ہم نے مانا کہ توبہ گناہ کے لیے تریاق ہے مگر تریاق کے بھروسہ زہر کھالینا کتنی بڑی حماقت ہے ہم نے کسی کو نہیں دیکھا جو سنکھیا ۲ تولہ اس بھروسہ پر کھاتا ہو کہ میرے پاس تریاق ہے بعد میں اسے کھالوں گا اور اگر کوئی ایسا کرتا بھی ہے تو اس کو سب لوگ بے وقوف بناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ زہر کا ضرر تو فی الحال تھا اور تریاق کا نافع ہونا فی المآل تھا اور وہ بھی موہوم کیونکہ ممکن ہے کہ زہر کا اتنا قوی اثر ہو جائے جو تریاق سے بھی زائل نہ ہو یا زہر کا اتنا فوری اثر ہو جائے کہ تم کو تریاق کھانے کی نوبت ہی نہ آئے۔

اسی طرح توبہ کے بھروسہ گناہ کرنا بھی سراسر حماقت ہے کیونکہ معصیت کا ضرر فی الحال ہے

اور توبہ کا نفع فی المآل ہے اور وہ بھی موہوم۔ کیا خبر اس گناہ کے بعد حیات بھی ہے یا نہیں۔ چنانچہ بعض لوگوں کے واقعات سنے گئے کہ وہ عین حالت زنا میں مر گئے' گناہ سے فارغ ہونے کی بھی مہلت نہیں ملی۔ دوسرے ایک مرتبہ توبہ کے بھروسہ پر گناہ کر کے پھر اس گناہ کا چسکا پڑ جاتا ہے پھر توبہ بھی نصیب نہیں ہوتی کیونکہ توبہ کے لوازم میں سے یہ بھی ہے کہ آئندہ کے لیے پختہ عزم کیا جائے کہ پھر یہ گناہ کبھی نہیں کریں گے۔ محض لفظی توبہ قابل اعتبار نہیں کہ اے اللہ میری توبہ! گناہ کے بعد جب اس کا چسکا لگ جاتا ہے تو توبہ کے وقت نفس یہ کہتا ہے کہ اس توبہ سے کیا نفع۔ کیونکہ کام تو پھر بھی کرنا ہے تو اب توبہ بھی گئی۔ اس وقت نفس یہ وعدہ کرتا ہے کہ اس کام سے جی بھر جائے تو سب گناہوں سے اکٹھی توبہ کرلیں گے مگر یہ وعدہ بھی پورا نہیں ہوتا کیونکہ حدیث میں ہے کہ گناہ سے دل پر زنگ لگ جاتا ہے جو بار بار گناہ کرنے سے بڑھتا رہتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

ہر گناہ زنگے ست برمرآۃ دل　　　دل شود زیں زنگہا خوار و خجل
چوں زیادت گشت دل را تیرگی　　　نفس دوں را بیش گردد خیرگی

''ہر گناہ دل کے آئینہ پر ایک زنگ کا داغ ہے جس کی وجہ سے دل ذلیل وشرمندہ ہوجاتا ہے اور جب دل کی تاریکی زنگ کی زیادتی سے بڑھ جاتی ہے تو کمینے نفس کی حیرانگی بڑھ جاتی ہے۔''

تو اس زنگ کی ظلمت اتنی غالب ہوتی ہے کہ توبہ کی توفیق نہیں ہوتی اور اگر کوئی اس سے توبہ کے لیے کہے بھی تو وہ یہ کہہ دیتا ہے کہ میاں اتنے گناہوں کے سامنے بے چاری توبہ کیا کرے گا اب اس کو رحمت خداوندی سے مایوسی ہوجاتی ہے۔

چنانچہ بعض محتضرین (یعنی جو حالت نزع میں مبتلا تھے) کو لوگوں نے کہا کہ اپنے گناہوں سے توبہ کرلو۔ انہوں نے یہی جواب دیا کہ میاں اتنے گناہوں کو ایک توبہ کیونکر مٹا سکتی ہے۔ پھر ظالم اسی حالت میں بدون توبہ کیے مر گئے تو آپ نے دیکھا کہ یہ کتنا بڑا نفس کا دھوکہ ہے کہ توبہ کے بھروسہ گناہ کی رغبت دلاتا ہے۔

صاحبو! خدا سے ڈرو اور نفس کے اس دھوکہ میں نہ آؤ۔ حدیث میں ہے کہ اے عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا گناہ کو حقیر نہ سمجھو۔ حقیقت میں جو لوگ توبہ کے بھروسہ گناہ پر پیش قدمی کرتے ہیں وہ گناہوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ غرض ہر شخص کے پاس معصیت کے اختیار کرنے اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کا ایک سبب اور داعی موجود ہے کوئی اس سے بچا ہوا نہیں۔ الا ماشاء اللہ ہر شخص کچھ نہ

کچھ سبب نکال لیتا ہے۔ کوئی اپنے کو معذور سمجھ لیتا ہے کوئی توبہ کا سہارا ڈھونڈ لیتا ہے۔

مال وجاہ کے شعبے

اور یوں تو دنیا کے بہت شعبے ہیں مگر دو شعبے سب سے بڑے ہیں مال اور جاہ۔ مال اور جاہ کے حاصل کرنے کے لیے اکثر لوگ معصیت سے نہیں بچتے۔ آخرت کو برباد کر لیتے ہیں اور اگر یہ حضرت مولوی ہیں تو وہ معصیت کو طاعت اور دنیا کو دین بنانے کی کوشش کریں گے مگر یاد رکھو! خدا کے سامنے یہ تاویلیں نہ چل سکیں گی۔ بہرحال لوگ طرح طرح کے اموال کے لیے دین کو برباد کر رہے ہیں۔ کوئی رشوت لیتا ہے، کوئی زبردستی اور جبر سے لوگوں کا مال وصول کرتا ہے۔ گو اس کا موقع ہر ایک کو نہیں ملتا، رشوت ستانی وظلم کے اسباب ہر شخص کے پاس کہاں ہیں۔ البتہ ایک صورت تو بہت ہی کثیر الوقوع ہے جس میں بہت لوگ مبتلا ہیں۔ وہ یہ کہ کسی کا روپیہ قرض لے کر ادا کرنے سے غافل ہیں، کسی کی چیز گھر میں آ گئی تو اب اس کو پہنچانا نہیں چاہتے۔ میراث میں اللے تللے سے کام کرتے ہیں، یہ تو ان کا حال ہے جو میراث کے مال کو چھپاتے نہیں اور بعض لوگ تو میراث کا مال چھپا بھی لیتے ہیں۔ اگر کسی لڑکی کا انتقال ساس کے یہاں ہوا تو وہ اس کے برتن اور کپڑے اور زیور کو دبا لیتی ہے، ماں باپ کو تھوڑا سا دکھلا دیا کہ بس اس کے پاس تو یہی تھا اور اگر ماں باپ کے یہاں انتقال ہو تو جو ان کے ہاتھ لگتا ہے وہ شوہر کو اس کی اطلاع نہیں کرتے۔ یہ تو بالکل گوہ در گوہ ہیں، گفتگو تو ان لوگوں میں ہے جو چھپاتے اور دباتے بھی نہیں مگر خرچ کرنے میں بے احتیاطی وہ بھی کرتے ہیں بعض جگہ مردہ کے اوپر قیمتی دوشالہ ڈالا جاتا ہے پھر وہ غریبوں کو دیدیا جاتا ہے اور تحقیق کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب ورثہ کا مشترک تھا جس میں نابالغ بھی ہوتے ہیں اور جو سب بالغ بھی ہوں تو وہ دل سے راضی نہیں ہوتے۔ پھر غمی کی رسوم میں سارا خرچ مردہ کے ترکہ میں سے ہوتا ہے۔ خرچ ہوتا ہے سب ورثہ کے حصہ میں سے اور نام ہوتا ہے بڑے وارث کا۔

افتخار اور ناموری کے لیے تو اپنے مال کا خرچ کرنا بھی حرام ہے اور دوسروں کے مال سے نام کرنا تو اور زیادہ اشد ہے۔ پھر اس میں نابالغوں کا بھی حق ہوتا ہے اور بالغین بھی راضی نہیں ہوتے۔ اگر رضامندی ہوتی تو شکایت کیوں ہوتی۔ حالانکہ بعد میں تقسیم کے موقع پر شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ یہ خرچ تم نے خود کیا، ہم نے کب کہا تھا یہ ہمارے حصہ میں کیوں لگایا جا رہا ہے اور اگر کسی نے بوجہ شرم کے کچھ نہ کہا تو اس سے رضامندی نہیں ہو جاتی۔ اگر تم کو ایسا ہی روپیہ اڑانا ہے تو سب کا حق نکال کر ان کے حوالے کر دو۔ پھر اپنے حصہ میں سے جو چاہو کرو یا ان سے قرض لے لو اور بعد میں سب کا قرض ادا

کردو مگر وہ قرض کاغذی ہی نہ ہو بلکہ واقعی قرض ہونا چاہیے ورنہ آخرت میں ماخوذ ہو گے۔

حدیث میں ہے کہ مقروض جنت سے محبوس رہتا ہے جب تک کہ اس کا قرض ادا نہ ہو۔ یہ وعید ایسے ہی قرض کے بابت ہے جو محض کاغذی ہو جس کے ادا کرنے کی نیت نہ ہو نیز بلا ضرورت ہو۔ باقی ضرورت کا قرض اس سے مستثنیٰ ہے۔ ضرورت کا قرض وہ ہے جس کے بغیر ضرر ہو' شکایت ہو' سو رسوم نہ کرنے میں تمہارا کیا ضرر ہے۔

پھر مردہ کے کپڑے تقسیم کرنے میں سخاوت سے کام لیتے ہیں' قیمتی کپڑے بھی خیرات کر دیتے ہیں حالانکہ بعض ورثاء ان کو خیرات کرنا نہیں چاہتے اور افسوس یہ ہے کہ لینے والے بھی تحقیق نہیں کرتے کہ جو کپڑے ہم لے رہے ہیں اس میں سب ورثاء راضی ہیں یا نہیں اور اپنا عذر یہ بیان کرتے ہیں کہ ہمارے ذمہ چھان پھوڑا کرنا نہیں ہے۔ ان خدا کے بندوں کو عقل نہیں آتی' چھان پھوڑ کی وہاں ضرورت نہیں جہاں شبہ نہ ہو بلکہ قوی شبہ ہو وہاں اس کی ضرورت ہے کہ تفتیش سے کام لیا جائے جس تفتیش کی ضرورت نہیں وہ یہ ہے کہ ایک شخص آپ کی دعوت کرے جس کی آمدنی بظاہر حلال ہے وہاں آپ یہ پوچھیں کہ گوشت کہاں سے آیا' دام کہاں سے آئے؟ یہ البتہ آپ کے ذمہ نہیں لیکن جہاں شبہ قوی ہو وہاں ضرور تفتیش سے کام لینا چاہیے۔ پھر مشکل یہ ہے کہ اگر کوئی اللہ کا بندہ تحقیق کرے تو دوسرے اقرباء اس کی اس کوشش کو باطل کرتے ہیں۔

ایک موضع کا واقعہ ہے کہ ایک زمیندار ایک بی بی اور دو نابالغ لڑکیاں چھوڑ کر مر گئے۔ بی بی نے ان کے کپڑے یہاں بھیجے' یہاں سے یہ کہہ کر واپس کر دیئے گئے کہ ان میں نابالغوں کا حق ہے۔ اتفاق سے وہاں ایک مولوی صاحب جو واقع میں بھی اچھے تھے وارد ہوئے۔ وہ کپڑے ان کے سامنے پیش کیے گئے اور یہاں کا عذر بھی بیان کر دیا گیا۔ انہوں نے فرمایا کہ آخر ان لڑکیوں کی شادی میں بھی تو ماں کا ان لڑکیوں کے حق سے زیادہ ہی صرف ہو جائے گا اس لیے ماں ان کپڑوں میں تصرف کر سکتی ہے۔ پس اس تاویل سے قبول فرما لیا۔ یہ تو علماء کی حالت ہے کہ نہ خود تفتیش کریں اور نہ تفتیش کرنے والے کی تحسین کریں بلکہ اس کی کوشش کو مٹانا چاہتے ہیں۔

عوام کی یہ حالت ہے کہ انہوں نے ایک قاعدہ کلیہ نکال لیا ہے کہ جب کسی مسئلہ یا عمل میں علماء کا اختلاف ہو تو جدھر زیادہ ہوں وہ حق ہے نہ معلوم یہ قاعدہ کہاں سے نکالا ہے حالانکہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ کثرت ادلہ سے ترجیح نہیں ہو سکتی۔ مثلاً اگر ایک مقدمہ میں دو گواہ ایک طرف ہوں اور سو گواہ

ایک طرف ہوں تو حاکم اسلام دونوں کو برابر سمجھے گا۔ یہ کوئی وجہ ترجیح نہیں کہ ایک طرف دو اور ایک طرف سو۔ البتہ شریعت میں اجماع حجت ہے مگر اجماع اس کا نام نہیں کہ ایک طرف زیادہ جماعت ہو تو بس وہ اجماع ہو گیا۔ فقہاء نے صاف لکھا ہے کہ ایک معتبر عالم کی مخالفت بھی قادح اجماع ہے۔

غرض علماء کے ان معاملات سے عوام کو جرأت ہوئی ہے اور وہ بھی احتیاط نہیں کرتے اور صاف کہتے ہیں کہ اگر یہ احتیاط ضروری ہوتی تو مولوی لوگ کپڑے لیتے ہوئے تفتیش کیوں نہ کرتے اسی طرح کسی سے کوئی چیز مانگ کر لادیں گے تو جب تک وہ خود ہی نہ مانگے اس وقت تک دینا نہیں جانتے۔

بدون رضامندی کسی چیز کا استعمال جائز نہیں

کسی نے آپ کے یہاں کھانا بھیجا اور آپ کی خاطر سے چینی یا تانبے کے برتن میں بھیجا تو اب برتن کو واپس کرنا جانتے ہی نہیں' بےفکرے گھر میں ڈال دیتے ہیں اور مہینوں اس میں کھانا کھاتے ہیں۔ حالانکہ فقہاء نے لکھا ہے کہ جس برتن میں کھانا بھیجا جائے اس کھانے کو دوسرے برتن میں نکال کر کھانا چاہیے' اسی برتن میں کھانا ناجائز ہے۔ ہاں اگر وہ ایسا کھانا ہے جس کو دوسرے برتن میں لوٹنے سے اس کی لذت جاتی رہے یا صورت بگڑ جائے تو اس کو اسی برتن میں کھانا جائز ہے جیسے فیرنی کو طشتری میں جما کر بھیجا تو اس کو دوسرے برتن میں لوٹنے سے صورت خراب ہو جاتی ہے۔ فیرنی کا لطف یہی ہے کہ جس برتن میں اس کو جمایا گیا ہے اسی میں کھایا جائے' لوٹ پوٹ کرنے سے بدنما ہو کر اس کی طرف رغبت ہو جاتی ہے' ہاں کوئی بہت ہی بھوکا ہو تو ہر حالت میں رغبت ہو سکتی ہے۔

جیسے ایک لطیفہ ہے کہ کسی عورت نے فیرنی پکا کر کسی طباق میں جمائی' خود کسی کام کو چلی گئی چھوٹے بچہ کو نگرانی کے لیے بٹھا گئی' ایک کتا آیا اور ایک طرف منہ ڈال کر کھانے لگا۔ بچہ غافل تھا پھر اسکو ہٹایا' ماں آئی تو سب واقعہ سنایا۔ اس نے ایک دوسرے برتن میں فیرنی کو لوٹ کر بچہ سے کہا' جا مسجد کے ملا کو دے آ' اس نے جا کر حوالہ کی' ملا جی کو بھلا فیرنی کب نصیب ہوئی تھی' لیتے ہی فوراً اُدھر ہی سے جدھر سے کھائی ہوئی تھی لگے ہاتھ مارنے' لڑکے نے کہا' ملا جی ادھر سے نہ کھانا' اُدھر تو کتا منہ ڈال گیا تھا' ملا جی نے جو یہ قصہ سنا برتن کو اٹھا کر دور پھینکا کہ جا کم بخت! کتے کے آگے کا میرے واسطے' پھینکنے سے پیالہ پھوٹ گیا' لڑکا رونے لگا کہ میری ماں مجھے مارے گی' ملا جی نے کہا تجھے کیوں مارے گی' کہنے لگا' اس برتن میں میرے چھوٹے بھائی کا گوہ اٹھاتی تھی' ملا جی کو یہ سن کر اور غصہ آیا' لگے قے کرنے۔

تو کوئی ان ملا جی کی طرح بھوکا ہو وہ تو البتہ فیرنی میں ہر طرح کے ہاتھ مارنے لگے گا ورنہ عموماً فیرنی کو اسی برتن میں کھایا جاتا ہے جس میں اس کو جمایا جاتا ہے۔ تو ایسی چیز کو بھیجنے والے کے

برتن میں کھالینا جائز ہے ورنہ نہیں اور جو فقہاء نے اس قول کی ظاہر ہے کہ کسی کی چیز کا استعمال بدون رضا مندی کے جائز نہیں اور برتن میں بھیجنا اس بات کی دلیل نہیں کہ اس میں کھانے کی بھی اجازت ہے' ہاں جس چیز کو دوسرے برتن میں لوٹنے سے اس کی ہیئت بگڑ جائے یا لطف جاتا رہے اس میں دلالتہ اس کی بھی اجازت ہے کہ میرے ہی برتن میں کھاؤ۔ پس اس مسئلہ کا مدار اس لم پر رکھتا ہوں۔ باقی صورت مسئلہ یہ غالباً اس وقت کے عرف پر ہوگی۔ اس زمانہ میں کھانا بھیجنے والے اپنے برتن میں کھانے کی اجازت نہ دیتے ہوں گے لیکن ہمارے یہاں کا عرف یہ ہے کہ جو شخص کسی کے یہاں کھانا بھیجتا ہے اس کی طرف سے یہ اجازت بھی ہوتی ہے کہ اسی کے برتن میں کھالیا جائے لیکن یہ اجازت نہیں ہوتی کہ وہ کھانا کھا کر پھر دوسرے وقت بھی اسے استعمال کرے اور استعمال بھی مہینہ بھر تک۔ پھر غضب یہ کہ ایک گھر میں جب کسی کا برتن آ جاتا ہے پھر وہ کسی کے یہاں کھانا بھیجنا چاہیں تو اپنے برتن میں نہیں بھیجتے بلکہ دوسرے کے برتن میں بھیج دیتے ہیں۔ پھر وہ دوسرے کے یہاں جا کر عرصہ تک پڑا رہتا ہے۔ پھر غاصب الغاصب کے یہاں سے کوئی چیز اسی برتن میں اصل مالک کے یہاں گئی تو اس وقت آپس میں نزاع ہوتا ہے۔ اصل مالک کہتا ہے کہ یہ میرا برتن ہے' دوسرا کہتا ہے کہ واہ! یہ تو مہینوں سے ہمارے یہاں پڑا ہے' اب کسی کو یاد نہیں کہ یہ برتن کس کے یہاں سے آیا اور مالک کے گھر سے کس کے پاس گیا تھا' اب نزاع دور کرنے کے لیے ایمان کی قسم لی جاتی ہے' قرآن کی قسم لی جاتی ہے' بھلا یہ بھی کوئی معاشرت ہے۔

واللہ! بہت گندی معاشرت ہو رہی ہے' ہر شخص کو چاہیے کہ اپنے گھر والوں کو سختی کے ساتھ تاکید کیا کرے کہ جب کسی کے یہاں سے کھانا آیا کرے فوراً اس کا برتن ساتھ کے ساتھ واپس کر دیا کریں۔ بحمد اللہ مجھے اس کا بہت ہی اہتمام رہتا ہے جب تک دوسرے کا برتن واپس نہیں ہو جاتا مجھے چین نہیں آتا۔ یہ تو عوام کی حالت ہے۔

اہل علم کی یہ حالت ہے کہ کسی کی کتاب لے لی تو اب اس کو واپس دینے کا نام جانتے ہی نہیں۔ کتاب دینے والا اگر کثیر المشاغل ہو تو اس کو یاد بھی نہیں رہتا کہ مجھ سے کتاب کس نے مانگی تھی' بس مہینہ بھر کے بعد وہ سمجھ لیتا ہے کہ کتاب چوری ہوگئی اور لینے والا بے فکر ہو گیا کہ وہ تو مانگتا ہی نہیں۔ اب گویا وہ ان کی ملک ہوگئی۔ پھر ان میں بعضے ایسے ہوتے ہیں کہ اپنی چیز تو دوسرے کی چھاتی پر سوار ہو کر لے لیتے ہیں اور دوسروں کی چیز دینے میں لاپروا ہوتے ہیں اور بعضے دینے میں بھی لاپرواہ ہوتے ہیں اور اپنی چیز لینے میں بھی لاپرواہ ہوتے ہیں۔ اس کو لوگ بزرگ سمجھتے ہیں کہ بڑا زاہد ہے' ایسی تیسی ایسے

زاہد کی۔ یہ شخص خدا کا مجرم ہے اپنی چیز کے وصول کرنے میں تو لاپرواہ ہونا تو عیب نہیں مگر دوسروں کی چیز واپس کرنے میں لاپرواہ ہونا بڑا گناہ ہے۔ آج کل لوگوں نے گویا بے ڈھنگے پن کا نام بزرگی اور زہد رکھ لیا ہے حالانکہ اہل اللہ بڑے منتظم ہوتے ہیں۔ دوسروں کا حق کبھی نہیں رکھتے۔

ہمدردی کرنے اور قرض دینے کا نتیجہ

اسی طرح بعض لوگ قرض میں گڑبڑ کرتے ہیں کہ کسی کا روپیہ لے کر ایسا بھولتے ہیں کہ گویا دینے کا نام ہی نہیں جانتے۔ اپنے سارے کام اللے تللے سے چلاتے ہیں مگر قرض کے ادا کرنے کی فکر نہیں۔ اسی واسطے مسلمانوں میں ہمدردی نہیں رہی۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کے پاس ضرورت سے زیادہ روپیہ موجود ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ کسی کو قرض دے دیں۔ اپنے آپ حفاظت سے بچیں اور دوسرے کا کام نکل جائے مگر کس کو دیں۔ لوگ قرض لے کر دینے کا نام ہی نہیں لیتے۔ اسی لیے قرض بے سودی آج کل نہیں ملتا کیونکہ اس کے ادا کی فکر ہی نہیں ہوتی۔ ہاں بیٹوں کا قرض خوب یاد رہتا ہے کیونکہ وہ پہلے ہی تمسک لکھوا لیتے ہیں اور سودی قرض خوب دل کھول کر دیتے ہیں جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ دو تین سال میں سود در سود ملا کر ایک ہزار کے چار ہزار وصول کرتے ہیں۔ بس اس سے سب خوش ہیں استغفر اللہ العظیم۔ اگر لوگوں کو بے سودی قرض کا بھی ایسا اہتمام ہوتا جیسا سودی قرض کا ہوتا ہے تو آپس میں مسلمانوں ہی سے روپیہ مل جایا کرتا اور مسلمانوں کی جائیدادیں اس طرح ہندوؤں کے ہاتھ میں نہ پہنچتیں۔

امانت کے بارے میں بھی یہی گڑبڑ ہے۔ کسی کے پاس امانت رکھو مگر یہ کبھی اطمینان نہیں ہوتا کہ یہ امانت کو بعینہ رکھے گا اکثر لوگ امانت کا روپیہ اپنے کام میں خرچ کر دیتے ہیں۔ پھر چار پانچ سو کی امانت خرچ کر گئے اور اس کے ادا کی کچھ فکر نہیں۔ اب وہ روپیہ والا غریب ان سے مانگتا ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ بھائی وہ تو خرچ ہو گئے جب ہوں گے دیدیں گے۔ وہ کہتا ہے کہ صاحب آپ نے امانت کے روپے کیوں خرچ کیے جہاں سے ہو میری رقم ادا کیجئے تو کہتے ہیں کہ صاحب مجھ سے غلطی ہوگئی کہ میں نے ضرورت میں آپ کی رقم خرچ کر دی اب اس وقت میرے پاس نہیں، میں کہاں سے ہگ دوں۔ میں کہتا ہوں کہ تم نہ ہگو مگر اس غریب روپے والے کا تو یہ سن کر پاخانہ نکل گیا ہوگا۔

چندوں کا غبن

سب سے بڑھ کر افسوس یہ ہے کہ لوگ مسجدوں تک کا چندہ کھا جاتے ہیں۔ ایک شخص مسجد

کے لیے چندہ کیا کرتا تھا جہاں تھوڑا بہت جمع ہو گیا اسے بیٹھ کر کھا پی لیا' پھر چندہ مانگنے لگا۔ جب کوئی اس سے پوچھتا کہ پہلا روپیہ کہاں گیا تو قسم کھا کر کہہ دیتا کہ مسجد میں لگا دیا۔ اس کے ایک پڑوسی نے کہا کہ ظالم تو جھوٹی قسم تو نہ کھایا کر' مسجد میں تو کہاں لگاتا ہے تو آپ نے اس سے کہا کہ آؤ میرے ساتھ چلو' دکھلاؤں۔ پھر مسجد میں جا کر روپیہ کو دیوار سے لگا دیا اور کہا کہ اس پر قسم کھایا کرتا ہوں کہ مسجد میں لگا دیا بس دیوار سے روپیہ کو لگا دیتا ہوں۔

یہ حالت ہے آج کل چندہ کرنے والوں کی۔ اسلامی چندوں کا نہ کوئی حساب ہے نہ کتاب' ہر شخص جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔ یادرکھو بعض کتب فقیہ میں ہے کہ ایک دانگ کے بدلہ میں جو غالباً تین پیسہ کا ہوتا ہے سات سو مقبول نمازیں لی جائیں گی' دنیا میں کچھ رے اڑالو آخرت میں بھگتنا پڑے گا۔

واقعی ہندوستان کے چندہ دینے والے بڑی ہمت کے لوگ ہیں کہ ہمیشہ آئے دن چندے دیتے رہتے ہیں اور یہ لوگ سب کو دیتے ہیں۔ خیر ان لوگوں کو تو ثواب مل ہی جاتا ہے کیونکہ ان کی نیت تو اچھی ہی ہوتی ہے مگر چندہ لینے والے آخرت میں خوب سزا بھگتیں گے جو اس طرح بے دریغ مسلمانوں کا روپیہ برباد کرتے ہیں۔

ہاں! ایک صورت میں چندہ دینے والوں کو بھی ثواب نہیں ہوتا جبکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ شخص جس کام کے لیے چندہ کر رہا ہے اس میں نہ لگائے گا۔ اس وقت دینے والوں کو بھی گناہ ہوگا کیونکہ اس شخص کو چندہ مانگنا حرام ہے اور لوگوں کے دینے سے اس کی جرأت بڑھتی ہے اور حرام کی اعانت بھی حرام۔ افسوس! لوگ کس کس طرح مخلوق کو دھوکہ دیتے ہیں مگر یادرکھو! خدا کے یہاں دھوکہ نہ چل سکے گا۔

زنہا رازاں قوم نباشی کہ فریبند حق رابسجودے ونبیؐ رابدرودے

''تم ان لوگوں میں سے ہرگز نہ ہو جو اللہ تعالیٰ کو ایک سجدہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک درود سے دھوکہ دیتے ہیں۔'' مولانا فرماتے ہیں:

خلق راگیرم کہ بفریبی تمام درغلط اندازی تا ہر خاص و عام
کارہا باخلق آری جملہ راست باخدا تزویر وحیلہ کے رواست
کارہااوراست باید داشتن رایت اخلاص و صدق افراشتن

''میں نے فرض کیا کہ اگر تو نے تمام مخلوق کو دھوکہ دے ہی دیا مگر خدا کو کہاں دھوکہ دے سکتا ہے۔ یعنی مخلوق کے ساتھ تیرے سب کام درست ہیں' خداوند تعالیٰ کے ساتھ مکر وحیلہ کب جائز

ہے حق تعالیٰ کے ساتھ سب کام درست رکھنے چاہئیں، اخلاص اور سچائی اور علم بلند رکھنا چاہیے۔"

مجھے خود ایک واقعہ پیش آیا کہ ایک مقام پر ایک مدرسہ کا جلسہ تھا۔ اس میں میرا بیان تھا وہ زمانہ چندہ بلقان تھا۔ بعد جلسہ کے کسی نے مختصراً اس کی بھی تحریک کر دی اس پر ایک تحصیلدار پنشنر نے اس چندہ میں سو روپے دیئے۔ میں باہر جا رہا تھا، چند آدمی ایک جگہ باتیں کرتے نظر آئے، دریافت پر یہ قصہ معلوم ہوا۔ میں نے جزاک اللہ کہہ دیا، بس یہ میرا جرم تھا جس پر انہوں نے مجھ کو بعد میں پریشان کیا۔

قصہ یہ ہوا کہ ان تحصیلدار صاحب نے جن لوگوں کو چندہ دیا تھا ان کو مجبور کیا کہ میرے سو روپیہ کی رسید علیحدہ منگا کر دو، انہوں نے اس درخواست کو لغو سمجھ کر کچھ توجہ نہ کی۔ جب وہ مایوس ہو گئے چونکہ میں نے جزاک اللہ کہا تھا، اس جرم میں وہ میرے سر ہوئے اور میرے پاس خط آیا کہ مجھے سو روپیہ کی رسید منگا دو، میں نے بواسطہ ایک دوست کو لکھا کہ جن کو تم نے چندہ دیا ہے ان سے رسید مانگو، مجھ سے کیا واسطہ! انہوں نے پھر مجھے لکھا کہ یا تو رسید منگا دو ورنہ روپیہ واپس دو، نہیں تو عدالت میں دعویٰ کروں گا۔ میں نے چندہ کرنے والوں کو لکھا کہ اس شخص کا روپیہ واپس کر دو۔ معلوم ہوا کہ وہاں تو خرچ روانہ ہو گیا۔ میں نے دفع فتنہ کے لیے سو روپے اپنے پاس سے ایک دوست کے پاس واپس بھیج دیئے کہ ان کو دیدیں مگر وہاں کے میرے دوستوں نے ان کو اپنے پاس سے رقم ادا کر دی اور میری رقم واپس کرنا چاہی، میں نے انکار کیا، جب جانبین سے اصرار و انکار بڑھا، آخر سب کے اتفاق سے وہ رقم ایک نیک کام میں لگا دی گئی۔

تو اس وقت ایک عالم صاحب نے مجھے رائے دی تھی کہ تم نے اپنے پاس سے کیوں دیا اس مد میں اور چندہ بھی تو آ رہا تھا، اس میں سے بھیج دیتے۔ میں نے کہا مجھے آپ کے اس فتویٰ پر حیرت ہے، یہ مجھے کہاں جائز ہے کہ میں دوسروں کا روپیہ اس شخص کو دوں، کیا لوگوں نے اس واسطے چندہ دیا ہے۔ بھلا آپ ہی سوچیں کہ اگر آپ چندہ میں روپیہ دیں اور میں اس کو اس طرح خرچ کر دوں تو کیا آپ کو یہ گوارہ ہوگا، ہرگز نہیں۔ پھر دوسروں کی رقم میں آپ مجھے یہ رائے کس طرح دیتے ہیں؟ اور تعجب یہ کہ وہ عالم مدرس بھی تھے اور صاحب فتویٰ بھی تھے۔

دین کو مصالح کے تابع بنا دیا گیا

اس طرح سے آج کل لوگوں نے دین کو اغراض و مصالح کے تابع بنا رکھا ہے۔ ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے۔ ایک مدعی اجتہاد عالم صاحب نے ساس کو حلال کر دیا۔ ایک شخص کو اپنی ساس سے تعلق ہو گیا تھا، کم بخت نے بیوی کو چھوڑ کر اس سے نکاح کرنا چاہا، علماء سے فتویٰ لیا۔ سب نے یہی

کہا کہ ساس سے نکاح حرام ہے مگر ایک عالم نے ایک ہزار روپیہ لے کر فتویٰ دیدیا کہ حلال ہے مگر چونکہ ساس کا حرام ہونا نص قطعی سے ثابت ہے۔ "وَاُمَّهَاتُ نِسَآؤُکُمْ" اس سے آپ نے تاویل نکالی کہ آج کل عورتوں میں جہالت زیادہ ہے جس کی وجہ سے بعض کلمات ان کی زبان سے ایسے نکل جاتے ہیں جن کی وجہ سے ایمان زائل ہوجاتا ہے تو اس کی منکوحہ کی زبان سے ایسے کلمات نکلے ہوں گے اور نکاح کے وقت تجدید ایمان نہیں ہوئی اس لیے منکوحہ سے اس کا نکاح درست نہیں ہوا جب نکاح درست نہیں ہوا تو منکوحہ کی ماں اس کی ساس بھی نہیں ہوئی۔ رہا حرمت مصاہرت کا مسئلہ سو یہ محض امام ابوحنیفہؒ کا مسئلہ ہے، ہم اس کو نہیں مانتے۔ حدیثیں اس کے خلاف ہیں۔

غرض اس نے گڑھ مڑھ کر ساس کو حلال کردیا۔ محض اس لیے کہ اسکو ایک ہزار روپیہ ملتا تھا۔ کم بخت حرص نے اس عالم کو تحریف دین پر آمادہ کردیا' یہ حرص بری بلا ہے۔ اس میں انسان جو کچھ نہ کرے تھوڑا ہے۔

ایک اور نکتہ قابل یاد رکھنے کے ہے۔ وہ یہ کہ حرص اہل اسراف کو زیادہ ہوتی ہے اور بخیل کو صرف اپنے مال کی حرص ہوتی ہے' دوسروں کے مال میں بخیل آدمی بڑا متقی ہوتا ہے وہ کسی کے مال کو ہاتھ نہیں لگاتا اور یہ اہل اسراف تو دوسروں کے مال کو اپنا مال سمجھتے ہیں۔ اس لیے میں کہا کرتا ہوں کہ آج کل اسراف کرنے سے بخیل ہونا اچھا ہے۔ اسراف کی وجہ سے دوسروں کے حقوق ضائع ہوتے ہیں۔ سو یہ ضرر لازمی ہے متعدی نہیں۔ اسی طرح بعض آدمی لوگوں سے ادھار لے کر ادا کرنا نہیں جانتے۔

مظفر نگر میں ایک شخص نے ایک سوداگر سے دس روپیہ قرض لئے کہ مجھے ضرورت ہے اس بیچارہ نے دیدیئے۔ پھر وہ حضرت روپیہ ہضم کرکے بیٹھ گئے' سوداگر نے تقاضا کیا تو پہلے پہل آپ نے ٹالا' پھر سال بھر کے بعد کہنے لگا کہ جاؤ' کیسا قرض لئے پھرتے ہو' کیا تمہارے پاس میری کوئی تحریر ہے؟ اگر ہے تو دکھاؤ ورنہ جاؤ' میں نہیں دیتا۔ اب وہ۔ بے چارا تحریر کہاں سے دکھاتا' اس نے تو انکو اعتبار پر ویسے ہی روپیہ دیدیا تھا۔ اب اس شخص کی حرکت کا یہ نتیجہ ہوا کہ آئندہ کیلئے اس نے قرض نہ دینے کا عہد کرلیا۔ غرض معاملات میں ایسی بے عنوانیاں کی جارہی ہیں کہ میں انکو بیان نہیں کرسکتا۔

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم (سارا بدن داغ داغ ہے روئی کہاں کہاں رکھیں)

خواص کی خرابیاں

ایک دو باتیں ہوں تو بیان بھی کی جائیں۔ یہاں تو سر سے پاؤں تک حالت خراب ہو رہی ہے' عوام و خواص سبھی کے معاملات گندے ہیں' خواص تک کی یہ حالت ہے کہ جب وہ کسی کے یہاں مہمان ہوتے ہیں تو کھانے کے وقت دوسرے لوگوں کو بلا بلا کر کھانے میں شریک کرتے

ہیں۔ اول تو دوسرے لوگوں کو چاہیے کہ کھانے کے وقت خود ہی وہاں سے الگ ہو جائیں لیکن اگر وہ الگ نہ ہوں تو مہمان کو ہرگز جائز نہیں کہ وہ سب کو بلا کر شریک کرے۔ آخر تم کو کیا حق ہے کہ دوسرے کے دسترخوان پر بدون اس کی اجازت کے لوگوں کو بٹھلاؤ۔

رہا یہ کہ میزبان اس سے خوش ہوتا ہے اس کو ناگوار نہیں ہوتا' یہ بالکل غلط ہے کیونکہ ہر شخص اپنے مہمانوں کے انداز سے کھانا پکاتا ہے۔ جب زیادہ آدمی بیٹھ جائیں گے تو اس کو ضرور ناگوار ہوگا اور اگر اس کو ناگوار نہ ہو تو اس کے گھر والوں کو ناگوار ہوگا کیونکہ ان کو اپنے لیے از سرِ نو انتظام کرنا ہوگا بلکہ عورتوں کی عادت یہ ہے کہ وہ اپنے واسطے چولہا گرم نہیں کرتیں۔ اگر کسی وقت کھانا نہیں بچتا تو وہ خود فاقہ کر لیتی ہیں اور اپنے گھر والوں کی کلفت کسی کو گوارا نہیں ہوتی مگر اس کی خواص کو بھی پرواہ نہیں۔ وہ دسترخوان پر بیٹھ کر ساری مجلس کو شریک کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حاضرین کو نہ بلانا اور تنہا کھانا کھانا شرم کی بات ہے۔

افسوس! ان کو خدا سے شرم نہیں آتی' اگر ایسی ہی شرم ہے تو ان کو بازار سے اپنا دام خرچ کر کے کھانا منگانا چاہیے' پھر اختیار ہے کہ جتنے آدمیوں کو چاہو بلا لو' مگر ان شاء اللہ جس دن ان سے ایسا کرنے کے لیے کہا جائے گا اس دن ایک کو بھی نہ بلائیں گے۔

ایک مرتبہ میرے یہاں ایک عالم مہمان تھے' گھر سے ان کے لیے کھانا گیا اور یہ قاعدہ ہے کہ مہمان کے سامنے کفایت کی مقدار سے کچھ زیادہ ہی بھیجا جاتا ہے۔ تو کھانا زائد دیکھ کر وہ عالم صاحب ایک دوسرے شخص کو جو میرا مہمان نہ تھا' کھانے میں شریک کرنے لگے' میرے ملازم نے کہا یہ کھانا آپ کی ملک نہیں بلکہ اس کی اباحت کی گئی ہے۔ جتنا آپ خود کھا لیں باقی جو بچے گا وہ گھر میں واپس جائے گا' دوسرے کو اس میں شریک کرنے کا آپ کو حق نہیں تو وہ عالم کہنے لگے کہ میں گھر سے اور کھانا نہ منگاؤں گا' دونوں اسی میں سے کھا لیں گے اور جتنا کھانا میرے واسطے گھر سے آ گیا ہے اس میں مجھے اختیار ہے چاہے سب کھاؤں یا کچھ چھوڑ دوں یا کسی کو کھلا دوں۔ میرے ملازم نے کہا کہ گھر میں سے مہمان کے سامنے ہمیشہ زیادہ ہی کھانا آتا ہے کہ اسے کم نہ پڑے۔ باقی اس میں مہمان کی تملیک نہیں کی جاتی ہے محض اباحت ہوتی ہے۔ اگر آپ خود سارا کھا جائیں اس کی تو اجازت ہے مگر دوسروں کو شریک کرنے کا آپ کو کوئی حق نہیں اور اگر آپ میری بات نہیں مانتے تو فلاں شخص سے (یعنی احقر) سے پوچھ لیجئے' کہنے لگے ہاں' پوچھوں گا۔

حالانکہ یہ مسئلہ بالکل ظاہر تھا۔ درسی کتابوں میں بھی موجود ہے۔ پوچھنے ہی کی ضرورت نہ تھی مگر پھر بھی ان عالم صاحب کو اس کا خیال نہ ہوا اور میرے ملازم کو بے حیا بن کر کہنا پڑا۔ پھر تماشا یہ کہ پوچھا بھی نہیں' آخر میں نے خود ہی متنبہ کیا۔ فقہاء نے صاف لکھا ہے کہ اباحت میں کھانا مالک کی ملک میں رہتا ہے' اگر مالک لقمہ اگلوانا چاہے تو اس کو اس کا بھی حق ہے۔ البتہ تملیک کی صورت میں وہ کھانا لینے والے کی ملک ہو جاتا ہے جیسے تقریبات کے اندر کھانا گھروں میں بھیجا جاتا ہے' وہ ملک ہے۔ باقی مہمانوں کے سامنے جو کھانا آتا ہے وہ اس کی ملک نہیں ہوتا وہ محض اباحت ہے کہ جتنا تم کھا سکو کھالو' باقی مالک کو واپس کر دو' مگر آج کل بعض اہل علم تک کو بھی اس کا لحاظ نہیں۔

اس کی وجہ ایک یہ بھی ہے کہ یہ امور شرفاء کے اندر تو فطری ہوتے ہیں ان کو دوسرے کے مال میں تصرف کرتے ہوئے خود ہی حجاب آتا ہے اور چھوٹی قوموں کے اندر حرص کا مادہ زیادہ ہوتا ہے اور اس وقت شرفاء نے علم دین کی طرف توجہ چھوڑ دی ہے۔ چھوٹی قوموں کے لوگ زیادہ پڑھتے ہیں تو ان کے اخلاق تو ایسے ہی ہوتے ہیں اور حق تعالیٰ نے خاص خاص قوموں میں خاص خاص خاصیتیں رکھی ہیں۔ اسی لیے نواب سعادت علی خان کی عادت تھی کہ وہ بعض قوموں کو ملازم نہ رکھتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ قومیں رشوت خور زیادہ ہوتی ہیں۔ ایک شخص جو اسی قوم کا تھا اس کو ملازمت کی ضرورت ہوئی تو سعادت علی خان کو درخواست دی۔ انہوں نے وہی عذر کیا تو آپ نے اس قاعدہ پر نکتہ چینی کرتے ہوئے یہ شعر لکھا:

نہ ہر زن زن ست و نہ ہر مرد مرد   خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

"نہ ہر عورت عورت ہے نہ ہر مرد مرد' اللہ تعالیٰ نے پانچوں انگلیاں برابر پیدا نہیں کیں۔"

مطلب یہ تھا کہ تم جو ان قوموں کے سب لوگوں کو یکساں سمجھتے ہو یہ غلط ہے' سب برابر نہیں ہوتے۔ سعادت علی خان نے لطیفہ کے طور پر جواب میں لکھا لیکن

وقت خوردن ہمہ یکساں می شوند

(لیکن کھانے کے وقت سب برابر ہوتی ہیں)

یعنی تم جو یہ کہتے ہو کہ خدا نے پانچوں انگلیاں برابر پیدا نہیں کیں' یہ درست ہے مگر کھانے کے وقت سب برابر ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ لقمہ سب کے سروں کو برابر ملا کر ہی لیا جاتا ہے۔ پس میاں اپنا سا منہ لے کر رہ گئے ہوں گے۔

اصلاح اخلاق کی ضرورت

میں تو یہ کہتا ہوں کہ علماء کو اصلاح اخلاق کی سب سے زیادہ ضرورت ہے ہمارے نواح میں

ایک بزرگ کسی رئیس کے یہاں مدعو تھے۔ کھانے کے وقت ان کو بلایا گیا تو ان کے اہل مجلس سب ساتھ چل کھڑے ہوئے۔ اس بارے میں گاؤں والے بہت اچھے ہوتے ہیں کہ کھانے کا نام سنتے ہی اٹھ بھاگتے ہیں۔ جب وہاں سب جا کر بیٹھے تو میزبان نے تواضع کے طور پر سب سے کہا کہ آپ بھی کھانے میں شریک ہو جائیں' کھانا بہت ہے' کچھ لوگوں نے عذر کیا کہ ہم تو محض حضرت کے ساتھ چلے آئے تھے' ہم کھانا نہ کھائیں گے' میزبان خاموش ہو گیا تو وہ بزرگ صاحب فرماتے ہیں کہ جب ایک مسلمان محبت سے کہتا ہے تو تم انکار کیوں کرتے ہو۔ سبحان اللہ! کوئی اس غریب کے دل سے پوچھتا کہ وہ کیسی محبت سے کہہ رہا تھا' وہ تو محض اس غیرت کے لحاظ سے کہہ رہا تھا کہ جب یہ لوگ میرے گھر پر کھانے کے وقت آ گئے تو ان سے کھانے کے لیے نہ کہنا اور ان کی بات تک نہ پوچھنا عرفاً مذموم ہے ورنہ ظاہر ہے کہ جس شخص نے دس پانچ آدمیوں کے کھانے کا انتظام کیا ہو وہ اتنے بڑے مجمع کو محبت سے کب مدعو کر سکتا ہے جو اس مثل کے موافق آ گئے ہوں ''مان نہ مان میں تیرا مہمان''۔

غرض ان بزرگ کے ارشاد سے سب لوگ ہاتھ دھو دھو کر بیٹھ گئے اور کھانا کم ہو گیا' بیچارے میزبان نے اپنے بھائی کے گھر سے منگایا وہ بھی کافی نہ ہوا' آخر بازار سے منگایا' سب کے سامنے بے آبرو ہو گئی کہ ان کے گھر سے کھانا نہ نکلا اور سخت بے لطفی ہوئی۔ بعد میں بعضوں نے خود ان بزرگ کی شکایت کی کہ ان کو خدا کا خوف نہیں آیا کہ اتنے بڑے مجمع کو دوسرے کے گھر پر لا کھڑا کیا۔

صاحبو! بے ڈھنگی بات سے سب کو تکلیف ہوتی ہے گو کوئی شرم و لحاظ کی وجہ سے ظاہر نہ کرے۔ مجھے خود ایک واقعہ پیش آیا کہ ایک انجمن میں مجھے بلایا گیا تو میں نے سفر خرچ کے سوا کچھ نہ لیا اور کرایہ بھی تیسرے درجہ کا لیا۔ وہ بھی انجمن سے نہیں بلکہ خاص داعی کی رقم سے جو کہ پہلے ہی شرط ٹھہر چکی تھی' وہ مجھے زائد دینے لگے میں نے انکار کیا اور کھانے کے اندر بھی میں نے تکلف کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اس برتاؤ سے انجمن والے بڑے خوش ہوئے اور میرے سامنے سیکرٹری انجمن نے ایک واعظ کی شکایت کی کہ صاحب وہ تو ایک دن میں گیارہ روپے کے پان کھا گئے۔ گیارہ روپے کے پان ایک آدمی تو بھلا کیونکر کھا سکتا تھا' بس یہ ہوا کہ جتنے آدمی ان سے ملنے آئے ان سب کو خوب پان کھلائے۔ اس وقت تو کسی نے کچھ نہ کہا مگر بعد میں شکایت زبان پر آ ہی گئی۔

میں نے دل میں کہا کہ آپ جو مجھ کو زیادہ رقم دے رہے تھے اگر میں لے لیتا تو کل کو آپ میری بھی یہی شکایت کرتے اور واقعی میزبان کو جب کلفت ہوتی ہے تو شکایت دل میں آتی ہی ہے۔ اس لیے الحمدللہ کہ میں نہ پان کھاتا ہوں نہ چائے پیتا ہوں نہ ناشتہ کا عادی ہوں تاکہ میزبان کو

کئی کلفت نہ ہونے پائے۔ ایک جگہ کھانے کے بعد یہ خیال کر کے کہ میزبان بے تکلفی سے خوش ہوگا' میں نے پان مانگ لیا مگر میزبان نے خوب ہی کیا کہ صاف جواب دیدیا کہ ہمارے یہاں پان نہیں ہے' کوئی کھاتا نہیں اور واقعی یہ پان کا خرچ بالکل ہی فضول ہے۔ اس میں میزبان کا اچھا خاصا خرچ ہو جاتا ہے اور احسان کسی پر نہیں ہوتا کیونکہ ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ میں نے ایک ہی ٹکڑا کھایا تھا مگر سو آدمیوں کو ایک ایک ٹکڑا دینے میں میزبان کے تو روپے خرچ ہو جاتے ہیں' پھر کھانے کا وقت بھی مقرر ہے کہ دن رات میں دو وقت کھایا جاتا ہے' پان کا کوئی وقت ہی نہیں' میرے خیال میں بعض دفعہ پان کا خرچ کھانے سے بھی بڑھ جاتا ہے اس لیے اس کو بالکل ہی حذف کر دینا چاہیے اور اگر کسی مہمان کے واسطے پان آئیں تو اس کو یہ جائز نہیں کہ اپنے پاس بیٹھنے والوں کو بھی کھلا دے اور فرمائش کر کے ان کے لیے بھی پان منگائے۔ اس سے میزبان کو بعض اوقات ناگواری ہوتی ہے۔

اسی واسطے میری عادت ہے کہ جب میں سفر کرتا ہوں تو اپنے ساتھ صرف ایک آدمی کو لیتا ہوں اور داعی کو پہلے سے اس کی اطلاع کر دیتا ہوں تاکہ وہ آزاد رہے۔ داعی پر صرف میرا اور اس آدمی کا بار ہوتا ہے۔ پھر بعض دفعہ راستہ میں اگر لوگ محبت کی وجہ سے ساتھ ہو لیتے ہیں تو میں ان سے صاف کہہ دیتا ہوں کہ آپ اپنا انتظام خود کریں جہاں میرا قیام ہوگا وہاں آپ قیام بھی نہ کریں بلکہ سرائے وغیرہ میں جہاں آسانی ہو وہاں ٹھہریں اور بازار سے اپنے کھانے کا انتظام کریں اور صبح و شام محض ملاقات کے لیے میرے پاس آجایا کریں جس سے میزبان کو یہ معلوم نہ ہو کہ آپ میرے ساتھ ہیں۔ پھر اگر وہ ازخود آپ کی دعوت کرے تو آپ اپنے تعلقات کو دیکھ کر دعوت منظور کریں یا رد کریں' میرے طفیلی بن کر کھانا نہ کھائیں۔

اور اگر کسی وقت میزبان مجھ سے کہنے لگتا ہے کہ آپ کے ان ہمرائیوں کی بھی دعوت میں کرنا چاہتا ہوں تو میں صاف کہہ دیتا ہوں کہ میرے ساتھ کوئی نہیں۔ میں نے کسی کو نہیں بلایا۔ اگر آپ کو دعوت کرنا ہو تو خود ان سے کہیے اور محض اپنے تعلقات کی بناء پر جو چاہے کیجئے میرے اوپر اس کا احسان نہ ہوگا۔ میں ان سے کہنا نہیں چاہتا میری عام عادت یہی ہے۔ ہاں اگر کوئی بہت ہی مخلص ہوتا ہے تو وہاں میں اس قاعدہ پر عمل نہیں کرتا۔

ایک مرتبہ جونپور میں بہت سے لوگ میرے ساتھ ہو گئے اور سب اپنا اپنا انتظام بازار سے کرتے تھے۔ میزبان چاہتے بھی تھے کہ سب میرے ہی یہاں کھانا کھائیں مگر میرے ساتھیوں نے منظور نہ کیا۔ ایک عالم مجھ سے جھگڑنے لگے کہ صاحب آپ اپنے ساتھیوں کو فرما دیجئے کہ

آپ ہی کے ساتھ کھانا کھائیں اس میں میزبان کی دل شکنی ہوتی ہے۔ میں نے کہا مولانا بس آپ خاموش رہیں، میں اس رسمی دل شکنی کو اس حقیقی کلفت سے سہل سمجھتا ہوں جو اتنے مجمع کے انتظام سے میزبان کو اوران کے گھر والوں کو پیش آئے گی اور کسی کسی کو ناگواری بھی ہوگی۔

اب سنئے دوسروں کے گھروں پر تو مولانا کی یہ رائے تھی مگر جب خود دعوت کی تو صرف میری اور ساتھیوں میں سے اپنے ایک قدیم دوست کی دعوت کی، بقیہ ساتھیوں میں سے کسی کو بھی نہیں پوچھا اور عذر کرنے لگے کہ گھر میں علالت تھی اس لیے میں سب کو مدعو نہ کرسکا۔ میں نے دل میں کہا کہ دوسروں کے گھر پر رائے دیتے ہوئے آپ کو یہ خیال نہ آیا کہ شاید ان کے گھر پر بھی کوئی عذر ہو۔ پھر گھر نہیں پک سکتا تھا تو بازار میں تو پک سکتا تھا۔ بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ مولانا کو میری دعوت کرنے کی ہمت بھی اسی لیے ہوئی کہ دیکھ لیا کہ میں ساتھیوں کو دعوت میں شریک نہیں کرتا۔ اگر سارے ساتھی میرے ساتھ دعوت میں شریک ہوا کرتے تو شاید وہ میری دعوت بھی نہ کرتے۔ اس لیے مشائخ وعلماء کو ان باتوں کا بہت ہی خیال رکھنا چاہیے کہ اپنے سب ساتھیوں کا بار میزبان پر نہ ڈالا کریں۔

غرض اموال میں بہت کم احتیاط کی جاتی ہے جس کی وجہ سے ہماری معاشرت نہایت خراب ہو رہی ہے اور اس کا منشاء وہی ہے کہ ہم دنیا کو دین پر اور آخرت پر مقدم کر رہے ہیں۔

جاہ مال سے زیادہ مرغوب ہے

اب ایک چیز رہ گئی جاہ، یہ مال سے بھی زیادہ مرغوب ہے کیونکہ جاہ کی حقیقت ملک قلوب ہے۔ اس سے بڑے بڑے کام نکلتے ہیں جو کام ہزاروں روپے خرچ سے بھی پورے نہ ہوں وہ صاحب جاہ کے زبان ہلانے کے نکل جاتے ہیں اور اصل میں جاہ محض اس وجہ سے مطلوب ہے تاکہ اس کے ذریعے سے لوگوں کی ایذاء سے بچا رہے یعنی جاہ کا اصل نفع دفع مضرت ہے مگر آج کل اس کو جلب منفعت کے لیے آلہ بنایا جاتا ہے اور اس سے ہزاروں روپیہ کمایا جاتا ہے۔ غرض حب مال دنیا ہے تو حب جاہ دنیا کیوں نہ ہوگی۔ حدیث میں ہے:

ماذبان جائعان ارسلا فی مطیعة غنم افسدلها من حب المال والشرف للدین. (او کماقال)[1]

"یعنی دو بھوکے بھیڑیئے بکریوں کے گلہ کو اتنا تباہ و برباد نہیں کرتے جتنا حب مال وحب جاہ دین کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔"

---

[1] (لم أجده فی "موسوعة أطراف الحدیث النبوی الشریف")

اس سے سمجھ لیجئے کہ حب جاہ دین کو کس قدر تباہ کر دیتا ہے۔ حقیقت میں جاہ حاصل کرنے کے لیے انسان وہ وہ کام کر گزرتا ہے جو تحصیل مال کے لیے بھی نہیں کرتا۔ تحصیل جاہ میں دین کو اچھی طرح برباد کیا جاتا ہے۔ رسوم و تقریبات میں ہزاروں روپیہ محض نام کے واسطے خرچ کیے جاتے ہیں، شادی اور غمی میں ایک شخص اپنی زمین و جائیداد تک بیچ ڈالتا ہے۔ کوئی اس سے پوچھے کہ تو نے کیا حاصل کیا، کچھ بھی نہیں، صرف ایک نام خریدا جو اگر بیچا جائے تو دو کوڑی کو بھی نہیں بک سکتا۔

خیر یہ لوگ تو دنیا خرچ کر کے ایسی چیز خریدتے ہیں جس کو وہ خود بھی دنیا سمجھتے ہیں مگر بعض لوگ دین کی صورت بنا کر دنیا خریدتے ہیں۔ یہ ان سے بھی بدتر ہیں کیونکہ وہ تو دنیا کو دنیا کی صورت سے حاصل کرتے ہیں، کسی کو دھوکہ نہیں دیتے اور یہ جماعت دنیا حاصل کرتی ہے، دین کی صورت میں۔ اس سے لوگوں کو دھوکہ ہوتا ہے بلکہ بعض دفعہ وہ خود بھی دھوکہ میں رہتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ ہم دین کا کام کر رہے ہیں۔ چنانچہ تحصیل علم دین سب سے اعلیٰ چیز ہے مگر دیکھ لیجئے اس میں لوگوں کی کیا نیتیں ہیں۔ اکثر کی نیت محض دنیا ہی کمانا ہوتا ہے۔ گو علم دین سے دنیا بہت حاصل نہیں ہوتی ہاں گداگری آ جاتی ہے کہ آئے دن مسلمانوں سے چندوں کا سوال ہوتا ہے جس سے بجائے عزت کے ذلت زیادہ ہوتی جاتی ہے مگر پھر بھی بعض لوگ محض اس نیت سے علم حاصل کرتے ہیں کہ عالم بن کر ایک مدرسہ مستقل قائم کر کے اس کے لیے چندہ کریں گے اور بعض لوگ چندے بھی نہیں کرتے، ان کو مال اگرچہ کم ملتا ہے مگر جاہ زیادہ حاصل ہوتی ہے کیونکہ اب بھی مسلمانوں میں علماء کی قدر بحمد اللہ بہت ہے۔ بشرطیکہ وہ علماء کی طرز پر رہیں، گداگری نہ کریں۔ گو وہ علماء کا طرز ریاء ہی سے اختیار کریں اور ان کی نیت علم حاصل کرنے سے یہی ہو کہ مخلوق کی نگاہ میں ہماری عزت ہوگی مگر اس طرز استغناء کی خاصیت یہ ہے کہ اس سے خواہ مخواہ عالم کی قدر ہوتی ہے تو بعض لوگ علم پڑھنے سے اگر چندہ کرنے کی نیت بھی نہ کریں مگر حصول جاہ کی نیت کرتے ہیں یہ بھی دنیا ہی ہے۔

حب جاہ کے نتائج

مگر دین کی صورت میں اس علم کا انجام یہ ہوگا کہ حدیث میں ہے:

یجاء بالشهید یوم القیامة فاتی به فعرفه نعمه فعرفها قال ماعلمت فیها قال قاتلت فیک حتیٰ استشهدت قال کذبت ولکنک قاتلت لان یقال فلان جری فقد قیل ثم امربه فسحب علیٰ وجهه حتیٰ القی فی النار۔[1]

---

[1] (الصحیح لمسلم کتاب الامارۃ: ۱۵۲، مشکوۃ المصابیح: ۲۰۵ تفسیر القرطبی ۱: ۱۸، بالفاظ مختلفة)

یعنی شہید کو قیامت کے دن خدا تعالیٰ کے سامنے لایا جائے گا پھر حق تعالیٰ اس کو اپنی نعمتیں بتلائیں گے جن کا وہ اقرار کرے گا۔ پھر سوال ہوگا کہ ان نعمتوں کے شکریہ میں تو نے کیا عمل کیا' وہ کہے گا' اے پروردگار! میں نے آپ کے راستہ میں جہاد کیا حتیٰ کہ شہید ہو گیا۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو جھوٹا ہے' تو نے محض اس واسطے قتال کیا تھا تا کہ لوگ یوں کہیں کہ فلاں شخص بڑا بہادر ہے' دل کا مضبوط ہے' حاکم کے سامنے بڑی جرأت سے بیان دیئے' کسی سے نہیں ڈرا اور جیل خانہ میں خوشی کے ساتھ چلا گیا۔ سو دنیا میں تمہاری تعریف ہو چکی' پھر حکم ہوگا کہ اس کو اوندھے منہ جہنم میں ڈال دو۔

ثم یجاء بالقاری قدتعلم العلم وعلمه وقرأ القرآن فاتی به فعرفه نعمه فعرفها قال فماعلمت فیها قال تعلمت العلم وعلمته و قرأت فیک القرآن قال کذبت ولکنک قرأت لیقال انک قاری فقد قیل ثم امربه فسحب علی وجه حتی التقی فی النار۔

پھر عالم کو لایا جائے گا جس نے علم حاصل کر کے دوسروں کو بھی پڑھایا تھا اور قرآن کو اچھی طرح پڑھا تھا۔ حق تعالیٰ اس کو بھی اپنی نعمتیں جتائیں گے جن کا وہ اقرار کرے گا' پھر ارشاد ہوگا کہ تم نے ان نعمتوں کے شکریہ میں کیا کیا' وہ کہے گا کہ میں نے علم حاصل کیا اور لوگوں کو سکھایا اور آپ کی رضا کے لیے قرآن سیکھا۔ ارشاد ہوگا کہ تو جھوٹا ہے بلکہ تو نے محض اس لیے علم حاصل کیا تھا کہ تجھے قاری کہا جائے' سو یہ سب کچھ ہو چکا' پھر اس کے لیے بھی وہی حکم ہوگا۔ چنانچہ منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ یہ مولانا صاحب کی گت بنی جو بڑے نکتہ داں اور بڑے مدرس و مفتی تھے جن کے ہزاروں آدمی مرید و معتقد تھے اور مصافحہ کے وقت ان کے ہاتھ پیر چومے جاتے تھے۔ **ثم جاء بالجواد**

پھر سخی کو بلایا جائے گا جس کو خدا تعالیٰ نے قسم قسم کی نعمتیں اور مختلف انواع کا مال عطا فرمایا تھا۔ حق تعالیٰ اس کے سامنے بھی اپنی نعمتیں گنائیں گے جن کا وہ اقرار کرے گا۔ پھر سوال ہوگا کہ ان نعمتوں کے شکریہ میں تو نے کیا کیا؟ وہ کہے گا کہ اے پروردگار! میں نے کوئی موقع ایسا نہیں چھوڑا جہاں روپیہ کا خرچ کرنا آپ کو محبوب تھا مگر وہاں آپ کے لیے ضرور مال خرچ کیا۔ ارشاد ہوگا تو جھوٹا ہے بلکہ تو نے یہ سب کچھ محض اس لیے کیا تا کہ لوگ یوں کہیں فلاں شخص بڑا سخی ہے۔ پس تمہاری تعریف ہو چکی' پھر اس کے لیے بھی وہی حکم ہوگا۔ چنانچہ اس کو بھی اوندھے منہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

محض صورت دین کا نام دین نہیں

تو دیکھئے! شہید اور عالم اور سخی کی یہ گت کیوں بنی۔ محض اس لیے کہ انہوں نے خدا کے

واسطے یہ کام نہ کیے تھے۔اس سے معلوم ہوا کہ محض صورت دین کا نام نہیں بلکہ صورت کے ساتھ حقیقت بھی ہونی چاہیے۔جیسا مولانا فرماتے ہیں:

گر بصورت آدمی انساں بدے　　احمدؐ و بوجہل ہم یکساں بدے

''اگر آدمی کی صورت کی وجہ سے انسان ہوتو احمد صلی اللہ علیہ وسلم اور بوجہل یکساں ہوتے۔''

اگر محض صورت دین قابل اعتبار ہوتی تو قیامت میں شہید اور عالم اور سخی کی یہ گت نہ بنتی کیونکہ صورت دین کی تو ان کے پاس کمی نہ تھی مگر حقیقت دین سے وہ خالی تھے۔یعنی اخلاص فی العمل سے اس لیے وہ صورت کچھ کام نہ آئی۔صورت اور حقیقت میں ایسا فرق ہے جیسے ایک تو حقیقی شیر ہوتا ہے جس کی صورت سے تو کیا آواز اور بوتک سے تمام جانور کانپ جاتے ہیں اور جنگل کا جنگل تھراجاتا ہے اور ایک مصنوعی شیر ہوتا ہے جیسے بعض جگہ محرم کے مہینہ میں بعض جگہ لوگ شیر کی کھال پہن کر شیر بنتے ہیں۔وہ ایسا شیر ہوتا ہے کہ اگر سامنے سے بھیڑیا یا باؤلا کتا آجائے تو یہ شیر صاحب سب سے پہلے دم دبا کر بھاگیں۔یہی حال ان لوگوں کا ہے جو دین کی صورت میں دنیا حاصل کرتے ہیں۔اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

اینکہ می بینی خلاف آدم اند　　نیستند آدم غلاف آدم اند

''انسان یہ جو تم خلاف آدم دیکھتے ہو یہ انسان نہیں انسانوں کے غلاف میں ہیں۔''

جس طرح وہ مصنوعی شیر حقیقت میں شیر نہیں بلکہ غلاف شیر ہے اسی طرح دنیا بصورت دین حقیقت میں دین نہیں بلکہ محض غلاف دین ہے جیسے کوئی بدشکل بڑھیا عورت جوان عورتوں کا بھیس بدل کر عمدہ لباس پہن کر ایک مرد سے شادی کرے۔ظاہر میں وہ جوان ہوگی لیکن جب لباس اتار کر دیکھا تو ماں کی بھی ماں نکلی۔

بس قامت خوش کہ زیر چادر باشد　　چوں باز کنی ماد مادر باشد

''سر پر نقاب ہونے سے خیال تھا کہ حسین وجمیل ہوگی مگر جب اس نے چادر اٹھائی تو معلوم ہوا کہ یہ تو ماں کی بھی ماں ہے۔''

یہی حال ان لوگوں کا ہے جو بدون اخلاص کے دین کے کام کرتے ہیں:

از بروں چوں گور کافر پر حلل　　اندروں قہر خدائے عزوجل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید　　وزد رونت ننگ میدارد یزید

''باہر سے کافر کی قبر ہر طرح مزین اور اندر سے خدائے ذوالجلال کا عذاب ہورہا ہے باہر

ہے تو بایزید بسطامیؒ پر طعنہ زنی کرتا ہے اور تیری اندرونی حالت سے شیطان بھی شرماتا ہے۔''

مگر اس کا یہ مطلب نہیں صورت بالکل بیکار ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ محض صورت کافی نہیں بلکہ صورت کے ساتھ حقیقت بھی ہونی چاہیے۔ دیکھو اگر کوئی یہ کہے کہ مٹی کا بنایا ہوا آم بیکار ہے تو اسکا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ آم کی صورت مطلقاً بیکار ہے بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس صورت کے ساتھ اگر حقیقت بھی آم کی ہو اس وقت تو یہ صورت بھی اچھی ہے ورنہ مٹی کی صورت کو کوئی لے کر کیا کرے۔ چنانچہ حقیقی آم میں اس کی صورت بھی مطلوب ہوتی ہے جہاں اسکی شیرینی اور لطافت کی تعریف کی جاتی ہے وہاں اس کی شوخی رنگ اور چھلکے کی باریکی کی بھی تعریف ہوتی ہے۔

اگر کوئی شخص ایک نہایت حسین عورت کا فوٹو آپ کو دے تو اس کو آپ فضول سمجھیں گے لیکن اگر ویسی ہی حسین عورت زندہ آپ کو مل جائے تو اس وقت آپ صورت کو ہرگز بیکار نہ سمجھیں گے۔

اسی طرح سمجھو کہ دین کی صورت بھی مطلوب ہے بشرطیکہ اس کے ساتھ حقیقت دین بھی ہو جائے۔ اگر حقیقت دین کے ساتھ صورت دین نہ ہو جیسے بہت لوگ باطن کے اچھے ہوتے ہیں ان کے دل میں خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور تواضع و اخلاق سب کچھ ہوتا ہے۔ مگر ظاہر میں صورت شرع کے خلاف ہوتی ہے تو ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص تصرف کر کے اپنی روح کو کتے کے قالب میں حلول کر دے۔ بعض لوگوں کو تصرف کی مشق سے یہ قوت حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی روح کو دوسرے حیوانات کے اجسام میں منتقل کر دیتے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی روح انسانی کو کتے کے قالب میں منتقل کر دے گا تو اس وقت وہ کتا ہی ہوگا انسان نہ ہوگا۔ گو روح انسان کی ہوگی مگر کوئی شخص بھی اس کو آدمیوں کے برابر بٹھلانا گوارا نہ کرے گا۔

اس مثال سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ صورت کی بھی ضرورت ہے اور حقیقت کی بھی۔ نہ صورت بدون حقیقت کے کافی ہے نہ حقیقت بدون صورت کے کافی ہے۔ (گو اس عدم کفایت میں تفاوت ضرور ہے کہ صورت بدون حقیقت کے زیادہ بری ہے اور حقیقت بدون صورت کے گو اتنی بری نہیں مگر بری وہ بھی ہے۔ خوب سمجھ لو۔ ۱۲ جامع)

روح اور جسم کا تعلق

اس جگہ بعض طالب علموں کو ایک شبہ پیدا ہوگا۔ وہ یہ کہ حدیث میں آیا ہے کہ شہداء کی ارواح جنت میں حواصل طیور خضر میں ہوں گی اور تقریر سابق سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اگر انسان کی روح کسی حیوان کی روح میں منتقل ہو جائے تو اس وقت وہ انسان نہ ہوگا بلکہ حیوان ہوگا۔ اس سے لازم آتا ہے

کہ شہداء جنت میں انسان نہ رہیں گے بلکہ پرندے بن جائیں گے اور یہ فضیلت کے منافی ہے کیونکہ انسان پرندے سے افضل ہے۔ پس اس کا پرندہ بن جانا اس کے تنزل کا سبب ہوگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جنت میں وہ جسم طیر شہداء کے لیے مرکب ہوگا ان کا حقیقی جسم وہ نہ ہوگا بلکہ ان کے لیے جسم انسانی دوسرا ہوگا۔ پس ارواح شہداء کا حواصل طیور خضر میں ہونا ایسا ہے جیسا کہ دنیا میں ہم بہلی اور بگھی یا ڈولی اور پالکی میں سوار ہوتے ہیں۔ اگر پالکی اور بگھی بند ہو تو دیکھنے والے کو یہی معلوم ہوگا کہ پالکی اور بگھی آرہی ہے، ہمارا جسم اس کو نظر نہ آئے گا مگر اس سے یہ ہرگز نہ سمجھا جائے گا کہ بگھی اور پالکی ہمارا جسم ہے اور ہماری روح اس کے اندر حلول کئے ہوئے ہے بلکہ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اس کے اندر جو آدمی بیٹھا ہے اس کا جسم بگھی اور پالکی کے جسم سے علیحدہ ہے اور یہ محض اس کی سواری ہے۔

اسی طرح یہاں سمجھئے کہ جنت میں روح شہداء کے لیے سبز پرندوں کا جسم بمنزلہ پالکی کے ہوگا اور اس کے اندر روح انسانی اپنے جسم انسانی کے ساتھ سوار ہوگی۔ پس اس سے انسان کا پرندہ بن جانا لازم نہیں آتا۔ یہ صورت جب لازم آتی ہے کہ روح انسانی اپنے جسم سے علیحدہ ہو کر جسم طیر میں حلول کرتی اور وہاں یہ بات نہ ہوگی۔

اب رہی یہ بات کہ جسم انسانی کونسا ہے جس کے اندر شہداء کی روحیں حلول کر کے حواصل طیور خضر میں سوار ہوں گی۔ آیا وہی یہی جسم عنصری ہے یا کوئی دوسرا جسم ہے؟

اس کی تحقیق کے لیے کشف کی ضرورت ہے کیونکہ نص اس سے ساکت ہے۔ اہل کشف کو معلوم ہے کہ عالم برزخ میں انسان کو جسم مثالی عطا ہوتا ہے جو اسی جسم عنصری کے مشابہ ہے مگر اس سے زیادہ لطیف ہوتا ہے لیکن یہ جسم مثالی صرف برزخ ہی میں انسان کو عطا ہوگا اور جنت دوزخ میں یہی جسم عنصری پھر مل جائے گا۔ گو برزخ میں جسد عنصری کا ہونا کچھ محال نہیں مگر خلاف مشاہدہ ہے۔ اہل کشف کو معلوم ہوا ہے کہ برزخ میں عذاب وثواب ارواح کو جسم مثالی کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ لہٰذا ملحدین کا یہ اعتراض رفع ہوگیا کہ احادیث میں جو عذاب وثواب قبر کا ذکر ہے یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ ہم نے انسان کے مرجانے کے بعد اس کے جسم عنصری کا مہینوں پہرہ دیا ہے ہم کو تو کچھ بھی عذاب وثواب نہ نظر نہیں آیا۔

جواب یہ ہے کہ برزخ میں انسان کو دوسرا جسم عطا ہوتا ہے جو کہ جسم مثالی ہے۔ عذاب و ثواب اسی کو ہوتا ہے۔ لہٰذا جسد عنصری پر عذاب وثواب محسوس نہ ہونے سے اس کی مطلقاً نفی نہیں ہوسکتی پھر بعض دفعہ حق تعالیٰ نے اپنی قدرت ظاہر کرنے کے لیے اس جسم عنصری پر بھی عذاب و

ثواب کو ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ اس قسم کے واقعات منقول ہیں کہ بعض لوگوں نے کسی مردہ کی قبر میں آگ جلتی ہوئی دیکھی، بعض لوگوں کو کسی قبر سے نہایت پاکیزہ خوشبو محسوس ہوئی۔ لہٰذا اس حدیث پر کوئی اشکال نہیں ہے، خوب سمجھ لو۔

الغرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ ظاہر کے ساتھ باطن کی بھی ضرورت ہے اور باطن کے ساتھ ظاہر کی ضرورت ہے۔ بعض جاہل درویشوں کو یہ غلطی پیش آئی ہے کہ انہوں نے باطن کا اس درجہ اہتمام کیا کہ اصلاح ظاہر کو بیکار و فضول سمجھنے لگے۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ نماز کی روح ذکر ہے۔ پھر دعویٰ کیا کہ ہمارا باطن ہر دم ذاکر ہے اس لیے ہم کو نماز کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح زکوٰۃ کی روح تزکیہ باطن ہے کہ دل کو حرص و بخل سے پاک کیا جائے، پھر کہنے لگے کہ ہمارے اخلاق مہذب ہو چکے ہیں ہم کو زکوٰۃ دینے کی ضرورت نہیں۔ علیٰ ہذا حج کی روح تجلی الوہیت کا مشاہدہ ہے اور ہم کو تجلی الوہیت کا مشاہدہ ہر جگہ حاصل ہو جاتا ہے اس لیے حج کی بھی ضرورت نہیں۔

یاد رکھو یہ صریح زندقہ ہے۔ ان لوگوں نے اعمال شرعیہ کی روح کو دیکھا ہی نہیں۔ اگر وہ ان اعمال کی حقیقی ارواح کو دیکھ لیتے تو پھر ان اعمال کی صورت کو بیکار نہ سمجھتے کیونکہ ہر عمل کی روح کو اس کی صورت کے ساتھ ایسا خاص تعلق ہے کہ وہ بدون اس کے کبھی حاصل نہیں ہو سکتی، نماز کی روح مطلق ذکر نہیں ہے جیسا کہ ان لوگوں نے سمجھا ہے بلکہ ایک خاص ذکر ہے جس کا تحقق اسی صورت صلوٰۃ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسی طرح حج کی روح مطلق مشاہدہ تجلی الوہیت نہیں ہے بلکہ خاص وہی مشاہدہ ہے جو بدون افعال حج کے حاصل نہیں ہوتا۔ جیسا کہ بعض دوائیں بالخاصہ مفید ہوا کرتی ہیں کہ وہ خاصہ ان ہی میں ہوتا ہے کسی دوسری دوا سے وہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ گو وہ درجہ حرارت و برودت میں اس کے بالکل برابر ہی ہو۔ خوب سمجھ لو۔ (میں نے اس مسئلہ کو ایک وعظ میں نہایت بسط و تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، جس کا نام روح الارواح ہے۔)

اس لیے میں پھر کہتا ہوں کہ نہ ظاہر و باطن سے مغنی ہے نہ باطن ظاہر سے بلکہ دونوں کا ساتھ ساتھ ہونا ضروری ہے۔ یہ مضمون ظاہر و باطن کے متعلق درمیان میں ایک مناسبت سے مذکور ہو گیا۔ میں اصل میں یہ کہہ رہا تھا کہ بعض لوگ دنیا کو دین کی صورت میں حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ بہت لوگ علم دین حاصل کرتے ہیں جو ظاہر میں آخرت کا کام ہے دنیا کا کام نہیں مگر ان کی نیت جاہ و مال حاصل کرنے کی ہوتی ہے اس لیے ایسے علم کو دنیا ہی کہا جائے گا۔ یہ ہے تحصیل دنیا بصورت دین۔

اخلاص کی ضرورت

دین کا کام خاص وہ علم ہے جس میں اخلاص ہو جس کی آج کل بہت ہی کمی ہے۔ علامہ شعرانی

نے اخلاص کی ایک علامت لکھی ہے وہ یہ کہ جو کام تم کر رہے ہو اور اگر کوئی دوسرا اس کام کا کرنے والا تم سے اچھا اس بستی میں آ جائے اور وہ کام ایسا ہو جو علی العین واجب نہ ہو جیسے مسجد و مدرسہ کا اہتمام یا وعظ کہنا' پیری و مریدی کرنا' کسی نیک کام کے لیے چندہ کرنا وغیرہ وغیرہ تو تم کو اس کے آنے کی خوشی ہو رنج نہ ہو۔ بلکہ تم خود لوگوں کو اس کے پاس بھیجو کہ وہاں جاؤ وہ مجھ سے بہتر ہیں اور سارا کام خوشی کے ساتھ دوسرے کے حوالہ کر کے خود ایک گوشہ میں بیٹھ جاؤ اور دل میں خدا کا شکر کرو کہ اس نے ایسے آدمی کو بھیج دیا جس نے تمہارا کام بٹوا لیا۔ اگر یہ حالت ہو تب تو واقعی تم مخلص ہو۔

مگر اب تو کسی عالم کی بستی میں کوئی دوسرا چلا آئے جس کی طرف عوام کا رجوع ہونے لگے تو جلے مرتے ہیں اور دل سے یہ چاہتے ہیں کہ اس شخص سے کوئی بات ایسی ظاہر ہو جس سے عوام بدگمان ہو جائیں کہ "دو شمشیر در نیامے نہ گنجند ...... اسی طرح دو عالم در مقامے نہ گنجند" (دو تلواریں ایک نیام میں نہیں آ سکتیں اسی طرح دو عالم ایک مقام پر اکٹھے نہیں ہو سکتے) گویا اپنے کو وحدہ لاشریک لہ سمجھتے ہیں کہ بس تمام لوگوں کو ہماری ہی طرف رجوع کرنا چاہیے کسی اور کی طرف رخ بھی نہ کرنا چاہیے کیونکہ قبلہ و کعبہ تو ہم ٹھہرے پھر دوسری طرف نماز کیسی۔ انا للّٰه وانا الیه راجعون۔ اس حالت میں تم ہرگز مخلص نہیں ہو بلکہ اخلاص سے مفلس ہو۔

اور لیجئے ایک مولوی صاحب کا کسی مدرسہ میں قیام ہے جب اس کا سالانہ جلسہ ہوتا ہے تو آپ کو ایک خاص خط آتا ہے اور سمجھتے ہیں کہ یہ خط دینی ہے کیونکہ نفس کہتا ہے کہ مجھ کو محض دین کا کام جاری ہونے اور طلبہ فارغین کو سند فراغ ملنے کی خوشی ہو رہی ہے۔ اپنی کارروائی ظاہر ہونے کی خوشی نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس کا ایک امتحان ہے وہ یہ کہ اگر یہ حضرت مولوی صاحب اس مدرسہ سے الگ کر دیئے جائیں اور کوئی دوسرا ان کی جگہ پڑھانے لگے پھر اس کے فارغ کردہ طلبہ کو سند فراغ دی جائے اور اس کے لیے جلسہ کیا جائے تو ان مولوی صاحب کو اس وقت بھی یہی خط آئے گا یا نہیں۔ ایمانداری سے اپنے دل میں ٹٹول لیں' اگر اس وقت بھی ان کو ایسا ہی خط آئے تو واقعی یہ دینی خط ہے ورنہ سمجھ لو کہ یہ خط محض دنیوی ہے جس میں ریاء و عجب کی آمیزش ہے۔

اب تو یہ حالت ہے کہ کسی مدرسے سے علیحدہ کئے جانے کے بعد یہ مولانا صاحب اس مدرسہ کی تخریب ہی کے درپے نہ ہوں تو یہ ان کی بڑی عنایت ہے۔ آئندہ اس کے جلسوں سے خط آنا اور مسرت و خوشی ہونا تو بہت دور ہے۔

مجھے خود ایسے واقعات بہت پیش آتے ہیں کہ ایک مولوی صاحب کسی مدرسہ میں ملازم

ہیں۔ جب تک وہ وہاں رہیں گے برابر میرے پاس خطوط بھیجتے رہیں گے کہ یہاں آپ کے آنے کی بہت ضرورت ہے اس جگہ جہالت و بدعت زیادہ ہے۔ پھر جب مولانا کی وہاں سے بدلی ہوگئی تو اس جگہ کی بدعت و جہالت سب رخصت ہوگئی۔ اب وہاں کسی جلسہ اور وعظ کی کچھ ضرورت ہی نہیں رہی بلکہ اب جس جگہ مولانا بدلی ہوکر پہنچے وہاں کا چاند بدلی میں آ گیا۔ اب ساری بدعت و جہالت وہاں آ گئی اور اس جگہ کے لیے وعظ و جلسہ کی ضرورت ظاہر ہونے لگی۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ساری بدعت اور جہالت کی پوٹ خود ان مولوی صاحب کی ذات بابرکات ہے کہ جہاں آپ پہنچتے ہیں وہیں بدعات و جہالات کا زور ہوجاتا ہے اور وعظ و جلسہ وغیرہ کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے، کچھ نہیں، نہ پہلی جگہ جلسہ اور وعظ بدعت و جہالت کی اصلاح کے لیے کیا جاتا تھا نہ دوسری جگہ اس غرض کے لیے جلسہ کیا جاتا ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ جس جگہ مولانا صاحب کا قیام ہوتا ہے اس مدرسہ سے آپ کی تنخواہ میں کمی نہ آئے بلکہ ترقی ہوتی رہے ورنہ اگر بدعت و جہالت کی اصلاح کے لیے جلسے کئے جاتے تو سب سے پہلے ان مقامات کی فکر ہوتی جہاں کے مسلمانوں کو کلمہ پڑھنا بھی نہیں آتا۔ ان کی صورتیں ہندوؤں جیسی ہیں اور بیاہ شادی سب ہندوؤں کی طرح ہوتی ہیں کیونکہ ان مقامات پر تبلیغ کرنا فرض ہے مگر اب تو ہم لوگ اسی جگہ جاتے ہیں جہاں ہماری آؤ بھگت ہو، ایسے مقامات پر کون جائے جہاں کے مسلمان ہمیں پانی پینے کے لیے برتن بھی نہ دیں کیونکہ وہ ہم سے ویسے ہی چھوت چھات کرتے ہیں جیسے ہندو کرتے ہیں۔ افسوس!

نفس کا کید خفی

صاحبو! یہ نفس کا کید خفی ہے کہ ہم نے اپنے مدرسہ کے جلسہ سے خوش ہونے کو دینی مسرت سمجھتے ہیں، یہ نفس بڑا ہوشیار ہے، بعض دفعہ یہ ایسی پٹی پڑھاتا ہے کہ خود صاحب نفس کو بھی خبر نہیں ہوتی کہ اس میں نفس کا کید تھا۔ چنانچہ اس مقام پر بعض اوقات نفس دھوکہ دیتا ہے کہ اپنی کارگزاری پر اس لیے زیادہ مسرت ہوتی ہے کہ اس فعل کا ہم کو ثواب ملا، غیر کے فعل کا ثواب ہم کو نہیں ملتا اس لیے اس کی مسرت اس قدر نہیں ہوئی۔ اس کا امتحان یہ ہے کہ اگر ایسے اسباب جمع ہوجائیں کہ فعل تو ان کا ہو مگر انتساب ہوجائے دوسرے کی طرف تو کیا اس وقت بھی ویسی ہی مسرت ہوتی ہے۔

غرض ہماری حالت یہ ہے کہ کوئی تو دنیا کو دنیا کی صورت سے حاصل کر رہا ہے اور اس میں ایسا منہمک ہے کہ آخرت کی اسے کچھ پرواہ نہیں اور کوئی دنیا کو دین کی صورت سے حاصل کر رہا ہے ایسا شخص اپنے کو دیندار سمجھتا ہے مگر حقیقت میں یہ بھی دنیادار ہے۔ حق تعالیٰ اسی کی شکایت فرماتے ہیں:

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی.

''کہ تم فلاح کے لیے کوشش نہیں کرتے بلکہ حیات دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو۔''

مطلق طلب دنیا کی ممانعت نہیں

یہاں چند نکتے سمجھنے کے قابل ہیں۔ایک یہ کہ حق تعالیٰ نے اس جگہ (بَلْ تُؤْثِرُوْنَ فرمایا ہے جو ایثار سے مشتق ہے جس کے معنی ایک چیز کو دوسرے پر ترجیح دینے کے ہیں اور اس کے بجائے (بل تطلبون یا بل تتبغون) نہیں فرمایا جس سے معلوم ہوا کہ مطلق طلب دنیا پر شکایت نہیں بلکہ شکایت اس پر ہے کہ دنیا کو آخرت پر ترجیح دی جائے تو اگر کوئی شخص دنیا کو آخرت پر ترجیح نہ دے بلکہ دونوں کے تزاحم کے وقت آخرت ہی کو ترجیح دے لیکن اس کے ساتھ وہ دنیا کمانے میں مشغول رہے تو اس کی مذمت نہیں ہے۔اس میں زاہدان خشک کی اصلاح ہے جو مطلق طلب دنیا کو مذموم سمجھتے ہیں۔بس خوب سمجھ لو کہ ترجیح دنیا علی الآخرت کی ممانعت ہے مطلق طالب دنیا کی ممانعت نہیں ہے۔

اب لوگوں کی حالت یہ ہے کہ اگر کوئی شادی کرے تو کہتے ہیں کہ یہ کیسے بزرگ ہیں جو بیوی رکھتے ہیں۔بزرگوں کو بیوی کی کیا ضرورت ہے۔سبحان اللہ! بس بزرگوں کو فرشتہ ہونا چاہیے کہ نہ کھائیں نہ پئیں نہ بیوی کریں۔

ایک مرتبہ میں میرٹھ گیا' گھر میں سے میرے ساتھ تھیں کیونکہ ان کے معالجہ کی ضرورت تھی اور وہ معالجہ قصبہ میں نہ ہوسکتا تھا۔شہروں ہی میں ہوسکتا تھا۔قصبہ میں بعض اسباب علاج میسر نہیں ہوتے جو شہروں میں میسر ہوسکتے ہیں۔وہاں ایک بی بی نے مجھ سے بیعت کی درخواست کی تو ایک دوسری عورت اس سے کہتی ہے کہ تو ان سے مرید نہ ہو' یہ تو بیوی کو ساتھ ساتھ لئے پھرتے ہیں' ہمارے پیر صاحب سے مرید ہوجانا' انہوں نے پچاس سال سے اپنی بیوی سے بات تک نہیں کی' وہ بی بی کچھ مسائل سے واقف تھی' اس نے جواب دیا کہ جس پیر نے پچاس سال تک بیوی سے بات نہیں کی وہ تو پچاس سال تک خدا کا مجرم رہا کہ اتنے عرصہ تک بیوی کے حقوق ضائع کرتا رہا' وہ ولی کیا ہوتا وہ تو فاسق ہے۔غرض آج کل بیوی کو ساتھ رکھنا بھی دنیا میں داخل کیا جاتا ہے۔

عادات نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع

اسی طرح بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ کیسے بزرگ ہیں کہ جو ٹھنڈا پانی پیتے ہیں۔آٹھ آنہ گز کا کپڑا پہنتے ہیں' گیہوں کھاتے ہیں' جو کی روٹی نہیں کھاتے حالانکہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غذا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عادۃً کھایا ہے یا عبادۃً۔ ظاہر ہے کہ عبادۃً نہیں کھایا۔ پھر عادت نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع شرعاً واجب نہیں نہ ان کے ترک میں کوئی گناہ ہے۔ عادات میں مزاج وغیرہ کے لحاظ کرنے کا اختیار رہے۔ بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض عادات ایسی ہیں جن کی ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لیے شریعت نے عادات نبویہ کا اتباع واجب نہیں کیا' ہاں اگر کسی کو ہمت ہو اور عادات پر عمل کرنا بھی نصیب ہو جائے تو اس کی فضیلت میں شک نہیں مگر اس کو دوسروں پر طعن کرنے کا بھی حق نہیں۔

جو کی روٹی پر مجھے قصہ یاد آیا کہ ایک مرتبہ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بھائی آج سے سنت کے موافق جو کی روٹی کھایا کریں گے۔ چنانچہ جو کا آٹا پسوایا گیا اور اس کو چھلنی میں نہیں چھانا گیا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آٹے میں پھونک مار دیا کرتے تھے' جتنی بھوسی پھونک مارنے سے اڑ گئی وہ اڑ گئی' باقی کو گوندھ لیتے تھے۔ خواجہ صاحب نے بھی ایسا ہی کیا' اب جو وہ روٹی کھائی گئی تو سب کے پیٹ میں درد ہو گیا۔

اب ان کا ادب دیکھئے کہ یہ نہیں فرمایا کہ سنت کے اتباع سے ایسا ہوا بلکہ یہ فرمایا بھائی ہماری غلطی تھی جو ہم نے برابری کا دعویٰ کیا اور اپنے کو اس سنت کے قابل سمجھا' ہم اس کے قابل نہ تھے اس لیے ہم کو تکلیف ہو گئی۔ بس اس سنت پر وہی عمل کر سکتا ہے جو اس درجہ کا ہو' ہم اس درجہ کے نہیں ہیں۔ سبحان اللہ! ادب اسے کہتے ہیں۔

نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ آپ زمین پر سویا کرتے تھے۔ اب آج کل طبائع ایسی ہیں کہ وہ زمین پر نہیں سو سکتے۔ نیز بعض لوگ ایسے ہیں جو زیتون کا تیل اور چربی نہیں کھا سکتے۔ اس سے ان کو تکلیف ہوتی ہے تو ان سنتوں کا اتباع ضروری نہیں کیونکہ یہ سنن عادیہ ہیں اور عادات میں ہر شخص کو اپنے مزاج کی رعایت کا شرعاً اختیار ہے۔ اسی طرح ملازمت اور کھیتی کر کے دنیا طلب کرنا حرام نہیں۔ چنانچہ آیت میں "بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا" (مگر اے منکرو تم آخرت کا سامان نہیں کرتے بلکہ) تم دنیوی زندگی کو مقدم رکھتے ہو۔ (الاعلیٰ:۱۶) فرمانا اور بل تطلبون وغیرہ نہ فرمانا اس کی دلیل ہے اس کے علاوہ احادیث وافعال صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ان اعمال کا جواز بخوبی ثابت ہے۔

شیوخ کاملین کی حالت

شیوخ کاملین کی حالت یہی ہے کہ وہ ضعفاء کو قطع تعلقات مباحہ کا امر نہیں فرماتے۔

ملازمت اور تجارت وزراعت کی بے تکلف اجازت دیتے ہیں۔ عمدہ غذاؤں کے کھانے سے منع نہیں کرتے' نہ زیادہ سونے سے روکتے ہیں' نہ بیوی بچوں کے ساتھ ہنسی دلگی کرنے سے منع کرتے ہیں' نہ کم کھانے کا حکم دیتے ہیں بلکہ وہ ہر شخص کی حالت کے موافق علاج کرتے ہیں جس کو دیکھتے ہیں کہ اسے کم کھانے سے ضرر نہ ہوگا اسے تقلیل غذا کا اعتدال کے ساتھ امر کرتے ہیں اور جس کو دیکھتے ہیں کہ خود ہی کمزور ہے اگر غذا کم کرے گا تو وہ اور زیادہ کمزور ہو جائے گا اسے بجائے تقلیل غذا کے مقویات اور دودھ گھی کھانے کا حکم دیتے ہیں۔

وہ شیخ اناڑی ہے جو سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکے۔ بعض مشائخ لکیر کے فقیر ہوتے ہیں کہ ان کے پاس جو آتا ہے اسے تقلیل غذا اور تقلیل نوم وغیرہ کی تاکید کرتے ہیں چاہے کسی کا دماغ ہی خشک ہو جائے۔ مولانا ایسے ہی مشائخ کو فرماتے ہیں:

چار پارا قدر طاقت بار نہ بر ضعیفاں قدر ہمت کار نہ
طفل راگر ناں دہی برجائے شیر طفل مسکین راازاں ناں مردہ گیر

''چوپایوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ مت لادو' اسی طرح کمزوروں پر ان کی ہمت سے زیادہ کام نہ ڈالو یعنی ورد وظائف نہ بتلاؤ۔''

یعنی بچوں کو اگر تم بجائے دودھ کے روٹی کھلانے لگو تو وہ بیچارہ تو چار دن میں ہلاک ہو جائے گا۔ پس ہر شخص کو اس کے تحمل کے موافق کام بتلانا چاہیے۔ یہ نہیں کہ ہر شخص کو ملازمت چھوڑا کر پہلے ہی دن تارک بنانا شروع کردو۔ عارف شیرازی ایسے ہی اناڑی شیوخ کو لتاڑتے ہیں:

خستگاں راچوں طلب باشد ہمت نبود گرتو بیدادکنی شرط مروت نبود

''کمزوروں کو جب طلب ہو اور قوت نہ ہو تو ان کی قوت سے زیادہ کام لینا ظلم کرنا ہے جو شرط مروت کے خلاف ہے۔''

لوگ دیوان حافظ کو معمولی کتاب سمجھتے ہیں حالانکہ اس میں تمام تر سلوک ہی سلوک بھرا ہوا ہے اور یہ محض اعتقادی بات نہیں ورنہ تم کسی اور کتاب سے تو اتنے مسائل تصوف سلوک کے نکال دو جو واقع میں تصوف کی کتاب نہ ہو۔ بات یہ ہے کہ مضمون نکلتا اسی جگہ سے ہے جہاں پہلے سے ہوتا ہے۔ آخر دوسرے دیوان بھی تو ایسے موجود ہیں جن میں دیوان حافظ کا اتباع کیا گیا ہے مگر ان میں سے اتنے مسائل نہیں نکل سکتے کیونکہ وہاں پہلے ہی سے کچھ نہیں۔ غرض عارف شیرازی فرماتے ہیں کہ جن ضعفاء کو طلب ہو مگر ہمت نہ ہو ان کو ان کی ہمت کے موافق کام بتلانا چاہیے'

ہمت سے زیادہ ان سے کام لینا ظلم اور بے مروتی ہے۔

میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جن کو آج کل کم کھانے سے نقصان ہوا۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ کے ایک مرید کم کھایا کرتے تھے' مولانا نے ان کو منع کیا اور فرمایا کہ دماغ خشک ہوجائے گا اور یہ حدیث پڑھی "**المومن القوی خیر من المومن الضعیف**"[1] کہ مسلمان قوی اور مضبوط کمزور سے بہتر ہے کیونکہ تندرست قوی آدمی دوسروں کی بھی خدمت کر سکتا ہے اور کمزور خود دوسروں پر بار ہوتا ہے تو خواہ مخواہ غذا کم کر کے اپنے کو ضعیف بنانا اچھا نہیں اور متقدمین سے جو ایسے مجاہدات منقول ہیں تو ان کے قوی پہلے سے اچھے ہوتے تھے' پھر غذا کم کرنے سے ان کو ضرر اور ضعف نہ ہوتا تھا' وہ مجاہدات کے بعد اتنا کام کرتے تھے کہ ہم تندرستی کی حالت میں اس کا دسواں حصہ بھی نہیں کر سکتے۔ پھر ان مرید صاحب نے مولانا کی ایک نہ سنی اور غذا کم ہی کرتے رہے' پھر ان کو کچھ عربی عبارتیں نورانی حروف میں نظر آنے لگیں۔ مولانا سے بیان کیا وہ اپنے دل میں سمجھتے تھے کہ بس مجھے کشف ہونے لگا اور میں بڑے درجہ میں پہنچ گیا۔ مولانا نے سن کر فرمایا: جنون کا مقدمہ شروع ہو گیا۔ تقلیل غذا موقوف کر دو' دودھ گھی خوب کھاؤ اور طبیب سے دماغ کراؤ ورنہ چند دن میں پاگل ہو جاؤ گے مگر وہ اب بھی باز نہ آئے۔ چنانچہ چند روز کے بعد ان کو جنون ہو گیا' ننگے بیٹھے رہا کرتے اور ذکر کی بجائے گالیاں بکا کرتے۔

اطباء کا طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص کے ساتھ جدا معاملہ اس کے مناسب کرتے ہیں تو شیوخ کاملین بھلا ایسا کیوں نہ کریں گے۔ اگر فہم ہو تو ان کے پاس رہ کر عامی آدمی بھی اس تفصیل کو سمجھ سکتا ہے۔ چنانچہ ایک شیخ کے پاس ایک مرید رہتا تھا جس کی غذا سب سے زیادہ تھی۔ دوسرے مریدوں نے شکایت کی کہ فلاں مرید بہت کھاتا ہے' شیخ نے اس کو بلایا اور فرمایا کہ بھائی' سالک کو تقلیل غذا اختیار کرنی چاہیے نہ بہت کھانا چاہیے بلکہ اعتدال سے کھانا چاہیے۔ اس نے کہا حضرت! ہر ایک کا اعتدال جدا ہے آپ نے پہلے میری غذا تو دریافت فرمائی ہوتی اس کے بعد معلوم ہوگا کہ میرا اعتدال وہی ہے جو میں نے اختیار کیا کیونکہ میں یہاں آنے سے پہلے پچیس روٹیاں کھایا کرتا تھا' اب پندرہ کھاتا ہوں تو اعتدال ہوا یا اعتدال سے زیادہ اور جو لوگ خانقاہ میں پانچ روٹیاں کھاتے ہیں ان کی غذا پہلے سات آٹھ روٹیاں کی تھی تو ان کا یہی اعتدال ہے کہ وہ پانچ کھائیں۔ شیخ نے فرمایا کہ واقعی تم سچ کہتے ہو۔ بس اس سے کم مت کرنا اور مریدوں سے فرمادیا

---

[1] (حلیة الأولیاء لأبی نعیم ١٠: ٢٩٦' کشف الخفاء للعجلونی ٢: ٢٢٠' الأسماء والصفات للبیهقی: ١٥٩)

کہ بھائی وہ زیادہ نہیں کھاتا اپنی خوراک سے بہت کم کھاتا ہے۔

تو دیکھئے کہ صحبت کی برکت سے اس عامی کو خود معلوم ہوگیا کہ ہر ایک کا اعتدال جدا ہے، مجھے اپنی غذا اتنی نہ کم کرنی چاہیے جتنی اور لوگوں کی ہے۔ الغرض شریعت نے تمتع دنیا سے منع نہیں فرمایا بلکہ ترجیح دنیا علی الآخرت سے منع کیا ہے۔ پس دنیا کو بقدر ضرورت حاصل کرنا خواہ تجارت سے ہو یا ملازمت سے یہ حرام نہیں۔ ہاں! دین کو برباد کرکے دنیا کمانا حرام ہے۔

ارادہ دنیا کی قسمیں

اس جگہ شاید طلبہ کو ایک اشکال ہوگا۔ وہ یہ کہ قرآن میں تو ارادہ دنیا کی مطلقاً مذمت وارد ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيْهَا مَانَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا. (بنی اسرائیل نمبر۱۸)

ترجمہ: ''جو شخص دنیا (کے نفع) کی نیت رکھے گا ہم ایسے شخص کو دنیا میں جتنا چاہیں گے جس کے واسطے چاہیں گے فی الحال ہی دیدیں گے پھر اس کے لیے جہنم تجویز کریں گے وہ اس میں بدحال راندہ (درگاہ) ہوکر داخل ہوگا۔''

ایک اور جگہ ہے: **وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَالَهُ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ.** (وامثالهامن الأيات). (الشوریٰ آیت نمبر۲۰)

''اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو تو ہم اس کو کچھ دنیا (اگر چاہیں) دے دیں گے اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔''

سو ان آیات میں اردۂ دنیا پر بھی وعید وارد ہے۔ طلب اور سعی تو ارادہ سے بھی آگے ہے۔ وہ توجہ بدرجہ اولیٰ مذموم ہوگی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ''القرآن يفسر بعضه بعضاً'' پس دیگر نصوص کے ملانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ مطلق ارادہ پر وعید کا ترتب نہیں ورنہ پھر ''اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا'' کے کیا معنی ہوں گے۔ اگر ارادہ دنیا مطلقاً مذموم ہے تو بیع و شرا کی اجازت کیوں ہے اور شریعت نے کھیتی پر عشر وغیرہ کیوں واجب کیا۔ اموال میں اور جانوروں میں زکوٰۃ کیوں مقرر کی کیونکہ جب دنیا رکھنا ہی جائز نہ ہوگا تو ان حقوق کے وجوب کی نوبت ہی کہاں آئے گی بلکہ اس تقریر پر تو صاف یہ کہہ دیا جاتا تھا تجارت بھی ممنوع ہے اور زیادہ مال جمع کرنا اور بہت سے جانور

پالنا بھی حرام ہے۔ حالانکہ نصوص میں زراعت وتجارت اور زیادہ جمع مال کی کوئی ممانعت نہیں۔ ہاں ممانعت کے بجائے ان کے لیے احکام زکوٰۃ وغیرہ مشروع ہیں۔

پس دیگر نصوص کے ملانے سے ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ "من کان یرید محض العاجلة" کہ جو شخص صرف دنیا کا ارادہ کرے اس کے لیے یہ وعید ہے۔ یعنی ارادہ دنیا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو دنیا محض کا ارادہ کرنا کہ اس کے ساتھ آخرت کا ارادہ بالکل نہ ہو۔ یہ مذموم ہے اور موجب وعید۔ دوسرے دنیا کا ارادہ کرنا آخرت کے لیے کہ تجارت وزراعت وملازمت بطریق حلال اس لیے کرتا ہے تاکہ اس کے ذریعے سے اہل حقوق کے حقوق ادا کرے اور اطمینان سے آخرت کے کام بجالائے۔ اس صورت میں اصل ارادہ آخرت ہے اور دنیا کا ارادہ اس کے تابع ہے۔ اس کی مذمت نہیں یہ موجب وعید ہے بلکہ یہ ارادہ تو ایک درجہ میں فرض ہے جس کو یہ حدیث بیان کرتی ہے۔

"طلب الحلال فریضة بعد الفریضة"[1]

اگر ارادہ دنیا مطلقاً مذموم ہوتا تو قرآن میں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی طرف سے اس کو منسوب نہ کیا جاتا حالانکہ غزوہ احد میں جب مسلمانوں کو شکست ہوئی تو حق تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو اس کے سبب پر متنبہ فرماتے ہوئے بتلایا کہ یہ شکست اس لیے ہوئی کہ ایک جماعت نے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے درہ کوہ پر متعین فرما کر یہ حکم دیا تھا کہ تم یہاں سے نہ ہٹنا خواہ ہم غالب ہوں یا مغلوب۔ اس حکم کی مخالفت کی اور مسلمانوں کو غالب اور کفار کو بھاگتے ہوئے دیکھ کر درہ کوہ پر ٹھہرنے کی ضرورت نہ سمجھی اور غنیمت کا مال لوٹنے میں مشغول ہو گئے۔ اس کے متعلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ. (آل عمران آیت نمبر ۱۵۳)

کہ تم میں سے (یعنی صحابہ میں سے) بعض دنیا کا قصد کرتے تھے اور بعض آخرت کا قصد کرتے تھے اس میں صحابہ کی طرف ارادہ دنیا کی طرف نسبت کی گئی ہے اور جو شخص صحابہ کے فضائل ومقامات سے واقف ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ ارادہ مذمومہ کی نسبت صحابہ کی طرف دشوار ہے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم محض دنیا کا ارادہ کبھی نہیں کر سکتے۔ پھر یہاں کیا مطلب ہے۔ ابن عطاء نے اس

[1] (المعجم الکبیر للطبرانی ۱۰: ۹۰، کنز العمال: ۹۲۰۳) (رواہ البیہقی والطبرانی والدیلمی عن ابن مسعود و انس وابن عباس ان السخا وبعضها یوکد بعضا لاسیما و شواھد، کثرۃ ۱۵، مقاصد حسنہ ص ۱۴۸ جامع ۱۲)

کی تفسیر بیان کی ہے: یعنی

منكم من يريد الدنيا للأخرة ومنكم من يريد الاخرة الصرفه.

کہ تم میں سے بعضے دنیا کا آخرت کے لیے ارادہ کرتے تھے اور بعض محض آخرت کا قصد کرتے تھے۔ اس پر یہ سوال ہوگا کہ جب صحابہؓ کا ارادہ دنیا آخرت کے لیے تھا تو وہ مذموم نہ تھا۔ پھر اس کو شکست کا سبب کیوں بنایا گیا؟

جواب یہ ہے کہ ارادہ فی نفسہ مذموم نہ تھا لیکن غلطی اجتہادی سے مفضی ہوگیا تھا مخالفت حکم رسول کی طرف' اس لیے عتاب ہوا۔

اب مسئلہ بالکل منقح ہوگیا کہ مذمت ارادۃ الدنیا للدنیا کی ہے ارادۃ الدنیا للآخرت مذموم نہیں۔ پس نوکری اور زمینداری وتجارت سے کسی کو منع نہیں کیا جاتا ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ اتنی بات دیکھ لو کہ دین تو برباد نہیں ہوتا۔

لفظ دنیا کا نکتہ

آگے حق تعالیٰ ہماری اس غلطی کا منشاء بتلاتے ہیں کہ ہم جو دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اس کا منشاء کیا ہے۔ حق تعالیٰ نے لفظ دنیا ہی میں اس منشاء کی طرف اشارہ فرمادیا ہے کیونکہ لفظ دنیا دنو سے مشتق ہے جس کے معنی قرب کے ہیں یعنی دنیا کے منافع چونکہ عاجل اور قریب ہے اور بالفعل حاصل ہونے والے ہیں اس لیے تم آخرت پر ترجیح دیتے ہو۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ دنیا کی لذتیں ہم کو اس وقت حاصل ہیں خواہ وہ لذات مباحہ ہوں یا افعال معصیت ہوں۔ اسی وجہ سے لوگ ان کی طرف متوجہ ہیں اور آخرت کی لذتیں و نعمتیں ادھار ہیں اس لیے ان کی طرف وہ کشش نہیں جو دنیا کی طرف ہے۔ چنانچہ ایک آزاد شاعر کہتا ہے:

اب تو آرام سے گزرتی ہے   عاقبت کی خبر خدا جانے

یہ عذر تھا طالبان دنیا کا۔ حق تعالیٰ نے لفظ دنیا میں اس کو بھی بیان فرمادیا۔ کیا رحمت ہے کہ ہمارا عذر بھی ساتھ ساتھ بیان فرمادیا اور یہ قرآن کی کتنی بڑی بلاغت ہے کہ اس کا کوئی لفظ زائد و بیکار نہیں۔ بہت لوگوں کا اس جگہ لفظ دنیا اختیار کرنے کا طریقہ سمجھ میں نہ آیا ہوگا۔ وہ اس کو زائد سمجھتے ہوں گے مگر زائد نہیں بلکہ اس میں ہمارے عذر کی طرف اشارہ ہے۔ علماء نے ایسا ہی نکتہ سورہ عبس میں "اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى" کے متعلق بیان کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں کفار قریش کے بڑے بڑے

سردار جمع تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو تبلیغ فرما رہے تھے کہ اتنے میں ایک نابینا صحابی عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ حاضر ہوئے اور انہوں نے پکار کر کہا "**یا رسول اللہ علمنی مما علمک اللہ**" [1] کہ مجھ کو بھی وہ باتیں بتلا دیجئے جو خدا تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلائی ہیں۔ اس موقع پر ان صحابی کا سوال کرنا کسی قدر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گراں گزرا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال ہوا کہ اصول کی تعلیم مقدم ہے فروع کی تعلیم پر پھر یہ تو ہر وقت کے ہیں۔ یہ سرداران قریش اتفاق سے آ گئے ہیں ایسا نہ ہو کہ یہ موقع تبلیغ کا جاتا رہے اور ان کی تبلیغ صحابی کی تعلیم سے زیادہ ضروری ہے کیونکہ وہ صحابی تو ایمان لا چکے ہیں۔ دوسرے وقت بھی احکام دریافت کر سکتے ہیں اور یہ لوگ کافر ہیں جن کو میرے پاس آنے کی طلب نہیں اس وقت اتفاق سے آ گئے تو شاید ان کو تبلیغ احکام سے ہدایت ہو جائے۔ اس خیال کی وجہ سے صحابی کے سوال پر قدرے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گرانی ہوئی اور چہرہ پر بھی عبوس کا اثر ظاہر ہوا کہ فوراً حق تعالیٰ کی طرف سے محبت آمیز عتاب نازل ہوا "عَبَسَ وَتَوَلّٰیٓ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی" (سورہ عبس آیت نمبر۱، ۲) یعنی "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور وہ اعراض کرنے لگے۔ اس وجہ سے کہ ان کے پاس ایک اندھا آ پہنچا۔"

تو علماء نے لکھا ہے کہ لفظ اعمیٰ میں حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عذر بیان فرمایا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمانہ سے یہ بات بہت بعید ہے کہ کسی کے آنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی پر بل پڑیں کیونکہ آنے والے کی اس سے دل شکنی ہوتی ہے مگر وہ صحابیؓ چونکہ نابینا تھے جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عبوس کی اطلاع نہ ہو سکتی تھی اس لیے اس موقع پر عبوس کا اثر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی پر ظاہر ہو گیا کیونکہ اس سے ان کی دل شکنی نہیں ہوئی۔ اگر وہ بینا ہوتے تو ہرگز آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر عبوس کا اثر ظاہر نہ ہوتا۔

رہا یہ سوال کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عذر تھا تو حق تعالیٰ نے عتاب کیوں فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی شان ہے۔ حق تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کے اخلاق اعلیٰ درجہ کے کامل ہوں۔ پس گو اس جگہ بوجہ ایک عارض کے ان صحابی کی دل شکنی نہ ہوئی لیکن وہ فعل تو ایسا تھا کہ اگر صحابی کو اس کی اطلاع ہو جاتی تو ان کی دل شکنی ہوتی۔ پس ایسا فعل کبھی نہ کیا جائے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے والوں کے لیے دل شکنی کا سبب کسی درجہ میں بھی ہو سکتا ہے۔ سبحان اللہ! کیا پاکیزہ تعلیم ہے۔

---

[1] (تفسیر القرطبی ۱۹ : ۲۱۳)

آج کل لوگ اس کو اخلاص سمجھتے ہیں کہ لوگوں کے سامنے ناگواری ظاہر نہ کریں اور اگر اس کا اطمینان ہو جائے کہ دوسرے کو ہماری ناگواری معلوم نہیں ہو سکتی تو پھر اس کی رعایت نہیں کرتے۔ حق تعالیٰ نے اس پر متنبہ فرمادیا کہ یہ بات کمال اخلاق کے منافی ہے۔

اب ایک سوال یہ باقی رہا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے اہم کام میں مشغول تھے جو ان صحابی کی تعلیم سے مقدم تھا تو ان صحابی کا اس اہم کام میں مخل ہونا ضرور موجب گرانی تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان ناگواری میں مصیب تھے۔ پھر عتاب آپ پر کیوں ہوا؟ ان صحابی پر ہونا چاہیے تھا کہ یہ ایسے ناوقت کیوں آئے؟

جواب یہ ہے کہ لفظ اعمیٰ میں ان صحابی کا عذر بھی مذکور ہے کہ وہ بوجہ نابینا ہونے کے معذور تھے ان کو یہ خبر نہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت کسی کام میں مشغول ہیں اور دوسرا جواب حق تعالیٰ نے آگے بیان فرمایا ہے: "اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی وَمَا عَلَیْکَ اَلَّا یَزَّکّٰی" جس کا حاصل یہ ہے کہ جن کفار کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ فرما رہے تھے وہ طالب نہ تھے۔ محض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دل چاہتا تھا کہ وہ ایمان لے آئیں لیکن وہ خود حق سے اعراض کرتے تھے اور صحابی طالب حق تھے۔ اس صورت میں کفار کی اصلاح موہوم اور صحابی کی اصلاح متیقن تھی تو آپ نے اصلاح موہوم کا اس درجہ اہتمام کیوں فرمایا کہ اس وقت طالب حق کا آنا گراں ہونے لگا۔ اگر ان غریبوں کے آنے سے وہ چلے جاتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جوتی سے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان کے ساتھ استغناء کا برتاؤ کرنا چاہیے تھے اور صحابی کی تعلیم میں مشغول ہو جانا چاہیے تھا جس کی اصلاح یقینی تھی۔

پس یہاں سے یہ مسئلہ بتلا دیا گیا کہ منفعت موہومہ پر منفعت متیقنہ کو مقدم کرنا چاہیے چنانچہ حق تعالیٰ نے ابن ام مکتوم کی اصلاح میں ذرا سی تاخیر کرنے پر عتاب فرمایا ہے حالانکہ اس تاخیر سے وہ فوت نہ ہوئی جاتی تھی۔ پس تعلیم اصول کی تقدیم اس وقت ہے جب نفع کے مظنون اور متیقن ہونے میں دونوں مساوی ہوں ورنہ متیقن مقدم ہوگا مظنون پر۔

لیکن آج کل عام طور پر مسلمان اس کے خلاف کر رہے ہیں کہ ایک موہوم دنیوی منفعت کے لیے اپنے ان منافع دینیہ کو برباد کر رہے ہیں جو اس وقت ان کو حاصل ہیں۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ حق تعالیٰ نے لفظ دنیا میں ہمارا عذر بیان فرمایا ہے کہ لو ہم تمہارے عذر کو بھی بیان کیے دیتے ہیں کہ تم دنیا کو اس وجہ سے مقدمہ کرتے ہو کہ اس کے منافع قریب اور عاجل ہیں لیکن اس کا جواب بھی سن لو۔

آخرت کی صفات

"وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی" اس میں جواب یہ ہے کہ اس عذر کا جس سے اس کا غلط ہونا معلوم ہوگیا۔ حاصل جواب کا یہ ہے کہ کسی منفعت کا محض عاجل ہونا اس کی ترجیح کے لیے کافی نہیں بلکہ ترجیح کے اور اسباب بھی ہوتے ہیں۔ سو دنیا میں ہر چند یہ صفت ہے کہ وہ عاجل ہے مگر آخرت میں اس کے مقابل دو صفتیں ہیں۔ ایک خیریت دوسرے بقاء یعنی دنیا سے آخرت عمدہ اور کثیر بھی ہے اور پائیدار رہنے والی بھی ہے۔ دنیا میں نہ وہ عمدگی اور زیادت ہے اور نہ وہ پائیداری ہے اور ان دونوں میں سے ہر صفت ایسی ہے کہ اس کے مقابل وصف عاجل کو ہرگز کوئی ترجیح نہیں دیتا کیونکہ اگر عاجل ہونا ہمیشہ موجب ترجیح ہوتو پھر تجارت کبھی نہ ہوسکے کیونکہ اس میں سرمایا عاجلہ کو اس وقت لگانا پڑتا ہے اور نفع زائد آجل ہے لیکن تمام عقلاء اس وجہ سے تجارت کو موقوف نہیں کرتے کہ اس کا نفع بعد میں حاصل ہوتا ہے اور سرمایہ اس وقت موجود ہے بلکہ سب لوگ خوشی کے ساتھ موجودہ سرمایہ کو تجارت میں لگا دیتے ہیں محض اس امید پر کہ آئندہ نفع زائد ملے گا۔ معلوم ہوا کہ زیادت و کثرت کے مقابلہ میں وصف عاجل نظر انداز کردیا جاتا ہے۔ پھر تم آخرت پر دنیا کو اس وجہ سے کیوں مقدم کرتے ہو کہ وہ عاجل ہے اور آخرت آجل ہے۔ تم نے یہ بھی سوچا کہ آخرت دنیا سے کتنی زیادہ اور عمدہ ہے۔

اسی طرح زراعت بھی دنیا میں نہ ہوسکتی کیونکہ اس میں بھی موجودہ غلہ کو آئندہ کی امید پر مٹی میں ملادیا جاتا ہے۔ اگر تم منفعت عاجلہ کے ایسے ہی عاشق ہوتو بس زراعت کو بھی جواب دے دو۔ مگر تم ایسا نہیں کرتے بلکہ ہر سال زراعت کرتے ہو کیونکہ اس میں زیادہ ملنے کی امید ہے۔ پھر آخرت کے مقابلہ میں دنیا کے اس وصف کو کیوں دیکھتے ہو کہ وہ عاجل ہے اور یہ آجل ہے۔ ارے! وہ آجل ایسی ہے کہ اس کے سامنے دنیا کسی بھی قابل نہیں۔

اور دوسری صفت آخرت میں یہ ہے کہ وہ ابقیٰ ہے، بہت پائیدار ہے اور پائیداری بھی خود ایسا وصف ہے کہ اس کے مقابلہ میں وصف عجلت کوئی چیز نہیں۔ چنانچہ دنیا میں اس کی صدہا نظیریں ہیں۔ ایک شخص آپ کو مکان دینا چاہتا ہے مگر اس کے پاس دو مکان ہیں ایک تو کچا بنا ہوا ہے اور چھوٹا بھی ہے اور دوسرا پختہ اور عالیشان ہے اور وسیع بھی ہے۔ وہ آپ سے کہتا ہے کہ اگر تم پختہ مکان لینا چاہتے ہوتو میں یہ بھی دے سکتا ہوں۔ مگر چار سال کے بعد یہ واپس لے لیا جائے گا اور اگر کچا مکان لینا چاہو تو وہ ہمیشہ کے لیے تمہاری ملک کردوں گا۔ اب بتلایئے آپ کیا کریں گے؟ یقیناً ہر عاقل یہی کہے گا کہ بھائی اس عالیشان محل سے جو عاریتہً ملتا ہو وہ کچا مکان اچھا جو دوامًا ملک ہو۔

مگر افسوس! تم دنیا و آخرت کے معاملہ میں اس فیصلہ کو نظر انداز کرتے ہو کہ آخرت کو جو دوامی ہے دنیا کے لیے چھوڑتے ہو جو چندروزہ ہے۔ انسان کی حیات ہی کیا ہے؟ بعضے لوگ رات کو اچھے خاصے سوئے اور صبح کو مرے ہوئے پائے گئے۔

اس ناپائیدار مردار کے لیے تم اپنا اصلی وطن برباد کرتے ہو جو ہمیشہ کے لیے حق تعالیٰ تمہارے نام کرنا چاہتے ہوں۔ پھر مزہ یہ کہ یہاں پر معاملہ برعکس ہے کہ دنیائے عاجل عالیشان خوبصورت بھی زیادہ نہیں۔ آخرت اس سے کہیں وسیع اور کتنی ہی بڑی ہے اور نہایت خوبصورت و عالیشان ہے۔ تو یہاں تم ایک کچے ناپائیدار مکان کے لیے جو عاریۃً مل رہا ہے اور رعایت بھی سال دو سال کے لیے نہیں بلکہ ایک دو لمحہ کے لیے کیونکہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود۔ ایسے عمدہ و عالیشان محل کو چھوڑتے ہو جو دواماً تمہاری ملک کیا جاتا ہے۔

اب بتلاؤ تمہارا وہ عذر کہاں گیا کہ صاحب! دنیا تو اب مل رہی ہے اور آخرت کا معاملہ ادھار پر ہے۔ صاحبو! دنیا تم کو ایک دو لمحہ کے لیے مل رہی ہے جس میں کچھ راحت نہیں کلفت ہی کلفت ہے اور آخرت ہمیشہ کو مل رہی ہے جہاں رنج و غم کا نام نہیں جس کو دیکھ کر بے ساختہ کہو گے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۙ الَّذِیْ اَحَلَّنَا دَارَالْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ لَايَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّلَايَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ. (فاطر ۳۵)

"جس نے ہم کو اپنے فضل سے ہمیشہ رہنے کے مقام میں لا اتارا جہاں ہم کو نہ کوئی کلفت پہنچے گی اور نہ ہم کو کوئی خستگی پہنچے گی۔"

اب ایک شبہ رہ گیا۔ وہ یہ کہ طالبان دنیا شاید یوں کہیں کہ ہم جو تجارت و زراعت میں نفع آجل زائد کو عاجل پر ترجیح دیتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ تجارت و زراعت میں وہ نفع آجل چھ مہینہ یا سال بھر کے اندر مل جاتا ہے اور آخرت کا ادھار ایسا ہے کہ نہ جانے کب ملے گا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تاخیر زائد کی وجہ سے عاجل کو ترجیح اس وقت ہو سکتی ہے جب کہ مؤجل کے ملنے کا پورا یقین نہ ہو اور اگر پورا یقین ہو کہ یہ مؤجل ضرور ملے گا تو وہاں تاخیر زائد کی بناء پر عاجل کو ترجیح نہیں ہو سکتی۔

آخرت کا وقوع

اب دیکھو کہ آخرت کا وقوع محتمل ہے یا یقینی۔ فرماتے ہیں:

اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی صُحُفِ اِبْرَاهِيْمَ وَمُوْسٰی. (الاعلیٰ آیت نمبر ۱۸-۱۹)

''اور یہ مضمون صرف قرآن ہی کا دعویٰ نہیں بلکہ یہ مضمون اگلے صحیفوں میں بھی ہے یعنی ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے صحیفوں میں۔''

یعنی آخرت کا آنا ایسا یقینی ہے کہ خبر متواتر سے ثابت ہے۔ حضرت ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے وقت سے اسکی خبر ہر زمانہ میں دی جارہی ہے۔ لہٰذا یہ عذر بھی باطل ہوا اور ایک جواب میں پہلے دے چکا ہوں کہ آخرت کے آنے میں صرف تمہاری موت کی دیر ہے۔ مرنے کے بعد ہی سے تم کو آخرت کی نعمتوں کا مشاہدہ ہوجائے گا اور مرنے میں دیر کیا ہے' زندگی کا دو منٹ بھی بھروسہ نہیں لہٰذا تاخیر زائد کہنا ہی غلط ہے۔

اور ایک تیسرے جواب کی طرف اس آیت میں حضرت ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام کا نام ذکر کر کے اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ کہ اعمال آخرت کا ثمرہ سب ادھار ہی نہیں ہے بلکہ حیات دنیا میں بھی اس کے ثمرات حاصل ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم وحضرت موسیٰ علیہما السلام کے واقعات دنیا کو معلوم ہیں کہ انہوں نے آخرت کو دنیا پر ترجیح دی تھی تو خدا تعالیٰ نے ان کو دنیا میں بھی کیسی کامیابی اور فلاح و عزت وراحت عطا فرمائی کہ ان کے دشمن مغلوب ومقہور ہوئے اور وہ غالب وقاہر ہوئے۔ دشمنوں کے نام لینے والے بھی ناپید ہوگئے اور ان حضرات کے نام لینے والے اتباع وتعظیم کرنے والے ہر زمانہ میں موجود رہتے ہیں تو خیریت وبقاء آخرت کا نمونہ دنیا میں بھی اللہ کے بندوں کو عطا ہوتا ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ دنیا کی راحت وعزت بھی اسی سے حاصل ہوتی ہے کہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دی جائے۔ چنانچہ بحمداللہ ہر زمانہ میں جو لوگ آخرت کے طالب ہوئے ہیں اور اب بھی ہیں ان کو اہل دنیا سے زیادہ راحت وعزت حاصل رہی ہے اور یہی اہل دنیا کا مقصود ہے۔ سو یہ بھی اہل آخرت کو زیادہ حاصل ہے۔ اب اس مضمون پر کوئی اشکال نہیں رہا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ دنیا کو آخرت پر ترجیح نہ دو۔ اس کے بعد طلب دنیا کی بھی ممانعت نہیں بس جو کام کرو اس میں یہ دیکھ لو کہ آخرت تو برباد نہیں ہوتی۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائیں اور عمل کی توفیق ہو۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَصَلَّی اللّٰهُ عَلٰی سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ.

دارالمسعود

دنیا کو چھوڑنے کا سب کو یقین ہے مگر پھر بھی ہم نے دنیا کو دل سے لگا رکھا ہے اور اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ مرنے کے بعد انسان ایک تنگ و تاریک گڑھے میں مقید ہو جاتا ہے اور تنہا پڑا رہتا ہے۔ اس تنہائی کے تصور سے لوگوں کو وحشت ہوتی ہے حالانکہ یہ تنہائی موجب راحت ہوگی اور اس خلوت میں وہ لطف ہے کہ بخدا کسی اور چیز میں اس کے برابر لطف نہیں!!!

آخرت کی نعمتوں کے متعلق یہ وعظ ۱۶ شعبان ۱۳۳۷ھ شب یک شنبہ کو گڑھی پختہ ضلع مظفرنگر میں قریباً ۱۰۰ افراد کے مجمع میں حافظ حسن علی خان صاحب رئیس گڑھی پختہ کے صاحبزادہ مسعود علی خان کے انتقال پر اس کے والدین کی تسلی کے لیے کہا گیا جو ۲:۳۰ گھنٹہ میں ختم ہوا اور مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُوْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ. اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّۃِ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّکَ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ. (سورہ ھود آیت نمبر ۱۰۸)

ترجمہ: ’’اور رہ گئے وہ لوگ جو سعید ہیں سو وہ جنت میں ہوں گے (اور) وہ اس میں (داخل ہونے کے بعد) ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم ہیں' ہاں اگر خدا ہی کو (نکالنا) منظور ہو تو دوسری بات ہے وہ غیر منقطع عطیہ ہوگا۔‘‘

تمہید: یہ ایک آیت ہے جس میں حق تعالیٰ شانہ عم نوالہ نے اہل سعادت کا مقام و مسکن بیان فرمایا ہے اس سے پہلے ایک مضمون اجمالی مذکور ہے۔ ’’فَمِنْھُمْ شَقِیٌّ وَّسَعِیْدٌ‘‘ اور اس کے اوپر قیامت کا ذکر ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ قیامت آنے والی ہے جس میں ہر شخص کو اس کے اعمال کی جزا و سزا ملے گی۔ اس کے ضمن میں اولاً بالا جمالی یہ ارشاد ہے: ’’فَمِنْھُمْ شَقِیٌّ وَّسَعِیْدٌ‘‘ (ھود آیت نمبر ۱۰۵)

’’پھر (آگے) ان میں (یہ فرق ہوگا کہ) بعضے تو شقی (یعنی کافر) ہوں گے اور بعضے سعید (یعنی مومن)‘‘

اس وقت دو قسم کے لوگ ہوں گے۔ بعض شقی ہوں گے اور بعض سعید ہوں گے۔ اس کے بعد دونوں کی تفصیل ہے۔ ایک آیت میں ایک جزو کی تفصیل ہے یعنی اَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا الآیۃ کہ جو لوگ شقی ہیں وہ جہنم کی آگ میں چیختے پکارتے ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم رہیں گے مگر جس وقت آپ کا پروردگار چاہے کیونکہ آپ کا پروردگار جو چاہے کرتا ہے۔ اس کے بعد دوسری آیت میں دوسرے جزو کی تفصیل ہے یعنی: ’’وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا‘‘ الآیۃ کہ جو لوگ سعید و

مسعود ہیں وہ جنت میں ہمیشہ رہیں گے' جب تک آسمان وزمین قائم رہیں گے مگر جس وقت آپ کا پروردگار چاہے ان پر دائمی عطا ہوگی جو منقطع نہ کی جائے گی' یہ حاصل ترجمہ آیتوں کا ہوا۔

قبر اور روح کا تعلق

اس وقت مجھ کو اس مضمون کے اختیار کرنے سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ دنیا ہی میں تمام لذات جمع ہیں اور آخرت کے متعلق خصوصاً قبر کے متعلق یہ خیال ہے کہ وہ ہو کا میدان ہے یا خالی مکان ہی مکان ہے اور کچھ نہیں۔ چونکہ لوگوں کو نعمائے آخرت کی تفصیل معلوم نہیں اس لیے عالم کی فضا اور وسعت تو ذہن میں آتی ہے مگر وہاں کی لذات ذہن میں نہیں آتیں اور جن کو تفصیل کا علم بھی ہے ان کو چونکہ استحضار نہیں ہے اس لیے ان کے دل پر بھی وہی اثر ہے جو ناواقف کے ذہن پر ہے اور عالم آخرت کو ہو کا میدان بھی وہی لوگ سمجھتے ہیں جو ذرا واقف ہیں اور جو ناواقف ہیں۔ وہ تو یہ سمجھتے ہیں کہ عالم آخرت بہت تنگ ہے۔ قیامت کے بعد تو یہ جنت کا خیال ان کو آجاتا ہے مگر قیامت سے پہلے اور موت کے بعد تو ان کو صرف قبر کا خیال آتا ہے جو ظاہر میں ایک تنگ و تاریک گڑھا ہے۔ ناواقف لوگ اس گڑھے ہی کو قبر سمجھتے ہیں مگر جو واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ حقیقی قبر نہیں ہے بلکہ یہ تو حید کی قبر ہے' بدن کا گھر ہے۔ روح کا گھر یہ گڑھا نہیں ہے۔ گو روح کو اس سے بھی تعلق ہے مگر روح اس میں مقید نہیں ہے' تعلق اور چیز اور قید ہونا دوسری چیز ہے۔

دیکھو! آفتاب کو زمین سے تعلق تو ہے کہ تمام عالم اس سے منور ہے مگر کیا وہ زمین کے اندر مقید ہے' ہرگز نہیں وہ تو اتنا بڑا ہے کہ زمین سے صد ہا حصے زیادہ ہے۔ پس روح کو ایسا ہی سمجھو۔

کالشمس فی کبد السماء وضورھا یغشی البلاد مشارقاً مغارباً

آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک پیالہ میں یا لگن میں پانی بھر کر رکھا جائے تو اس میں آفتاب کا جسم نظر آتا ہے مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ آفتاب اس کے اندر مقید ہے' ہرگز نہیں! اسی طرح آئینہ میں آپ اپنی صورت دیکھتے ہیں تو اس وقت آئینہ سے آپ کو تعلق تو ہوتا ہے مگر کیا آپ آئینہ کے اندر مقید ہیں ہرگز نہیں' پس مرنے کے بعد روح کو جسم سے ایسا ہی تعلق ہوتا ہے جیسا آپ کو آئینہ سے تعلق ہے۔ پس یہ قبر ظاہری محض جسد کے لیے تو قید ہے مگر روح کے لیے قید نہیں ہے اور انسان کی حقیقت روح ہے نہ کہ جسد۔ اگر کوئی شخص قبر میں دفن نہ کیا جائے بلکہ بھیڑیا اس کو کھالے تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ بھیڑیے نے انسان کو کھالیا۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ بدن کو کھالیا۔

پس قبر کو انسان کے لیے قید سمجھنا غلط ہے۔ وہ صرف بدن کی قید ہے اور اعمال سیئہ سے جو قبر

میں تنگی ہوتی ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ گڑھا تنگ ہو جاتا ہے کیونکہ کوئی اس گڑھے میں دفن نہ کیا جائے تو کیا وہ اس تنگی سے بچ جائے گا بلکہ وہ تنگی اور قسم کی ہے۔ پس خوب سمجھ لو کہ روح قبر کے اندر مقید نہیں ہاں اس کو قبر سے تعلق ضرور ہے تو جو لوگ بالکل ناواقف ہیں وہ تو یہ سمجھتے ہیں کہ عالم آخرت جو موت کے بعد شروع ہوتا ہے بہت ہی تنگ ہے کیونکہ وہ اس ظاہری قبر کو روح کی قبر سمجھتے ہیں۔

آخرت سے توحش کی وجہ

اور جن کو تھوڑی سی واقفیت ہے وہ روح کو قبر میں مقید تو نہیں سمجھتے مگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ عالم آخرت ایسا ہے جیسا افریقہ کا میدان کہ بالکل ہو کا مکان ہے۔ ان کو یہ خیال ہی نہیں آتا کہ وہاں پر یہاں سے جو اچھے میوے ہیں بڑے خوشنما اور خوبصورت باغ ہیں اور بڑے عمدہ مکانات ہیں۔ ہر طرح کا سامان راحت ہے۔ اسی واسطے عام طور پر آخرت کی طرف لوگوں کو رغبت نہیں بلکہ اس سے متوحش ہیں۔ یہ خرابی ہے نعمائے آخرت کے نہ جاننے کی کیونکہ عام حالت یہ ہے کہ ان کو لذات ہی کی طرف رغبت ہوتی ہے۔ ایسی طبائع بہت کم ہیں جن کو محض قرب حق کی وجہ سے آخرت کی طرف رغبت ہو۔ عام طور پر طبائع کو لذات کی طرف رغبت ہے اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں آخرت کی لذتوں اور نعمتوں کو بیان فرمایا اور ان کو بیان کر کے فرمایا ہے:

وَفِيْ ذَالِکَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ. (المطففين آيت نمبر ۲۶)

''اور حرص کرنے والوں کو ایسی چیز کی حرص کرنا چاہیے۔''

کہ رغبت کرنے والوں کو اس میں رغبت کرنا چاہیے اور ادھر تو نصوص میں آخرت کی طرف رغبت اور دنیا سے بے رغبتی دلائی گئی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

الدنيا دار من لا دار له ولها يجمع من لا عقل له.[1]

کہ دنیا اس کا گھر ہے جس کے پاس گھر نہ ہو اور دنیا کے لیے جمع وہی کرتا ہے جس کو عقل نہ ہو۔ ادھر ہماری حالت ہے اس کے برعکس ہے کہ دنیا ہی سے رغبت ہے اور آخرت سے توحش ہے اور اس کا سبب ہے نعمائے آخرت سے ذہول۔ چنانچہ ابھی مذکور ہوا اور علاج ہوتا ہے ازالہ سبب سے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ آخرت کی نعمتوں اور لذتوں کو مستحضر رکھا جائے۔ یہی وجہ ہے اس وقت بیان کے لیے اس آیت کے اختیار کرنے کی۔ تو سنئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا. (هود آيت نمبر ۱۰۸)

---

[1] (أنظر تخريج الحديث الرقم:۷)

جو لوگ سعید ہیں وہ جنت میں ہیں۔ لغت میں جنت باغ کو کہتے ہیں۔ سبحان اللہ! کیا پاکیزہ کلام ہے کہ ایک لفظ میں تمام تفصیل بتلا دی جس کا بیان عنقریب آتا ہے ایسے ہی اس سے پہلے جو فرمایا ہے: "وَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ" کہ بدبخت لوگ آگ میں جائیں گے وہاں بھی ایک ہی لفظ بیان فرمایا ہے مگر اس میں لزوماً بھی تفصیل ذکر نہیں کی گئی۔

اس میں ایک راز ہے جو طلبہ کے سمجھنے کا ہے وہ یہ کہ خوف خود مطلوب نہیں بلکہ وہ صرف اس لیے مطلوب ہے کہ معاصی سے بچنے کا وسیلہ ہے تو اس طرز بیان میں ہم کو تعلیم کا طریقہ بتلایا گیا ہے کہ تخویف میں مبالغہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ زیادہ ڈرانے سے آدمی گھبرا جاتا اور بعض دفعہ رحمت سے مایوس ہو جاتا ہے جس سے وہ عمل سے معطل ہو جاتا ہے۔

چنانچہ کان پور میں ایک وکیل صاحب میرے ہم نام میرے پاس اس حالت میں آئے کہ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ احیاء العلوم کے باب الخوف کا مطالعہ کر کے مایوس ہو چکے تھے میں نے ان کی تسلی کی اور احیاء العلوم کا باب الخوف دیکھنے سے ان کو منع کیا۔

اسی لیے زیادہ خوف دلانے کا حکم نہیں ہے۔ حدیث میں خود تصریحاً موجود ہے:

واسئلک من خشیتک ماتحول به بینی وبین معاصیک [1]

معلوم ہوا کہ خوف کا صرف وہ درجہ مطلوب ہے جس سے معاصی میں رکاوٹ ہو جائے۔ اس سے زائد مطلوب نہیں جو مایوس کر دے۔ اسی لیے حق تعالیٰ نے یہاں لفظ نار پر اکتفا فرمایا ہے اور چونکہ نار عادۃً دیگر عقوبات کو مستلزم نہیں اس لیے اس میں دیگر عقوبات کی طرف اشارہ بھی نہیں ہوا اور رجاء و ترغیب خود مقصود ہے اس لیے اس کے مقابل اہل سعادت کے لیے تفصیل کی ضرورت تھی تا کہ ان کو آخرت کی طرف زیادہ رغبت ہو۔

نعمائے آخرت سے لاعلمی کا اثر

مگر اللہ تعالیٰ کا کلام ایسا بلیغ ہے کہ مقابلہ میں بھی ایک ہی لفظ ارشاد فرمایا ہے مگر وہ ایک لفظ ایسا ہے کہ عادۃً ذہن اس کی تفصیل کی طرف خود بخود منتقل ہو جاتا ہے کیونکہ باغ میں پھل بھی

---

[1] (لم أجده فی الموسوعة)

ہوتے ہیں' سایہ بھی ہوتا ہے' درخت اور پھول بھی ہوتے ہیں' فرحت بخش ہوا بھی ہوتی ہے پانی بھی افراط کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور مقدمہ ملالو کہ وہ باغ خدائی باغ ہے تو اس سے یہ معلوم ہوگا کہ وہ معمولی باغ نہیں ہے' دنیا میں بھی جو سلاطین وامراء کے باغ ہیں ان میں تمام سامان راحت مہیا ہوتا ہے اور عجیب وغریب چیزیں ہوتی ہیں۔ کسی بادشاہ کے باغ میں محلات وغیرہ کے علاوہ عجائب خانہ بھی ہوتا ہے کسی کے باغ میں سیرگاہیں بے نظیر ہوتی ہیں تو اب سمجھ لوکہ خدا کا باغ کیسا ہوگا خصوصاً جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف رغبت بھی دلائی ہے۔ تو یقیناً معمولی باغ نہیں بلکہ اس میں عجیب وغریب سامان ہوں گے۔

حاصل یہ ہوا کہ سعداء کو ایسا مت سمجھو کہ وہ مرنے کے بعد گئے گزرے ہوگئے بلکہ وہ ہر قسم کی راحت میں ہوں گے۔ یہ خیال صرف کفار ومنافقین کا تھا کہ مرنے کے بعد گئے گزرے ہوئے۔ پہلے مسلمانوں کا نہ یہ خیال تھا نہ حال تھا اور آج کل کے مسلمانوں کا گو یہ خیال تو نہیں سنا گیا مگر ان کے حال سے ضرور ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرنے والوں کو گیا گزرا ہوا سمجھتے ہیں کیونکہ اگر ایسا نہ سمجھتے تو اس کا کچھ اثر تو ظاہر ہوتا۔ جنت کی طرف رغبت تو ہوتی اور آخرت سے توحش تو نہ ہوتا۔ منافقین کی حالت اور اعتقاد تو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَاتَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِی الْاَرْضِ اَوْكَانُوْا غُزًّی لَّوْكَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَاقُتِلُوْا لِیَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ. (ال عمران آیت نمبر ۱۵۶)

''کہ ان کو اپنے بھائیوں اور عزیزوں کے مرنے سے حسرت ہوتی ہے کہ ہائے اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو قتل نہ ہوتے' جہاد میں چلے گئے اس لیے مر گئے' کفار اور منافقین کی یہ حالت اس لیے تھی کہ وہ دنیا ہی سب کچھ سمجھتے تھے' ان کو آخرت کو خبر ہی نہ تھی۔ اس لیے وہ مسلمانوں کو جہاد میں قتل ہونے سے بالکل گیا گزرا ہوا سمجھتے تھے۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک کیڑا پتھر میں رہ کر یہ سمجھتا ہے کہ آسمان وزمین جو کچھ ہے سب اسی پتھر کے اندر ہے۔''

چوآں کرمے کہ در سنگے نہاں است　　　زمین و آسمان وے ہماں ست

"پتھر کے اندر جو کیڑا ہے وہی اس کا زمین و آسمان ہے۔"

نیز ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بدوی کا قصہ مثنوی میں لکھا ہے کہ اس کے یہاں فاقہ اور تنگ دستی تھی۔ اس کی بیوی نے کہا کہ تو بغداد کے خلیفہ کے پاس کیوں نہیں جاتا جس کی سخاوت کا دنیا میں شور وغل ہے۔ کیا عجب ہے کہ اس کی ایک نظیر سے ہماری تنگدستی مٹ جائے۔ مرد نے کہا کہ تو نے اچھا مشورہ دیا مگر بادشاہوں کے دربار کے لائق کوئی تحفہ بھی تو ہونا چاہیے۔ بیوی نے کہا کہ آج کل کئی برس کے قحط کے سبب اطراف میں کہیں پانی نہیں مل رہا ہے مگر ہمارے تالاب میں کچھ پانی ہے، وہ عجب چیز ہے، اس سے بڑھ کر بادشاہ کے لیے کیا تحفہ ہوگا۔ بدوی نے کہا، واقعی سچ ہے، اس سے بہتر کوئی تحفہ نہیں۔ بادشاہ کو ایسا پانی نصیب نہ ہوا ہوگا۔

چنانچہ ایک گھڑے میں تالاب سے پانی بھر کر چلا اور بغداد کا رخ کیا اور راستہ بھر **رب سلم رب سلم!** کا ورد کرتا رہا کہ خدا کرے یہ گھڑا صحیح سالم پہنچ جائے۔ خدا خدا کر کے گھڑا صحیح سالم بغداد تک پہنچا اور خلیفہ کے محل تک پہنچ کر اس نے نقیبوں سے کہا کہ میں خلیفہ کے لیے ایک نایاب تحفہ لایا ہوں اور اس سے ملنا چاہتا ہوں، نقیبوں نے فوراً خلیفہ کو اطلاع دی۔ وہاں سے حکم ہوا کہ بدوی کو دربار میں حاضر کیا جائے۔ یہ دربار میں گھڑا سر پر رکھے ہوئے پہنچا۔ خلیفہ نے پوچھا: "**یاوجه العرب ماعندک**" کہ اے معزز عربی! تیرے پاس کیا تحفہ ہے؟ آپ نے یہ سنتے ہی اس کو تخت پر جا دھرا اور کہا "**هذا ماء الجنة**" یہ جنت کا پانی ہے۔ خلیفہ نے جو گھڑے کا منہ کھولا تو تمام دربار سڑ گیا کیونکہ کئی دن سے گھڑا بند تھا، اس میں گرمی کی وجہ سے تعفن پیدا ہو گیا تھا مگر اللہ رے حوصلہ اور کرم کہ خلیفہ کے چہرے سے ذرا ناگواری ظاہر نہ ہوئی۔ پھر درباریوں کی کیا مجال تھی جو کوئی ناک منہ چڑھاتا۔ خلیفہ نے بدوی کا بہت شکریہ ادا کیا اور کہا کہ واقعی تم میرے واسطے عجیب تحفہ لائے کہ اس سے بہتر کوئی تحفہ نہیں ہوسکتا۔ اس کے بعد اس کو مہمان خانہ میں بھیج دیا اور چند روز مہمان رکھ کر خلعت عطا کیا اور حکم دیا کہ اس کے گھڑے کو اشرفیوں سے بھر کر واپس کر دیا جائے اور واپسی میں اس کو دجلہ کے پاس سے نکالا جائے تاکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ خلیفہ کو اس تحفہ کی ضرورت نہ تھی۔ خود اس کے محل کے نیچے سے ایسا صاف

شفاف شیریں دریا بہہ رہا ہے۔

روبرو سلطان و کاروبار ہیں　　حسن تجری تحتہا الانہار ہیں!

''بادشاہ کے پاس جاؤ اور کاروبار دیکھو، عمدہ باغ اور اس کے نیچے نہریں جاری دیکھو''

جس وقت وہ بدوی اشرفیوں سے بھرا گھڑا لے کر دجلہ کے پاس سے گزرا ہے تو اس کی یہ حالت تھی کہ زمین میں گڑا جاتا تھا اور کہتا تھا کہ اللہ اکبر! خلیفہ نے جو کچھ میرے ہدیہ کی قدر کی یہ محض اس کا کرم تھا اور اس کے صلہ میں جو خلعت و انعام اس نے مجھے دیا ہے یہ ''فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنَاتٍ'' (الفرقان ۷۰) ''تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے (گزشتہ) گناہوں کی جگہ نیکیاں عنایت فرمائے گا۔''

صاحبو! جس طرح یہ شخص دجلہ کو دیکھ کر اپنے تالاب کے پانی کو تحفہ کہنے سے شرماتا تھا، بخدا اسی طرح جب ہم لوگ آخرت کی نعمتوں کو دیکھیں گے تو اس وقت یہاں کی لذات کو لذات کہنے سے شرمائیں گے مگر ہم کو وہاں کی نعمتوں اور لذتوں کی خبر نہیں اس لیے جب یہاں آم یا خربوزہ کھاتے ہیں تو اپنے مردہ عزیزوں کو یاد کرتے ہیں کہ ہائے! آج وہ نہ ہوا وہ بھی کھاتا، ارے واللہ! وہ تو اس وقت تمہارے خربوزہ کو نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا، کھانا تو در کنار۔

مردہ کو چیزوں کا ثواب پہنچتا ہے

بعض لوگ ہر موسم پر موسم کی چیزیں اپنے عزیزوں کے لیے خیرات کیا کرتے ہیں۔ خاص کر وہ چیزیں جن کو مرنے والے کو رغبت تھی۔ اس میں پڑھے لکھے بھی مبتلا ہیں اور وہ بہت دور پہنچے۔ انہوں نے اس عمل کے لیے ''لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ'' (آل عمران آیت نمبر ۹۲) ''(اے مسلمانو!) تم خیر کامل کو کبھی نہ حاصل کر سکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو (اللہ کی راہ) میں خرچ کرو گے۔'' سے استدلال کیا کہ انفاق محبوب شرعاً مطلوب ہے، پھر اس میں کیا حرج ہے کہ مرنے والے کا مرغوب و محبوب خیرات کیا جائے۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مما تحبون فرمایا ہے مما یحبون نہیں فرمایا۔ پس خیرات کرنے والے کو اپنا محبوب خیرات کرنا چاہیے نہ کہ مردہ کا محبوب اور راز اس میں یہ ہے کہ اصل مدار فضیلت کا اخلاص ہے اور اپنے محبوب کے

انفاق میں اخلاص زیادہ ہوتا ہے نہ کہ دوسرے کے انفاق میں، یہ تو ان کے استدلال کا جواب تھا۔

اب میں وہ دلیل بیان کرتا ہوں جس سے یہ معلوم ہوگا کہ جو چیز ہم خیرات کرتے ہیں مردوں کو وہ بعینہ نہیں پہنچتی بلکہ اس کا ثواب پہنچتا ہے۔ سنئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآءُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ. (الحج آیت نمبر ۳۷)

''اللہ کے پاس نہ تو ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون لیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔''

اس میں صاف تصریح ہے کہ قربانی کا گوشت و خون خدا کے یہاں نہیں پہنچتا بلکہ تمہارا اخلوص واخلاص پہنچتا ہے اور اسی ہی کا ثواب تم کو ملتا ہے اور وہی ثواب مردوں کو پہنچا دیا جاتا ہے جبکہ ان کی طرف سے قربانی یا کوئی اور خیرات کی جائے۔

اور اس سے آپ کو یہ بھی معلوم ہوگیا کہ محرم کے شربت میں بھی عوام کے عمل کا مبنی ہی خیال کہ شہدائے کربلا پیاسے شہید ہوئے تھے اس لیے شربت پہنچانا چاہیے کہ پیاس بجھے۔ سو اول تو یہی سمجھنا غلط ہے کہ ان کو یہ شربت پہنچتا ہے شربت ہرگز نہیں پہنچتا۔ دوسرے یہ عمل عقیدت کے بھی تو خلاف ہے۔ کیا آپ کا یہ اعتقاد ہے کہ وہ حضرات ابھی تک پیاسے ہی ہیں، کیا ان کو جنت سے ابھی شربت نہیں ملا اور اب تک پیاسے ہیں۔ یہ اعتقاد آپ ہی کو مبارک ہو، ہمارا تو یہ اعتقاد ہے کہ ان کو شہادت کے وقت ہی ان شاء اللہ تعالیٰ شراب طہور کا وہ جام مل چکا ہے جس سے پہلی بھی پیاس جاتی رہی اور آئندہ کی بھی جاتی رہی۔

اور اس اعتقاد فاسد کا ایک مفسدہ یہ ہے کہ بعض دفعہ محرم کا مہینہ سردیوں میں آتا ہے تو اس وقت بھی شربت ہی پلایا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت لوگ بیمار پڑ جاتے ہیں، کسی کو نمونیہ ہو جاتا ہے، خدا بچائے ایسی پابندی رسم سے اور غور کر کے دیکھا جاتا ہے کہ رسوم کی پابندی ہمیشہ بے سوچے سمجھے ہی ہوتی ہے۔

چنانچہ شادی سے پہلے دلہن کو مائیوں بٹھلانا واجب سمجھتے ہیں کہ اس کا ایک کوٹھڑی میں بند کر کے بٹھلا دیا جائے جہاں اس کو خاموش رہنے اور بھوکا رہنے کی تعلیم دی جاتی ہے تاکہ شادی کے

بعد منہ پر ہاتھ رکھنا اور خاموش رہنا دشوار نہ ہو مگر میں کہتا ہوں کہ شعر و گفتن چہ ضرور؟ شادی کے بعد ہی منہ پر ہاتھ رکھنے اور خاموش رہنے کی کیا ضرورت ہے، وہی پابندی رسم اور کچھ نہیں۔

اس پابندی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ بعض دفعہ گرمی کے زمانہ میں شادی ہوتی ہے اور لڑکی کو مائیوں بٹھلاتے ہیں تو اس کے دماغ پر گرمی چڑھ جاتی ہے۔ اب عورتیں یہ تو نہ کہیں گی کہ مائیوں بٹھلانے سے دماغ کو گرمی چڑھ گئی بلکہ یہ کہیں گی کہ آسیب آ گیا۔ میں کہتا ہوں ہاں سچ ہے مگر خبر بھی ہے وہ آسیب کون ہے، وہ دلہن کی اماں جان ہیں جس نے اس غریب کو کال کوٹھڑی میں بند کر رکھا ہے کیونکہ شیطان دو قسم کے ہیں، شیاطین الجن وشیاطین الانس۔ مگر عورتوں کے یہاں تو آسیب بہت ستاتا ہے، بات بات میں آسیب کا خلل ہو جاتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ابتداء میں تو لڑکی کو گرمی دماغ کی وجہ سے ہذیان ہوتا ہے جب تم نے اس کو آسیب بتلایا اور آسیب کا علاج کیا تو اب بعض مقامات پر لڑکیوں کے ہاتھ بہانہ آ جاتا ہے پھر وہ ہر بات میں اپنے اوپر آسیب سوار کر لیتی ہیں، جیسے بعض مقامات میں سنا گیا کہ جہاں کوئی عورت خاوند سے ناخوش ہوئی اور اس نے اللہ بخش کا بہانہ لے لیا کہ میرے اوپر تو ماموں اللہ بخش آ گیا ہے، کوئی شوہر نادان ہوا تو عورت کے دھوکہ میں آ گیا اور عاقل ہوا تو اس کا علاج جوتے سے کر دیا جہاں دماغ پر دس جوتے لگے اور سب آسیب جاتا رہا۔

تو جس طرح مائیوں بٹھلانے کی پابندی ہے کہ نہ گرمی دیکھیں نہ سردی اسی طرح محرم کا شربت ہے، جس کا مبنی یہ خیال ہے کہ جو چیز خیرات کی جاتی ہے مردہ کو وہی پہنچتی ہے اور مردہ کی محبوب چیز خیرات کرنے کا مبنی یہ حسرت ہے کہ ہائے آج وہ ہوتا تو وہ بھی کھاتا۔ جب وہ نہیں ہے تو لاؤ خیرات ہی کر دو تا کہ اس کو پہنچ جائے۔ منشاء یہ ہے کہ ہم کو نعمائے جنت کا استحضار نہیں ہے اگر ہم کو یہ بات مستحضر ہوتی کہ بہت سی نعمائے جنت سے وہ محظوظ و مسرور ہو رہا ہے تو یہ حسرت ہرگز نہ ہوتی کیونکہ نعمائے جنت سے دنیا کی نعمتوں اور لذتوں کو کیا نسبت۔

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمائے جنت میں رمان ونخل وغیرہ کا بیان فرمایا ہے ان کو دنیا کی رمان ونخل پر قیاس نہ کیا جائے۔ نعمائے آخرت کو نعمائے دنیا

سے محض اسمی مشارکت ہے ورنہ حقیقت میں وہ اور چیزیں ہیں اور یہ اور چیزیں ہیں۔ برائے نام دونوں میں کچھ مشابہت ہے، اس کی ایسی مثال ہے جیسے راجہ محمود آباد نے وائسرائے کی دعوت میں ایک انار تیار کرایا تھا جو دو سو روپے میں تیار ہوا تھا۔ اس کی صورت اور نام تو انار کا تھا مگر حقیقت میں وہ اور چیز تھی۔ خود قرآن میں ارشاد ہے:

قَوَارِيْرَ مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا. (الدھر آیت نمبر ۱۶)

کہ جنت میں چاندی کے شیشے ہوں گے یعنی جن میں آئینہ کی سی شفافی اور صفائی ہوگی اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی چیزیں دنیا کی چیزوں سے صرف نام میں مشابہ ہیں ورنہ وہاں کی چاندی آئینہ کی طرح شفاف ہوگی جس میں سے نگاہ آر پار ہو جائے گی۔ دنیا کی چاندی میں یہ بات کہاں تو اب تم اس تمنا میں ہو کہ مردے یہاں ہوتے ہیں اور مردے اس تمنا میں ہیں کہ تم وہاں ہوتے۔ خدا جانے یہاں کیا رکھا ہے جس پر لوگ فریفتہ ہیں۔

زر و نقرہ چیست تا مفتوں شوی چیست صورت تا چنیں مجنوں شوی

"یہ سونا چاندی کیا ہے جس پر تو عاشق ہوا چاہتا ہے اور یہ رنگ و خون کی صورتیں کیا حقیقت رکھتی ہیں جن پر تو پاگل ہوا جاتا ہے۔"

دنیا و آخرت کی نعمتوں کی مشارکت

وہاں کی نعمتوں کو حدیث سے معلوم کرو۔ حدیث میں آتا ہے کہ حوروں کے سر پر ایسی نفیس اوڑھنیاں ہیں کہ اگر ان کا ایک پلہ دنیا میں لٹک جائے تو آسمان کے چاند و سورج ماند پڑ جائیں، وہاں کی حوریں ایسی حسین ہیں کہ ستر جوڑوں کے نیچے ان کا بدن جھلکتا ہے، جنت کی مٹی جواہرات اور مشک کی ہے حوض کوثر کے پانی کی تعریف یہ ہے:

من شرب منه شربة لا يظما بعدها ابدًا۔[1]

جس نے اس سے ایک دفعہ پانی پی لیا اس کو کبھی پیاس نہ لگے گی اور لطف یہ کہ بدون پیاس کے بھی اس کی طرف رغبت ہوگی اور اس کا لطف حاصل ہوگا، دنیا کے پانی میں پیاس کے وقت تو مزہ آتا ہے بدون پیاس کے مزا نہیں آتا، جنت کے پانی کی شان یہ ہے کہ ایک دفعہ پی کر عمر بھر کے

---

[1] (المعجم الکبیر للطبرانی ۱۰: ۹۹، اتحاف السادۃ المتقین ۱۰: ۴۹۷)

لیے پیاس کی کلفت دفع ہو جائے گی اور بدون پیاس کے اس کا مزا حاصل ہوگا۔ بتلاؤ دنیا میں ایسا پانی کہاں ہے جس سے پیاس ہی نہ لگے اور بدون پیاس کے اس سے مزا آئے۔ اسی پر تمام نعمتوں کو قیاس کرلو کہ نعمائے جنت کو دنیا کی لذتوں سے محض نام کی مشارکت ومشابہت ہے۔

اب یہ حسرت کرنا کہ ہمارے مردہ عزیز دنیا میں ہوتے اور یہاں کی نعمتوں سے متلذذ ہوتے سراسر حماقت نہیں تو اور کیا ہے' ارے ان نعمتوں کو ان کے سامنے رکھو تو شاید ان کو قے آنے لگے۔

میں نے اسی مضمون سے گنگوہ میں ایک درویش کی اصلاح کی تھی وہ حضرت حاجی صاحبؒ سے مرید تھے مگر سماع کے اور بدعات عرس وغیرہ کے عادی تھے۔ وہ گنگوہ میں آئے اور حضرت شیخ عبدالقدوس رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر پھول چڑھا کر میرے پاس آئے اور میرے گلے میں بھی پھولوں کا ہار ڈالا اور میرے پوچھنے پر کہا کہ میں ایک باغ میں گیا تھا وہاں سے یہ پھول لایا تھا۔ کچھ تو شیخ کے مزار پر چڑھائے کچھ تمہارے واسطے لایا ہوں کیونکہ تم بھی شیخ کی طرح میرے محبوب ہو۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ نے شیخ کے مزار پر جو پھول چڑھائے بڑی غلطی کی کیونکہ دو حال سے خالی نہیں یا تو شیخ کی روح کو ادراک ہے یا نہیں' اگر ادراک نہیں تو پھول چڑھانے سے کیا نفع۔

اور اگر ادراک ہے تو بتلاؤ جو شخص جنت کی شمائم وروائح وعطریات کو سونگھ رہا ہو اس کو ان پھولوں کی خوشبو سے کیا راحت پہنچ سکتی ہے بلکہ اس کو تو الٹی ایذاء ہوئی ہوگی۔ یہ بات سن کر وہ متنبہ ہوئے اور اپنی غلطی کا اعتراف کرکے آئندہ کے لیے اس سے توبہ کی۔

بس آپ اس قاعدہ کو سمجھ لیجئے کہ جنت کی نعمتوں کے سامنے یہاں کی نعمتیں کچھ بھی نہیں ہیں۔ پھر آپ کو موسمی چیزیں کھاتے ہوئے یہ حسرت نہ ہوگی کہ ہائے ہمارا فلاں عزیز بھی آج ہوتا' وہ بھی کھاتا اور اب محروم ہے۔ صاحب وہاں کی نعمتوں سے تو دنیا کی نعمتوں کو کوئی نسبت ہی نہیں۔

چنانچہ ایک فرق بھی ہے کہ یہاں کے تمام لذائذ تھوڑی دیر میں بدبودار پاخانہ میں جاتی ہیں جس کی بدبو سے دماغ پریشان ہو جاتا ہے' جنت کی نعمتوں میں فضلہ بالکل نہیں۔ جیسا چاہو کھالو' ایک ڈکار خوشبودار آجائے گی اور سارا کھانا ہضم ہو جائے گا یا خوشبودار پسینہ آجائے گا اور سارا پانی ہضم ہو جائے گا نہ وہاں پیشاب کی تکلیف ہے نہ پاخانہ کی نہ ہیضہ کا اندیشہ ہے نہ بدہضمی کا' وہاں

کی راحت میں تکلیف کا نام نہیں۔

اسی لیے بعض علماء نے لکھا ہے کہ آدم علیہ السلام کو جس درخت سے منع کیا گیا تھا وہ دنیا کا درخت تھا جو جنت میں بطور امتحان آدم علیہ السلام کے لگا دیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اس سے منع کر دیا تھا کہ اس کے کھانے سے فضلہ پیدا ہوگا اور جنت میں بم پلیس نہیں ہے جہاں فضلہ نکالا جائے۔ جب آدم علیہ السلام نے اسے کھالیا تو قضائے حاجت کا تقاضا ہوا۔ حکم ہوا کہ جنت سے نکلو دنیا میں جاؤ، بم پلیس وہاں سے جنت میں نہیں ہے تو ان کو جنت سے نکلنا قضائے حاجت کے واسطے ہوا تھا، محض عتاب کے طور پر نہیں ہوا، بھلا مقربین پر بھی کہیں محض عتاب ہوتا ہے۔

خیر یہ تو ایک لطیفہ ہے جو جنت کی غذاؤں میں فضلہ نہ ہونے پر یاد آ گیا۔ باقی اصل مضمون یہ تھا اور بالکل مضمون صحیح ہے کہ جنت کی غذا میں فضلہ بالکل نہیں تو اب ہماری یہ حسرت بالکل فضول ہے کہ ہائے ہمارا فلاں عزیز دنیا کی نعمتوں سے محروم ہے، ارے وہ تو ایسی نعمتیں کھا رہا ہے کہ تمہارے خواب میں بھی نہیں آئیں مگر ہم نے وہاں کی نعمتوں کو دیکھا نہیں اور ان کو سوچتے بھی نہیں، اس لیے دنیا کی نعمتوں پر مفتوں ہیں اور ایسے مفتوں ہیں کہ یہاں کی سڑی ہوئی چیزوں کا جنت میں ہونا چاہتے ہیں۔ چنانچہ مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خادم حقہ پیتے تھے وہ مولانا سے پوچھنے لگے کہ حضرت جنت میں حقہ پینے کے واسطے آگ بھی مل جائے گی؟ یہ بیچارے حقہ تمباکو پر ایسے مفتوں ہیں کہ جنت میں بھی حقہ کے طالب ہیں، یہ خبر نہیں کہ وہاں کی لذائذ کو دیکھ کر دنیا کی تمام لذائذ کو تم بھول جاؤ گے اور حقہ تمباکو تو کیا چیز ہے جو خود ہی واہیات ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے:

علی الاصباح کہ مردم بکارو بار روند — بلاکشان تمباکو بسوئے نار روند

''علی الصبح لوگ اپنے کاروبار پر جاتے ہیں، تمباکو کے رسیا آگ کی جانب روانہ ہوتے ہیں۔''

صبح کو پاکیزہ اور متبرک وقت دوسروں کے لیے عبادت کا وقت ہے اور حقہ والوں کو اس وقت آگ کی تلاش ہوتی ہے، یہاں تک کہ متبرک جگہ یعنی جنت میں بھی اس کو اس وقت آگ کی فکر ہے کہ ملے گی یا نہیں۔ میں حقہ پینے کو حرام تو نہیں کہتا مگر ہے بری چیز حقہ پینے والوں کو کھانے پینے

میں بھی اس کے بغیر لطف نہیں آتا اور شریف اوقات میں ان کو اسی کی دھن لگی رہتی ہے۔ پھر صورت بھی تو بری ہو جاتی ہے کہ منہ سے بھی دھواں اور ناک سے بھی دھواں اور پیٹ میں بھی دھواں جو دوزخیوں کی سی صورت ہے، پھر جنتی ہو کر دوزخیوں کی سی صورت بنانا فضول بات ہے۔

جنت کے حیرت انگیز پھل

غرض ہم نے جنت کی نعمتوں کو سوچا نہیں اسی لیے دنیا کی لذتوں پر مفتوں ہیں۔ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ جنت میں عجیب تماشا ہوگا کہ بعض دفعہ پھل سامنے لایا جائے گا، اس کو کھانے کے واسطے توڑیں گے تو اس میں سے حسین حور نکل آئے گی جس سے حیرت ہو جائے گی۔

جیسے ایک امیر کے مہمان کی حکایت سنی ہے کہ امیر صاحب کے باورچی نے ان کے سامنے کھانا رکھا جو مقدار میں بہت قلیل تھا۔ جب روٹی سالن ختم ہو گیا تو اس نے کہا کہ رکابی اور پیالہ نوش کیجئے، مہمان خفا ہونے لگے کہ گستاخی کرتا ہے ہم کو رکابی پیالہ کھانے کو کہتا ہے۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ حضور میں گستاخی نہیں کرتا، آپ اس کو توڑ کر دیکھیں تو رکابی کا پیالہ توڑا تو معلوم ہوا کہ وہ بالائی ہے، اس کو بھی کھا گئے اور بہت مزیدار معلوم ہوا، پھر اس نے کہا کہ اب دسترخوان بھی کھا لیجئے، دسترخوان کو توڑ کر کھایا تو وہ بھی ایک عجیب روٹی تھی۔

نوابوں کے یہاں تو کبھی کبھی ایسا تماشا ہوتا ہے جنت میں روزانہ ایسا ہی ہوگا۔ پس یہ خیال بالکل غلط ہے کہ مرنے کے بعد آدمی گیا گزرا ہوا ہو جاتا ہے۔ مسلمان ایسا نہیں ہوتا بلکہ وہ ایسی راحت اور لذات میں پہنچ جاتا ہے کہ دنیا کی لذتوں کی ان کے سامنے کوئی ہستی نہیں۔ اسی لیے وہ مرنے والے یہ تمنا کرتے ہیں کہ تم بھی وہیں ہوتے دنیا میں نہ ہوتے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَلَاتَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَرَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ فَرِحِيْنَ بِمَا اٰتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَايُضِيْعُ اَجْرَالْمُؤْمِنِيْنَ. (آل عمران آیت نمبر ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱)

جو لوگ اللہ کے راستہ میں (اعلاء کلمۃ اللہ) جان دے چکے ہیں ان کو مردہ نہ سمجھے بلکہ وہ

اپنے رب کے پاس زندہ ہیں۔ان کو (جنت کی) روزی دی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و انعام سے وہ بہت خوش ہیں اور جو لوگ ان کے پاس نہیں پہنچے وہ ان کے لیے بھی خوشیاں مناتے ہیں کہ (یہاں پہنچ کر) ان کو کسی قسم کا خوف اور غم نہ رہے گا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و انعام سے خوشیاں مناتے ہیں اور اس بات پر بھی خوش ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں فرماتے۔ اب بتلاؤ! تمہاری رائے صحیح ہے یا ان کی۔ یقیناً ان کی ہی رائے صحیح ہے کہ تم بھی وہیں جاؤ تو اچھا ہے۔

آخرت دنیا سے بہتر ہے

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى"

کہ تم دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت اس سے بہتر ہے اور پائیدار بھی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مردوں کی رائے صحیح ہے کہ زندوں ہی کو جنت میں پہنچنے کی تمنا کرنا چاہیے۔ پس تم مردوں کی فکر چھوڑو، اپنی فکر کرو کہ تم بھی ان سے جاملو۔ ایک مضمون کو ایک بدوی نے خوب ادا کیا ہے۔ جب حضرت عباس بن عبدالمطلب کا وصال ہو گیا تو ان کے صاحبزادہ عبداللہ بن عباس کو بہت صدمہ تھا۔ ایک بدوی نے ان کی اس طرح تسلی کی۔

اصبر نکن بک صابرین فانما   صبر الرعیة بعد صبر الراس

اے ابن عباس! صبر کیجئے کہ آپ کو دیکھ کر ہم بھی صابر ہو جائیں گے کیونکہ رعیت کا صبر سردار کے صبر کے تابع ہے۔ اس کے بعد کہتا ہے:

خیر من العباس اجرک بعدہ واللہ خیر منک للعباس

اور صبر کیوں نہ کیا جائے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ عباس جو تم سے جدا ہو گئے اس میں نہ تمہارا کچھ نقصان ہوا نہ ان کا نقصان ہوا۔ تم کو تو ان کی مفارقت پر صدمہ ہونے کا ثواب مل گیا جو تمہارے حق میں عباس کے وجود سے زیادہ بہتر ہے اور ان کو تم سے جدا ہو کر خدا مل گیا جو ان کے حق میں تم سے بہت بہتر ہے۔ واقعی خوب ہی تسلی کی۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اس بدوی سے بہتر کوئی کسی نے میری تسلی نہیں کی۔

بات یہ ہے کہ ہم کو سارا رنج وغم اس واسطے ہوتا ہے کہ آخرت ہم کو یاد نہیں۔ اگر آخرت کی راحت ولذت یاد ہوتی تو اپنے عزیزوں کا یہاں چلنا پھرنا یاد نہ کرتے اور طبعی غم الگ چیز ہے بلکہ اس کا جنت میں چلنا پھرنا یاد کرتے اور اس سے خوش ہوتے اور تمنا کرتے کہ ہم بھی وہیں ہوتے۔

دیکھو! اگر تمہارا بیٹا حیدر آباد میں جا کر وزیر ہو جائے تو تم یہ تمنا کرو گے کہ وہ حیدر آباد نہ جاتا یا یہ تمنا کرو گے کہ ہم بھی حیدر آباد پہنچ جاتے تو اچھا تھا کہ اپنی آنکھوں سے بیٹے کی عزت وشان و شوکت دیکھتے۔ یقیناً یہی تمنا کرو گے کہ تم بھی حیدر آباد پہنچ جاتے' پھر اپنے مردہ عزیزوں کے متعلق یہ تمنا کیوں ہے کہ وہ یہاں ہوتے۔ یہ تمنا کیوں نہیں کہ تم وہاں ہوتے۔

عارفین کو یہی تمنا ہے۔ وہ اسی آرزو میں ہیں کہ کسی طرح جلدی سے آخرت میں پہنچ جائیں کیونکہ ان پر آخرت کی راحت منکشف ہو چکی ہے۔ جامی فرماتے ہیں:

دلا تا کے دریں کاخ مجازی   کنی مانند طفلاں خاک بازی
توئی آں دست پرور مرغ گستاخ   کہ بودت آشیاں بیروں ازیں کاخ
چرازاں آشیاں بیگانہ گشتی   چو دونان چغد این ویرانہ گشتی

''اے دل اس مجازی مکان میں (دنیا) کب تک لڑکوں کی طرح خاک سے کھیلتا رہے گا تو ہی وہ ہاتھ کا پلا ہوا مرغ گستاخ ہے تیرا آشیانہ اس مکان سے باہر تھا اس آشیانہ سے تو کیوں بیگانہ ہو گیا' کمینوں کی طرح تو اس ویرانہ کا اُلو بنا ہوا ہے۔''

مولانا فرماتے ہیں:

بشنو از نے چوں حکایت می کند   وز جدائی ہا شکایت می کند
کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند   از نفیرم مرد وزن نالیدہ اند

''روح انسانی عالم ارواح میں محبت ومعرفت حق میں مستغرق تھی عالم اجسام (ناسوت) میں آ کر شہوت وغضب اور صفات جسمانیہ کا غلبہ ہوا' وہ صفات حمیدہ کی کمی کی شکایتیں کرنے لگیں جس کی آہ وبکا سے دیکھنو ں کا کلیجہ پھٹنے لگا اور ابنائے زمانہ اس سے متاثر ہوئے۔''

چونکہ نالہ عاشق کے سننے سے دوسروں کو بھی شوق پیدا ہوتا ہے اس لیے فرماتے ہیں کہ عشاق کا نالہ اور ان کی گفتگو سننے سے مراد عشاق عارفین ہی ہیں۔ اس میں دنیا سے بے رغبتی

اور آخرت کی طرف رغبت کا طریقہ بتلایا گیا ہے کہ عشاق الٰہی کی صحبت اختیار کرو اور ان کا نالہ جدائی سنو۔ کس کی جدائی

کز نیستاں تامرا ببریدہ اند   از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند
سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق   تا بگویم شرح درد اشتیاق

''مجھ کو عالم ارواح سے جدا کر دیا گیا ہے تو اس درجہ شورشوں میں مبتلا ہو کر سونے دیکھنے والوں کا کلیجہ پھٹ جاتا ہے' میں ایسا سینہ چاہتا ہوں جو خود کسی کے فراق سے پارہ پارہ ہوتا کہ اپنا دردِ اشتیاق کھولوں تب اس کی سمجھ میں آئے۔''

کیوں؟ اس لیے کہ

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش   باز جوید روزگار وصل خویش

''ہر شخص کا قاعدہ ہے جب اپنی اصل سے جدا ہوتا ہے تو اس زمانہ وصول کو ڈھونڈتا ہے۔''

جناب! ساری خرابی اس کی ہے کہ ہم نے دنیا کو وطن سمجھ رکھا ہے اس لیے آخرت کا اشتیاق نہیں۔ اگر آخرت کو اصلی وطن سمجھتے اور وہاں کی نعمت اور راحت مستحضر ہوتی تو اپنے عزیزوں کے وہاں جانے پر حسرت نہ ہوتی بلکہ اپنے نہ جانے پر حسرت ہوتی۔

جنت کلفت سے خالی ہے

آخرت کی راحت کیا پوچھنا' ان کی تو یہ شان ہے:

وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُوْنَ.

(حٰمٓ السجدہ آیت نمبر ۳۱)

کہ جس چیز کو دل چاہے گا اور جو درخواست کریں گے وہ بھی پوری ہوگی۔ حدیث میں آتا ہے کہ بعض لوگ کھیتی کی درخواست کریں گے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اے ابن آدم! تو بڑا حریص ہے بھلا جنت میں تجھ کو کھیتی کی کیا ضرورت ہے۔ وہ کہے گا اے رب میرا دل چاہتا ہے پس فوراً کھیتی پیدا ہو جائے گی اور اسی وقت تیار ہو کر غلہ کھیتی سے الگ ہو کر انبار لگ جائے گا۔

شاید کوئی معقولی صاحب یہاں یہ احتمال نکالیں کہ اگر کسی کا مرنے کو جی چاہے تو کیا جنت میں اسے موت بھی آئے گی؟ اس لطیفہ کا جواب تو یہ ہے کہ ایسے تم ہی ہو گے جو جنت میں مرنا چاہو اور تو کوئی ایسا ہوگا نہیں کیونکہ موت کو تو دنیا میں بھی کسی کا دل نہیں چاہتا۔ طبعاً اس سے کراہت ہے

اور اگر کسی کا دل موت کو چاہتا بھی ہے تو اس کی وجہ یا تو شدت کلفت ہے جس سے تنگ آ کر انسان موت کی تمنا کرتا ہے اور جنت کلفت سے خالی ہے یا اشتیاق لقاء اللہ ہے اور جنت میں جا کر یہ شوق پورا ہو جائے گا اور اصل جواب یہ ہے کہ جنت میں جانے کے بعد مرنے کی تمنا قلب میں نہیں آ سکتی۔ بطور امتحان کے بھی یہ تمنا دل میں نہ آئے گی اور یہ سب عیش تو دخول جنت کے بعد ہو گا جو قیامت کے بعد ہونے والا ہے۔

ارواح کی حالت

اور قیامت سے پہلے یہ حالت ہو گی کہ روحوں کے رہنے کے واسطے عرش کے نیچے قندیل لٹکے ہوں گے جن کے اندر سبز پرندوں کے قالب میں روحیں رہیں گی اور یہ قالب ان کے واسطے جسم و قالب نہ ہو گا بلکہ بطور مرکب کے ہو گا کہ جہاں چاہیں اس مرکب کے ذریعے اسے اڑتے پھریں گے۔ یہی نعمتیں اور راحتیں آخرت کی ہیں جن کی وجہ سے اہل اللہ کے قلوب دنیا سے بیزار ہیں۔

حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''کہ دنیا کو مجھ سے کیا واسطہ اور مجھے دنیا سے کیا تعلق! میری حالت تو دنیا ہی میں ایسی ہے جیسے ایک سوار چلتے چلتے کسی درخت کے نیچے سایہ لے لیتا ہے[1]'' اور ظاہر ہے کہ سوار اس حالت میں درخت کے ساتھ دل نہیں لگاتا نہ اس کو اپنا وطن سمجھتا ہے۔

اب ہماری حالت قابل افسوس ہے یا نہیں کہ ہم نے دنیا کے ساتھ دل لگا رکھا ہے حالانکہ اس کو چھوڑنے کا سب کو یقین ہے کوئی شخص یہاں ہمیشہ رہنے والا نہیں ہے اور زیادہ وجہ دنیا سے دل لگانے کی یہ ہے کہ لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ مرنے کے بعد انسان ایک تنگ و تاریک گڑھے میں مقید ہو جاتا ہے اور تنہا پڑا رہتا ہے' اس تنہائی کے تصور سے لوگوں کو وحشت ہوتی ہے بلکہ انسان میں ایسا برا مادہ ہے کہ غائب کو شاہد پر قیاس کر کے یہ سمجھتا ہے کہ جیسے تنہائی سے اب وحشت ہوتی ہے مرنے کے بعد بھی ہو گی۔ اسی پر خیال مبنی ہے کہ مرنے کے بعد تنہائی ہو گی اور تنہائی سے وحشت ہو گی مگر یہ دونوں مقدمات مخدوش ہیں۔ ثانی تو اس لیے کہ یہاں خود مشاہد ہے کہ بعض تنہائی بھی راحت ہے۔ چنانچہ کہا ہے:

---

[1] (الصحیح للبخاری ۳:۲۱۳' مسند امام احمد بن حنبل ۱:۳۰۱'۴۴۱' المستدرک للحاکم ۴:۳۱۰)

خلوت گزیدہ رابہ تماشا چہ حاجت ست چوں کوئے دوست ہست بصحرا چہ حاجت ست

''خلوت کو محبوب رکھنے والے کو سیر وتفریح کی حاجت نہیں جب محبوب کا کوچہ موجود ہے تو صحرا کی ضرورت نہیں ہے۔''

جو لوگ یہاں خلوت پسند ہیں ان سے خلوت کا مزا پوچھو کہ وہ تمہاری انجمن آرائی پر نفرت ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

ستم ست اگر ہوست کشد کہ بسیر و سمن درآ تو ز غنچہ کم نہ دمیدہ دردل کشا بہ چمن درآ

پھر بھی دنیا میں ان کو خلوت کا پورا لطف اس لیے نہیں آتا کہ جسم کی قید کمال خلوت سے مانع ہے، مرنے کے بعد یہ قید مرتفع ہو جائے گی تو خلوت کا پورا لطف حاصل ہوگا۔ یعنی مشاہدہ جمال حق پوری طرح نصیب ہوگا۔ اس میں وہ لطف ہے کہ بخدا کسی چیز میں اس کی برابر لطف نہیں۔ خاقانی فرماتے ہیں:

پس از سی سال ایں معنی محقق شد بخاقانی کہ یک دم با خدا بودن بہ از ملک سلیمانی

''تیس سال کے بعد خاقانی کو اس امر کی تحقیق ہوئی کہ ایک لمحہ اللہ والا بننا حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت سے بہتر ہے۔''

اور نواب شیفتہ فرماتے ہیں:

چو خوش ست با تو بزمے بنہفتہ ساز کردن در خانہ بند کردن سر شیشہ باز کردن

''سالک کو وہ اس طرح لے جاتے ہیں کہ دوسرے کو خبر نہیں ہوتی مگر جذب سے وہ بھی خالی نہیں ہوتے۔''

اور ایک عاشق کہتے ہیں:

ہمہ شہر پر ز خوباں منم و خیال ماہے چہ کنم کہ چشم بدبیں نکند بکس نگاہے

''سارا شہر حسینوں سے بھرا ہوا ہے اور میں ایک چاند کے خیال میں مست ہوں کیا کروں میں، کاش کہ یہ بدخوبی کی نظر کسی پر بھی نہ پڑے۔''

اور ہمارے خواجہ صاحب فرماتے ہیں:

دل ہو وہ جس میں کچھ نہ ہو جلوہ یار کے سوا میری نظر میں خاک بھی جام جہاں نما نہیں

اور فرماتے ہیں:

(کسی کی یاد میں بیٹھے جو سب سے بے غرض ہو کر تو اپنا بوریہ بھی پھر ہمیں تخت سلیمان تھا ۱۲ جامع)

پس وہاں کی خلوت کو سبب وحشت سمجھنا غلط ہے اس تنہائی پر دنیا کی ہر مجلس آرائی قربان ہے اور اول مقدمہ اس لیے کہ یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ مرنے کے بعد انسان بالکل تنہا رہ جاتا ہے۔

بلکہ حدیث میں آتا ہے کہ مرنے کے بعد روح عالم ارواح میں پہنچتی ہے جہاں سب روحیں اس کا استقبال کرتی ہیں اور دنیا کے حالات اس سے دریافت کرتی ہیں اپنے عزیزوں کا حال پوچھتی ہیں۔ پھر ایک کہتا ہے کہ اس کو راحت کرنے دو دنیا سے تھکا ہوا آیا ہے۔

میری نانی صاحبہ کا جب وصال ہونے لگا تو انہوں نے سیدنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ تشریف لائے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میرے ساتھ چلو راستہ صاف ہے تم کو کچھ خطرہ نہیں۔

تو احادیث اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے ساتھ ہی تنہائی ختم ہو جاتی ہے اور مسلمانوں کی روح عالم ارواح میں جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے مشرف ہوتی اور اپنے عزیزوں کی ملاقات سے مسرور ہوتی ہے۔ غرض وہاں ہر وقت خوشی رہے گی اور ایسی خوشی ہوگی کہ دنیا میں اس کا خواب بھی نہیں دیکھا گیا۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ. (الطور آیت نمبر ۲۳)

کہ جنتی آپس میں جام شراب میں چھینا جھپٹی کریں گے جس میں نہ بیہودگی ہوگی نہ گالم گلوچ کا نام و نشان ہوگا۔ اسی راحت کا کچھ نمونہ دنیا میں اگر نظر آتا ہے تو اہل اللہ کی زندگی میں نظر آتا ہے اہل دنیا کو تو اس کی ہوا بھی نہیں لگی۔

ہمارے حاجی صاحب کے دیکھنے والے بیان کرتے ہیں کہ حضرت حاجی صاحب کا معمول تھا کہ نماز فجر و اشراق کے بعد حضرت اپنے حجرہ میں سے مٹھائی کی ہنڈیا نکال لتے اور مولانا حضرت شیخ محمد صاحب اور حضرت حافظ محمد ضامن صاحب کے ساتھ مٹھائی تناول فرماتے۔ تو بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا کہ ایک صاحب ہنڈیا اٹھا کر بھاگ جاتے اور دوسرے حضرات ان کے پیچھے پیچھے چھیننے کو دوڑتے تھے' آج کل تو اس کے خلاف تہذیب سمجھا جاتا ہے مگر کیا جانے ان لوگوں نے کس چیز کو تہذیب سمجھ رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کل تعذیب کا نام تہذیب رکھ لیا ہے۔

غرض دنیا میں وہ راحت اور وہ سامان میسر نہیں آ سکتا جو آخرت میں ہوگا۔ اگر اس کو یاد رکھا جائے تو کسی عزیز کے مرنے پر حسرت نہیں ہو سکتی۔ ہاں یہ حسرت ہو سکتی ہے کہ ہم وہاں کیوں نہیں پہنچے اور اگر تمہاری دعا قبول ہو جائے اور مردے یہاں آ جائیں تو واللہ! یہاں رہنا ہرگز نا گوارا نہ کریں اور موت ہی کی تمنا کریں اور تم کو ملامت کریں کہ دنیا سے دل لگا رکھا ہے' آخرت کو بھلا رکھا ہے۔ بس اب ہماری یہ حسرت کہ ہائے فلاں عزیز اس وقت ہوتا تو وہ بھی امرود وانار کھاتا بالکل اس کا مصداق ہے:

تو نہ دیدی گہے سلیماں را چہ شناسی زبان مرغاں را

''تو نے کبھی حضرت سلیمان علیہ السلام کو نہیں دیکھا تو پھر پرندوں کی بولی کیسے سمجھے گا۔''

اور ہماری حالت یہ ہے:

چوں آ کرمے کہ در سنگے نہاں ست زمین و آسمان وے ہماں ست

''پتھر کے اندر جو کیڑا ہے وہی پتھر اس کیڑے کا زمین وآسمان ہے۔''

عزیز کے انتقال پر رنج طبعی کا تو مضائقہ نہیں وہ تو بے اختیاری بات ہے اور اس میں حکمت ہے کہ انسان کو توجہ الی اللہ کی دولت اس کے ذریعے سے نصیب ہوتی ہے اور ثواب ملتا ہے مگر یہ حسرت اور دل پھاڑنا واہیات ہے کہ ہائے وہ اکیلا ہوگا۔ ہائے وہ ہماری طرح مزے مزے کی چیزوں سے متمتع نہ ہوگا۔ بخدا وہ تم سے زیادہ راحت میں ہیں تم ان کی فکر نہ کرو' اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ مردوں کے عیش وراحت کو معلوم کرنا چاہو تو میرا رسالہ شوق وطن مطالعہ کرو۔ اس کے متعلق میں تو کلا علی اللہ دعویٰ کرتا ہوں کہ ان شاء اللہ اس کے دیکھنے کے بعد زندوں کو موت کا اشتیاق ہوگا اور مردوں کے زندہ ہونے کا خیال نہ ہوگا بلکہ اپنی فکر ہوگی کہ کسی طرح ہم بھی وہاں پہنچ جائیں۔ پس ہم کو اس کی کوشش کرنا چاہیے کہ ہم کو آخرت کی چین اور راحت حاصل ہو جس کا طریقہ اس آیت میں بتلایا گیا ہے جس کا مجمل عنوان سعادت حاصل کرو ہے۔

اور یہ ایک اتفاقی لطیفہ ہے کہ جس عزیز کے واقع انتقال کی تعزیت کے لیے یہ بیان ہو رہا ہے اس کا نام بھی سعادت پر مشتمل ہے اور ان شاء اللہ وہ اپنے نام کی طرح مسعود ہی ہے۔ ان شاء

اللہ وہ آخرت کی راحت وآسائش سے کامیاب ہے۔ بہرحال آخرت کی راحت حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ سعادت حاصل کرو۔

سعادت ونحوست کی حقیقت

سعادت کی حقیقت لغت میں نیک بختی ہے جس کے معنی ہیں خوش قسمتی۔ مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ اچھے نصیب والے ہیں وہ جنت میں ہمیشہ رہیں گے اور اس حقیقت سے یہ نہ سمجھا جائے کہ دخول جنت میں عمل کو دخل نہیں بلکہ جس کا نصیب اچھا ہے جس کی تقدیر بھلی ہے وہی جنت میں جائے گا۔ سو یہ خیال بالکل غلط ہے کہ جنت میں جانے کے لیے عمل کی ضرورت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو قرآن وحدیث دوقومی کی تاکید اور گناہوں پر وعید کیوں ہوتی؟ کیا یہ تاکید و وعید بیکار ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ جس کے نصیب اچھے ہیں جس کی تقدیر بھلی ہے اس کے متعلق وہاں یہی لکھا جاتا ہے کہ فلاں شخص چونکہ عمل نیک کرے گا اس لیے جنت میں جائے گا۔ پس صاحب نصیب وہی ہے جو نیک عمل کرتا ہے اور بدنصیب وہ ہے جو برے عمل کرتا ہے۔ نصیب کا اچھا ہونا تقدیر کا بھلا ہونا عمل صالح پر موقوف ہے۔ قانون اور قاعدہ یہی ہے۔

یوں خلاف قاعدہ کسی پر فضل ہوجائے وہ اور بات ہے مگر وہ بھی صرف ہمارے نزدیک خلاف قاعدہ ہوگا کیونکہ ہم کو اس کے عمل کی خبر نہیں، باقی اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ بھی خلاف قاعدہ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ہر شخص کی پوری خبر ہے تو جس کو باوجود بدعملی کے بدون عذاب کے جنت میں بھیجا جائے گا اس کے پاس کوئی عمل صالح اتنا بڑا ہوگا جو تمام گناہوں پر غالب آ گیا ہے جس کی خبر اللہ تعالیٰ کو تھی ہم کو خبر نہ تھی۔

سعادت کے دوسرے معنی اور بھی ہیں جو نحوست کے مقابل ہیں یعنی بابرکت ہونا۔ اس کے اعتبار سے مطلب یہ ہوگا کہ جو لوگ بابرکت ہیں وہ جنت میں جائیں گے اور جو منحوس ہیں وہ جہنم میں جائیں گے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ حقیقی منحوس کون ہیں؟ صرف وہ ہیں جو کہ جہنم میں جائیں گے اور یہ جو مشہور ہے نحوست کہ بعض لوگ قمری کو یا اُلو کو یا کیلے کے درخت کو منحوس سمجھتے ہیں یا بعض ایام کو منحوس سمجھتے ہیں یہ کوئی چیز نہیں۔ میرٹھ میں ایک بنیا منحوس گھوڑوں کو خریدتا تھا اور بہت

نفع کماتا تھا۔ اس کے حق میں وہی بابرکت تھے' بعض لوگوں کو قرآن کی اس آیت "فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي أَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ" (القمر آیت نمبر۱۹) "تو ہم نے ان پر ایک ہوائے تند ایسے دنوں میں بھیجی جو (ان کے حق میں) منحوس تھی۔" سے شبہ ہو گیا ہے کہ بعض ایام بھی منحوس ہوتے ہیں مگر انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ایام نحسات کی تفسیر دوسری آیات میں "سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمَانِيَةَ أَيَّامٍ" وارد ہوئی ہے تو اس کو ملا کر یہ لازم آئے گا کہ کوئی دن بھی مسعود نہیں بلکہ سب ایام منحوس ہی ہیں اور اس کا کوئی قائل نہیں۔ لہٰذا اس سے استدلال صحیح نہیں ہو سکتا۔ دراصل ایام میں سعد و نحس کا مسئلہ اہل نجوم کا اختراع ہے اور شیعہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے بھی اس کو منسوب کیا ہے مگر وہ روایت موضوع ہے۔ شریعت میں بعض ایام متبرک تو ہیں مگر منحوس کوئی دن نہیں۔ رہا یہ سوال کہ پھر ایام نحسات کے کیا معنی ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے معنی نحسات علیھم ہیں یعنی قوم عاد کے حق میں وہ ایام منحوس تھے کیونکہ ان پر ان ایام میں عذاب آیا تھا اور وہ عذاب مسبب تھا کفر و معصیت سے۔ پس معلوم ہوا کہ اصل نحوست کی چیز معصیت ہے۔ بہرحال خود اس آیت سے معلوم ہوا کہ سعادت نام ہے طاعت کا اور نحوست نام ہے معصیت کا۔ اب بتلاؤ کہ منحوس ہم ہیں یا الو اور قمری اور کیلا۔ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں معصیت سے مبرا ہیں تو یہ کیسی غلطی ہے کہ ہم اپنی نحوست کو دوسری چیزوں پر ٹالتے ہیں۔ بس ہماری وہ حالت ہے:

حملہ برخود میکنی اے سادہ مرد ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

"بے وقوف اپنے اوپر حملہ کرتا ہے جب کہ اس شیر نے اپنے اوپر حملہ کیا۔"

عمل صالح کی توفیق

اب میں اس آیت کے متعلق چند علمی نکات بیان کر کے ختم کرنا چاہتا ہوں۔ میرے خیال میں اس جگہ سعدوا بصیغہ مجہول میں ایک راز یہ سمجھ آتا ہے۔ بشرطیکہ لغت سے اس کی تائید ہو جائے اور مسعد کا متعدی ہونا معلوم ہو جائے' مجھے یہاں قاموس نہیں ملی ورنہ تحقیق کر لیتا کہ اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ تم جو کامیاب اور نیک بخت کیے گئے ہو یہ تمہارا کیا ہوا نہیں بلکہ یہ خدا

تعالیٰ کی طرف سے محض عنایت ہی عنایت ہے کیونکہ ہر چند کہ سعادت کا مدار عمل صالح پر ہے مگر عمل صالح کی توفیق محض حق تعالیٰ کے فضل سے ہے۔ یہ جو آپ کو نماز کا شوق ہے اور رات کو تہجد میں اٹھتے ہیں یہ آپ کا کام نہیں بلکہ کوئی اور ہی اٹھا رہا ہے۔ بس ہماری حالت یہ ہے:

رشتہ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ است

''انہوں نے ہی یہ حرکات پیدا کر رکھی ہیں جس طرف چاہتے ہیں متحرک کر دیتے ہیں۔''

یہ تو سعدوا میں نکتہ تھا۔

دو علمی نکتے

اس کے بعد:

مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّکَ (سورہ ھود آیت نمبر ۱۰۸)

''جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں وہاں اگر خدا ہی کو (نکالنا) منظور ہو تو دوسری بات ہے''

کے متعلق دو علمی نکتے عرض کرتا ہوں کیونکہ اس پر بظاہر یہ شبہ وارد ہوتا ہے کہ اہل جنت کا جنت میں خلود آسمان زمین کے دوام کے برابر ہوگا اور آسمان و زمین کا دوام محدود ہے تو اہل جنت کا خلود بھی محدود ہوا۔

اس کا جواب تو یہ ہے کہ یہاں پر سمٰوٰت والارض سے مراد جنت کے آسمان و زمین ہیں، دنیا کے آسمان و زمین مراد نہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ جنتی جنت میں ہمیشہ رہیں گے جب تک جنت کی زمین و آسمان رہے اور جنت کی زمین و آسمان کا دوام غیر محدود ہے ان کے لیے کبھی فنا نہیں۔ تو اب کسی شبہ کی گنجائش نہیں اور اس کی دلیل کہ جنت کی زمین و آسمان کا دوام محدود نہیں۔ وہ آیات ہیں جن میں خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا وارد ہے اور وہ احادیث ہیں جن میں ''یااھل الجنة خلود ولاموت ویااھل النار خلود ولاموت''[1] وغیرہ وارد ہے۔

رہا یہ سوال کہ ''مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ'' کہنے کی ضرورت ہی کیا تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایسا جیسے کسی کو انعام میں کوئی گاؤں دیا جائے اور یوں کہا جائے کہ جب تک یہ

---

[1] (الترغیب والترھیب للمنذری ۴:۵۶۳، فتح الباری لابن حجر ۱۱:۴۰۶، سنن الترمذی:۲۵۵۷)

گاؤں باقی ہے اس وقت تک تم اس کے مالک ہو تو اس طرز سے مخاطب کی پوری تسلی ہو جاتی ہے کہ مجھ سے اس کا چھیننے والا کوئی نہیں۔ یہی مقصود اس جگہ "مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ" کے بڑھانے میں ہے۔

اس کے بعد "اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّکَ" کے متعلق ایک اشکال کو دفع کرنا چاہتا ہوں۔ بظاہر "اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّکَ خَالِدِیْنَ فِیْهَا" استثناء ہے۔ ترجمہ یہ ہوا کہ اہل سعادت جنت میں ہمیشہ رہیں گے مگر جب خدا چاہے تو اس سے شبہ ہوتا ہے کہ کسی وقت اہل جنت کا خلود منقطع بھی ہو جائے گا یا انقطاع کا احتمال ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ میرے نزدیک یہ خالدین سے مستثنیٰ نہیں بلکہ الذین سعدوا سے استثناء ہے اور ما بمعنی من ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ جو لوگ اہل سعادت ہیں وہ جنت میں جائیں گے مگر جس کو خدا چاہے وہ جنت میں نہ جائے گا۔ یعنی بعض اہل سعادت ایسے بھی ہیں جن کو ہم لوگ سعید سمجھتے ہیں مگر خدا کے نزدیک وہ سعید نہیں ہیں۔ واللہ یہ بات قاصمۃ الظہر ہے۔ اس نے عارفین کی کمر توڑ دی ہے کیونکہ اس کی کسی کو خبر نہیں ہے کہ ہم خدا کے نزدیک کیسے ہیں۔

تا یارکرا خواہد و میلش بکہ باشد

"محبوب حقیقی کسے چاہیں گے اور کسے اپنے قرب سے نوازیں گے۔"

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دوسری جگہ سورہ اعراف میں "اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّکَ" میں ما کو بمعنی من فرمایا ہے۔ اس میں اور اس میں بظاہر کچھ فرق نہیں اس لیے یہاں بھی ما کو بمعنی من کہنے میں کچھ حرج نہیں اور اسکے بعد خلود اہل جنت میں کچھ اشکال باقی نہیں رہتا کیونکہ اس میں خلود سے استثناء نہیں ہے۔

مولانا شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے اس کی ایک تفسیر کی ہے جو بہت ہی عجیب ہے۔ وہاں تک کسی کا ذہن نہیں پہنچ سکتا۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ "اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّکَ" سے اللہ تعالیٰ کو فرق کرنا منظور ہے اپنی ابدیت اور اہل جنت کی ابدیت سے کہ خدا تعالیٰ کی ابدیت کسی کی مشیت کے تابع نہیں اور اہل جنت کی ابدیت داخل مشیت ہے۔ "اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّکَ" سے فقط یہ بات بتلانا مقصود ہے کہ اہل جنت کی ابدیت مستقل نہیں بلکہ تابع مشیت الٰہیہ ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ یہ ابدیت کسی وقت منقطع ہو جائے گی کیونکہ دوسری نصوص سے یہ مراد معلوم ہے کہ حق تعالیٰ کی مشیت

جو خلود اہل جنت کے متعلق ہے وہ کبھی منقطع نہ ہوگی۔ یہ حاصل ہے شاہ صاحب کی تفسیر کا۔

مگر ان کی عبارت سے یہ مضمون ہر شخص نہیں سمجھ سکتا بلکہ وہی سمجھے گا جس کو یہ معلوم ہو کہ اس مقام پر ایک اشکال ہے جس کو شاہ صاحب رفع کرنا چاہتے ہیں۔ واقعی شاہ صاحب نے اس کو بہت سہل اور مختصر عنوان سے رفع کر دیا ہے جو ان کے تبحر علم کی دلیل ہے۔

ایک آریہ نے یہ اعتراض دوسرے عنوان سے شائع کیا تھا کہ خدا کا وجود بھی غیر متناہی ہے اور جنتیوں کا وجود بھی غیر متناہی ہے تو دونوں برابر ہو گئے۔

میں نے اس کا یہ جواب دیا تھا کہ خدا تعالیٰ کا وجود غیر متناہی بالفعل ہے اور جنتیوں کا وجود غیر متناہی بمعنی لاتقف عند حد ہے مگر شاہ صاحب کا جواب سب سے عمدہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا وجود غیر متناہی بالذات ہے اور اہل جنت کا وجود غیر متناہی بالغیر ہے۔ یعنی مشیت کے تابع ہے۔ یہ چند نکات تھے جو اس آیت کے متعلق تھے۔ اب میں آیت کا خلاصہ عرض کر کے بیان کو ختم کر دوں گا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہم کو آخرت کی راحتوں کی طرف متوجہ فرمایا تا کہ ان کو مستحضر کر کے ہم آخرت کی طرف رغبت کریں اور اس کے لیے سعی کریں اور طریقہ راحت اخرویہ حاصل کرنے کا یہ بتلایا ہے کہ سعادت حاصل کریں جس کا خلاصہ عمل صالح ہے۔

اور یہاں سے میں اہل علم کو متنبہ کرتا ہوں کہ وہ اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ اہل علم آج کل علم حاصل کر کے بے فکر ہو جاتے ہیں، عمل کا اہتمام اور تکمیل عمل کی کوشش نہیں کرتے اور حیرت ہے کہ اس پر وہ اپنے آپ کو نائب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سمجھتے ہیں۔ کیا یہی علم مجرد عن العمل وہ شے ہے جس سے تم نیابت رسول چاہتے ہو اس علم خالی عن العمل کی تو وہ حالت ہے جس کے متعلق اہل تحقیق یوں فرماتے ہیں:

علم رسمی سربسر قیل است قال	نے ازو کیفیتے حاصل نہ حال
علم چہ بود آں کہ رہ بنما یدت	زنگ گمراہی زدل بزدایدت
ایں ہوس ہا از سرت بیروں کند	خوف و خشیت دردلت افزوں کند
تو ندانی جز یجوز ولا یجوز!	خود ندانی نی کہ توحوری یا عجوز!
علم نبود غیر علم عاشقی	مابقی تلبیس ابلیس شقی!

علم چوں بردل زنی یارے شود　　علم چوں برتن زنی مارے شود

''علم رسمی محض قیل وقال ہے نہ اس سے کوئی کیفیت حاصل ہو نہ حال علم، وہی ہے جو تم کو خدا کا رستہ دکھادے اور دل سے گمراہی کا زنگ دور کردے۔ یہ علم حرص وھویٰ سے چھڑا کر ہمارے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف وخشیت پیدا کرتا ہے، تم کو جائز ہے یا ناجائز ہے کہ سوا اپنی خبر نہیں کہ تم مقبول ہو یا مردود، علم عاشقی کے علاوہ جو علم بھی ہے وہ ابلیس شقی کی تلبیس ہے، علم جب دل تک پہنچ جائے تو دوست بن جاتا ہے اور علم کی جب بدن تک رسائی ہو تو وہ سانپ بن جاتا ہے۔''

حقیقی علم

حقیقی علم وہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو اور وہ بدون عمل کے نہیں ہوسکتی۔ پس علم بدون عمل کے جہالت کی مثل ہے　　علمے کہ رہ حق نہ نماید جہالت ست

''علم جب حق تعالیٰ تک نہ پہنچائے وہ جہالت ہے۔''

غرض علم محض پر کفایت کرنا بڑی غلطی ہے۔ علماء وطلبہ کو عمل کا پورا اہتمام کرنا چاہیے۔ جب ہی ان کو سعادت حاصل ہوگی۔ چونکہ اس بیان میں اہل علم وطلبہ بھی شریک ہیں اس لیے یہ مضمون طالب علموں کی ضرورت کا بیان کردیا گیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ دنیا وآخرت کی چین چاہتے ہو تو سعادت حاصل کرو اور ایسی سعادت جس سے جنت کا دخول اولیٰ حاصل ہو اور حق تعالیٰ کا قرب کامل عطا ہو۔ علم دین مع العمل ہے۔ گو سعادت کا ایک درجہ مجرد علم سے اور مجرد عمل سے بھی حاصل ہوسکتا ہے کیونکہ نجات مطلقہ کے لیے نفس ایمان واسلام بھی کافی ہے مگر ناقص درجہ پر کفایت کرنا غلطی ہے کیونکہ آخرت کا عذاب ذرا سا بھی بہت ہے۔ واللہ! اس کا تحمل نہ ہوسکے گا۔ پس اس کی کوشش کرو کہ سعادت کاملہ نصیب ہو اور وہ جبھی ہوگی جب کہ علم دین بھی حاصل ہو اور اس کے ساتھ عمل کا بھی اہتمام ہو۔

اب مرحوم کے لیے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس کی آخرت کو راحت وچین عطا فرمائے اور زندوں کے لیے صبر وقرار وسکوں کی دعا کیجئے۔ مجھے امید ہے کہ ان شاء

اللہ تعالیٰ اس بیان سے ان کا دل ٹھنڈا ہو گیا ہوگا اور اگر اس مضمون کو سوچتے رہے تو ان شاء اللہ پوری طرح قرار و سکون ہو جائے گا۔ ایک تدبیر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ مرحوم کی بیماری اور انتقال وغیرہ کا تذکرہ موقوف کر دیا جائے کہ اس سے دل پر تازہ زخم لگتا ہے۔

بس اب میں ختم کرتا ہوں۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ
ہم کو سعادت کاملہ عطا فرمائیں اور فہم تسلیم و عمل
مستقیم عطا فرمائیں۔ آمین!

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا
مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ.
وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ
الْعَالَمِیْنَ.

تم بحمد اللہ